وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر
ناصر کاظمی، شخصیت اور فن
ڈاکٹر حسن رضوی

وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر

ناصر کاظمی: شخصیت اور فن

ڈاکٹر حسن رضوی

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

مدینۃ العلمؐ اور باب العلمؑ کے نام

ترتیب

○::○ باب دوم:

اردو غزل، روایت اور ارتقا

○::○ باب سوم:

ناصر کاظمی کی شاعری

(د) "نشاط خواب" غزل گو ناصر کاظمی کی شاعری کا مختلف مزاج۔

(ہ) "سر کی چھایا" منظوم ڈراما۔

(و) "کلاسیکی شعرا کا انتخاب

۱۔ انتخاب میر۔ ۲۔ انتخاب نظیر۔

۳۔ انتخاب ولی۔ ۴۔ انتخاب انشا۔

○::○ باب چہارم :
ناصر کاظمی کی نثر

ناصر کاظمی کے نثری مضامین کی فہرست۔ نثر کیا ہے؟۔
ناصر کاظمی کی نثر۔ ناصر کاظمی کے مضامین کا فکری و فنی جائزہ۔ نثری مضامین کی کتاب "خشک چشمے کے کنارے" کے مضامین۔ ناصر کاظمی کا نظریہ فن' میں کیوں لکھتا ہوں؟"میر ہمارے عہد میں"" میر کے خوابیدہ پہلو' میر درد کے ہاں عشق مجازی۔ ہم عصروں کے بارے میں مضامین' ادب کے مختلف موضوعات و مباحث پر نثری تحریریں' ریڈیائی فیچرز' (نظیر اکبر آبادی' غالب' داغ' حسرت موہانی' اقبال' راشد' میرا جی 'فیض' نئی غزل' اردو شاعری میں ردیف کی اہمیت' اردو غزل میں ہجر و وصال' شاعر اور خدا کی تلاش' شاعر اور تنہائی)

○::○ باب پنجم :
ناصر کاظمی کی گفتگو' مکالمے اور غیر مطبوعہ ڈائریاں

(الف) ناصر کاظمی کی گفتگو اور مکالمے' مکالموں کا پس منظر' گفتگو کے بارے میں 'دوستوں کی آرا' مکالموں کا قلم بند ہونا' مکالمے' "خوشبو کی ہجرت" "رفتار کا بدن"" غالب اور ہم"" "دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی

طرف"

(ب) ناصر کی غیر مطبوعہ ڈائریاں' ڈائری کیا ہے؟ ناصر کاظمی کی ڈائری نویسی' "چند پریشاں کاغذ" کی ابتدائی تاریخ' غیر مطبوعہ ڈائریوں کے مندرجات' (خوش خوراکی اور خوش لباسی' "ہمایوں" کے بارے میں' پتوں اور بجلی کا ذکر' حلقہ ارباب ذوق کا ذکر' راولپنڈی سازش کیس اور فیض صاحب سے ملاقات کا تذکرہ' احمد ندیم قاسمی' اختر شیرانی' مولانا عبدالمجید سالک اور عبدالمجید بھٹی کا ذکر' انگریزی ادب سے دلچسپی' گھڑ سواری اور شکار کا ذکر' ٹی ہاؤس / کافی ہاؤس کے ادیب دوست' ٦ اور ١٠ ستمبر ١٩٦٥ء کا ذکر' ناصر کاظمی کی بیگم اور بیٹوں کا تذکرہ' عنصر کاظمی کا تذکرہ' آباؤ اجداد کا ذکر اور اپنے بڑے سوتیلے بھائی حامد حسین کا ذکر' قرآن کریم اور نہج البلاغہ کا مطالعہ' احباب کے تذکرے اور مشاعرے' کبوتروں کے بارے میں مکمل معلومات۔

○::○ ضمیمہ :

○::○ ناصر کاظمی کا عکس تحریر :

"چند پریشان کاغذ" کے عکس' ڈائری نمبر ١ کے چند صفحات کے عکس' میٹرک کی سند کا عکس' جس پر اصل تاریخ پیدائش درج ہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور کی انتظامیہ کے ساتھ خط و کتابت کے عکس' بیماری کے سبب چھٹی کے لیے درخواستوں کے عکس۔ میڈیکل رپورٹوں کے عکس' ریڈیو کی انتظامیہ کی جانب سے اعلیٰ حکام کی خدمت میں مالی امداد کے لئے ٹیلیکس کے عکس۔ موت کے سرٹیفکیٹ کا عکس' سٹاف یونین کی جانب سے اعلیٰ حکام کی خدمت میں گریجویٹی کی جلد ادائیگی کی اپیل کا عکس۔

○::○ کتابیات:

(الف) کتب۔
(ب) رسائل و جرائد۔
(ج) ہم عصر ادیبوں کے مضامین۔
(د) انٹرویوز۔
(ہ) غیر مطبوعہ مواد۔

○::○

Dr. Hasan Rizvi has done what was long over-due. Admittedly, Nasir Kazmi is the haunt of many minds - but no worth-while effort in the past was made to explore the creative dynamics of his personality. Hasan has finally accomplished it, not as a compulsion - not by way of drudgery - but as labour of love. The book is not a tentative, bleary - eyed venture, not a pot-pourri of incoherent details. It is work of sustained, sensitive scholarship, an in-sightful and in-depth study. There is nothing abstruse or vague about its contents, the style is refreshingly lucid. An eminently readable and revealing book; it tells you a lot about Nasir Kazmi, about his dreams, fears, aversions and commitments. It also seeks to assess, on the basis of concrete evidence, his calibre both as a poet and man of letters. Dr. Hasan's book would serve as valuable reference book. Dr. Hasan's is an impeccable research work a creative effort of rare ment. A book of abiding worth probably the first and the last one. It is a boon for those who adore Nasir Kazmi and a source of inspiration for young scholars who may like to under-take further research on him.

(NUSRAT ALI)
29-C, GOR-III
Shahdman, Lahore.

پیش لفظ

......انتظار حسین

یہ توقع نہیں تھی کہ ناصر کاظمی اتنی جلدی تحقیق کا موضوع بن جائے گا۔ کل تک وہ ہمارے درمیان چل پھر رہا تھا اور زندوں سے زیادہ زندہ نظر آتا تھا۔ جب وہ گرمی کی کھڑی دوپہروں میں اور جاڑوں کی لمبی راتوں میں لاہور شہر کی گلیوں اور سڑکوں کو کھوندتا پھرتا تھا تو اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ شتابی سے فارغ ہوا چاہتا ہے۔ بس وہ دیکھتے دیکھتے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر دیکھتے دیکھتے تحقیق کا موضوع بھی بن گیا۔ اب تک تو یہی ہوتا آیا تھا کہ شاعر دنیا سے گزرنے کے بعد رفتہ رفتہ تاریخ ادب کا حصہ بنتا تھا اور پھر ایک زمانے کے بعد تحقیق کا موضوع بنتا تھا۔ ناصر کو یہ شرف کتنی جلدی حاصل ہو گیا۔ اس میں ناصر کے دوستوں اور عزیزوں کے لئے خوشی کا پہلو بھی ہے اور ساتھ میں کچھ پریشانی کے پہلو بھی ہیں۔

حسن رضوی کوئی ان نامی گرامی محققوں میں سے نہیں ہیں جن کی تحقیق کا لوہا مانا جاتا ہے۔ اس عزیز نے کام کھیلے کھلائے محققوں والا دکھایا ہے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کی زندگی کی چھوٹی بڑی تفصیلات کو اکٹھا کر دینے کا نام تو تحقیق نہیں ہے۔ اگرچہ ایسی تفصیلات کو بھی جو ابھی تک نظروں سے اوجھل تھیں کھود کر نکال لائے تو پھر کیا۔ ایسی تحقیق پر کون چونکتا ہے اور کون داد دیتا ہے۔ تحقیق ایسی ہو کہ دنیائے

ادب چونک پڑے اور ایک بحث اٹھ کھڑی ہو۔ داد تو ایسی ہی تحقیق پر ملے گی۔ سو جب ایک محقق شواہد اکٹھے کر کے اپنے حساب پر ثابت کر دکھاتا ہے کہ خالق باری، امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے تو اہل علم و ادب کے حلقوں میں ایک ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی تائید کرتا ہے کوئی تردید میں شواہد لاتا ہے۔ یا پھر شاعر کی زندگی کے کسی ایسے راز سے پردہ اٹھایا جائے یا چھپے ہوئے ایسے پہلو کو سامنے لایا جائے کہ جو سنے چونک پڑے۔ مگر ایسی تحقیق تو کسی ایسے شاعر ہی پر ہو گی جس پر صدیاں بیت چکی ہوں۔ کم از کم صدی ڈیڑھ صدی کا فاصلہ تو ہو۔ اسی صورت میں ہم شاعر کے کلام کے الحاقی ہونے نہ ہونے کے بارے میں بھی قیاس کے گھوڑے دوڑا سکتے ہیں۔ نجی زندگی کے رازوں پر بے تکلفی سے بحث بھی اسی صورت میں کر سکتے ہیں۔

جب ایک محقق یہ کہتا ہے کہ غالب کو ایک ڈومنی سے عشق تھا یا میر اپنی ایک عزیزہ کے عشق میں پاگل ہو گیا تھا تو میر اور غالب کا دل میں بہت احترام ہوتے ہوئے بھی مجھے ایسے کسی بیان سے پریشانی نہیں ہوتی اور مومن کا کسی پردہ نشین سے کیا رشتہ تھا اور وہ دلی والی تھی یا سہرام کا نگینہ تھی مجھے کیا۔ میں ایسی ساری تحقیق لطف لے کر پڑھ سکتا ہوں۔ میر، غالب، مومن اور میرے درمیان فاصلہ بھی تو بہت ہے۔ میری ان سے کوئی ذاتی دوستی نہیں تھی اور ان میں سے کسی کی کوئی بیٹی بہن بیوی بھائی یا بیٹا زندہ نہیں ہے۔ اس لئے سماجی سطح پر کسی کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اب میری سمجھ میں محققوں کی یہ منطق آتی ہے کہ جب شاعر پہ صدی ڈیڑھ صدی گزر جائے تب اس پر تحقیق شروع کرو۔ حسن رضوی نے ناصر کاظمی پر ہاتھ جلدی ڈال دیا۔

حسن رضوی کو اس تحقیقی کام میں جس بات نے بہت فائدہ پہنچایا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا تعلق اسی شہر انبالہ سے ہے جو ناصر کا شہر ہے۔ اس باعث ناصر کے خاندان کے لیے چھپے کتنے افراد تک اسے رسائی حاصل ہو گئی اور پھر کتنے ایسے بزرگوں سے بھی اسے پوچھ گچھ کا موقعہ مل گیا جو ناصر کی ابتدائی زندگی کے عینی شاہد ہیں اور اس خاندان سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس زور پر حسن رضوی نے ناصر کے سلسلہ میں واقعی کچھ ایسا سوانحی مواد برآمد کیا ہے جو عام حالات میں کسی محقق کے لئے برآمد کرنا

ممکن نہیں تھا۔ مگر پھر وہی بات کہ دریافت شدہ سوانحی مواد میں کوئی بات، کوئی شوشہ ایسا بھی تو ہونا چاہئے جس میں چونکانے کی صلاحیت ہو۔ اگر تحقیق کر کے یہی ثابت کیا جائے کہ ناصر نے اپنے خاندان کی جو ہوا باندھی تھی وہ صحیح نہیں تو ایسی تحقیق کی اہمیت تو بس واجبی واجبی ہے۔ مگر حسن رضوی نے ہمیں اپنی تحقیق سے چونکانے کا اہتمام بھی کماحقہ کیا ہے۔ اس نے ناصر کی چھپی ہوئی جذباتی زندگی سے پردہ اٹھانے کا جتن کیا ہے اور اپنے حساب اداسی کے شاعر کی اداسی کا اصلی سبب معلوم کر لیا ہے۔

اگرچہ محبت کی یہ داستان انبالہ تک محدود نہیں رہتی بلکہ لاہور تک چلتی ہے۔ پھر بھی میں اسے انبالہ والے خانے ہی میں رکھوں گا۔ اس طرح میں ناصر کا دوست ہوتے ہوئے بھی اس واقعہ سے اپنی بے خبری اور بے تعلقی کا اطمینان کر سکتا ہوں۔ مگر حسن رضوی نے ناصر کی بعض ایسی جذباتی وابستگیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کا قرائن کے اعتبار سے مجھے عینی شاہد ہونا چاہئے۔ مگر میں حسن رضوی کو اپنے ٹھیے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دوں گا۔ ناصر کے بعض ہم عصروں کی طرح میں قطعی انداز میں تو اس کی تردید نہیں کر سکتا۔ ایسے کسی معاملہ کے بارے میں آپ قطعی انداز میں کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔ مگر میں ایسی کسی فرضی یا اصلی جذباتی وابستگی کے بارے میں تصدیق بھی نہیں کر سکتا۔ میں کہیں چپکے سے کچھ لکھ لکھا کر اب سے سو سال بعد والے محقق کے لئے تو کوئی بیان چھوڑ سکتا ہوں مگر آج کے کسی محقق یا سوانح نگار کو میں کوئی سہولت فراہم کرنے یا ٹپ دینے کے لئے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔

بہرحال ناصر کی "پہلی بارش" کی وجہ نزول جو سمجھائی جا رہی ہے وہ ساری بحث مجھے بہت فضول نظر آئی ہے۔ شاعری کو سمجھنے کا یہ بہت سطحی طریقہ ہے۔ اس پر مجھے اپنے ناول "بستی" پر لکھا ہوا ایک مضمون یاد آ رہا ہے۔ مضمون نگار کو اس ناول کے بعض کرداروں پر گمان ہوا کہ یہ ناول نگار کے کچھ دوست ہیں جو فرضی ناموں سے ناول میں ظاہر ہوتے ہیں۔ سو اس نے ناول پر گفتگو اس طرح کی کہ کرداروں کے نام غائب کر دیئے اور انہیں احمد مشتاق، منیر نیازی اور ناصر کاظمی کہہ کر بحث شروع کر دی۔ جس طرح مضمون نگار کے اس طریقہ نے اس مضمون کو مہمل بنا دیا ہی طرح مجھے "پہلی بارش" پر کچھ خاص ذاتی حوالوں سے ہونے والی بحث بھی

مہمل نظر آتی ہے۔ بری شاعری اور برے افسانے کی اور بات ہے' اچھی شاعری اور اچھے افسانے میں لکھنے والا اتنی آسانی سے پکڑا نہیں جاتا۔ ذاتی تجربے شعر اور افسانے میں ایک پیچ در پیچ عمل سے گزرتے ہیں اور ان کی اس طرح کایا کلپ ہوتی ہے کہ غبی نقادوں کو تو جانے دو سمجھدار نقاد بھی انہیں پکڑ نہیں پاتے۔ اور کبھی کبھی ذاتی تجربے کا سراغ شاعری اور افسانے کے ان حصوں سے ملتا ہے جن کی طرف نقادوں کا اس سلسلہ میں دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

اب رہی یہ بات کہ ناصر کاظمی نے اپنے بارے میں کیا بیانات دیئے تھے اور حسن رضوی کی تحقیق ہمیں کیا بتاتی ہے سو حسن رضوی کی تحقیق برحق مگر میں بھی اس پر ایک اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ناصر کاظمی کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ محققوں کا عمومی طریق کار یہ ہے کہ وہ زیر تحقیق شاعر کے بیانات کو اپنے درآمد شدہ واقعات کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور اپنے حساب دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیتے ہیں کہ شاعر کے بیان میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ تھا۔ مگر واقعات کی کسوٹی جھوٹ سچ کو پرکھنے کی کوئی بہت جامع کسوٹی نہیں ہے اور بالخصوص شاعروں یا اہل تخلیق کے سلسلہ میں۔ مگر محققوں کی اپنی ذہنی مجبوریاں بھی تو ہیں۔ وہ محض اور صرف واقعات کی دنیا میں رہتے ہیں۔ مگر شاعر واقعات کی دنیا میں کم اور تخیلات کی دنیا میں زیادہ رہتا ہے۔ ناصر کاظمی کے سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہئے۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ اور بیشک ایسی کوئی خواہش زندگی میں پوری نہ ہو۔ مگر ناصر نے تو جانے کتنی ایسی خواہشوں کو تخیلی سطح پر بسر کیا تھا اور انہیں اس سطح پر اپنے لئے سچائی بنا لیا تھا۔

لیکن حسن رضوی کی تحقیق نے مجھ پر بعض عجب انکشافات کئے ہیں ناصر کے کتنے ایسے بیانات تھے جنہیں میں نے تخیلاتی سچائی کے طور پر قبول کیا تھا۔ مگر حسن رضوی کی تحقیق سے کھلا کہ وہ تو واقعہ ہے۔ مثلاً گھڑ سواری کا مسئلہ ہے۔ اب میں ناصر کاظمی کو دیکھ کر کبھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کبھی گھڑ سوار بھی رہا ہوگا اور میں کیا سب ہی دوست جب وہ گھڑ سواری کے حوالے سے کوئی اپنا تجربہ بیان کرتا تھا تو مسکرا کر چپ ہو جاتے تھے۔ ایک احمد مشتاق تھا جو علانیہ اپنے شک کا اظہار کر دیتا تھا۔ میں نے دل میں اس کی توجیہہ اس طرح کر رکھی تھی کہ آخر ناصر کو نامی

شہسواروں اور فاتحوں سے بھی تو بہت شغف ہے۔ تیمور کا ذکر وہ کس گرمجوشی سے کرتا ہے۔ شاید اس کے اندر کچھ ایسا ہی بننے کا کوئی خواب مدھم مدھم منڈلا رہا ہے۔ اس واسطہ سے شیر کے شکار اور گھڑ سواری کے ذاتی تجربوں کا بیان سمجھ میں آتا ہے۔ مگر حسن رضوی کی تحقیق تو ناصر کے ان سارے بیانات کی جو اس نے اپنی گھڑ سواری کے سلسلہ میں دیئے تھے واقعاتی سطح پر تصدیق کر رہی ہے اور اسی تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا کہ انبالہ میں اس کے والد کا واقعی ایک اصطبل بھی تھا ورنہ ہم دوستوں نے تو اصطبل کی بات کو بس ایک داستان ہی جانا تھا۔

ناصر کے یہاں واقعہ اور تخیل کا عجب انداز سے گھال میل ہوا تھا کہ واقعہ تخیل کی کارستانی نظر آتا ہے اور تخیل کی کارستانی پر واقعہ ہونے کا گمان گزرتا۔ معاف کیجئے مجھ سے غلطی ہو گئی۔ ناصر کے یہاں واقعہ اور تخیل کے عمل کو الگ الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ آپس میں اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش ہی بدمذاقی نظر آتی ہے۔ اب یوں دیکھئے کہ ناصر صحن میں بیٹھا پراٹھا کھا رہا ہے۔ ایک بھڑ آس پاس بھنبھنا رہی ہے۔ بار بار اڑتی ہوئی اس کے چہرے کے قریب آتی ہے۔ ناصر اسے ہاتھ کی جنبش سے پرے کر دیتا ہے۔ وہ دور چلی جاتی ہے۔ مگر پھر اڑتی اڑتی اس کے چہرے پر منڈلانے لگتی ہے۔ سامنے دیوار پر بیٹھا کوا یہ منظر دیکھ رہا ہے۔ وہ اڑ کر آتا ہے۔ بھڑ کو چونچ سے پکڑتا ہے۔ مارتا ہے۔ مری ہوئی بھڑ کو ناصر کے سامنے احتیاط سے رکھ دیتا ہے اور واپس پھر دیوار پر جا بیٹھتا ہے اگر میں ناصر کے اس بیان کو اس طرح چھانوں پھٹکوں کہ اس میں واقعہ کتنا ہے اور تخیل کی رنگ آمیزی کتنی ہے تو میری یہ کوشش کتنی مضحکہ خیز ہو گی اور اس سے جھوٹ کے سوا کچھ برآمد نہیں ہو گا۔ بس یہ اسی شکل میں رہے تو سچ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایسا شاعر جس کے یہاں واقعہ اور تخیل کی حدیں آپس میں گھل مل گئی ہوں وہ محقق کے بس کی چیز نہیں ہے۔ ہاں اگر محقق اپنے آپ کو بدل لے یعنی واقعاتی حساب سے جنم لینے والے سچ اور جھوٹ کے چکر سے نکل کر جب بھی کوئی محقق ناصر کو اپنا موضوع بنائے گا ناصر کا اس سے پہلا تقاضا یہی ہو گا کہ واقعاتی اعتبار سے جنم لینے والے سچ اور جھوٹ کی تکڑی سے نکلو اور پھر مجھے دیکھو۔

حرف آغاز

□☆∷☆□

حرف آغاز

اردو غزل کے بارے میں ناصر کاظمی نے کہا تھا کہ "غزل کا احوال دلی کا سا ہے یہ بار بار اجڑتی ہے اور بار بار بستی ہے۔ کئی بار غزل اجڑی لیکن کئی بار زندہ ہوئی اور اس کا امتیاز یہی ہے کہ اس میں شاعری اچھی ہوئی۔"

اقبال کے بعد ناصر کاظمی ایک ایسے منفرد غزل گو کے طور پر ابھرے جنہوں نے نہ صرف اجڑی ہوئی غزل کو نئی زندگی سے ہمکنار کیا بلکہ فطرت اور کائنات کے حسن بے مثال سے وہ خود بھی حیران ہوئے اور پھر اپنے جوہر تخلیق سے اوروں کو بھی حیران کیا۔ احساس تحیر ہی ناصر کاظمی کی شاعری کی وہ خوشبو تھی جو فضاؤں میں پھیلتی چلی گئی اور اس فضا میں سانس لینے والوں کے دلوں میں گھر کر گئی۔ اس خوشبو کو جس کسی نے بھی محسوس کیا اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک نیا جہان حیرت دیکھا جس میں سرسبز و شاداب درخت تھے ان درختوں پر چہکتے پرندے تھے۔ رنگ رنگ بولتی چڑیاں تھیں۔ ننھے منے آسمانی سفیر کبوتر تھے۔ کھلا آسمان تھا۔ تارے تھے' چاند تھا' پتوں کے جلترنگ تھے' سرسوں کے پھول تھے۔ کتابی چہرے تھے۔ روشن آنکھیں تھیں۔ مہکتے رت جگے تھے۔ اداس صبحیں تھیں۔ ساون تھا۔ کڑی دھوپ تھی۔ گرمی اور جاڑے کے موسم تھے۔ مہکتی گلیاں تھیں۔ سنسان شہر تھے۔ میلے ٹھیلے تھے۔ ہلکی سردی کی

بارش تھی۔ ان دیکھے موسموں کی خوشبو تھی اور مانوس موسموں کی مہکاریں تھیں۔ ناصر کاظمی کے اس حیرت کدے ہی نے مجھے ناصر کاظمی کی متنوع شخصیت اور ان کے فن کے مطالعے کی طرف مائل کیا۔ میں نے اس کا ذکر ڈاکٹر سہیل احمد خان سے کیا تو انہوں نے ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے تحقیق کرنے کی مجھے تحریک دی۔ میری ناصر کاظمی کے فن اور شخصیت سے دلچسپی ان کی غزل کی خوشبو اور ان کی باتوں کی بارشوں کی مہکاروں کے علاوہ اس بنا پر بھی تھی کہ وہ میرے بزرگوں کے وطن انبالہ شہر کے باسی تھے جہاں کی تہذیب سرسوں کا پھول تھی۔ میں نے ان کے تخلیقی رنگوں میں کھوئے ہوؤں کی جستجو کے ساتھ ساتھ نئے خوابوں کی چمک اور نئے زمانوں کی مہک محسوس کی اور اس طرح سے ان کی شخصیت کو عام شعرا کی شخصیات سے بہت مختلف پایا تو میرا تجسس اور بڑھا۔ اور یوں میں نے ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن پر کام کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس ضمن میں میرے استاد ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صدر شعبہ اردو اورینٹل کالج نے مجھے اس موضوع پر کام کرنے کا حوصلہ دیا اور یوں میں نے ڈاکٹر سہیل احمد خان کی رہنمائی میں ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن کے بارے میں جستجو شروع کر دی۔ یونیورسٹی نے میرے پی ایچ۔ ڈی کے لئے پیش کردہ خاکے کو منظور کر لیا اور پھر میں باقاعدہ اپنے اس موضوع کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میرے سامنے ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن کے بارے میں تحقیق کرنے کے سلسلے میں بہت سے سوالات تھے جنہیں جاننے کے لئے میں نے نہ صرف اندرون ملک بلکہ ناصر کاظمی کی جنم بھومی انبالہ کا بھی سفر اختیار کیا۔ میرے والد مرحوم سید کوثر عباس رضوی نے مجھے انبالہ محلہ قاضی واڑہ کا پورا نقشہ بنا دیا تھا اور سمجھا دیا کہ کون کہاں کہاں رہتا تھا۔ انبالہ شہر کے ڈپٹی کمشنر شری انل رازدان نے اس ضمن میں میری رہنمائی کی اور ہولی طمن کے روز اپنی ذاتی گاڑی میں مجھے محلہ قاضی واڑہ بھیجا۔ میں اس شہر اور اس کے محلوں میں گھوما پھرا اور ناصر کی شاعری کی خوشبو کو مختلف حوالوں سے ان گلیوں اور محلوں میں محسوس کیا۔ پھر میں نے ناصر کاظمی کی شخصیت کے بارے میں مختلف گرہیں کھولنے کے سلسلے میں ان کی بچپن کے دوستوں سے رابطہ کیا:۔ حا اور گوجرانوالہ میں مقیم ہیں۔ لاہور میں ناصر کاظمی کے دوستوں سے ملا۔ انتظ ، شیخ صلاح الدین، شہرت بخاری کے

خیالات سے استفادہ کیا۔ ناصر کاظمی کے دونوں بیٹوں باصر سلطان کاظمی اور حسن سلطان کاظمی نے ہمیشہ ایک نئے حوالے سے میری رہنمائی کی ۔ ناصر کاظمی کے بھائی عنصر کاظمی اور بیگم شفیقہ کاظمی نے کئی حوالوں سے میرے تجسّس کو دور کیا۔ افتخار کاظمی 'مزدور امام ناصر کاظمی کے بچپن کے دوست ہیں ان سے متعدد بار ملا اور ناصر کاظمی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے معلومات حاصل کیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر حسن عسکری کاظمی ' سید محمد باقر کاظمی ' سید کاظم علی شاہ 'سید محمد رضوان کاظمی ' سید محمود الحسن کاظمی ' سید اشفاق علی شاہ' سید نصیر کاظمی ' ناصر زیدی' سید ہاشم علی شاہ' سید عاقل کاظمی ' بشیر زیدی اسیر' ڈاکٹر سعادت سعید' ڈاکٹر اجمل نیازی' ڈاکٹر سید سعید مرتضٰی زیدی' پروفیسر شبیہ الحسن ہاشمی اور عتیق اللہ شیخ کے علاوہ انبالہ شہر کی متعدد شخصیات نے مفید معلومات مہیا کیں۔ اس طرح سے ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے تحیر کے کئی در کھلتے چلے گئے۔ کچھ تجسّس اسلم انصاری کے حوالے سے بھی تھا سو میں نے اس ضمن میں احمد عقیل روبی اور اسلم انصاری سے استفسار کئے۔ ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے مجھے ناصر کاظمی کی شخصیت غیر معمولی اور متنوع دکھائی دی۔ یہی وجہ ہے کہ ناصر کاظمی کی شخصیت کا باب طوالت اختیار کر گیا۔ ناصر کاظمی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور اظہار کے لئے اس کے سوا ممکن بھی نہیں تھا اس لئے کہ ناصر کاظمی کی شخصیت محض ایک شاعر ہی کی نہیں تھی اس میں چھوٹا سا سائنس دان' شکاری' موسیقار' مصور' کبوتر باز اور فطرت سے عشق کرنے والا ایک حساس انسان بھی چھپا بیٹھا تھا۔ سو میں نے ان تمام پہلوؤں کے حوالے سے ناصر کی شخصیت کا جائزہ لیا اور انھیں ان کے ہم عمر خاص و عام شعرا اور ادیبوں سے قطعی مختلف پایا۔ سو اس مقالہ کا پہلا باب ناصر کاظمی کی شخصیت کے متعلق ہے۔ اس باب میں ناصر کی شخصیت کے حوالے سے تحقیق ہے۔ اس سلسلے میں یہ احساس بھی کار فرما رہا کہ ابھی ناصر کے بہت سے معاصرین اور دوست حیات ہیں اس لئے اگر مفصل معلومات جمع کی جائیں تو آئندہ تحقیق کرنے والے کے لئے ایک بنیاد فراہم ہو سکتی ہے اس پس منظر میں امید ہے اس باب کی طوالت کو معاف کیا جائے گا۔ ناصر کاظمی پر انبالہ کے کچھ سادات کو یہ اعتراض تھا کہ وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ دوسرے معنوں میں ان

کے سید ہونے پر شبہ کیا جاتا تھا۔ میں نے اس باب میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ گو ان کا تعلق انبالہ کے سادات کاظمی سے نہیں تھا مگر وہ کھرے سید تھے۔ اس ضمن میں ناصر کاظمی کا شجرہ بھی تلاش کر کے دیا گیا ہے۔ ناصر کاظمی کی نثر اور شاعری میں انبالہ کا بہت ذکر ملتا ہے اور وہاں بولی جانے والی زبان کا عکس بھی ان کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ سو پہلے باب میں انبالہ شہر کے بارے میں وہاں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے حوالے سے جائزہ پیش کیا ہے۔ ناصر کاظمی نے اپنی ڈائریوں میں اپنی پیدائش کی تاریخ ۸ر دسمبر ۱۹۲۵ء درج کی تھی جبکہ ان کی تاریخ پیدائش میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے مطابق یکم دسمبر ۱۹۲۳ء ہے۔ اس ضمن میں ناصر کاظمی کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ کا کھوج لگا کر اصلی تاریخ پیدائش کی نشاندہی کی ہے۔ ناصر نے اپنی ڈائری میں اپنے خاندانی رئیس ہونے کا بھی ذکر کر رکھا تھا۔ اس بارے میں تحقیق سے ثابت کیا گیا ہے کہ ان کا تعلق محض ایک عام خوشحال گھرانے سے تھا اور وہ خاندانی رئیس نہیں تھے۔ ناصر کی زندگی میں بم بنانے کا واقعہ' شیر سے لڑائی' گھڑ سواری' شکار' موسیقی سے رغبت' کبوتروں اور پرندوں سے عشق ان تمام مشغلوں کے حوالے سے اس باب میں اصل حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ ناصر کاظمی نے اپنی ڈائری میں اپنے پہلے عشق کا بھی ذکر کیا ہے مگر دوسرے اور سن شعور کے عشق کے بارے میں انہوں نے زندگی بھر لب کشائی نہیں کی۔ اس عشق کے حوالے سے بھی کچھ نئے انکشافات کیے گئے ہیں۔ ناصر کاظمی کی بیماری کے حوالے سے ریڈیو نے جو رول ادا کیا ناصر کاظمی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی درخواستیں اور ان کی مکمل تفصیل بھی پہلی مرتبہ اسی باب میں منظر عام پر آئی ہے۔ ناصر نے یوں تو کئی ڈائریاں لکھیں مگر ان کی زندگی کی اہم ڈائری جسے انہوں نے " چند پریشاں کاغذ" کا نام دے رکھا تھا پہلی مرتبہ اس باب میں اس ڈائری سے متعلق حقائق سامنے آئے ہیں جبکہ پانچویں باب میں اس کے حوالے سے تفصیلاً" اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ پہلے باب میں ناصر کاظمی کی شخصیت کے اہم گوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ناصر کاظمی کی متنوع شخصیت کے بھرپور احاطہ کے سلسلے میں یہ باب ہر لحاظ سے توقعات پر پورا اترے گا اور ناصر کی شخصیت کے بہت سے نئے پہلو اجاگر ہوں گے۔

دوسرے باب میں ناصر کاظمی کی شاعری کے حوالے سے اردو غزل' روایت اور ارتقا کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ غزل نے ماضی سے لے کر حال تک کا جو سفر طے کیا ہے اور وہ ناصر کاظمی تک پہنچتے پہنچتے جن مراحل سے گزری ہے اس باب میں آپ کو اس کا جائزہ ملے گا۔

تیسرا باب ناصر کاظمی کی شاعری سے متعلق ہے اس باب میں ناصر کاظمی کے تمام شعری مجموعوں "برگ نے"' "دیوان"' "پہلی بارش"' "نشاط خواب" اور "سر کی چھایا" (منظوم ڈرامے) کا تفصیل کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے' ان تمام شعری تصنیفات کو ناقدین نے کیسے دیکھا اس پر بھی بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناصر کاظمی نے اردو غزل کے احیا کے لئے حیرتوں کے جو نئے در وا کئے ہیں ان کے سبب وہ اقبال کے بعد جدید شاعری کے علمبردار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس باب میں ناصر کاظمی کے وسیع المطالعہ ہونے کی تصدیق بھی کی گئی ہے۔ وہ مشرقی اور مغربی ادب کے ایک مستقل قاری تھے انہوں نے مختلف کلاسیکی شعرا کے کلام سے جو انتخاب کیا ہے وہ بھی اس باب کا حصہ ہے۔

چوتھا باب ناصر کاظمی کے نثرپاروں پر مشتمل ہے اس میں ناصر کاظمی کے مضامین' اداریوں' خاکوں اور ریڈیو کے فیچرز کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ ناصر کاظمی اس باب میں اپنی پہچان ایک منفرد اور اہم نثار کے طور پر کراتے ہیں۔

پانچواں باب ناصر کاظمی کے مکالموں اور گفتگو کے علاوہ ان کی غیر مطبوعہ ڈائریوں پر مشتمل ہے۔ ناصر کاظمی نے اپنے احباب کے ساتھ جو تخلیقی باتیں کیں اور جو مکالمے کئے ان کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس طرح ناصر کاظمی کی ایک غیر مطبوعہ ڈائری جسے ناصر نے "چند پریشاں کاغذ" کا نام دیا تھا اس ڈائری سے متعلق پہلی مرتبہ چھپے ہوئے ادبی' نجی گوشوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اس ڈائری میں ناصر نے کبوتروں سے متعلق جو معلومات دی ہیں وہ غیر معمولی قسم کی ہیں۔

آخر میں ناصر کاظمی کی تحریروں کے عکس دیئے گئے ہیں۔ ان میں ناصر کی ڈائریوں کے علاوہ ناصر کاظمی کی زندگی کے آخری ایام میں ان کی جانب سے لکھی گئی درخواستیں اور ریڈیو حکام کی جانب سے ان کی بیماری کے سلسلے میں امداد کے

لئے کی گئی خط و کتابت کے عکس شامل ہیں۔ ان ڈائریوں کے اوراق اور ریڈیو سے خط و کتابت سے ناصر کاظمی کی زندگی میں ڈسپلن کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ آخری حصہ ان کتب کی فہرست پر مشتمل ہے جن سے اس مقالہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں استفادہ کیا گیا۔

ناصر کاظمی کی شخصیت ہو یا شاعری وہ ایک سحر انگیز شخصیت کے مالک اور اقبال کے بعد اردو غزل کے سب سے بڑے منفرد اور باکمال شاعر تھے۔ ناصر کاظمی کی تمام شاعری ایک ایسا حیرت کدہ ہے جس میں داخل ہونے والا دیر تک اس کے سحر میں کھویا رہتا ہے اور جب باہر آتا ہے تو وہ ناصر کی حیرانیوں کا ذکر ان کے اشعار سنا کر کرتا ہے۔ یہی صورت ناصر کی نثر کی بھی ہے۔ ناصر نے اپنی شاعری اور نثری اظہار کے لئے نہایت سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ ان کی گفتگو کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور ان کی شاعری آج بھی ہر ایک کی دل کی دھڑکن ہے اور ان کی نثر خود ان کی طرح سادہ مگر گہری ہے۔

مجھے یہاں یہ بھی عرض کرنے میں تامل نہیں کہ یہ مقالہ مکمل کرنے میں کافی تاخیر ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں نے ناصر کاظمی پر کام شروع کیا تو میری پہلی کار چوری ہو گئی۔ جس میں میرے اور بہت سے ضروری کاغذات اور اشیا کے علاوہ میرا ریسرچ ورک بھی شامل تھا۔ خاص طور پر اس میں ناصر کاظمی کے کئی احباب کے انٹرویوز کے کیسٹ تھے جو گاڑی کے ساتھ چوری ہو گئے سو مجھے از سر نو پھر ہمت سے کام لینا پڑا اس کے بعد پھر میرے ساتھ یہی حادثہ دوبارہ پیش آیا اور میری دوسری کار بھی چوری ہو گئی۔ اس میں بھی میری تحقیق سے متعلق کافی مواد شامل تھا جو چوری ہو گیا۔ میں اس دوسرے واقعہ سے کافی دل برداشتہ ہوا اور تقریباً ہمت ہار بیٹھا تھا کہ میرے پرانے دوست ڈاکٹر مظفر عباس اور محسن عبدالکریم خالد نے پھر سے میری ہمت بندھائی اور مجھے کام جاری رکھنے کے لئے تحریک دی۔ سو میں نے بڑی دلجمعی کے ساتھ پھر سے رخت سفر باندھا اور ناصر کاظمی کے دوستوں سے دوبارہ انٹرویو کئے' متعدد بار ناصر کے گھر والوں سے ملاقاتیں کیں اور ہر مرتبہ انہوں نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج یہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ میں اس کے پایہ تکمیل تک پہنچنے کے سلسلے میں اپنے استاد ڈاکٹر سہیل احمد خان کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ہر

مرحلے پر میری بھرپور رہنمائی کی اور ہر موسم میں۔ موسم کی گرم' سرد شدت کے باوجود ہر گھڑی اپنے گھر اور دفتر کے دروازے کو میرے لئے کھلا رکھا۔ ان کی خصوصی توجہ اگر میرے اس سفر میں زاد راہ نہ بنتی تو یہ سفر شاید اس احسن طریقے سے طے نہ ہو پاتا۔ میں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے میرے لئے بہت سی آسانیاں پیدا کیں۔ ادارہ تالیف و ترجمہ کے سینئر ریسرچ آفیسر عبدالرحمٰن ملک صاحب نے اس کے پروف پڑھنے میں مجھ سے تعاون کیا اور ادارہ تالیف و ترجمہ ہی کے اکبر علی اردو ٹائپسٹ نے نہایت توجہ کے ساتھ اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا' میں ان کا بھی بے حد ممنون ہوں۔ مجھے ریڈیو پاکستان لاہور کی انتظامیہ کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جس نے ناصر کاظمی کے بارے میں ان کی سروس سے متعلق معلومات مہیا کیں۔ محمد اعظم خان' عبدالرب شجیع اور اکرم چودھری صاحب اس ضمن میں میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ میں ڈاکٹر آغا سہیل' ڈاکٹر عابد حسین قریشی اور ڈاکٹر عبیداللہ خان کی محبت آمیز شفقتوں کا بھی ممنون ہوں۔ میرے عزیز دوستوں توفیق بٹ' دلدار بھٹی' تنویر ظہور اور نیاز احمد کا خلوص بھی شامل حال رہا جبکہ میرے پیارے دوستوں عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کی دعائیں بھی یقیناً میرے ہمراہ رہیں۔ اے۔ جی جوش' واصف علی ناگی' عابد تہامی' آصف علی پوتا' نصرت علی اور ناہید شاہد کی محبتیں بھی مجھے حاصل رہیں۔ میں اپنے خطاط دوست محمد سرور کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس مقالہ کو اپنی خطاطی سے سجایا' صفدر حسین اور آغا نثار بھی اس کی تزئین کے سلسلے میں شکریہ کے مستحق ہیں۔

میں اپنی شریک سفر انجم زہرا اور اپنے بچوں مہوش حسن' محمد علی اور محمد کاظم کا بھی ممنون ہوں جن کے حصے کا بہت سا وقت میں نے اس مقالہ کی تیاری میں صرف کیا اور اپنی والدہ صاحبہ' اپنی خوش دامن صاحبہ اور چچا علی عباس رضوی کا بھی شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں کی ٹھنڈی چھاؤں مجھ پہ سایہ فگن رہی' میں اپنی ہمشیرہ ملیکہ زہرا' بھائیوں فرخ عباس رضوی' عامر عباس رضوی' منفعت عباس رضوی' نیر عباس رضوی' مشیر عباس رضوی اور اپنے برادران نسبتی مسعود عباس نقوی' مصور عباس نقوی' منور عباس نقوی' مدثر عباس نقوی' مبشر عباس نقوی' مظہر عباس نقوی' محسن عباس نقوی' عرفان عباس نقوی اور تمام بھائیوں' بہنوں کی نیک تمناؤں کا بھی شکر گزار

ہوں اور خاص طور پر اپنے پیارے بھتیجوں علی کاظم اور مہرین کا بھی جو روزانہ مجھ سے استفسار کرتے پچھا کتنا لکھنا باقی ہے؟

سب سے آخر میں مجھے سب سے بڑھ کر اس قادر مطلق کا شکریہ ادا کرنا ہے جس نے میرے لئے یہ علم کا در وا کیا اور میں مدینتہ العلم اور باب العلم کے وسیلے سے کسی قابل ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے دوست نیاز احمد کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے مقالہ مکمل ہوتے ہی مجھے اس کی اشاعت کا احساس دلایا اور آج یہ کتابی صورت میں ان ہی کی وجہ سے آپ کے سامنے ہے۔ مقالہ کی طوالت کے پیش نظر ڈاکٹر مظفر عباس نے اسے ایڈیٹ کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا اور مجھ سے بھرپور تعاون کیا سو کتابی صورت میں اسے لانے کے لئے مجی نیاز احمد اور ڈاکٹر مظفر عباس کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔)

حرف آخر ::

اب جبکہ خدا کے فضل و کرم سے میں اپنی ان تحقیقی کاوشوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہوں مجھے اپنی والد بزرگوار سید کوثر عباس رضوی (مرحوم)' سسر محترم سید منظور عباس نقوی (مرحوم) چچا سید قیصر عباس رضوی (مرحوم) بے حد یاد آرہے ہیں میرے یہ تینوں بزرگ صاحب علم بھی تھے اور صاحب کردار بھی اور انتہائی متقی پرہیز گار۔ میں نے اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے ان سے بہت کچھ فیض پایا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں ان کی دعاؤں کی خوشبو کے سبب ہوں جو ہمیشہ میرے شامل حال رہی ہیں اور آج بھی میں ان مہکاروں کو محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اپنے پیارے دوست پروفیسر مختار حسین ترابی (مرحوم) بھی بہت یاد آرہے ہیں جو چند روز پیشتر ہم سے اچانک بچھڑ گئے ہیں۔ وہ میرے دکھ سکھ کے ساتھی تھے اور سگے بھائیوں جیسے تھے افسوس کہ میں ان کی محبت بھری چھاؤں سے محروم ہو گیا ہوں۔ میرے یہ تمام پیارے اگر اپنی زندگی میں میری اس کامیابی کو دیکھ پاتے تو کتنے خوش ہوتے؟ افسوس!

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

(حسن رضوی)

سوانحی خاکہ

ناصر کاظمی کا مختصر سوانحی خاکہ
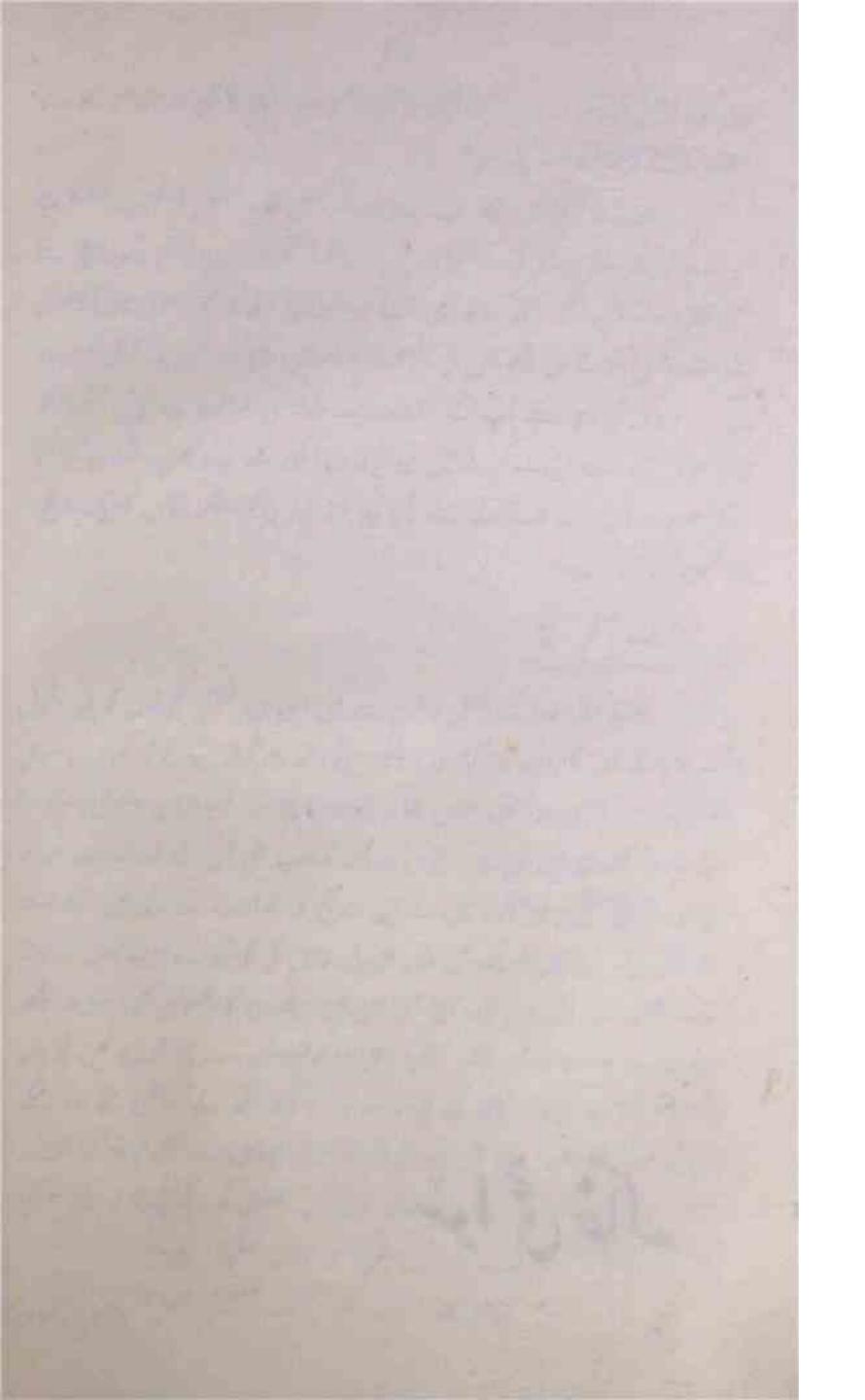
ولادت: یکم دسمبر ۱۹۲۳ء (جدید تحقیق کے مطابق) سابقہ ۸ر دسمبر ۱۹۲۵ء

مقام: انبالہ شہر، محلہ قاضی واڑہ

والد: محمد سلطان کاظمی، صوبیدار میجر، رائل انڈین فورس

تعلیم: نیشنل ہائی اسکول پشاور، ڈی بی مڈل سکول، ڈکشائی، مسلم ہائی سکول انبالہ، اسلامیہ کالج لاہور، گورنمنٹ کالج لاہور، (تقسیم کے بعد کچھ عرصہ)

پہلا مجموعہ غزل: "برگ نے" ۱۹۵۲ء (مکتبہ کارواں، لاہور)

مدیر "اوراق نو": ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۱ء

مدیر "ہمایوں": ۱۹۵۲ء تا ۱۹۷۵ء

مدیر و ناشر "خیال": ۱۹۷۵ء

"سر کی چھایا": "نشاط خواب" ۱۹۵۷ء (مطبوعہ "سویرا" لاہور

لائزان آفیسر

محکمہ سماجی بہبود: ۱۰ اپریل ۱۹۵۸ء تا ۳۱ جولائی ۱۹۶۶ء

نائب مدیر

"ہم لوگ": اور اسسٹنٹ پبلسٹی آفیسر "ویلیج ایڈ"
یکم جنوری ۱۹۵۹ء تا ۳۱ جولائی ۱۹۶۳ء

سٹاف آرٹسٹ

ریڈیو پاکستان لاہور: یکم جولائی ۱۹۶۳ء تا دم آخر۔

ترجمہ امریکن سوسائٹی: از کینتھ ایس لن (ناشر اردو مرکز لاہور)
زیر اہتمام امریکن سنٹر لاہور ۱۹۶۵ء

وفات: ۲ مارچ ۱۹۷۲ء

مقام: لاہور

تدفین: قبرستان مومن پورہ لاہور

○::○

تصنیفات

۱ : برگ نے (غزلیں) ۱۹۵۲ء

۲ : دیوان (غزلیں) ۱۹۷۲ء

۳ : پہلی بارش (غزلیں) ۱۹۷۵ء

۴ : نشاط خواب (نظمیں) ۱۹۷۷ء

۵ : سر کی چھایا (منظوم ڈرامہ) ۱۹۸۱ء

۶ : خشک چشمے کے کنارے (نثر) ۱۹۸۲ء

۷ : خشک چشمے کے کنارے (نیا ایڈیشن اضافے کیساتھ) ۱۹۹۰ء

۸ : انتخاب میر ۱۹۸۹ء

۹ : انتخاب نظیر ۱۹۹۰ء

۱۰ : انتخاب ولی ۱۹۹۱ء

۱۱ : انتخاب انشا ۱۹۹۱ء

۱۲ : خیال کا ۱۸۵۷ء نمبر ۱۹۵۷ء مرتبہ: ناصر کاظمی / انتظار حسین۔

زیرِ طبع

۱ : ڈائری اور البم۔

۲ : انتخاب داغ۔

۳ : انتخاب انیس۔

۴ : انتخاب قلق لکھنوی۔

۵ : انتخاب غالب و دیگر کلاسیکی شعرا کے انتخاب۔

○::○
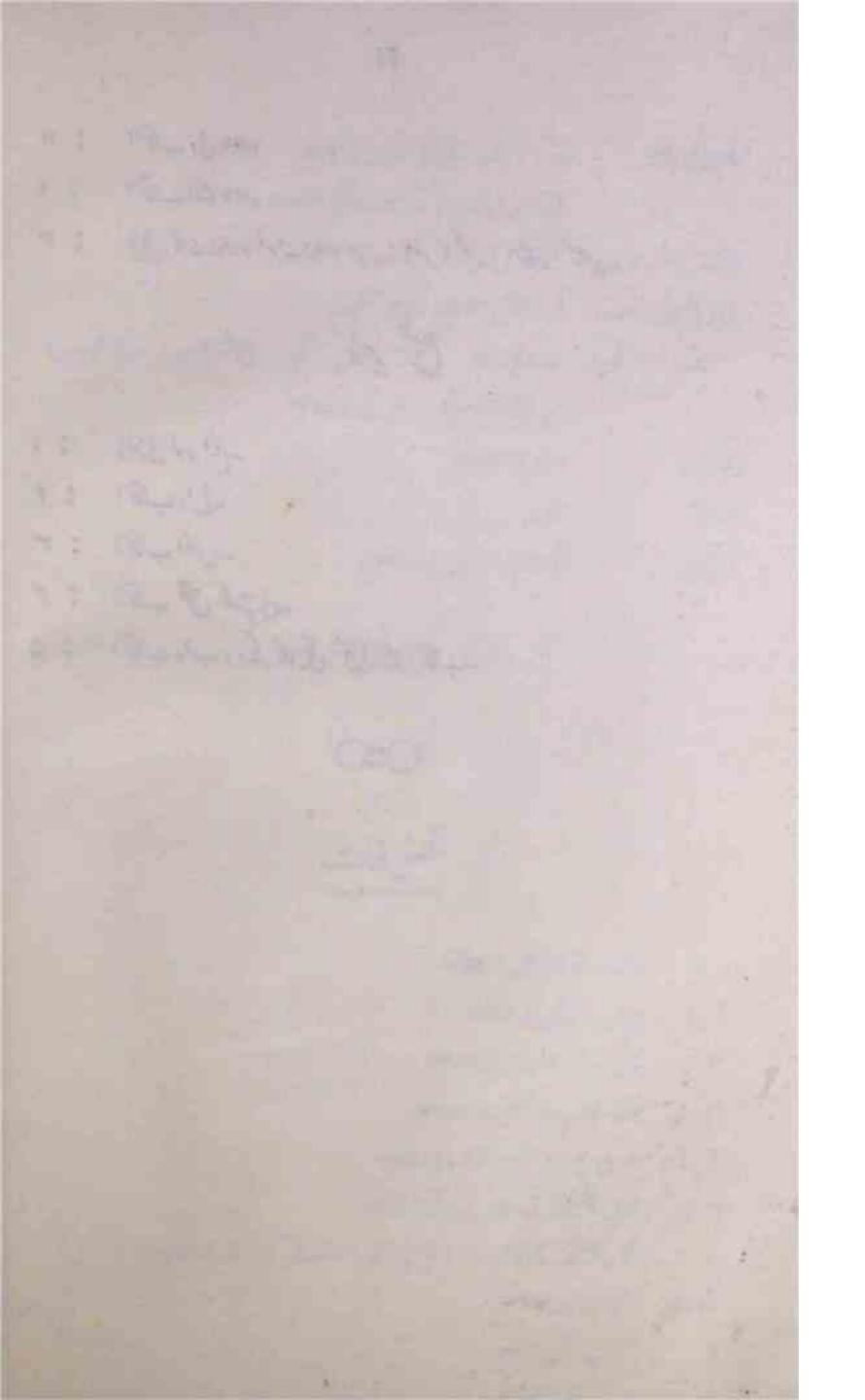
باب اول

کدھر سے آیا کدھر گیا وہ

□☆::☆□
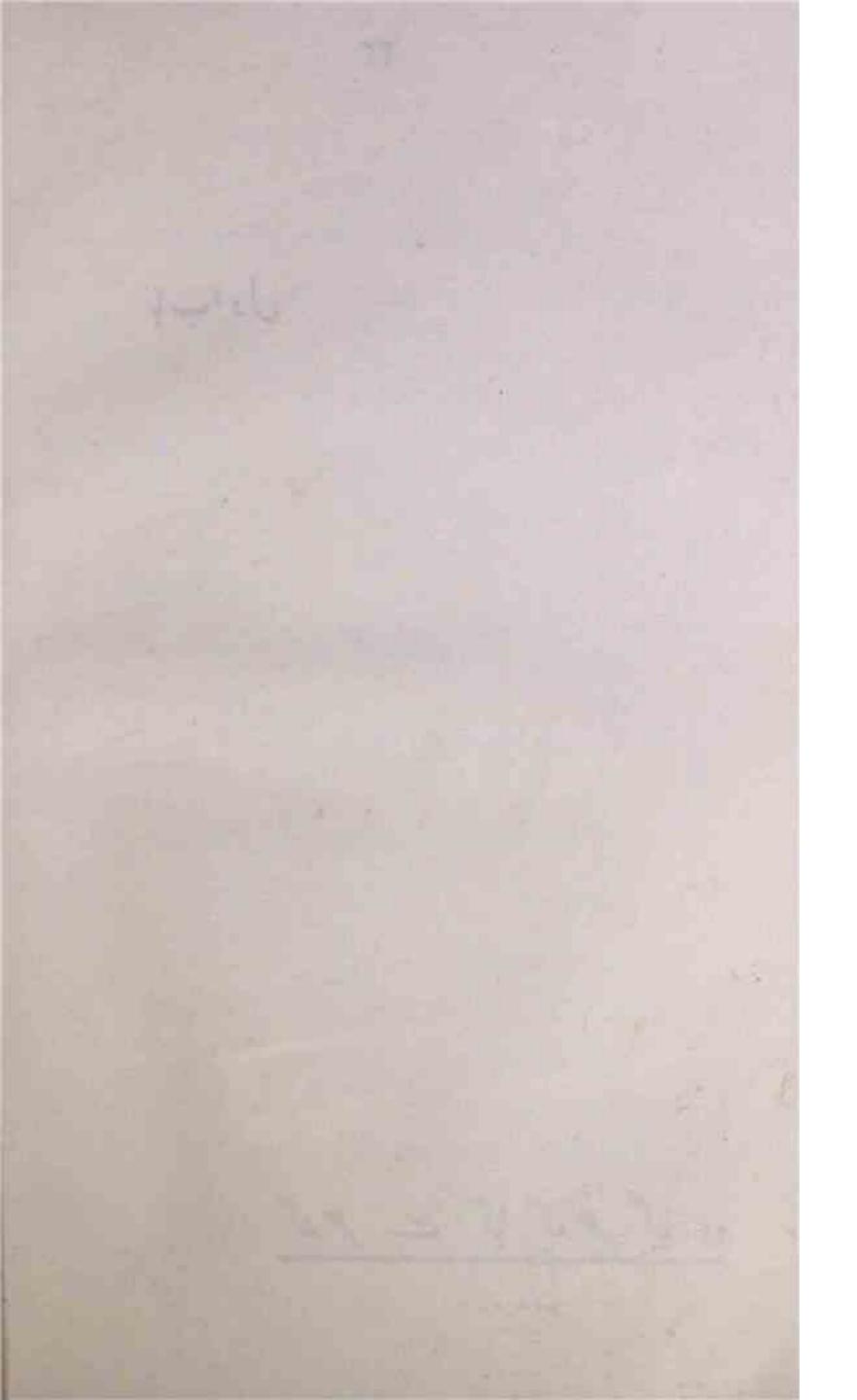
ناصر کاظمی کی شخصیت اور حالات زندگی

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی
اے ساکنان خطہ لاہور دیکھنا!
لایا ہوں اس خرابے سے میں لعل معدنی

نشاط خواب کے ان قطعہ بند اشعار میں ناصر کاظمی نے اپنے آبائی وطن انبالہ کو اس طرح یاد کیا ہے جس طرح میر نے لکھنؤ میں دہلی کو کیا تھا۔ انبالہ گو دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد دکن کی طرح ادب کا گہوارہ نہ تھا اور نہ ہی یہاں سے کسی قابل ذکر مذہبی، سیاسی تحریک کی ابتدا ہوئی لیکن پھر بھی یہ شہر اپنے مخصوص اور منفرد تہذیب و تمدن، زبان، اخلاق اور مذہبی اقدار کی بنا پر اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔

انبالہ شہر کی سات پٹیوں میں ایک پٹی صوبہ اکبر پور کاظمی سادات کی ملکیت تھی۔ سیدان چھری مار (ترمذی) بھی اسی پٹی میں مالک تھے۔ سیدوں کے یہ دونوں

خاندان انبالہ شہر میں بر سر اقتدار رہے۔ ان کے علاوہ سیدان سکھراون' سیدان مچھونڈا' سیدان پٹاسیہ' سیدان بلخی اور سیدان تیر گر بھی قاضی واڑہ کے قریب آباد تھے۔ یہاں سادات عام طور پر ملازمت کی طرف مائل تھے۔ بعض اعلی عہدوں پر فائز بھی تھے۔ متوسط اور نچلے طبقے کے لوگوں کے یہاں دریاں بنانے کا کام ہوتا تھا اور تقریباً ہر گھر میں دریاں بنانے کی کھڈی لگی ہوتی تھی۔ یہاں کے لوگوں کو صنعت و حرفت کے میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا شوق نہ تھا۔ کھیتی باڑی مزارعوں پر چھوڑ رکھی تھی جو بعد میں ادنیٰ مالک بن گئے تھے اور خود انہوں نے اعلیٰ مالک کی حیثیت سے قناعت کی۔

"انبالہ کے کاظمی سادات کا شجرہ"

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ

|

ابوالعباس

|

سید موسیٰ اکبر

|

سید علی

|

سید محمد

|

سید عقیل

|

سید جعفر

|

سید عالم
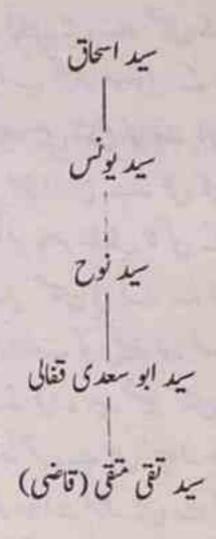
کاظمی سادات انبالہ سید تقی متقی ہی کی اولاد ہیں۔ سید تقی متقی چھٹی صدی ہجری میں ہندوستان آئے۔ قاضی تقی متقی شہزادہ حامد کے ساتھ آئے تھے۔ شاہزادہ مع اپنے لشکر شہدا کے مقام روپڑ میں آسودۂ خاک ہیں۔ ان کا مزار روپڑ ہی میں ہے۔ وہاں وہ حضرت ملک تاج الدین لکھی شاہ شہید اکبر کی معیت و رفاقت میں انبالہ اور اس کے نواح میں جہاد کے لئے آئے۔ حضرت لکھی شاہ کا مزار انبالہ میں سبزی منڈی کلاں میں ہے۔ یہاں ۲۲ رجب سے میلہ لگتا ہے۔ ان کے مزار پر زائرین پنکھے چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں۔ سید تقی متقی کا سفر نامہ فارسی زبان میں دستیاب ہے۔ یہ سفر نامہ سادات کاظمی انبالہ کے شجرۂ نسب میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

ناصر کاظمی کا تعلق انبالہ سے ضرور ہے لیکن جہاں تک ان کے شجرۂ نسب کا تعلق ہے وہ سادات انبالہ اور سید تقی متقی سے مختلف ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ناصر کاظمی کے آباؤ اجداد میں سے سید ابوالحسن گنور سے ترک سکونت کرکے انبالہ میں مقیم ہوئے۔ یہ خاندان قاضی تقی متقی کے خاندان سے الگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

سادات انبالہ قاضی واڑہ انہیں اپنوں میں سے نہیں مانتے۔ جہاں تک ناصر کاظمی کے شجرہ نسب کا تعلق ہے یہ شجرہ نسب گلزار موسوی کے نام سے سید فیض الحسن پنشنر گورنمنٹ پٹیالہ نے اگست ۱۹۴۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا مطبع "دی پرنٹرز لمیٹڈ انبالہ صدر میں باہتمام لالہ کیدار ناتھ مینجر درج ہے۔ کل کاپیوں کی تعداد ۵۰ تھی جس میں ایک مجھے ناصر کاظمی کے فرزند اکبر باصر سلطان کاظمی کے توسط سے دستیاب ہوئی۔ ان کاپیوں کی اشاعت کا کام سید نذیر حسین بی اے نے کیا اور اس میں ان کا تحریر کردہ تعارف بھی شامل ہے۔ اس شجرہ نسب کو دیکھنے اور نسب نامہ کاظمی سادات انبالہ کے مولف سید لطیف حسین کاظمی کے فرزند سید نصیر حسین کاظمی سے جو ان دنوں سادات انبالہ کا شجرہ نسب از سر نو مرتب کر رہے ہیں، تبادلہ خیالات کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ناصر کاظمی گو سادات انبالہ میں سے نہیں تھے لیکن سید ضرور تھے۔ سادات انبالہ کے وہ حضرات جو انہیں اپنوں میں سے سید نہیں مانتے ان کا اعتراض یہاں تک تو درست ہے کہ وہ ان بزرگ کی اولاد میں سے نہیں ہیں جن میں سے وہ ہیں اور یہ کہ وہ قدیم انبالوی نہیں ہیں لیکن یہ بات درست نہیں ہے کہ چونکہ وہ ان میں سے نہیں ہیں اس لئے سید بھی نہیں ہیں۔

ناصر کاظمی کے جد امجد سید قیام الدین ہیں جو اصفہان سے گنور ریاست پٹیالہ منتقل ہوئے اور ان کی چھٹی پشت میں سید ابوالحسن گنور کو چھوڑ کر انبالہ آ گئے۔ اس لئے انبالہ میں مقیم سادات انبالہ جو سید تقی متقی کی اولاد میں سے ہیں، کا یہ اعتراض کہ وہ ہم میں سے نہیں اپنی جگہ درست ہے لیکن ناصر کاظمی کے سید ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں وہ کھرے سید تھے ملاحظہ کیجئے ان کا شجرہ نسب

امام موسیٰ کاظمؑ

امام رضا ہارون اسحاق ابراہیم اسماعیل عباس حسین حسن نوح احمد سالم

الملقب طالب

قاضی تقی متقی
کے بزرگ اکبر

قاسم

جعفر

عیسیٰ

ابو سعید

سید کمال

عبدالسلام وضوئی

تاج الدین اصفہانی

سید محمد شاہ

ابو الفوارض

ابو الفضل

سید محمود

فخر الدین

شہاب الدین

قیام الدین

زین الدین

معین الدین

حبیب اللہ

علی شبیر

سید محمود

عبدالحکیم

بدرالدین

قطب الدین

محکم الدین عرف فضل علی

امیر علی

شریف حسین

کاظمی بیگم ہاشمی بیگم محمد سلطان محمد امیر عبداللہ

حمیدہ حامد حسین ناصر کاظمی عنصر کاظمی افضل رضا
(ناصر رضا)

باصر سلطان کاظمی حسن سلطان کاظمی

ناصر کاظمی کا اصل نام ناصر رضا تھا۔ ان کے والد کا نام محمد سلطان تھا "گلزار موسوی" میں محمد سلطان کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ شریف حسن کے بڑے بیٹے ضلع گجرات میں پیدا ہوئے تھے ایف اے پاس محکمہ فوج میں ہیڈ کلرک' تنخواہ معقول نماز پنج گانہ کے پابند' قریب ۵۲ برس کی عمر میں ہیں۔ میلا گندمی رنگ' قد میانہ' قدرے ترش مزاج کے آدمی ہیں۔ فوج میں ملازم ہونے کی وجہ سے بصرہ' بغداد' وغیرہ رہ کر کربلائے معلیٰ اور دیگر زیارات سے مشرف ہو آئے ہیں۔ پہلی شادی مسماۃ جعفری بیگم دختر روشن علی سید ساکن مگر پورہ سے ہوئی تھی جس سے حامد حسین اور حمیدہ بیگم پیدا ہوئے۔ دوسری شادی محمدی بیگم دختر سید نیاز نبی سے ہوئی جس سے ناصر رضا' عنصر رضا دو لڑکے موجود ہیں۔ حمیدہ بیگم بڑی ذہین اور سمجھدار لڑکی تھی جو ۱۳' ۱۴ برس کی عمر میں فوت ہو گئی ہے۔ محمد سلطان کو بچپن میں سواری کا بہت شوق تھا اس لئے سوار بہت اچھے ہیں۔ گھوڑوں کی پہچان اور علاج وغیرہ سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ کلام میں اس قدر طول دیتے ہیں کہ مبالغہ کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ نیک اور بھلے مانس ہیں۔"

ناصر کاظمی کے بارے میں انبالہ کے کاظمی سادات ہونے کے بارے میں ان کے بچپن کے عزیز ترین دوست افتخار حسین کاظمی کا کہنا ہے کہ "ناصر کاظمی کا انبالہ کے کاظمی سادات سے تعلق نہ تھا بلکہ ان کے آباؤ اجداد چند پورہ سے ہجرت کرکے انبالہ شہر آئے تھے قاضی واڑہ کے لوگ انہیں سید نہیں مانتے تھے وہ انہیں چند پورے کے

جوگی کہتے تھے۔ لیکن وہ تھے سید۔" ا

سو ناصر کاظمی کے خاندان کے بارے میں پایا جانے والا یہ تاثر اپنی جگہ درست تھا کہ وہ ان میں سے نہیں تھے لیکن جہاں تک ان کے سید ہونے کا تعلق ہے وہ ان کے شجرہ نسب سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کھرے سید تھے۔ انبالہ شہر کے سادات محض تعصب کی بنا پر ان کے بارے میں مختلف نظریہ رکھتے تھے جبکہ بعد میں ناصر کاظمی کے خاندان کے کئی رشتے قاضی واڑہ کے سادات گھرانوں میں ہوئے اگر وہ سید نہ ہوتے تو یہ کبھی بھی ممکن ہی نہیں تھا کہ ان کی رشتہ داریاں قاضی واڑہ کے سادات سے قائم ہوتیں۔

ناصر کاظمی کی ولادت ::

ناصر کاظمی کی ولادت کی تاریخ کے شواہد ان کی اپنی لکھی ہوئی ڈائریوں سے ملتے ہیں۔ ڈائری نمبرا میں جس کا حوالہ ناہید قاسمی نے اپنے ایم۔ اے اردو کے مقالہ اور کتاب ناصر کاظمی شخصیت اور فن میں دیا ہے' ناصر کاظمی کی تاریخ پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء بروز جمعہ دی گئی ہے ۔۲ جبکہ ناصر کاظمی نے اپنی ایک دوسری ڈائری میں اپنی تاریخ ولادت ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء بروز ہفتہ علی الصباح لکھی ہے۔ ان دونوں ڈائریوں میں تاریخ اور سن ولادت ایک ہی ہے جبکہ دن میں فرق ہے' ڈائری نمبر ۲ غیر مطبوعہ میں لکھتے ہیں۔

"۱۹۲۵ء ۸ دسمبر بروز ہفتہ علی الصباح اپنے نانا مرحوم کے گھر قاضی واڑہ میں پیدا ہوا۔ مس ڈیوس' مسز سکائر' زیرا' مس پرلی اور میری والدہ کی دیگر سہیلیاں اس موقع پر مبارک باد دینے کے لئے آئیں۔

ناصر کاظمی کی صحیح تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۲۳ء ::

ناصر کاظمی نے اپنی ڈائری میں اپنی ولادت کی تاریخ ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء تحریر کی

ہے۔ یہ تاریخ ان کی دونوں ڈائریوں میں درج ہے۔ کہیں دن جمعہ ہے کہیں ہفتہ لیکن ان کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے مطابق تاریخ مختلف ہے۔ راقم نے اس سلسلے میں ناصر کاظمی کے دونوں فرزندوں اور بھائی سے رابطہ کیا کہ کسی طرح ناصر کاظمی کے پورے کوائف حاصل ہو جائیں کہ انہوں نے کب میٹرک کیا اور صحیح تاریخ پیدائش کیا ہے مگر سوائے ناصر کاظمی کی ڈائریوں کے اور کوئی ایسا ریکارڈ نہیں ملا جس سے یہ پتہ چل سکتا کہ ناصر نے میٹرک کا امتحان کب پاس کیا تھا۔ اندازاً" یہ سال ۳۹ ۔ ۱۹۴۰ء کا سال تھا۔ راقم نے انکے ریکارڈ کا کھوج لگانے کے لئے تگ و دو جاری رکھی۔ بالآخر ریڈیو پاکستان سے تلاش کرنے میں مدد ملی۔ ناصر کاظمی ریڈیو پر سکرپٹ رائٹر تھے۔ وہاں ان کی پرسنل فائل اور سروس بک موجود ہونی چاہیے تھی ۔ پہلے دو سالوں میں تو اس کا سراغ نہیں ملا بالآخر ایک کباڑ خانے میں سے یہ فائل بہت سی گرد آلود فائلوں کے درمیان سے مل گئی۔ اس فائل کو پڑھنے سے ناصر کی شخصیت کے بہت سے پہلو اجاگر ہوئے جن کا تذکرہ آئندہ ابواب میں ہو گا۔ اس فائل سے ناصر کاظمی کا جو میٹرک کا سرٹیفکیٹ دستیاب ہوا ہے اس کا عکس ضمیمہ کے باب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس سرٹیفکیٹ کے مطابق ناصر کاظمی یکم دسمبر ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے ------- پنجاب یونیورسٹی سے ناصر کاظمی نے مارچ ۱۹۳۹ء کے سیشن میں میٹرک پاس کیا۔ سرٹیفکیٹ پر ان کا نام سید ناصر رضا ولد سید محمد سلطان درج ہے اور میٹرک کا رول نمبر ۷۴۶۰ ہے۔ یہ امتحان انہوں نے مسلم ہائی سکول انبالہ سٹی سے دیا تھا اور میٹرک میں سیکنڈ ڈویژن حاصل کی تھی۔ سرٹیفکیٹ پر کنٹرولر آف ایگزامینیشن یونیورسٹی آف دی پنجاب کے دستخط ہیں اور اس پر سینٹ ہال لاہور یکم اگست ۱۹۳۹ء کی تاریخ درج ہے۔ اصل سند کی ٹائپ شدہ کاپی کی ایم اے مجید ریجنل انجینئر ریڈیو پاکستان لاہور نے تصدیق کی ہے۔ ناصر کاظمی کا قد ان کی سروس بک کے حوالے سے پانچ فٹ سات انچ تھا اور شناختی نشان کے لئے لکھا ہے۔

سو میٹرک کی سند کے مطابق ناصر کاظمی کی صحیح تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۲۳ء ہے اور انہوں نے میٹرک کا امتحان مارچ ۱۹۳۹ء میں سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ حیرت ہے کہ ناصر کاظمی نے اپنی ڈائریوں میں اپنی تاریخ پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کیوں

لکھی جبکہ میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں مستند تاریخ ولادت یکم دسمبر ۱۹۲۳ء ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی عمر اصل عمر سے کم بتانا چاہتے ہوں مگر یہ کم عمر میٹرک کے امتحان کے وقت بھی لکھوائی جا سکتی تھی مگر ناصر نے ایسا نہیں کیا۔

ناصر کاظمی کے والدین اور بہن بھائی ::

ناصر کاظمی کے والد سید محمد سلطان کے بارے میں ان کی خالہ بی بی صغرا کا کہنا ہے "وہ بہت نازک مزاج تھے اور کھلی ہوا میں رہنے کو پسند کرتے تھے اس لئے ہجرت کے بعد لاہور میں جب انہیں ایک تنگ سے مکان میں رہنا پڑا تو وہ خاصے پریشان ہوئے' یہی مزاج تھا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی پرورش شہزادوں کی طرح کی تھی۔ ۳ے

ناصر اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔

"میرے بڑے بھائی حامد حسین محکمہ پولیس میں ملازم ہیں۔ پہلی والدہ سے ہیں ان سے ایک بہن حمیدہ بانو بھی تھیں جو ۱۸ سال کی عمر میں قلبی حرکت بند ہو جانے سے انبالہ میں فوت ہو گئیں۔ وہ مجھے میری ماں سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ میرا ایک چھوٹا بھائی ہے عنصر رضا جو میری زندگی کا اب آخری سہارا ہے۔" ۴ے

ناصر کاظمی کا بچپن ::

ناصر کاظمی نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ وہ ۱۹۲۵ء دسمبر کو علی الصباح اپنے نانا مرحوم کے گھر قاضی واڑہ میں پیدا ہوئے۔ راقم کو ناصر کاظمی کی اس جائے پیدائش دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ناصر کاظمی کے دادا کا مکان محلہ ہاشمی میں تھا۔ اس محلّہ کے بارے میں عنصر کاظمی ۵ے نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ "یہ محلّہ ان کے دادا کے بھائی ہاشم رضا کے نام پر ہاشمی محلّہ پڑ گیا تھا۔ اس محلّہ میں جو لوگ

آباد تھے انہیں نمک گر کہا جاتا تھا۔ میرے والد چونکہ فوج میں صوبیدار میجر تھے اس لئے گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ ہمارے یہاں ایک بگھی اور ایک اچھی نسل کا گھوڑا ہوا کرتا تھا۔ ناصر کاظمی کو اپنے ننھیال میں بہت پیار ملا تھا اور ان کا بچپن شہزادوں کی طرح گزرا۔"

ناصر کاظمی کے بارے میں محترمہ صغرابی بی اپنے مضمون میں لکھتی ہیں

"آٹھ دسمبر ۱۹۲۵ء کو ناصر رضا انبالہ میں پیدا ہوا۔ اپنی ماں کا پہلا بچہ اور نانا اور دادا کے گھر کا چراغ تھا۔ میں اس وقت لاہور کے لیڈی میکلیگن سکول میں برائے تعلیم داخل تھی۔ چونکہ میں نے فروری میں پرائیویٹ مڈل کا امتحان دینا تھا اور جون میں جے وی کا اس لئے میں دو روز یعنی ہفتہ اتوار چھٹی پر آتی تھی صرف ناصر کو دیکھنے کی غرض سے۔ ماشاء اللہ بہت فربہ، ہوشیار اور چاق و چوبند پایا۔ بہت خوش ہوئی اس کے بعد امتحانوں سے فارغ ہو کر جولائی ۱۹۲۶ء میں انبالہ پہنچ گئی۔ وہیں سکول میں ملازم ہو گئی اور سکول میں ہی اپنے رہنے کا ٹھکانہ کر لیا۔ اس وقت ناصر چھ مہینے کا ہو گا"۔

ابتدائی تعلیم ::

ناصر کاظمی نے ابتدائی تعلیم جو کہ دینی تھی اپنے دادا اور نانا کے گھروں پر پائی۔ اپنی نانی امیر بی بی، جو کہ نابینا تھیں، ان سے قرآن پڑھا کرتے تھے۔ ابھی ناصر کاظمی اڑھائی برس ہی کے تھے کہ ان کو سیر کرانے کے لئے نوکر محمد حسین ہمیشہ تیار رہتا۔ ناصر کاظمی اپنی ڈائری میں رقمطراز ہیں۔

بریلی میں میری عمر اڑھائی سال کی تھی ------------ دو خچروں والا تانگہ میرے لئے ہر وقت تیار رہتا۔ محمد دین چپڑاسی تھا وہ مجھے کندھوں پر بٹھا کر کمپنی باغ کی سیر کراتا۔"۶

یہاں اس اقتباس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بچپن میں بہرحال ناصر کاظمی کو ایسی آسائشات میسر تھیں جو اس زمانے کے ایک صوبیدار میجر کی افسری کے ٹھاٹھ باٹھ

میں شامل تھیں۔ ناصر کاظمی ابھی چار برس ہی کے ہوں گے کہ ان کے والد کا تبادلہ انبالہ سے نوشہرہ چھاؤنی کا ہو گیا اور ناصر اپنے والدین کے ہمراہ انبالہ سے نوشہرہ چھاؤنی چلے گئے۔ ناصر کاظمی اپنی ڈائری میں نوشہرہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"نوشہرہ۔ شہر سے دور ایک گوشے میں ایوب خان (رئیس نوشہرہ) کے مکان میں میری والدہ' والد رہتے تھے۔ بعد میں نانا صاحب بھی والدہ کی علالت کی خبر سن کر آ گئے تھے۔ اس وقت میری عمر چار برس کی ہو گی۔ یہ شہر بہت ہی ویران اور بے کیف تھا اکثر لوگ ناخواندہ اور قبیلہ کی طرح خانہ بدوش تھے لیکن کمپنی باغ جو ملاکنڈ روڈ پر تھا اور دریائے کابل نہایت دلچسپ تھا۔ اس دریا پر ریل کے پل کے علاوہ ایک کشتیوں کا پل بھی تھا میں اور والدہ اور والد اکثر شام کو دریا کی سیر کو جاتے اور ایک کشتی لے کر سیر کرتے۔ والد کشتی میں ہی نماز پڑھتے۔ یہاں کے لیڈی ہسپتال کی بڑی ڈاکٹر مس بارنٹ نہایت ہی حسین و جمیل اور نو عمر عورت تھی۔ میں اکثر اس کے رنگین اور معطر ماحول میں رہتا تھا۔ وہ مجھے اکثر پیار کرتی اور کھلونے دیتی۔ ایک دفعہ انبالے میں مسز فائر نے مجھے ایک سوتی جاگتی گڑیا دی جس کا ایک حصہ اب تک میرے پاس موجود ہے۔" ۲۷

اب دیکھئے کہ چار سال کا بچہ اپنے ماحول سے کس قدر متاثر ہے کہ خوبصورتیوں کو بھی محسوس کر رہا ہے اور مکاروں کو بھی۔ ناصر کاظمی نے جو اپنی شاعری میں ماضی کو بے حد یاد کیا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ بچپن کا ان کا مشاہدہ بہت حسین اور بے پناہ تھا۔ کوئی بچہ چار سال کی عمر میں کسی حسین و جمیل خاتون کو یاد رکھے اور اس کے حسن کا تذکرہ برس ہا برس بیت جانے کے بعد کرے تو یہ اس کے ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی حس جمال کے بیدار ہونے کی دلیل ہے۔ اور جہاں تک ناصر کاظمی کی یادوں کا تعلق ہے۔ انہوں نے بچپن کی یاد کے ایک حصے کو جس طرح اپنے سینے سے لگائے رکھا اور گڑیا کے ایک حصہ کو گم تک نہ ہونے دیا۔ یہاں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ یادیں جو جاندار چیزوں سے وابستہ ہوں گی اور خاص طور پر حسین و جمیل انسانوں سے انہیں ناصر کاظمی بھلا کیسے بھول پاتے۔

بچوں کے لئے ریل گاڑی ہمیشہ باعث تحیر رہی ہے۔ ایک زمانے میں لوگ ریلوے سٹیشنوں پر بھی محض سیر کے لئے جایا کرتے تھے۔ جبکہ بچے ریل گاڑی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اکثر بچے ریل گاڑی سے متعلق حیران کن سوال بھی کیا کرتے تھے۔ راقم کے والد مرحوم بھی ریلوے میں ملازم تھے اس لئے راقم کا بچپنا بھی ریل گاڑیوں کو دیکھتے گزرا ہے۔ ناصر کاظمی کو بھی ریل گاڑی کو دیکھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔

"۸ــ میری عمر اس وقت تقریباً چار برس کی ہو گی ان دنوں ہم نوشہرہ میں رہتے تھے اور ریل گاڑی ہمارے گھر کے پیچھے سے گزرتی تھی۔ سارا دن گاڑیاں گزرتی رہتیں لیکن شام ہوتی تو میں نانا کے ساتھ جنگلے کے پاس جا کھڑا ہوتا اور ریل گاڑی کا اس وقت تک انتظار کرتا جب تک اسے دیکھ نہ لیتا۔ ایک دن نانا کو انبالے سے تار آئی اور وہ چلے گئے اس دن میں شام کی گاڑی نہ دیکھ سکا میں رات بھر نیند میں جاگتا رہا اور انجن ہمارے گھر کے صحن میں شنٹ کرتا رہا اس دن پاگل کا لفظ باجی سے میں نے پہلی بار سنا۔"

"دوپہر ۹ــ کی خاموشی میں ریل گاڑی سے بہتر ساتھی مجھے کبھی نہ ملا۔ میں ہر روز دوپہر کو دیوار پر بیٹھا گھنٹوں گاڑی کا انتظار کرتا اور لوہے کے جنگلے کو دیکھتا رہتا۔"

اپنی ۱۰ــ ایک اور ڈائری میں لکھتے ہیں۔

ہر روز شام کے ۵ بجے چائے کے بعد میرے نانا مجھے ریل گاڑی دکھانے جاتے جو ہمارے گھر کے عقب میں ایک کھیت کے قریب سے چیختی ہوئی گزرتی تھی۔ میں بیتاب ہو کر اسے دیکھتا سفر کا شوق میری گھٹی میں تھا بعد میں مجھے موقع بھی ملا۔"

یہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی نے بچپن ہی سے اپنے من میں حیرانیوں کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ ریل گاڑی کا وقت پر آنا اور چیختے ہوئے گزر جانا۔ انتظار کی وہ کیفیت ظاہر کرتا ہے جو آگے چل کر ناصر کاظمی کی شاعری میں رومانوی رنگ میں نمایاں ہوئی۔ ہماری یہاں بہت سے افسانہ نگاروں اور شاعروں نے ریل گاڑی کو

اپنی تخلیقات میں اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ ناصر کاظمی بلا کے ذہین تھے انہیں چار برس کی عمر کی یادیں بھی ازبر تھیں جبکہ اڑھائی برس کی عمر کا ایک واقعہ بھی انہوں نے اپنی ڈائری میں یوں تحریر کیا ہے۔

بریلی ۱۹۲۸ء میں میری عمر اڑھائی برس کی تھی۔ کرنل بوشاک ولسن کے ساتھ والد صاحب ہیڈ کلرک تھے۔ دو خچروں والا تانگہ ہر وقت میرے لئے تیار تھا۔ محمد دین چپڑاسی تھا وہ مجھے کندھوں پر بٹھا کر کمپنی باغ کی سیر کراتا۔ لال سنگھ اور ہرنال والد صاحب کے دوست تھے ایک دن میں والد صاحب اور لال سنگھ دیگر دوستوں کے ہمراہ شام کے وقت ریلوے لائن کے پار شکار کے لئے گئے ایک تالاب کے کنارے سیاہ مرغابیوں کا جوڑا بیٹھا تھا۔ والد صاحب نے گولی چلائی ان میں سے مادہ پانی میں گر گئی۔ محمد دین نے باہر نکال لیا۔ وہ ابھی زندہ تھی گھر میں پلنگ کے نیچے چھوڑ دی رات کو اس کی پلاؤ بنائی۔

دینی تعلیم ::

ناصر کاظمی اپنے والدین کے ساتھ ایک عرصہ تک نوشہرہ میں مقیم رہے۔ اس دوران سیر و تفریح ان کا خاص مشغلہ تھا۔ نوشہرہ کے ساتھ ہی دریائے سندھ بہتا ہے اور پھر نوشہرہ کے گرد و نواح میں ناشپاتیوں کے باغات ناصر کاظمی کی دلچسپی کا مرکز تھے۔ روزانہ ریل گاڑی کا انتظار کرنا ان کی زندگی کا معمول تھا۔ پرندوں کو چہچہاتے دیکھنا اور گھنٹوں انہیں تکتے رہنا ناصر کاظمی کی روز کی عادت تھی۔ ناصر کاظمی نے قرآن کریم اپنی نانی امیر بی بی اور والدہ سے پڑھا۔ گھر کا ماحول خالصتاً" مذہبی تھا والد اور والدہ دونوں عبادت گزار تھے۔ یہی حالت نانا اور نانی کے یہاں بھی تھی۔ میر انیس اور میرزا دبیر کے مرثیوں کی آوازیں ناصر کے کانوں میں بچپن ہی سے پڑ چکی تھیں۔ گھر میں میر' غالب' انیس' دبیر اور اقبال کے کلام کے علاوہ سوز و سلام اور مراثی کی دیگر کتابیں بھی موجود ہوتی تھیں۔ ناصر کاظمی نے جب آنکھ کھولی تو وہ انبالہ میں تھا۔ اڑھائی سال کی عمر میں بریلی چلا گیا اور چار سال کی عمر میں نوشہرہ' نوشہرہ اور انبالہ کی فضا میں بہت فرق تھا اور

زبان بھی مختلف تھی۔ عنصر کاظمی نے اپنے مکالمہ میں اپنے گھر کے ماحول اور زبان کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

"ہمارے گھر میں عزاداری ہوا کرتی تھی گھر کا ماحول خالصتاً" مذہبی تھا۔ ہمارے والد اور والدہ نہایت عبادت گزار تھے جبکہ نانا اور نانی بھی نہایت پرہیز گار عبادت گزار تھے۔ ناصر کاظمی نے قران کریم کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے گھر میں موجود کتابوں سے بھی استفادہ کیا۔ ان کتابوں میں زیادہ تر سوز و سلام اور مراثی کی کتابیں تھیں۔ "۱۲

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی کو مذہبی تعلیم ورثے میں ملی تھی۔ اس کا اثر ان پر تمام زندگی حاوی رہا۔ وہ عموماً دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ جس شخص نے قران کریم کا اچھی طرح سے مطالعہ نہیں کیا وہ بڑا ادیب اور بڑا شاعر ہو ہی نہیں سکتا۔ ۱۳

نوشہرہ میں قیام کے دوران ناصر نے دینی تعلیم گھر پر حاصل کی اور وہاں دو سال کے قیام کے دوران میں چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے ان کے والد کا تبادلہ پشاور ہو گیا۔

پشاور میں قیام اور ابتدائی تعلیم:

نوشہرہ سے پشاور چند میل ہی کے فاصلے پر ہے۔ راستے میں مختلف پھلوں کے باغات آتے ہیں۔ ناصر کاظمی کے والد کا تبادلہ نوشہرہ سے پشاور ہو گیا تو وہ اپنی والدہ اور والد کے ہمراہ پشاور چلے گئے۔ یوں بچپن ہی میں ناصر کاظمی کو مختلف علاقوں کے دیکھنے کا موقع ملا جو زبان و ثقافت اور تہذیب کے اعتبار سے انبالہ مشرقی پنجاب سے قطعی مختلف تھے۔ پشاور میں زیادہ تر پشتو اور ہندکو زبان بولی جاتی ہے۔ ناصر کاظمی کی مادری زبان انبالہ کی اپنی بولی تھی جو پنجابی اور اردو کا خوبصورت سنگم ہے۔ اب اس زبان کو ہریانوی بولتے ہیں۔ عموماً انبالہ کے گھروں میں یہی زبان بولی جاتی تھی لیکن جن

گھروں میں تعلیم عام ہو گئی تھی یا جن گھروں کے افراد فوج اور سول میں افسر ہو گئے تھے وہاں اردو بولی جاتی تھی اور وہ بھی انبالہ ہی کے لہجے میں۔

پشاور سے بھی ناصر کاظمی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ انہوں نے اپنی ڈائری میں پشاور کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت سے دوستوں کے نام گنوائے ہیں اور ان باغات کا بھی ذکر کیا ہے جہاں وہ عموماً پرندوں سے ہم کلام اور پھولوں کا رنگ روپ دیکھنے جایا کرتے تھے، ناصر کاظمی کہتے ہیں۔

پانچویں اور چھٹی جماعت میں نے نیشنل ہائی اسکول پشاور سے پاس کی ماسٹر پرتھی چند، پنڈت ہیمراج، ہیڈ ماسٹر بھیجا مل، مولوی عنایت اللہ اور ماسٹر مول چند میرے استاد تھے۔ پشاور میں ذوالفقار علی، وحید اللہ اور رتن لعل میرے ہم جماعت تھے اور میرے خاص دوست تھے۔ رتن لعل سینما ہال میں قلب حرکت بند ہو جانے سے جان بحق ہوا اور باقی نہ جانے کہاں کہاں ہیں۔ پشاور میں وزیر باغ، شاہی باغ، قلعہ اکبر، میری دلپسندیدہ سیر گاہیں تھیں۔ شاہی باغ میں چڑیاں، چھرنے اور طوطے پکڑا کرتا تھا۔ کبوتر پالنے کا شوق مجھے بچپن سے تھا اور ان کے بارے میں غیر معمولی معلومات رکھتا ہوں۔ انبالہ کے رئیس میرے کبوتروں کی زیارت کو آتے تھے اور صبح کے وقت جب کبوتر اڑتے تو شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔ میرے والد والدہ، نانی مرحومہ میرے کبوتروں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ میری نانی امیر بی بی ہر چند نابینا تھیں لیکن میرے کبوتر اور بلی ان سے بہت مانوس تھے۔" [۱۴]

ناصر کاظمی کا حافظہ بلا کا تھا دس بارہ برس کی عمر میں اتنا کچھ یاد رکھنا غیر معمولی بات تھی۔ انہیں اپنے بچپن کے اساتذہ اور دوست سب یاد تھے اور یہ بھی یاد رہا کہ ان کا ایک دوست رتن لعل سینما ہال میں فلم دیکھتے ہوئے مر گیا تھا۔ ناصر کے دوستوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شامل تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گھر کے مذہبی ماحول کے باوجود ایک سیکولر ذہن رکھتے تھے۔ یہ سیکولر سے مراد لامذہبیت نہیں۔ عموماً ہمارے یہاں سیکولر کے معنی یہی لئے جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ناصر کاظمی کی طبیعت میں ابتدا ہی سے تعصب نہیں تھا اور یہ مزاج ان کا آخری دم تک قائم رہا۔ ان کے

دوستوں میں زیادہ تر ایسے لوگ شامل تھے جو دوسرے مسلک کے تھے اور ناصر کاظمی نے کبھی انہیں ان کے مسلک کے حوالے سے نہیں دیکھا۔

ناصر کاظمی نے اپنی ڈائری کے اوراق میں دریا خان سے ڈیرہ اسماعیل خان جاتے ہوئے دریا میں پانی کے جہازوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو مبالغہ معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اگر پانی کے جہاز چل رہے ہوتے تو انہیں تانگوں پر سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جہاز میں دریا کو عبور کرتے۔ اصل میں ناصر کاظمی کو بچپن ہی سے حیرانیاں بکھیرنے کی عادت تھی۔ اس لئے وہ اپنی گفتگو اور تحریر میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کر جاتے ہیں جو حیرانی کا باعث ہوتی ہے۔ اب جب انہوں نے جہاز کا ذکر کیا ہے تو یہ بھول گئے ہیں کہ دریا کے ایک کنارے کو دوسرے کنارے ملانے کے لئے کشتیوں کا پل بھی ہے جہاز یہ پل کیسے عبور کرتا ہو گا۔ اس بارے میں ڈاکٹر اجمل نیازی کا کہنا ہے۔

> "دریا خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے مابین دریائے سندھ پر کشتیوں کا پل بہت پرانا ہے۔ دریا کو عبور کرنے کے لئے لوگ کشتیوں کا پل بھی برسوں سے استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں اور پھر کشتیوں میں بیٹھ کر بھی دریا کو زمانہ قدیم سے عبور کیا جاتا ہے میں نے نہ تو کبھی اس دریا میں کوئی بڑا جہاز دیکھا ہے اور نہ ہی سنا ہے۔ البتہ وہاں کے لوگ سٹیمر کو بھی جہاز ہی بولتے ہیں۔ یہ سٹیمر مدت سے دریائے سندھ میں چلتی ہے۔" ۱۵؎

ناصر کاظمی کا عقیدہ ::

انبالہ شہر میں سادات کاظمیہ اور سادات رضویہ آباد تھے۔ ان کا ذکر ابتدائی صفحات میں آ چکا ہے ایک زمانے میں سادات کاظمیہ تقیہ کیے ہوئے تھے اور سنی مسلک کے بعض دینی فرائض کی ادائیگی کیا کرتے تھے اور ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے تھے لیکن ایام عزا باقاعدگی سے مناتے تھے۔ قاضی واڑہ میں ان کا امام باڑہ بھی تھا گلستان معرفت۔ اس بارے میں محمد باقر کاظمی کا کہنا ہے۔

انبالہ میں سادات کاظمیہ آباد تھے۔ ان کے علاوہ نصیر پور کے رضوی خاندان کے سید بھی یہاں آباد تھے۔ ناصر کاظمی کا تعلق انبالہ کے سادات کاظمیہ سے نہیں تھا۔ وہ باہر سے یہاں آ کر آباد ہوئے۔ انبالہ کے سادات عزاداری میں بڑی عقیدت کے ساتھ حصہ لیتے تھے مگر نماز ہاتھ باندھ کر ہی پڑھتے تھے یہ تقریباً ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے کہ لکھنؤ کے ایک فارغ التحصیل عالم دین مولانا مظہر حسین سہارن پور سے انبالہ آئے اور انہوں نے وہاں مجالس پڑھیں لیکن جب انہوں نے بعض بزرگ سادات کو ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ حیران ہوئے اور انہوں نے تلقین کی کہ آپ شیعان علی ہیں اور آپ کے عقائد بھی مسلک جعفری کے مطابق ہیں تو ہاتھ باندھ کر نماز کیوں پڑھتے ہیں ان کے اس وعظ سے تمام سادات نے ہاتھ کھول کر نماز پڑھنی شروع کر دی۔ سو ناصر کاظمی کے دادا اور والد بھی شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور بہت عبادت گزار تھے۔ گھر میں ایام عزا میں ہمیشہ سوز خوانی اور مجالس ہوا کرتی تھیں۔ مجالس سننے کے لئے خواتین، خواتین کی مجالس میں شریک ہوتیں اور مرد گلستان معرفت میں مجالس عزا سننے جاتے اس ضمن میں پروفیسر حسن عسکری کاظمی کا کہنا ہے۔

انبالہ شہر میں محرم کے ایام میں عزاداری نہ صرف اہل تشیع بڑھ چڑھ کر مناتے تھے بلکہ اس میں اہل سنت بھی برابر حصہ لیتے تھے۔ ان کے تعزیے الگ سے بنتے تھے اور وہ نہایت خوبصورت ہوتے تھے، انبالہ شہر کا محرم خاص طرح کا ہوتا تھا۔ انبالہ میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ یہاں کے اہل سنت بھی شبیہہ ذوالجناح کا جلوس نکالتے تھے مگر ماتم کی بجائے یاحسینؑ کہتے تھے تمام دن مختلف محلوں میں گشت کرتے تھے۔ شیعہ مسلک کے لوگوں کے بہت سے امام باڑہ تھے جن میں مختلف اوقات میں مجالس کا اہتمام ہوتا تھا لیکن سب سے بڑی مجلس گلستان معرفت اور دربار حسین میں ہوتی تھی۔ سوز خوانی میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی سوز خوانی کرتے تھے شاکر رضوی کے دوست اوم پرکاش بھی سوز خوانی کرتے تھے۔ دربار حسین امام بارگاہ میں جو کہ ہاشمی محلہ میں تھی ناصر کاظمی ایام عزا میں شریک ہوتے۔ کبھی کبھار سوز خوانی بھی کرتے تھے۔ مولانا علمدار حسین کی بیٹھک میں بھی مجالس ہوتی تھیں۔ جس میں ظہور الحسن بخاری کے ساتھ ناصر بھی سوز خوانی کیا کرتے تھے۔ انبالہ مسلم سکول کے ہیڈ ماسٹر،

ماسٹر محی الدین باقاعدگی کے ساتھ ذوالجناح پر چڑھاوا چڑھاتے تھے جبکہ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر شیخ بشیر نومسلم دیوی چند کے یہاں حدیث پڑھتے تھے اور ان ہی کی کاوشوں سے انبالہ میں محرم کی بارہ چھٹیاں ہوتی تھیں۔ اس فیصلہ کو بدلنے کے لئے ماسٹر ظہیرالدین انصاری نے بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ انبالہ کا محرم اپنی مثال آپ تھا جس میں اتحاد بین المسلمین ہمیشہ قائم رہا۔ امام بارگاہ سے باہر سبیلیں ہندو مسلم سکھ سبھی لگاتے تھے اور تمام مذاہب کے لوگ بڑی عقیدت سے محرم میں عزاداری کا احترام کرتے تھے ہر سبیل پر یہ لکھا ہوتا تھا کہ "پانی پیو تو یاد کرو پیاس امام کی"

اس روایتی محرم کی ایک جھلک آج کل گوجرانوالہ میں سادات انبالہ کی امام بارگاہ گلستان معرفت گوبند گڑھ میں دیکھی جا سکتی ہے جہاں ہر سال نو دس محرم کو تمام انبالہ کے سادات اکٹھے ہو کر مل کر امام کو پرسہ دیتے ہیں۔ ناصر کاظمی بھی کئی مرتبہ دسویں کے روز گوجرانوالہ گئے۔ ناصر کاظمی کی آواز بہت سریلی تھی وہ سوز خوانی کرتے تو سننے والے داد دیئے بغیر نہ رہتے۔" [۱۶]

انبالہ شہر میں عزاداری سے متعلق ابتدائی ابواب میں کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے انبالہ کی عزاداری کے بارے میں یہ بتایا کہ وہاں تقریباً ۱۲ کے قریب امام باڑے تھے جن میں گلستان معرفت محلہ قاضی واڑہ میں اور دربار حسین ہاشمی محلہ میں تھا۔ ناصر کاظمی دربار حسین کے امام باڑے میں جاتے تھے اور ظہور الحسن کے یہاں سوز خوانی بھی کرتے تھے سوز خوانی بھی انہوں نے اپنے گھر اور خاص طور پر والدہ سے سیکھی تھی۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی کے مطابق انبالہ میں ایام عزا نہ صرف تمام مسلمان بلکہ ہندو اور سکھ بھی بڑی عقیدت کے ساتھ مناتے تھے۔ ناصر کاظمی اپنے عقیدے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مذہب میرا شاعری اور قبیلہ ہاشمی ہے۔ دین میرا اسلام ہے اور کتاب قرآن پاک جو میرے جد امجد شافع محشرؐ سرکار رسالت ختمی مرتبت نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ پر نازل ہوا۔ پیر طریقت میرا جد اعلیٰ امام اول علی مرتضیٰؑ ہے اور مورث اعلیٰ میرا علی کا لخت جگر امام ہفتم حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہیں جن کے خلف حضرت حسن الخاطب میرے جد اعلیٰ ہیں۔ علی کا شیعہ

ضرور ہوں مگر میرے عقیدے میں نہ تبرے کا کوئی دخل ہے نہ تقیہ کو۔ میرے دوست وہی ہیں جو خدا کے دوست ہیں' انبیاء کے دوست ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دوست ہیں۔ علی کے دوست ہیں اور آئمہ اطہار کے دوست ہیں بعض شیعہ رسوم میں اس لئے شرکت کرتا ہوں کہ ان سے آل نبیؐ اور اولاد علیؑ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مجلس عزا امام مظلوم اور شہدائے کربلا کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شبیہہ ذوالجناح' علم اور تعزیے شہدائے کربلا کی یادگاریں ہیں۔ اس لئے ان کا احترام بھی مجھ پر اور میری اولاد پر واجب ہے۔ اگر بعض واعظین اور عزادار کوئی نامناسب یا غلط حقائق بیان کرتے ہیں تو میں اور میری اولاد اس سے بری الزمہ ہے۔"۱۷

ناصر کاظمی کا عقیدہ بالکل واضح ہے۔ وہ ابتدا سے شیعہ اثنا عشری تھے اور مرتے دم تک پکے اور سچے مومن تھے۔ یہ مومن ہی کی صفات میں سے ایک ہے کہ وہ نہ تو کسی کے عقیدے کو چھیڑتا ہے اور نہ ہی اپنے عقیدے کو چھوڑتا ہے۔ ناصر کاظمی نے قرآن کا مطالعہ ترجمہ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے دین اور دنیا کو جاننے کے لئے قرآن حکیم کا مطالعہ بہت ضروری ہے حضرت علیؑ کی تصنیف نہج البلاغہ سے بھی انہیں خاص عقیدت تھی۔ اپنی ڈائری میں وہ اس کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ۲۰ اپریل ۱۹۵۴ء میں ان کی غیر مطبوعہ ڈائری میں اس کا بھی باقاعدہ ذکر ہے۔۱۸ انہوں نے اس ماہ نہج البلاغہ کا مطالعہ کیا۔ ناصر کاظمی شیعہ ہوتے ہوئے اتحاد بین المسلمین کے بہت بڑے حامی تھے۔ وہ علیؓ کے دوستوں کو دوست اور علی کے دشمنوں کو دشمن کہتے تھے بس یہی ان کا عقیدہ تھا۔

ناصر کاظمی کے بچپن کے مشاغل ::

موسیقی ::

ناصر کاظمی مسلک کے اعتبار سے فقہ جعفریہ کے ماننے والے تھے اس اعتبار

سے محرم کے ایام میں وہ تعزیہ داری کرتے۔ اس کے علاوہ ناصر کاظمی کو شاعری کے شوق کے علاوہ اور بہت سے فنون لطیفہ میں دلچسپی تھی۔ انبالہ میں کرمو پہلوان کی بیٹھک میں وہ شطرنج کھیلتے اور پھر اس سے ستار بجانا بھی سیکھتے۔ ان کے دوست افتخار کاظمی ان دنوں وائلن بجانا سیکھ رہے تھے۔ وہ وائلن نہ سیکھ سکے اس لئے ستار سیکھنے کی طرف مائل ہو گئے جبکہ ناصر نے جلد ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ موسیقی میں نام پیدا نہیں کر سکیں گے اس لئے انہوں نے سیکھنے سے اجتناب کیا مگر موسیقی سے ان کی دلچسپی ہمیشہ برقرار رہی' ناصر کاظمی اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں۔

"موسیقی سے مجھے خاص رغبت ہے ایک مرتبہ استاد عبدالعزیز مرحوم سے ستار اور سارنگی سیکھنے کی کوشش کی لیکن لاہور میں کالج کھلنے پر حسرت دل میں رہ گئی اور اس اثنا میں استاد فوت ہو گئے۔" ۱۹؎

اپنے انٹرویو میں ناصر کاظمی کہتے ہیں :

"میرے سارے ہی شغل ایسے تھے جن کا تعلق تخلیق سے اور فنون لطیفہ سے ہے ۔موسیقی' شاعری' شکار' شطرنج' پرندوں سے محبت' درختوں سے محبت یہ سب جو ہے' معلوم ہوتا ہے میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔" ۲۰؎

ایک اور جگہ اپنی ڈائری میں ناصر کاظمی لکھتے ہیں۔

"شاعری مجھے اپنے نانا سید نیاز نبی مرحوم اور والدہ محترمہ کنیزہ محمد بیگم سے ورثہ میں ملی ـــــــــ ـــــــــ موسیقی' شعر و شاعری' سوز خوانی دیگر فنون سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔" ۲۱؎

ناصر کاظمی کی فنون لطیفہ میں دلچسپی میں ان کی ننھیال کا بہت اثر تھا۔ ان کے نانا نہ صرف شعر و شاعری بلکہ موسیقی میں بھی بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ یہیں سے ناصر کو بھی شوق پیدا ہوا۔ پھر گھر میں سوز خوانی بھی ہوتی تھی خود ناصر کی والدہ بھی سوز خوانی کیا کرتی تھیں ناصر کی اپنی آواز بھی بہت اچھی تھی وہ ترنم میں کلام بھی پڑھتے تھے اس لئے سوز خوانی میں بھی حصہ لیتے تھے۔ ناصر کاظمی کے دوست افتخار کاظمی بتاتے

ہیں۔

"ہم دونوں اکٹھے رہتے تھے اس لئے اسے بھی موسیقی کا شوق پیدا ہوا اور اتنا زیادہ ہوا کہ اس نے موسیقی سیکھنے کے لئے باقاعدہ استاد رکھے ہوئے تھے جن سے ناصر نے طبلہ اور سارنگی سیکھی۔ راگ اور راگنیوں سے بھی واقف تھا۔ سینما دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ مجھے بھی زبردستی ساتھ لے جاتا تھا حالانکہ مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔" ۲۲ ؎

ناصر کاظمی کو بچپن ہی سے موسیقی پسند تھی۔ پچھلے اوراق میں ایسی ایک مثال دی گئی ہے جس میں ناصر نے اپنی پسند کا ریکارڈ بھجوایا تھا۔ ناصر کاظمی بنیادی طور پر شاعر فطرت تھا۔ وہ ہر موسم کے پتوں کو دیکھتا۔ کبھی بہار میں یہ پتے اسے ردم میں تالیاں بجاتے دکھائی دیتے۔ کبھی موسم خزاں میں زمین پر بکھرے بکھرے نظر آتے۔ پتوں کے ان ہی رویوں سے وہ خوش ہوتے اور کبھی اداس ناصر کاظمی کی لاہور میں جب پہلے پہل انتظار حسین سے ملاقات ہوئی تو دوسری ملاقات میں وہ انتظار سے یوں ملے۔

"میں نے پوچھا ناصر صاحب اس وقت کدھر؟

جواب دیا۔ پتے دیکھنے جا رہا ہوں۔

پتے؟ میں چکرایا۔

ہاں پتے! آج پتے بہت گرے ہیں میں لارنس کی طرف جا کے دیکھوں گا۔ آپ بھی چلیں۔ کیا مضائقہ ہے میں ساتھ ہو لیا۔ ناصر نے کہا یہ پت جھڑ کی رت ہے۔ یہ رت مجھے بہت خراب کرتی ہے۔ گرتے پتوں کو دیکھ کر میں اداس ہو جاتا ہوں۔" ۲۳ ؎

اداسی ناصر کو بچپن ہی سے دامن گیر تھی۔ رومانوی طبیعت کے سبب بہت جلد اداس ہو جاتے تھے۔ اس اداسی کا مداوا یا تو وہ شاعری کے توسط سے کرتے یا پھر موسیقی سے بہلاتے۔ اس زمانے میں بھی انہیں بہت سی راگ، راگنیوں سے شناسائی ہو گئی تھی جبکہ وہ بھجن بھی دلچسپی سے سنتے تھے۔ افتخار کاظمی کہتے ہیں:

"ناصر نے شعروشاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی میں بھی اپنی دلچسپی بڑھائی۔ اس کا ترنم بہت اچھا تھا۔ اکثر اپنے اشعار مجھے گا کر سناتا۔ سوز خوانی بھی کیا

کرتا تھا۔ استاد کرموں کی بیٹھک میں ہم دونوں نے استاد سے موسیقی کے اسرار و رموز سیکھے۔ ناصر کو ستار کے ساتھ ساتھ سارنگی بجانے کا شوق بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا بس یک دم ان سازوں پر مہارت حاصل کر لے مگر ریاض کے بغیر ایسا کیسے ممکن تھا۔" ۲۴

موسیقی کے ساتھ مصوری ::

ناصر کاظمی کی آواز بہت اچھی تھی۔ وہ اچھی آواز کو سروں میں ڈھالنے کے متمنی تھے۔ ساتھ کے ساتھ ساز بھی سیکھنا چاہتے تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ یہ کام بہت وقت مانگتا ہے تو انہوں نے سیکھنے سے خود کو الگ کر لیا۔ مگر موسیقی سے دلچسپی کو برقرار رکھا۔ موسیقی کے ساتھ ساتھ انہوں نے مصوری میں بھی دلچسپی لی' ناصر کہتے ہیں۔

"جو نغمے' جو لوک گیت' لوریاں بچپن میں سنی تھیں اب اپنے گلے میں پھوٹنے لگیں۔ جذبات لفظوں کی مالا میں گندھنے لگے۔ ان لفظوں کی ترتیب کے پیچھے اذان کی آواز کا شکوہ اور لوریوں کا رس بھی ہوتا۔ خیالات موزوں الفاظ میں ادا ہونے لگے۔ قدرت نے گلے میں سوز کی پتی رکھ دی تھی۔ میری آواز میں بڑا دکھ تھا اور میں دن رات اس آواز کے آہنگ میں سرشار رہتا۔ تنہائی کو یادوں کے کھلونے مل گئے۔ شعر ان کھلونوں کو بھی توڑنے لگا۔ انہیں یادوں اور تجربوں میں اپنی آواز کی روح پھونکتا ہوں اور اپنے افکار کے ہمزاد میں نے اسی آواز کے ذریعے قابو کئے ہیں۔ ماضی میرے لئے ہمیشہ زندہ ہے لیکن میں اس میں کھو نہیں جاتا بلکہ تجربے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس سے نئے پیکر تراشتا ہوں۔ پہلے پہل رنگوں پر دل دھڑکنے لگا۔ مصوری شروع کی لیکن جی محنت سے کتراتا تھا اس لئے رنگ بے آواز رہے اور گونگے رنگ میری تنہائیوں میں شریک نہ ہو سکے۔ رنگ پھینک

دیئے۔ کینوس پھاڑ دیئے اور سارنگی خرید لی۔ استاد عبدالعزیز جیسے مایہ ناز سازندے سے ضلع جگت کا سبق لیا لیکن تلون یہ چاہتا تھا کہ سر کا دیوتا ایک دم قابو آجائے۔ ایک دن بیزار ہو کر میں نے سارنگی فرش پر دے ماری۔ اس وقت سارنگی سے جو آواز نکلی وہ بہت دردناک تھی۔ سنگیت کی دیوی روٹھ گئی اور اڑ گئی۔ ایک عرصہ تک ذہن کی حالت یہ رہی جیسے کوئی سازندہ ایک کمرے سے میں اپنا ساز بند کر کے کمرے کو قفل لگا کر کسی دور دیش میں چلا جائے۔ اس کمرے کا تصور کیجئے پلنگ' قالین 'کرسیوں اور پردوں پر گرد جم چکی ہے۔ کوئی کھڑکی کھلی ہے کوئی بند ہے۔ ہوا چلے۔ آندھی چلے' مینہ برسے کمرہ ایک بے حس لاش کی طرح پڑا ہے۔ سازوں کے تاروں پر گرد جم چکی ہے۔ اس کی کھونٹیوں پر زنگ لگ گیا ہے تراوں میں کریوں نے بسیرا کر لیا ہے۔" ۲۵ •

اس اقتباس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ناصر کو موسیقی کے ساتھ ساتھ مصوری سے بھی کس قدر دلچسپی تھی مگر طبیعت میں ٹھہراؤ نہ ہونے کے سبب وہ کوئی کام جم کر نہیں کرتے تھے۔ یہی صورت ان کی نوکریوں کے معاملے میں بھی رہی۔ صرف اور صرف اگر کوئی کام جم کر کیا تو وہ شاعری ہے۔ ناصر کو اپنی بات سننے والے کے دل میں اتارنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ ایک جادوگر تھا جو کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ اور کہانی سناتے وقت اپنا ایسا رنگ باندھتا کہ سننے والا واہ واہ کر اٹھتا۔ بقول انتظار حسین ناصر کاظمی نے اپنی والدہ کو تو شاعرہ بنا دیا مگر والد کو میر تقی نہ بنا سکا۔ ۲۶

سو ناصر کاظمی بنیادی طور پر ایک تخلیقی خود رو پودا تھا جو کبھی باغات میں پروان چڑھا تو کبھی سبزہ زاروں میں۔ کبھی صحراؤں میں تو کبھی دریاؤں کے کنارے پر کبھی پہاڑوں اور وادیوں میں تو کبھی چٹیل میدانوں میں' کبھی اس نے ہرنوں کی چوکڑیاں بھرنے کی آواز سنی تو کبھی شیروں کی دھاڑ' کبھی گھوڑوں کی پیٹھ پر حضرت امیر خسرو کی طرح بیٹھ کر شعر کہے تو کبھی کرموں کی بیٹھک میں بیٹھ کر ستار اور سارنگی کے تار چھیڑے۔ کبھی آسمانوں پر آسمانوں ہی کے سفیروں کی ٹولیوں کو اڑتے دیکھا تو کبھی پرندوں سے ہم کلام ہوا۔ کبھی وہ پھولوں کی مہکاروں میں لمبے لمبے سانس لیتا تو کبھی

اداسی کی گھنیری چھاؤں میں آنسو بہاتا۔ اس کی زندگی کے موسم جدا جدا تھے وہ ہر موسم کا باسی تھا۔ اسے سب سے زیادہ اداسی کا موسم پسند تھا۔ اسی لئے اس کے تمام کلام میں اداسی بال کھولے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنی اس اداسی سے اپنے قارئین کی دلوں کی دھڑکنیں تیز کرتا ہے۔ اس لئے اس کی شاعری متحرک ہے۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ رعب دار اور کھرج دار آواز تھی۔ وہ تحت اللفظ بھی بہت عمدہ پڑھتا تھا۔ استاد کرموں کی بیٹھک سے استاد عبدالعزیز تک اس نے سارنگی اور ستار کے تاروں کو اپنا ہمراز کرنا چاہا مگر جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ پلک جھپکتے ہی ان تاروں کو اپنا ہمراز نہیں بنا سکے گا تو اس نے وہ تار ہی توڑ دیئے لیکن ٹوٹے ہوئے تاروں کی آواز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا ہمراز بنا لیا۔ یہی وجہ ہے انہیں زندگی میں جہاں بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی محبتوں کی خوشبو میسر آئی وہاں انہیں بہت سے گائیکوں' موسیقاروں کا قرب بھی حاصل ہوا۔ ان کی غزل کی جب کوئی موسیقار دھن بناتا پہلے وہ خود سنتے اور سر دھنتے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے ترانے ہوں یا ناصر کی اور غزلیں سب کی دھنیں ان کی موجودگی میں تیار ہوئیں۔ وہ مشاعروں میں ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اس لئے اچھے اچھے شاعروں کے سامنے اپنے کلام اور ترنم کے سبب حاوی ہو جاتے۔ ایک زمانے میں پاکستان کا کوئی مشاعرہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ مدعو نہ کیے جاتے ہوں۔ مگر پھر انہوں نے ترنم چھوڑ دیا اور تحت اللفظ ہی پڑھتے۔ موسیقی ان کے خون میں سرایت کر چکی تھی۔ رنگ ان کی شاعری کے پس منظر اور پیش منظر میں دکھائی دیتے تھے۔ کبوتروں اور شعروں کی اڑانیں ایک ہو گئی تھیں۔ یہی ناصر کا کل سرمایہ تھا۔ اس نے مختلف فنون سے محبوب کی طرح محبت کی۔ جس فن نے ساتھ نہ دیا ناصر نے اسے چھوڑ دیا مگر زندگی بھر بھلا نہ سکا۔ چنانچہ مصوری اور موسیقی اس کی ایسی محبوبائیں تھیں جن سے وہ ناطہ تو نہ جوڑ سکا مگر زندگی بھر ان سے علیحدگی بھی اختیار نہ کی۔ اس کے دوستوں میں کئی ایک ایسے دوست بھی ملیں گے جو مصور تھے ان میں ایک بہت بڑا نام شاکر علی کا ہے جن سے ناصر کی بہت دوستی تھی' اسی طرح گلوکاروں میں ملکہ ترنم نور جہاں' مہدی حسن' غلام علی' پرویز مہدی' سلیم رضا' منیر حسین' مسعود رانا' مجیب عالم وغیرہ سب سے ان کی شناسائی تھی جبکہ استاد امانت علی خان موسیقار حسن لطیف ان کے خاص

دوستوں میں سے تھے۔ ریڈیو کے موسیقار کالے خان سے بھی انہیں قرب حاصل تھا۔ جنہوں نے ان کے کئی ترانوں اور غزلوں کی دھنیں بنائیں۔ ناصر کو فنون لطیفہ کیا زندگی کے ہر پہلو پر بات کرنے کی دسترس حاصل تھی۔ منیر احمد شیخ کہتے ہیں۔

"مجھے دراصل اس کی جادو گری نے اپنی طرف کھینچا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر تھا ہی جادوگر۔ شاعری ہو یا نثر یا ٹیبل ٹاک۔ وہ رسیاں پھینکتا جاتا اور سانپ نکلتا جاتا۔ ایک بار جو اس کے طلسم میں آ گیا پھر وہ باہر نہیں نکل پاتا تھا۔" ۲۷ے

منیر احمد شیخ مرحوم آگے چل کر لکھتے ہیں۔

میں نے حضرت علیؓ کے خطبے پہلی مرتبہ اس کی زبان سے سنے۔ موسیقی اور لفظ کا رشتہ اس نے کئی محفلوں میں ہم پر عیاں کیا۔ وہ اس وجود کی سطح پر نہیں جیتا تھا کہ جس پر ہم سیدھے سادے دنیا دار جیتے ہیں۔" ۲۸ے

گزشتہ اوراق میں ہم نے ناصر کاظمی کے قرآن کریم کے مطالعہ کے ساتھ نہج البلاغہ کا بھی ذکر کیا تھا۔ منیر احمد شیخ مرحوم نے بھی حضرت علیؓ کے خطبات کا ذکر کیا ہے جو ناصر کو ازبر تھے۔ وہ حضرت علیؓ کا بے حد مداح تھا۔ دوستوں کی محفلوں میں وہ جناب امیر علیہ السلام کا تذکرہ نہایت عقیدت و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی علمی بصیرت کی خوشبو سے آشنا کرتا۔ منیر احمد شیخ مرحوم خود بھی موسیقی کی شدھ بدھ رکھتے تھے کہ کلاسیکی موسیقی کے گلوکاروں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ان کی لائبریری میں آج بھی ہے۔ موسیقی کے حوالے سے منیر احمد شیخ سے بات کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایک مرتبہ جب راقم بھارت کے کسی سیمینار میں شرکت کے لئے دہلی گیا تو منیر احمد شیخ نے راقم سے جو فرمائش کی تھی وہ کلاسیکی استادوں کے گانوں کی فرمائش تھی۔ اس لئے منیر احمد شیخ کی ناصر سے موسیقی کے حوالے سے گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ ناصر کاظمی موسیقی میں نہ صرف گہری دلچسپی لیتے تھے بلکہ وہ اس کے سحر کی باریکیوں سے بھی آگاہ تھے۔ ناصر کاظمی کی گفتگو کی جادو گری کو اکثر دوستوں نے جھوٹ اور مبالغہ کا نام دیا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ سونے کو مروجہ سکوں میں ڈھالنے کے لئے کچھ کھوٹ بھی ملانی پڑتی ہے۔ سو ناصر کاظمی میں جھوٹ یا مبالغہ سچ کے سکے میں کھوٹ کی مقدار

کے مطابق ہوتا تھا۔ دوسرے جھوٹ وہ ہوتا ہے جو کسی کو نقصان پہنچانے کا باعث ہو ناصر کاظمی کا جھوٹ قطعاً" ایسا نہیں تھا۔ وہ گپ ضرور لگاتا تھا مگر اس طرح سے کہ اس پر سچ کا گمان ہوتا تھا۔ اس نے انتظار حسین شیخ صلاح الدین' غالب احمد' منیر احمد شیخ' احمد مشتاق کی موجودگی میں جو واقعات سنائے تھے ان میں کئی ایک حقیقت پر مبنی تھے۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ وہ شیر سے پنجہ لڑا چکے ہیں ایک طرح سے صحیح ہے۔ جس کا ذکر ہم پچھلے اوراق میں کر چکے ہیں۔ ڈکشائی میں ان کے والد کے سلسلہ ملازمت کے دوران ان کی شیر ہی کی ایک قسم لگڑ بگڑ سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔ جسے ان کے والد نے بر وقت پہنچ کر چھڑا دیا تھا ورنہ بقول ناصر کاظمی آج اردو کا ایک شاعر ہم میں موجود نہ ہوتا۔ دوسرے ریچھ کی غار تک جانے والے قصے کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ موسیقی کے حوالے سے ستار اور سارنگی سیکھنے سے متعلق بھی حقائق ملتے ہیں۔ حمیرا عرف بالو سے عشق کی داستان بھی درست ہے۔ انبالہ میں بم بنانے والا واقعہ بھی صحیح ہے۔ کبوتروں سے محبت بھی واضح ہے البتہ ناصر کاظمی کی زندگی کا ایک بہت بڑا اور اہم واقعہ جس پر سے اس نے کبھی پردہ نہیں اٹھایا اس کا وہ حقیقی عشق تھا جو اس نے سلمیٰ نامی فرضی لڑکی سے کیا۔ جس کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا۔ یہی ناصر کاظمی کا ایک ایسا جھوٹ تھا جو حقیقی معنوں میں سچ تھا اور جس نے ناصر کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے اور اس کی شاعری کو متحرک کیا۔ باقی جہاں تک ناصر کی گفتگو کا تعلق ہے اس کی تصدیق ان کے ہر دوست نے کی ہے کہ وہ گفتگو کا جادوگر تھا جو اس کے حصار میں ایک مرتبہ آگیا پھر اسی کا ہو گیا اس بارے میں ناصر کاظمی کی بیگم شفیقہ کاظمی کا کہنا ہے۔

> "ناصر نے مجھے پہلے پہل پانچویں جماعت میں دیکھا تھا۔ وہ میرے کزن تھے ہمارے بڑوں میں ہی ہمارا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ وہ مجھے پسند کرتے تھے۔ لاہور میں جب بھی وہ ہمارے گھر آتے تو باتیں کئے جاتے اور میں ان کی گفتگو کے سحر میں محو رہتی۔ ان کی باتیں بہت اچھی ہوتی تھیں۔ سب گھر والے کہانیوں کی طرح سنتے تھے۔" ۲۹ے

یہاں ناصر کاظمی کی شریک حیات کے خیالات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ناصر

واقعی بات کو دلوں میں اتارنے کا ہنر جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن کے دوستوں میں بھی اس کے گرویدہ تھے اور پھر عہد جوانی میں انتظار حسین، احمد مشتاق، غالب احمد، صلاح الدین محمود، شیخ صلاح الدین، عبدالحمید، منیر احمد شیخ، محمد حسن عسکری، مظفر علی سید، منیر نیازی، جیلانی کامران، ڈاکٹر سہیل احمد خان، احمد ندیم قاسمی، آفتاب احمد، حنیف رامے سبھی نے ناصر کاظمی کی اس جادوگری کو مختلف حوالوں سے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔

شطرنج ::

ناصر کاظمی کے مشاغل میں شطرنج کو بھی ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ وہ کرموں پہلوان کی بیٹھک میں موسیقی سے بھی دل بہلاتے تھے اور شطرنج بھی کھیلتے تھے۔ شطرنج کھیلنے کا سلسلہ بھی آخری عمر تک جاری رہا۔ عنصر کاظمی کا کہنا ہے۔

"پاپا جی کو شطرنج کا شوق بھی ابتدا سے تھا۔ وہ چچا افتخار کاظمی کے ساتھ شطرنج کھیلتے یا پھر کرموں پہلوان کے گھر کی بیٹھک میں شطرنج کی بیٹھک جمتی۔ شطرنج کھیلنا اور اس کے داؤ کو سمجھنا اس زمانے میں بھی غیر معمولی بات تھی۔ پاپا جی کے ایک اور دوست ہوتے تھے جو لکھی شاہ کے مزار کے پاس رہتے تھے ان کا نام تھا اسحاق، وہ گیم وارڈن تھے۔ ہر اتوار کو پاپا جی ان کے ساتھ شطرنج کھیلتے یا پھر شکار کو جاتے۔" ۳۰۔

شطرنج ذہین لوگوں کا کھیل ہے اور یہ ایک ایسا نشہ ہے کہ جو شطرنج کھیلنے بیٹھ جائے پھر وہ مشکل ہی سے اٹھتا ہے۔ پہلے زمانے میں فرصتیں ہی فرصتیں ہوتی تھیں۔ سکول سے فراغت کے بعد یہی ناصر کے مشغلے تھے اتوار کو چھٹی ہوتی تھی اس لئے اس چھٹی کا مصرف کبھی شطرنج کھیل کر تو کبھی شکار پر جا کر ہوتا تھا۔ سادات کے گھرانوں میں شطرنج کھیلنا معیوب سمجھا جاتا تھا، اس لئے ناصر کے گھر والے بھی اسے ناپسند کرتے تھے۔ اس لئے کہ یہ یزید کا پسندیدہ کھیل تھا۔ اب بھی سادات میں اس کھیل کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناصر یہ کھیل باہر ہی کھیلا کرتے تھے۔ اب امام خمینیؒ نے

شرط کے بغیر اس کھیل کے کھیلنے کو جائز قرار دیا ہے۔ پھر بھی کٹر قسم کے شیعوں میں اب بھی یہ کھیل معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ناصر کاظمی کی شطرنج کے ساتھیوں میں افتخار اور اسحاق ہی ہوتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ کھیل ناصر کاظمی کے فرزندوں باصر سلطان کاظمی اور حسن سلطان کاظمی کو شاعری کی طرح وراثت میں ملا۔ باصر تو شطرنج کے چیمپئن ہیں۔ کئی ایک مقابلے جیت چکے ہیں۔ ناصر کے بھائی عنصر کاظمی بھی شعر کہتے ہیں اور شطرنج کھیلتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ چچا اور بھتیجے کبوتروں میں اس طرح دلچسپی لیتے ہیں جس طرح ناصر کا شیوہ تھا۔ ناصر کاظمی کے یہاں اب بھی شطرنج کے شائقین کا اجتماع ہوتا ہے۔ ان میں نامی گرامی لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔

شکار اور گھڑ سواری ::

ناصر کاظمی اکثر دوستوں کی محفل میں شکار اور گھڑ سواری کا ذکر کرتے تھے۔ اس ضمن میں ایک مرتبہ وہ اپنے والد کے ساتھ مرغابیوں کے شکار پر گئے۔ مادہ مرغابی کا شکار کیا جبکہ نر اس کی جدائی میں پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اس پر ناصر کی والدہ نے ناصر کے والد کو کہا یہ بہت ظلم ہے اور ناصر کے والد اس کے بعد شکار پر نہیں گئے۔ اس شکار کا تذکرہ پچھلے اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ ناصر کی لگڑ بگڑ سے لڑائی کا ذکر بھی پچھلے اوراق میں آ چکا ہے۔ انتظار حسین سے ناصر کاظمی کی جو گپ شپ ہوتی رہی اس میں بھی ناصر نے شکار کا ذکر کیا۔ انتظار حسین لکھتے ہیں۔

> "شیر سے ناصر کی مڈھ بھیڑ دو مرتبہ ہوئی ایک مرتبہ ناصر نے مروت برتی۔ دوسری مرتبہ شیر طرح دے گیا۔ ناصر نے مروت اس لئے برتی کہ شیر ببر اس وقت قیلولہ کر رہا تھا۔"

> "یار میں نے سوچا کہ اس وقت شیر کو بے آرام نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ وہ میری گولی کی زد میں تھا۔"

دوسری دفعہ یہ ہوا کہ ناصر نے اپنی بندوق نہیں بھری تھی کہ سامنے جھاڑیوں سے شیر نکل آیا۔ اس نے ناصر کو گھور کر دیکھا ضرور مگر پھر نظریں

نیچے کر کے گزر گیا۔"

"کیا شیر نظر نیچی کر سکتا ہے؟" ایک یار نے سوال اٹھایا؟ شیر نظر نیچی تو نہیں کرتا مگر اپنے شکاری کو دیکھ کر شرما جاتا ہے۔" انتظار حسین آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"اس کا مطلب یہ نہیں کہ ناصر نے کبھی شیر مارا ہی نہیں تھا۔ شیر مارنے کا انکشاف اس نے دوسرے موقع پر کیا جب وہ اپنے ایک کبوتر کی بہادری کے قصے سنا رہا تھا۔" اس نے بلی کو ایسی خونخوار نظروں سے دیکھا کہ غریب بلی سہم گئی۔

"تعجب کی اس میں بات کیا ہے۔ میں انہیں دنوں شیر مار کر لایا تھا۔ اس کی چربی میں نے محفوظ کر لی۔ اس کبوتر کو دانہ اسی چربی میں ملا کر کھلاتا تھا۔ پس کبوتر شیر بن گیا بلی قریب آتی تو اسے پنجہ مار کر لہولہان کر دیتا۔" ۳۱

اب دیکھئے ناصر نے اپنی گفتگو کے کمال سے کبوتر کو شیر بنا دیا اور ساتھ ساتھ واقعہ اس طرح سے گھڑا کہ سچ معلوم ہونے لگا۔ یہی ناصر کی گفتگو کا کمال تھا۔ جہاں تک شکار کا تعلق ہے جو شخص کتوں سے ڈرتا ہو اور کتوں سے ڈر کر راستہ بدل لیتا ہو بھلا وہ شیر کا شکار کر سکتا ہے؟ اس بارے میں ناصر کاظمی کے دیرینہ دوست شہرت بخاری کا کہنا ہے۔

"ناصر میرا دوست تھا سب سے زیادہ مجھ سے ہی دوستی تھی۔ قیام پاکستان سے پہلے جب وہ اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا۔ حمید نسیم، عبدالمجید بھٹی بھی اس کے دوست تھے۔ مجھے اس کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہ بڑے مزے کا آدمی تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں امیجینیشن سے کام لیتا تھا۔ اس کے شکار اس کے قصے کہانیاں سبھی اس کے امیجینیشن تھے۔" ۳۲

اپنی کتاب میں شہرت بخاری لکھتے ہیں۔

"اس کے والد صاحب ثروت تھے۔ ہوں گے۔ وہ خود تو بہت ہی غریب تھا۔ اس کے پاس تو ایک ٹوٹا ہوا چراغ بھی نہیں تھا جو راستہ دکھا سکے۔ اس کے

گھر میں شکار کھیلنے کے لئے گھوڑے تھے۔ ہوں گے۔ مگر اس کے پاؤں میں تو ڈھنگ کا جوتا بھی نہیں تھا۔ اس کے والد کا دستر خوان بہت وسیع تھا۔ ہو گا۔ مگر اسے تو پچیس برس دو وقت کی روٹی بھی اطمینان سے نصیب نہیں ہوئی کہ یہی وہ انعام تھا جو ایک شاعر کو اس کی قوم نے اپنی آزادی کی خوشی میں عطا کیا تھا۔"

شہرت بخاری ناصر کے بہت پرانے دوستوں میں سے تھے۔ وہ بھی ناصر کی گفتگو سے بے حد متاثر تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ناصر جو باتیں کرتا ہے ان میں محض اس کے خواب ہی ہوتے ہیں مگر وہ خوابوں کی بنت اس طرح سے کرتا ہے کہ حقیقت کا گمان ہونے لگتا۔ ناصر کاظمی کے والد انبالہ کے رئیس ہوتے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر قیام پاکستان کے بعد جائیداد کی صورت میں ضرور دکھائی دیتا۔ بقول عنصر کاظمی کہ ہمارے والد کی اس زمانے میں پانچ سو بیگھہ زمین تھی جس میں سے ہمیں پاکستان میں ۵ ایکڑ ملی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنے بڑے زمیندار کی زمین کا کلیم کیوں نہیں مل سکا۔ سو ناصر کاظمی جن خوابوں کی دنیا میں بستا تھا اس میں اس کے اس طرح کے ٹھاٹھ باٹھ تھے جب کہ حقیقت اس سے مختلف تھی۔ البتہ ان کے والد چونکہ فوج میں صوبہ دار میجر تھے اس لئے گھر میں کافی خوشحالی تھی۔

افتخار حسین اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ناصر کے اصطبل کے گھوڑے بھی ماشاء اللہ بہت سمجھ دار اور بردبار تھے۔ اس کے ایک ایک اشارے کو سمجھتے تھے۔ ہاں ایک عربی گھوڑا جب اس اصطبل میں آیا تو اس نے بہت سرکشی دکھائی۔ کسی کے قابو میں نہ آتا تھا۔ ناصر کہنے لگا۔ میں نے سوچا کہ میں ہی اسے قابو میں کروں گا۔ ان دنوں اپنی کاٹھی بنی ہوئی تھی۔ رانیں ایسی جیسے سونے کی پڑیاں جمی رکھی ہوں۔ بدن لوہا لاٹھ' میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مٹھی میں بال پکڑے اور اچک کر ننگی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ گھوڑے نے مڑ کر دیکھا کہ یہ کون سوار ہے اور پھر کیا چلنے لگا۔"

۔۳۳

گھڑ سواری کے بارے میں ناصر کے بچپن کے دوست افتخار کاظمی کا کہنا ہے۔

"ناصر کو گھڑ سواری کا شوق تھا۔ ان کا ایک پھوپھا اس وقت قانون گو تھا۔ وہ بھی گھوڑا رکھتا تھا۔ اس کے دادا تھانیدار تھے۔ ان کے پاس بھی گھوڑا ہوتا تھا۔ حویلی کے ساتھ ہی اصطبل تھا۔ جب جی چاہتا گھڑ سواری کر لیتے۔" ۳۴ے

سید مزور امام ' سید کاظم علی شاہ ' سید محمد باقر کاظمی ' سید مسعود الحسن کاظمی ' سید افتخار کاظمی دیگر احباب کی اس رائے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی رئیس نہیں تھے جبکہ بسلسلہ ملازمت ان کے والد کے پاس ایک گھوڑا ہوتا تھا جس پر سوار ہو کر ناصر نے انبالہ اور پٹیالہ کے تقریباً تمام گاؤں کی سیر کی۔

ناصر کاظمی لکھتے ہیں۔

"گھڑ سواری کا مجھے بے حد شوق ہے۔ ضلع انبالہ اور پٹیالہ کے تقریباً تمام گاؤں اور پنجاب (گوجرانوالہ ' پتوکی ' شیخوپورہ کے بیشتر گاؤں میں نے گھوڑے پر سفر کرتے ہوئے دیکھے۔ شملہ ہلز ' ڈگشائی ' جتوک ' کوٹ گڑھ ' کسولی ' سپاٹو کی ریٹی ' دھرم پور ' ڈیرہ دون ' سوری ' مری ' ڈلہوزی ' ایبٹ آباد کشمیر کی سیر کی۔" ۳۵ے

آسمانوں کے سفیر ناصر کاظمی کے کبوتر ::

ناصر کاظمی نے ہمیشہ اپنے کبوتروں کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ کیا۔ انہیں کبوتر پالنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ جب وہ چار سال کی عمر میں انبالہ سے نوشہرہ گئے تو ان کے کبوتر انبالہ میں ہی رہ گئے۔ جہاں ان کے نانا اور نانی کبوتروں کی دیکھ بھال کیا کرتے۔ ناصر کے پاس کبوتروں کی کئی قسمیں تھیں۔ وہ کبوتروں سے متعلق غیر معمولی معلومات رکھتے تھے۔ انہیں جہاں کہیں بھی اچھی نسل کے کبوتروں کا پتہ چلتا چل پڑتے اور انہیں حاصل کئے بغیر نہ رہتے۔ یہی صورت ان کی انبالہ میں تھی اور یہی بعد میں لاہور میں رہی۔ کبوتروں سے اپنی دلچسپی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"کبوتر پالنے کا شوق مجھے بچپن سے تھا۔ ہجرت کے وقت ۱۳ اگست کو میں اپنے سارے کبوتر باوانت سنگھ رئیس انبالہ کو دے آیا تھا نہ معلوم اب

کس حال میں ہیں۔ ان کبوتروں کی نسلیں اب ہمارے ملک میں نایاب ہیں۔" ۳۶۔

اس سے پہلے اوراق میں بھی ناصر کاظمی کے کبوتروں کا ذکر آ چکا ہے۔ ان کے کبوتروں کی دیکھ بھال ان کی والدہ' نابینا نانی اور نانا کیا کرتے تھے۔ کبوتر بھی ان سے بہت مانوس تھے۔ پھر کبوتروں سے ان کی محبت بلکہ عشق کا یہ عالم تھا کہ وہ کبوتروں کو کبوتر نہیں بلکہ شیر سمجھتے تھے۔ اس لئے تو اپنے دوستوں کو اپنے شکار کا قصہ سناتے ہوئے یہ بھی بتا گئے کہ انھوں نے شیر مار لیا اور پھر اس کی چربی کبوتروں کو کھلا دی ہے' جس سے کبوتر بھی شیر بن گئے۔ جہاں تک کبوتروں کی اڑانوں کے لئے کبوتروں کی خوراک کا تعلق ہے ناصر کاظمی کو اس کے کئی نسخے ازبر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ان نسخوں کی تلاش میں رہے۔ ان نسخوں پر بھی ہم بحث کریں گے مگر آیئے دیکھتے ہیں کہ ناصر کو کبوتر پالنے کا شوق کیسے ہوا۔ صغرا بی بی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

"پھر کبوتروں کا شوق ہوا میرے بڑے بھائی محمد حسین عرف نتھو بہت کبوتر رکھتے تھے۔ ان کے لئے مصالحے پکاتے' بادام' پستہ' بالائی موٹھ کی دال میں ملا کر کبوتروں کو کھلاتے۔ یہ ان کے پاس جاتا اور کبوتروں سے کھیلتا مگر والد کے ڈر سے گھر میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اس کو بہلانے کے لئے کبوتروں میں لے جاتے۔ یہ دیکھتا اور خوش ہوتا۔ جب چھ سات سال کا ہو گیا تو کبوتروں کے نام اور نسلوں وغیرہ کے بارے میں پوچھتا۔ پھر خود کبوتر رکھنے شروع کر دیئے۔ بڑے گھر میں اس کی ماں اور دادا نے اس کو کبوتر منگا دیئے اور کوٹھے پر کبوتروں کا ڈربہ بنا دیا۔ اب اس کو کبوتروں کی خاطر ہاشمی محلّہ سے قاضی واڑے جانا پڑتا تھا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں کبوتر چوری ہو جاتے یا اڑ جاتے۔ کیونکہ ان کے گھر کا پرانا نوکر کبوتر چرا کر بیچ آتا اور کہتا کہ اڑ گئے یا کہ بلی کھا گئی۔ پھر جب ان کا تبادلہ پشاور ہوا تو کبوتروں کا پیچھا چھٹا۔ کچھ عرصے بعد جب ناصر کے نانا کا انتقال ہوا تو پھر ان کو مسلسل انبالہ ہی میں رہنا پڑا اس لئے کبوتروں کا شوق پھر لوٹ آیا۔ کبوتر تو مول لاتا کبھی شہر سے

کبھی پٹیالہ شہر سے۔ اور باہر سے ہی گھر پھینک دیتا پھر دوڑا آتا اور ماں سے کہتا کہ اماں کسی کا کبوتر آگیا ہے۔ کیا اچھا ہے اسے ضرور پکڑوں گا۔ آخر پکڑ کر بند کرلیتا۔ اسی طرح کبوتروں کا سلسلہ جاری رہا اور بہت سارے کبوتر ہو گئے۔" ۳۷؎

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر کو کبوتروں کا شوق کس حد تک تھا۔ وہ کبوتر خرید کر لاتا اور گھر والوں پر ظاہر کرتا کہ باہر سے آیا ہے۔ اس زمانے میں بھی ناصر نے طرح طرح کے کبوتر حاصل کر رکھے تھے اور کبوتروں کے بارے میں اس کی معلومات غیر معمولی قسم کی تھیں۔ پاکستان بنتے ہی وہ کبوتر انبالہ کے رئیس کے سپرد کر آیا اور جب اس نے لاہور کرشن نگر میں اپنا مسکن بنایا تو پھر اسے کبوتروں نے یاد کیا اور ناصر نے کبوتروں کی اس یاد کو عملی شکل دے دی اور یوں کرشن نگر میں ناصر کے پاس بہت سے کبوتر جمع ہو گئے۔

احمد عقیل روبی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"اصلی اور خاندانی کبوتر کی تلاش میں ناصر مارے مارے پھرتے تھے۔ کسی نئے شہر مشاعرے پر جائیں اور انہیں پتہ چل جائے کہ یہاں نایاب کبوتروں کی منڈی ہے تو بھاگم بھاگ وہاں پہنچتے اور کچھ نہ کچھ خرید لیتے۔" ۳۸؎

افتخار کاظمی نے بھی عقیل روبی کے ان خیالات کی تائید کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ناصر جب کبھی بھی سرگودھے آتے تو ان کے دو ہی شوق ہوتے۔ ایک تو مشاعرے کے بعد سیدھے میرے گھر آ کر گپ لگانی اور ماضی کو یاد کرنا دوسرے کبوتروں کے بارے میں استفسار۔ انہیں جب کبھی بھی کسی اچھی نسل کے کبوتر کا پتہ چلتا وہ صبح ہوتے ہی اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔" ۳۹؎

ناصر کاظمی اپنے کبوتروں کا دھیان بچوں کی طرح کرتے تھے۔ ان کے کھانے پینے کے لئے ان کے بچے، بیگم اور بھائی عنصر بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ ناصر نے کبوتروں کی افادیت کے بارے میں کئی دوستوں سے گفتگو کی احمد عقیل روبی کا کہنا ہے کہ :

"شیر اور ہرن کے شکار کا شوق تو ان کے بچپن سے متعلق تھا۔ ہمارے سامنے نہ کبھی انہوں نے شیر مارا اور نہ ہرن مگر ایک شوق انہوں نے تا مرگ نبھایا اور وہ پرندوں سے محبت کا شوق تھا۔ کبوتروں سے ناصر کی دلچسپی انتہائی درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ صبح سویرے اٹھ کر انہیں دانہ پانی دکھانا' کابک سے نکال کر ہوا میں اڑانا۔ ہر کبوتر کے پروں کی دیکھ بھال۔ ناخنوں کی نگہداشت کرنا' دن نکلنے پر ان کا پہلا کام تھا۔ کہا کرتے تھے کہ "کبوتر باز کی نہ کبھی بینائی کمزور ہوتی ہے نہ پھیپھڑوں کا کوئی مرض لاحق ہوتا ہے۔ کبوتر اڑا کر اسے آسمان کی بلندیوں میں تلاش کرنا بینائی کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے اور جب کبوتروں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ میں کبوتر باز سانس کھینچتا ہے تو پھیپھڑوں کو ایک نئی زندگی ملتی ہے۔"[۴]

ناصر کاظمی کو اپنے کبوتروں سے جس قدر پیار تھا وہ اپنی جگہ۔ اسے ان کبوتروں سے عقیدت بھی تھی وہ کہا کرتے تھے یہ غازی کبوتر ہیں جنہوں نے امام مظلوم کی شہادت کی خبر ان کے لہو سے اپنے پروں کو تر کرکے دور دور تک پہنچائی تھی۔ انبالہ میں جب شبیہہ ذوالجناح برآمد ہوا کرتی تھی تو سینکڑوں کبوتروں کو ان کے پر سرخ کرکے شبیہہ ذوالجناح کی آمد کے ساتھ فضا میں چھوڑا جاتا تھا۔ اس وقت فضا میں راکھ اڑائی جاتی تھی اور تمام ماحول واویلا واویلا صدر واویلا اور یا حسین یا حسین کی صداؤں سے گونج اٹھتا تھا۔ انبالہ میں دسویں محرم کو یہ منظر انتہائی رقت آمیز اور انفرادیت کا حامل ہوتا تھا۔ آج کل سادات انبالہ گوجرانوالہ میں امام بارگاہ گلستان معرفت گوبند گڑھ سے دسویں محرم کو شبیہہ ذوالجناح کی برآمدگی کے وقت سینکڑوں کبوتر فضا میں چھوڑتے ہیں تو انبالہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے دسویں محرم کو ملک بھر کے سادات انبالہ گوجرانوالہ ضرور آتے ہیں۔ سو ناصر کو کبوتروں سے اس لئے بھی عقیدت تھی۔

"ناصر کاظمی نے کہا۔ جب محرم کا چاند دکھائی دیتا ہے تو میرا شیرازی کبوتر رو رو کر مجھے کربلا کے واقعات سناتا ہے۔ اس کا شجرہ نسب کبوتروں کے اس خاندان سے جا ملتا ہے جو خاندان کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے

ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کا چشم دید گواہ تھا۔

پھر چند لمحوں کے لئے چپ ہو گئے اور کہنے لگے۔

تاریخ صرف انسان نے کاغذوں پر محفوظ نہیں کی۔ پرندوں اور جانوروں کے سینوں میں بھی رقم ہے۔ صرف پڑھنے والی آنکھ چاہئے۔" ۱۰۔۳

سو ناصر کاظمی کو کبوتروں سے عقیدت کی ایک وجہ یہ بھی تھی وہ کبوتروں کو آسمانوں کے سفیر کہا کرتے تھے۔ ناصر نے پرندوں سے تمام زندگی بے حد محبت کی۔ کبوتر ان کی کمزوری تھے۔ ناصر کاظمی کی کبوتروں سے محبت کا یہ عالم ہے کہ ان کی ایک غیر مطبوعہ ڈائری میں ایک گوشہ کبوتروں کی اقسام ان کی خوراک اور ان کے علاج کے حوالے سے ہے۔ اب تک ناصر کاظمی کی شخصیت کے جو حوالے ملتے ہیں ان کی پہلی ڈائری کے حوالے سے زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کبھی کبھار ادھر ادھر بھی لکھ لیا کرتے تھے۔ انبالہ سے انہوں نے ڈائری لکھنی شروع کی پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا آخر انہوں نے قیام پاکستان کے بعد یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو اپنی یادداشتوں کو ایک بڑے رجسٹر میں ڈائری کی طرز پر اکٹھا کیا۔ یہ رجسٹر جو بہت ضخیم ہے ابھی تک اس کی کوئی تحریر منظر عام پر نہیں آئی۔ یہ رجسٹر ناصر کاظمی کے فرزندوں باصر سلطان کاظمی اور حسن سلطان کاظمی کی پاس موجود ہے۔ اس ڈائری پر ہم الگ سے روشنی ڈالیں گے۔ آیئے اب اس غیر مطبوعہ ڈائری سے کبوتروں کے بارے میں معلومات کو دیکھتے ہیں۔

چند پریشاں کاغذ، ناصر کی غیر مطبوعہ ڈائری اور کبوتر ::

یہ ڈائری یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو شروع ہوتی ہے پھر ایک ایک دن کے حوالے سے اس میں اہم واقعات لکھے گئے ہیں۔ سب سے آخر میں ایک گوشہ کبوتروں سے متعلق ہے۔ ناصر کاظمی کبوتروں کے بارے میں جو کچھ معلومات رکھتے تھے ان ابواب میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جب یہ ڈائری شائع ہو گی تو کبوتر بازوں کے لئے یہ ابواب خاص اہمیت کے حامل ہوں گے۔ اس لئے کہ اس میں نہ صرف کبوتروں کی مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں بلکہ کبوتروں کی اونچی اڑانوں کے لئے اساتذہ

کے نسخے بھی درج ہیں۔ اس ڈائری کو ناصر نے چند پریشاں کاغذ کا نام دیا ہے۔ اس گوشہ میں کبوتروں کی اونچی اڑانوں کے لئے جو نسخے دیئے گئے ہیں ان میں سے ایک نسخہ ملاحظہ کیجئے۔

"گردان ٹکڑی کے کبوتروں کا نسخہ (دوڑانے کے لئے)

رنگین نیلے کالے ہر اقسام کے لئے ::

نسخہ۔ ۴۲ استاد شریف بذریعہ ڈاکٹر عبدالشکور ڈیرہ غازی خان۔ اکتوبر کے آخر تک کبوتر قدرتی طور پر جھاڑ لیتے ہیں اور اڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ڈربوں میں نر الگ بند کریں اور مادہ الگ۔ لیکن یہ ضروری بھی نہیں۔ یکم نومبر کو خوراک دینے سے پہلے کبوتروں کو جلاب دے کر صاف کریں یہ نسخہ صرف دو روز مسلسل دیں۔

۱۔ گلاب کے پھول

۲۔ گولہ۔ کوزہ مصری ایک تولہ۔ آٹھ سیر دودھ گاؤ آدھ سیر پانی تازہ۔

دس عدد چھوٹی الائچی کے دانے، چھلکا انار کو دودھ میں جوش دے لیں پھر گلاب کے پھول۔ کوزہ مصری کوٹ کر ملا لیں۔ اور پانی بھی ملا لیں شام کو دانہ دینے کے بعد یہ پانی مسلسل دو روز تک پلائیں۔

تین نومبر ::

چھ ماشہ چھوٹی الائچی کے خالی چھلکے اچھی طرح رگڑ کر پانی میں جوش دیں پھر پانی ٹھنڈا کر کے کبوتروں کو نہلا دیں۔

دوپہر کے وقت جب کبوتروں کے پر خشک ہو جائیں تو اس کے بعد پراٹھا کھلائیں جس کا نسخہ درج ذیل ہے۔

یہ پراٹھا پندرہ نومبر تک چار روز کے بعد کھلاتے رہیں۔
پراٹھے کا نسخہ الگ ہے۔

-------- مختلف نسخے جو ڈائری میں موجود ہیں۔ ۴۳

۱: جاڑے میں خوراک گولیوں کے ذریعے۔ پچاس کبوتروں کو دوڑانے کے لئے۔

۲: برسات کے سوا ہر موسم کے لئے -------- پانی کا نسخہ کبوتروں کو تیز رفتار بنانے کے لئے۔

۳: خالص سردی یا بارش کے موسم میں

۴: کبوتروں کی مستی مارنے کا نسخہ

۵: گرمی کا نسخہ

۶: مختلف کبوتروں کی تعداد کے حوالے سے مختلف نسخے۔

۷: پچیس' چالیس' پچپن۔ ساٹھ کی ٹکڑیوں کو اڑانے کے لئے موسم کے اعتبار سے بابو نصر الدین کے نسخے۔

سو اس ڈائری میں جہاں ناصر نے اپنے معمولات کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے وہاں ایک گوشہ کبوتروں کے لئے بھی مختص کیا ہوا ہے۔

ناصر کی بچپن کی شرارتیں اور میٹرک کا امتحان ::

ناصر کاظمی بچپن میں بے حد شریر تھے کہتے ہیں کہ ذہین بچہ شریر ہوتا ہے۔ وہ مڈل کے امتحان میں بھی ضلع بھر میں اول آئے اور انبالہ مسلم ہائی سکول میں بھی وہ نمایاں کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔ پڑھائی کے دوران کبوتروں سے بھی محبت جاری رکھی۔ کرموں پہلوان کے ڈیرے پر سارنگی اور ستار بھی سیکھتے رہے۔ ظہور الحسن کے یہاں سوز خوانی بھی کرتے رہے۔ ایام عزا میں عزاداری میں بھی حصہ لیتے رہے۔ گھوڑا میسر آنے پر گھوڑے کی پیٹھ پر بھی بیٹھے۔ کبھی کبھار کسی کے ساتھ شکار پر بھی روانہ

ہو گئے اور پھر ان تمام مشاغل کے ساتھ ساتھ اپنا رومانس بھی جاری رکھا۔ سکول جانا اور سکول سے بھاگ جانا ناصر کاظمی کا معمول رہا۔ عموماً وہ اپنے دوست افتخار کے ساتھ یا محمد علی کے ساتھ اسکول سے بھاگتے اور اسکول کے پیچھے میر حامد حسین کاظمی کے باغوں میں جا کر امرود اور بیر توڑتے۔ انبالہ آموں کے باغات کی بنا پر بھی بہت مشہور تھا۔ کئی بزرگوں کا کہنا ہے کہ انبالہ کا نام اصل امباوالا تھا۔ انبالہ کی زبان میں آم کو امبہ کہتے ہیں۔ اور امبہ سے انبالہ ہو گیا۔ سو ناصر کبھی کبھار آموں کے باغوں کا بھی رخ کرتے۔ پرندوں سے ہم کلام ہونا ان کی چہچہاہٹوں کو سننا' کبوتر اور طوطے پکڑنا ناصر کی طبیعت کا خاصا تھا۔

> "سکول سے بھاگ کر میں محمد علی۔ افتخار بیروں' اناروں' آموں اور امرودوں کے باغ اجاڑتے۔ ایک مرتبہ ہم نے امرودوں کے باغ میں آگ لگا دی اور اس دن کے بعد باغ کا مالی کبھی نہ سویا۔ بیڑے والے بیر اور پنج پیروں کے مزار پر بیٹھ کر ہم بیر اور آم کھاتے تھے۔" ۴۴

ناصر کاظمی کی شرارتوں میں بھی ذہانت کا عمل دخل ہوتا تھا۔ مگر بعض شرارتیں عام بچوں جیسی ہوتیں مثلاً وہ اپنے مضمون میں کیوں لکھتا ہوں' میں کہتے ہیں' "کھلونے توڑنے پر میں نے بھی کئی بار مار کھائی۔ ابا جی کی جیبی گھڑی جب بھی ہاتھ لگتی اسے الٹی سیدھی چابی دے کر وقت کی گردش کو وہیں روک دیتا۔ وقت کا اس سرعت سے گزرنا شاق گزرتا۔ جی چاہتا کہ میں بھی ساتھ چلوں' ہر لمحہ گزرتا اور کان میں کہتا' میں جا رہا ہوں' گھڑی بند کر کے میں خوش ہوتا کہ اب کہاں جائے گا یہ لمحہ۔ سکول میں ماسٹر کی آنکھ بچا کر کھلونے میں چراتا اور نام کسی کا لیا جاتا۔ کھلونے میرے پاس ہوتے اور مار بھی اور کو پڑتی۔" ۴۵

ناصر کے رت جگے :

ناصر کو بچپن ہی سے جاگنے کی عادت تھی۔ راتوں کو جاگنا ان کی زندگی کا معمول رہا۔ راتوں کے حوالے سے ناصر کاظمی نے بہت سے اشعار کہے۔ برگ نے کے

یہ اشعار دیکھئے۔

کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کی ویرانے

بستی والوں سے چھپ کر
رو لیتے ہیں پچھلے پہر

پھر جاڑے کی رت آئی
چھوٹے دن اور لمبی رات

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

کوئی جب مل کے ہوا تھا رخصت
دل بے تاب وہی رات آئی
سایہ زلف بتاں میں ناصر
ایک سے ایک نئی رات آئی

۴۶ـ

ناصر کاظمی نے ان رت جگوں کے بارے میں انتظار حسین سے مکالمہ کے دوران کہا تھا۔

"اصل میں رات میری شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ رات' اندھیری رات نہیں یا وہ جسے ہمارے جدید شاعر ایک تاریکی کا استعارہ کہتے ہیں۔ رات تخلیق کی علامت ہے۔ دنیا کی ہر چیز رات میں تخلیق ہوتی ہے۔ پھولوں میں رس پڑتا ہے' سمندروں میں تموج ہوتا ہے رات کو۔ رات کو خوشبوئیں جنم لیتی ہیں حتیٰ کہ فجر تک فرشتے رات کو اترتے ہیں

سب سے بڑی وحی بھی رات کو نازل ہوئی ایک یہ بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم نے جو ان راتوں کا ذکر کیا تو اب بھی راتیں جاگتی ہیں لیکن شہر سوتا ہے اور میں اب تک بیمار ہوں۔ تھا جن کو درد عشق کا آزار مر گئے۔ الحمدللہ میں زندہ ہوں اور بیمار ہوں مرا نہیں اس لئے تمہیں لگتا ہے کہ میں نے راتوں کو پھرنا چھوڑ دیا راتوں کو میں جاگتا ضرور ہوں اکثر ہمارے ساتھ بیمار مر گئے۔" ۴۷ے

سو ناصر کاظمی کی زندگی میں راتیں بہت اہم ہیں جس کا اظہار انہوں نے اپنے تمام مجموعوں کے علاوہ نثر میں بھی کیا ہے۔ عقیل روبی ناصر کی راتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ناصر کاظمی کا دن تو رات ۱۲ بجے طلوع ہوتا ہے۔ آخر ہم نے پڑھنا ہے امتحان پاس کرنا ہے ناصر کاظمی کے ساتھ چل پڑے تو یہ سب کچھ ناممکن ہے۔" ۴۸ے

آگے چل کر عقیل روبی کہتے ہیں۔

"رات ہوتے ہی ناصر کاظمی گم سم ہو جاتے اور ایسے حالات میں تنہائی کے علاوہ انہیں کوئی ہم سفر نہیں بھاتا تھا۔" ۴۹ے

رت جگے ناصر کی زندگی کا اہم جزو تھے۔ راتوں کا جاگنا ان کا دستور ہو گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی ناصر کی زندگی رت جگوں ہی میں گزری۔ ان کی اس عادت سے ان کے اکثر دوست پیچھا چھڑانے کی کوشش بھی کرتے مگر ناصر کی یہ عادت مرتے دم تک وہی رہی۔ ہاں اگر کچھ فرق آیا تو شادی کے بعد ابتدائی دنوں میں جب انہوں نے ایک دو بجے گھر پہنچنا شروع کر دیا تھا۔ مگر پھر وہی روٹین' انتظار حسین نے ناصر کے رت جگوں کے بارے لکھا ہے۔

"رت جگے سے بچنے کی میں نے ایسی کوشش کی جیسے سادہ دل لوگ شرابی کی صحبت میں بیٹھ کر شراب سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خیر رتجگے کی لذت آشنا ہو جانے کے بعد بھی مجھے اس پر اصرار رہا کہ آدمی کو شب کی کسی نہ کسی منزل میں گھر کا رخ ضرور کرنا چاہئے۔ ناصر کا موقف یہ تھا کہ رات

ایسی شے نہیں کہ اسے چھت کے نیچے ضائع کیا جائے اور ناصر نے ان دنوں واقعی کوئی رات چھت کے نیچے ضائع نہیں کی۔ یہ تو شادی کے بعد ہوا کہ رات کے پچھلے پہر وہ گھر جانے لگا گھر کیسے جاتا تھا یہ ابھی مت پوچھیے۔"۔

۵۰

ناصر کو بچپن سے رات گئے جاگنے کی عادت تھی جیسا کہ ان کی خالہ صغرا بی بی نے کہا ہے کہ وہ راتوں کو جاگ کر نصاب تعلیم پڑھتا تھا اور پھر ایسا وقت آیا کہ نصاب تعلیم کی جگہ نصاب عشق نے لے لی اور راتوں کو جاگنا اور تارے گننا اور صبح کو چڑیوں کی آوازیں سننا اس کی زندگی کا معمول بن گیا۔ شادی کے بعد ان کی زندگی میں اتنا فرق آیا کہ پوری رات باہر گزارنے کی بجائے وہ رات کے دوسرے پہر گھر لوٹ جاتے تھے۔ اس بارے میں ان کی بیگم شفیقہ بیگم کا کہنا ہے۔

"راتوں کو دیر سے آنا ان کا معمول تھا مگر ہم اس کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ رات دیر سے گھر لوٹتے ہم دروازہ کھول دیتے۔"۔۵۱

شادی کے بعد ناصر نے دوسرے پہر گھر لوٹنا شروع کر دیا۔ مگر گھر پر بھی پھر مزید جاگنے کی ان کی عادت قائم رہی۔ انتظار حسین ناصر کے لاہور میں ابتدائی دنوں کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ انہوں نے کئی راتیں ناصر کے ساتھ جاگ جاگ کر گزاری ہیں مگر ان راتوں کو ناصر کاظمی نے ہمیشہ اپنی گفتگو سے روشن کیے رکھا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ناصر جس کمرے میں رہتا تھا وہ ایک معمولی سا کمرہ تھا۔ جہاں دن میں بھی بقول انتظار حسین رات کا گماں ہوتا تھا اور پھر انتظار کا یہ کہنا کہ وہ اپنے والد کو تو میر تقی نہ بنا سکا البتہ اپنی والدہ کے ادبی ذوق کا ذکر بہت جوش و خروش سے کیا کرتا تھا۔ اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ناصر کی طبیعت میں مبالغہ شامل تھا اور پھر ناصر نے خود کو تمام عمر جو رئیس زادہ ظاہر کیا اسکی بھی یہاں سے نفی ہوتی ہے۔ اگر وہ واقعی رئیس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے تو رئیس ہونے کے ناتے سے ان کے خاندان کے لاہور کے کسی نہ کسی رئیس گھرانے سے تعلقات ضرور ہوتے۔ جو ابتدا کے ان دنوں میں انہیں کہیں نہ کہیں اچھی جگہ پر ٹھہراتے اور پھر ناصر کاظمی قیام پاکستان سے پہلے ہی لاہور آ چکے تھے۔ سو جہاں تک راتوں کو جاگنے کا تعلق ہے انتظار

حسین نے ناصر کاظمی کے اس پہلو کو بڑے بھرپور انداز میں صحیح بیان کیا ہے اور جہاں تک ناصر کے رئیس زادہ ہونے کا تعلق ہے انتظار حسین بھی اس پر یقین نہیں کرتے تھے اور اس اقتباس میں بھی اس کے اشارے ملتے ہیں۔ لیکن اس سے ایک بات طے ہے کہ ناصر کا راتوں کو جاگنا ایک تخلیقی عمل تھا۔' انہوں نے ان رت جگوں میں وہ کچھ تخلیق کیا جو ان کی زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ ہے اور اس اثاثے میں وہ لفظ ستارے شامل ہیں جنھوں نے ناصر کی نثر اور شاعری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جگمگا دیا ہے۔

ناصر کاظمی 'بم' سائنس تجربے اور تحریک پاکستان ::

ناصر کاظمی نے میٹرک میں تعلیم کے دوران اپنے دوست افتخار کے ساتھ مل کر بم بنایا تھا اور پھر اس بم کا تجربہ بھی ڈپٹی کمشنر ہاؤس کے قریب چلا کر کیا تھا۔ اس واقعہ کو ناصر عموماً اپنے دوستوں کو سنایا کرتے تھے۔ انکے دوست افتخار کاظمی نے بھی اس کی متعدد بار تصدیق کی ہے۔ جبکہ صغرا بی بی نے بھی اپنے مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اصل میں ناصر کاظمی کو نت نئے کام کرنے اور مشغلہ اختیار کرنے کا شوق تھا۔ انہیں مشغلوں میں کبھی وہ سارنگی کی طرف مائل ہوتے کبھی ستار کی طرف۔ کبھی مصوری کا شوق جی کو چراتا تو کبھی شکار اور گھڑ سواری کا۔ کبھی طرح طرح کے کبوتروں کی تلاش میں نکلتے تو کبھی پرندوں سے ہم کلام ہوتے۔ کبھی پھولوں کی مہکاروں کو محسوس کرتے تو کبھی سانسوں کی خوشبوؤں کو دل میں بسا لیتے۔ ان مشاغل کے ساتھ ساتھ وہ بلا کے ذہین تھے اور ان کی اس ذہانت کا نتیجہ ہمیشہ ان کے سالانہ امتحان کے نتیجہ کے ساتھ بشارت کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ افتخار کاظمی کے بقول ناصر کاظمی آٹھویں جماعت تک سائنس کے طالب علم تھے مگر میٹرک میں انہوں نے اردو لے لی تھی۔ ناصر کو نت نئے تجربے کرنے کا شوق بچپن سے تھا۔ صغرا بی بی لکھتی ہیں۔

"اس کو تجربے کرنا' سائنس کے ذریعے بجلی بنانا' ہوائی جہاز بنانا وغیرہ کا شوق تھا۔ ایک دفعہ دو بوتلیں لے کر ان کے منہ توڑ ڈالے ایک بوتل میں تیزاب اور دوسری میں خدا جانے مٹی کا تیل تھا یا پٹرول تانبے کی تار ایک

لکڑی کی گلی پر لپیٹیں اور دوسری گلی پر لوہے کی تار دونوں کے سرے پر دیوار میں کوئی چیز گاڑ کر ایک چھوٹا سا بلب لگایا اس سے بجلی جل گئی خاصی دو تین گھنٹے تک روشن ہوتی رہی۔" ۵۲؎

آتش بازی بنانا' تہواروں میں حصہ ::

تو دوسروں کو اپنی تخلیقات سے حیران کرنا ناصر کے بچپن کا ہنر تھا۔ ایک بچے میں اتنی بہت سی غیر معمولی صفات کا جمع ہونا مستقبل میں اس کے تخلیقی روشن مستقبل کی واضح دلیل تھا۔ ناصر کو بچپن میں آتش بازی بنانے کا بھی شوق تھا۔ وہ اپنے دوست افتخار کے ساتھ مل کر گندھک پوٹاس اور پھر خاص لکڑی کے کوئلے اکٹھے کرتے انہیں پیس کر اناروں میں بھرتے' جہاز بناتے۔ پٹاخے چھوڑتے اور پھر سب لوگ ان کی آتش بازی کا مظاہرہ دیکھ کر حیران ہوتے۔ ناصر کاظمی اپنے مضمون "میں کیوں لکھتا ہوں۔" میں کہتے ہیں۔

"ہر بدلتے موسم کے ساتھ نئی نئی روشنیاں ابھرتیں' نئے نئے کھیل سوجھتے ہر تہوار اور ہر میلے اور رسموں میں دل ڈوب ڈوب جاتا۔ ہولی آتی تو رنگ اچھالتے۔ دیوالی آتی تو دیوے جلاتے اور دیواروں پر روشن کرتے' دوسہرہ آتا تو راون بناتے اور جلاتے۔ عید شب برات غرض ہر سے کا ساتھ دینا ایک فرض مقدس تھا۔ شب برات آتی تو آتش بازیاں چھوٹتیں میں اپنے گھر میں خود انار بناتا۔ پوٹاس کی گولیاں بھرتا' شب برات سے دنوں پہلے روئی کے کھیت سے باری کی چھڑیاں توڑ لاتا اس کے کوئلے بناتا گندھک شورہ بازار سے لے آتا المونیم لوہا تانبے اور پیتل کو ریتی سے گھس گھس کر لوہ چون بناتا۔ پھر وہ انار بنتے کہ دنیا دیکھتی اور ہم گاتے۔

گندھک زور کرے

شورا شور کرے

کولہ لے اڑے ۵۳؎

اس اقتباس سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ناصر کاظمی ہندو مسلم کلچر کے تہواروں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انبالہ میں پکھی کا میلہ بہت شہرت رکھتا ہے وہاں بھی باقاعدگی سے شریک ہوتے۔ دوسہرے، دیوالی اور بسنت کے ہندو تہواروں کو بھی مناتے۔ دیوالی کے حوالے سے صغرا بی بی نے لکھا ہے۔

"دیوالی کے دنوں میں کسی مندر میں جا گھستے۔ وہاں پہلے رام رام کرتے اندر چلے جاتے حلوا پرشاد وغیرہ لیتے پھر آتے ہوئے تمام تیل کے دیئے توڑ پھوڑ کر بھاگ جاتے۔" ۵۴؎

گویا ناصر کے بچپن کی شرارتیں تھیں مگر وہ تہذیبی طور پر ان تمام تہواروں کی رسموں میں حصہ بھی لیتے۔ آتش بازی خود بنانے کے بارے میں ناصر نے خود بھی بتایا ہے صغرا بی بی نے بھی تصدیق کی اور اب اس بارے میں افتخار کاظمی کے تاثرات ملاحظہ کیجئے۔

"ہمیں نت نئی چیزیں بنانے کا بہت شوق تھا۔ آتش بازی کا سامان جہاز وغیرہ بلکہ ایک دفعہ تو ہم نے بم تک بنا لیا اور اس کا کامیاب تجربہ بھی کیا۔ تقسیم ہند کے وقت بھی دو زہریلے بم اپنی حفاظت کی غرض سے بنا لئے تھے۔ ایک بم ناصر کے پاس تھا۔ ایک میرے پاس تاکہ بلوا ہو تو ہم اسے استعمال کر سکیں۔" ۵۵؎

بم کا واقعہ اور تحریک پاکستان ::

افتخار کاظمی کے انٹرویو کا یہ اقتباس بہت اہم ہے ایک تو اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ناصر کو نت نئے سائنسی تجربے کرنے کا شوق تھا اور اس سبب اس نے آتش بازی کا سامان بھی خود بنایا۔ دوسرے اس نے بم کا کامیاب تجربہ بھی کیا اور پھر اس تجربے کے بعد دو اور زہریلے بم بنائے جن میں سے ایک ناصر کے پاس تھا اور دوسرا افتخار کے پاس۔ ہمیں اب تک تو صرف ڈپٹی کمشنر ہاؤس کے نزدیک بم چلنے کے واقع کے شواہد ملتے ہیں مگر افتخار کاظمی کے اس اظہار نے بم بنانے کے تاریخی واقعہ کا

رخ تحریک پاکستان کی جانب موڑ دیا ہے۔ آیئے پہلے تو بم بنانے والے واقعہ کا جائزہ لیتے ہیں اس بارے میں صغرا کا کہنا ہے۔

"ان ہی دنوں انھیں ایک شرارت سوجھی۔ امتحان نزدیک تھے کہ انہوں نے دو بم بنائے ایک دوست کی فرمائش پر۔ اور ایک کو کمشنر کی کوٹھی کے پاس گرایا۔ یہ شک ہوا کہ وہ پھٹا نہیں دوسرا بم سکول کے پاس قبرستان میں پھینکا گیا جو بہت دھماکہ سے پھٹا۔ سارا علاقہ کانپ گیا اس وقت ڈپٹی کمشنر نے شہر میں اشتہار لگوا دیئے کہ یہ معلوم کرو کہ یہ بم کس نے بنائے جو کوئی اس کا پتہ لگائے گا اس کو پکڑوائے گا دو ہزار روپے انعام پائے گا مگر کسی کو خبر نہ تھی کہ چھپے رستم محلے ہی میں ہیں۔ اس وقت ہم لوگوں کی جان کے لالے پڑ گئے۔ جس کپڑے میں وہ لپیٹے ہوئے تھے وہ اور ان کے بچے ہوئے ٹکڑے زمین میں دبائے۔ آتشیں مادے۔ سوئیاں وغیرہ چھپا دیں خدا کا شکر ہے کہ بات ٹل گئی۔" ص۵۶

بم بنانے کا ذکر ناصر اکثر اپنے دوستوں سے بھی کیا کرتے تھے۔ اس بارے میں ناہید قاسمی نے اپنے مقالے "ناصر کاظمی۔ شخصیت اور فن" میں بھی صغرا بی بی کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے جب کہ ناصر کاظمی کی ڈائری میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ ناصر کاظمی کے بچپن کے دوست افتخار کاظمی نے اس کی ایک نئے رخ سے وضاحت کی ہے۔ صغرا بی بی نے لکھا کہ انہوں نے شرارت میں بم بنائے تھے۔ جہاں تک دوسرے مشاغل کا تعلق ہے ان میں تو شرارت کا پہلو ہو سکتا ہے مگر اس میں نہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تحریک پاکستان عروج پر تھی۔ سرسید احمد خان نے دو قومی نظریہ پیش کر کے برصغیر کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیداری کا پیغام دے دیا تھا۔ انبالہ میں بھی اس پیغام کا خاطر خواہ اثر ہوا قاضی واڑہ میں انبالہ سادات کے نوجوانوں نے امامیہ ریڈنگ روم قائم کیا جس میں روزانہ اخبارات منگوائے جاتے اور تحریک کے حوالے سے خبریں بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتیں۔ برصغیر پاک و ہند میں علامہ اقبال کے انقلابی اشعار کی گونجیں دور دور تک پھیل چکی تھیں۔ قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں برصغیر کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہندو

سامراج نے مسلمانوں کے استحصال کے لئے انگریزوں کے ساتھ مل کر کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ سکھ قوم بھی ہندوؤں کی آلہ کار بن چکی تھی۔ انبالہ میں محمد حنیف وکیل۔ میر حامد علی شاہ اور نوجوانوں میں میر کاظم علی شاہ نے مسلم لیگ میں شامل ہو کر آزادی کے لئے جدوجہد شروع کر دی تھی۔ مسلمانوں میں بدلتے ہوئے سیاسی موسم کے سبب عدم تحفظ کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ ناصر کاظمی نے میٹرک پاس کرنے کے بعد قیام پاکستان سے پہلے ہی لاہور میں اسلامیہ کالج میں ایف اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ جب قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے انبالہ گئے تو انہوں نے اپنے والدین کو انبالہ کی جائیداد بیچ کر لاہور میں سکونت اختیار کرنے کی خاطر راغب کیا مگر وہ نہ مانے اور کہا کہ ہم وہ دھرتی کبھی نہیں چھوڑیں گے جہاں ہمارے باپ دادا کی ہڈیاں دفن ہیں۔ صغرا بی لکھتی ہیں۔

"ابھی بی۔ اے کی ڈگری نہیں لی تھی کہ پاکستان بن گیا۔ ناصر گرمیوں کی چھٹیوں میں جب لاہور سے انبالہ گیا تو اپنے ابا کو کہنا شروع کر دیا کہ مکان فروخت کر دیجئے اور لاہور میں کوٹھی بنوا لیجئے یا کوئی بنی بنائی خرید لیجئے۔ اس لئے کہ بہت سے ہندو سکھ اپنے مکانات فروخت کرکے جا رہے تھے۔ خدا جانے کیسا وقت آ جائے اور ہمیں لاہور جانا پڑے۔ ناصر کے والد یہ سن کر بہت خفا ہوئے کہ ہم یہیں رہیں گے اپنے باپ دادا کی قبریں نہیں چھوڑ سکتے۔ ناصر کہتا ابا یہاں سے ایسے نکلیں گے کہ آپ اپنا حقہ بھی نہ اٹھا سکیں گے۔ آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ سوائے ایک دو بستر اور صندوق کے کچھ نہ لا سکے۔ جس تکیہ کے غلاف میں نقدی نوٹ تھے وہ راستے ہی میں کہیں گم ہو گیا۔" ۵۷

اس اقتباس سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ناصر کاظمی نے آنے والے حالات کو پہلے ہی سے بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ قیام پاکستان سے پہلے جب ناصر ایف اے کرنے کے بعد انبالہ لوٹتے ہیں تو اپنے والدین کو لاہور چلنے کا مشورہ دیتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے لاہور ہی میں یہ اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں سے ہندو سکھ اپنی جائیدادیں بیچ بیچ کر یعنی مشرقی پنجاب یوپی کی جانب جا رہے تھے۔ ناصر نے خطرہ کی گھنٹی کو پہلے ہی

محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے اپنے والد سے یہاں تک کہہ دیا کہ ایسی حالت ہو گی کہ "آپ اپنا حقہ بھی نہ اٹھا سکیں گے"۔

ناصر کاظمی نے تحریک پاکستان میں گو اس طرح سے بھرپور حصہ نہیں لیا جیسا کہ دوسرے نوجوان باقاعدہ تنظیموں میں شامل ہو کر لے رہے تھے مگر ان کے دل میں انگریز اور ہندو سامراج کے خلاف ایک نفرت تھی جس کا اظہار کبھی دیوالی کے دیئے توڑ کر تو کبھی بم کا دھماکہ کرتے ہوئے کرتے۔ ناصر کاظمی کو معلوم تھا کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔ انہوں نے لاہور میں اس تحریک کو منزل سے ہمکنار ہوتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ علامہ اقبال کی نظموں کی گونج ان کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ ناہید قاسمی اپنی کتاب "ناصر کاظمی شخصیت اور فن" میں لکھتی ہیں کہ۔

"۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کا عہد رومانیت 'بغاوت' انقلابی جدوجہد' سیاسی و معاشی وثقافتی' معاشرتی آزادیوں کی طلب کا عہد تھا۔ سبھی کے خیالات میں ہلچل مچی ہوئی تھی چاہے ترقی پسند تھے یا غیر ترقی پسند تھے۔" ۵۸؎

آگے چل کر وہ لکھتی ہیں۔

"۱۹۴۷ء سے قبل اردو شاعری میں تین نعرے واضح طور پر سنائی دے رہے تھے۔ ایک تو نعرہ عشق جو معاشرے کے خلاف تھا۔ یہ فرد کے جذباتی رویوں کی آزادی کا نعرہ تھا۔ دوسرا نعرہ انقلاب جو سیاسی استبداد اور غلامی کے خلاف اور آزادی کے حق میں بلند کیا گیا اور تیسرا نعرہ بغاوت کا تھا جو سبھی کا تھا۔ ہر ایک باغی ہو رہا تھا اور نئے راستوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔" ۵۹؎

اس اقتباس سے باشعور طبقے کے ذہنوں میں برپا ہونے والے انقلاب کی عکاسی ہوتی ہے۔ سو ناصر کاظمی پر بھی ان حالات کے اثرات کا مرتب ہونا ایک فطری عمل تھا۔ وہ بھی ان باغیوں میں سے تھے جو غلامی کی زنجیروں کو توڑنا چاہتے تھے اور ظلم و استبداد کی طاقتوں کو ناکوں چنے چبوانے کے آرزو مند تھے۔ مسلمانوں کی غربت اور ظلم و ستم سے بھرپور معاشرے کی تصویریں ان کی آنکھوں میں تھیں۔ انہیں حضرت قائداعظم محمد علی جناح سے جو عقیدت تھی اسے انہوں نے انتظار حسین سے آخری

مکالمے میں بیان کرتے ہوتے کہا ہے کہ پھر ایک عجیب بات ہے کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

"میں ان ننھے حقیر لوگوں میں سے ہوں جس نے قائداعظم محمد علی جناح سے ایک مرتبہ ہاتھ ملایا تو اب پاکستان میں آ کر میں نے دیکھا کہ یہ ایک دارالامان مجھے مل گیا ہے"۔۔۔۶۰

ناصر کاظمی کو مفکر پاکستان علامہ اقبال سے بھی بہت عقیدت تھی ان دنوں اقبال کی انقلابی نظموں کا بہت چرچا تھا۔ ناصر نے اقبال اور خود میں ایک قدر مشترک تلاش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اقبال کو جب دونی ملتی تو آڑیوں سے کنی کاٹتا اور دونی کا کبوتر خرید کر جیب میں بھر لیتا۔ اقبال کی شاعری میں کبوتر نے بہت ساتھ دیا ہے بلکہ شاہین کو بھی اپنی بلندی سے زمین پر اتار دیا ہے یہیں سے اقبال کی شاعری میں ایک نیا فلسفہ جنم لیتا ہے۔۶۱

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ناصر کو اقبال کی شخصیت اور شاعری دونوں سے عقیدت تھی۔ اس عقیدت میں گو اور بہت سے بھی عوامل شامل تھے مگر انہوں نے یہاں اقبال کی جدوجہد کو شاہین کے پلٹ کر جھپٹنے کی بجائے کبوتر کی امن پسندی قرار دیا ہے۔ یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ ناصر نے عقیدت کے حوالے سے ان دونوں عظیم رہنماؤں کے بارے میں مختلف مقامات پر اظہار خیال کیا ہے۔ خوشبو کی ہجرت میں اقبال پر مکالمے کی صورت میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اب اس تمام پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہیں جب ہم ناصر کاظمی اور ان کے دوست افتخار کاظمی کے بم بنانے کے عمل کو لیتے ہیں تو بقول صغرا بی بی: یہ شرارت نہیں بلکہ ایک ایسی بہادرانہ شعوری کوشش ہے جس سے عدم تحفظ کا احساس ختم ہوتا ہے۔ یہ عدم تحفظ کا احساس صرف ناصر کاظمی اور افتخار کاظمی کو ذاتی طور پر نہیں تھا بلکہ انہوں نے آنے والے وحشی دور کو اپنے تصور کے آئینے میں پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اس لئے انہوں اپنے والد سے تقسیم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ہجرت کر کے لاہور چلے چلیں وہ دور آئے گا کہ حقہ اٹھانے کا موقع بھی نہیں ملے گا گو تقسیم کے وقت انبالہ شہر

کا کوئی مسلمان اس آفت اور بربریت سے نہیں گزرا مگر جب آزادی کا اعلان ہوا تو روپڑ سے چلنے والی ٹرین پر سوار تمام مسلمانوں کو سکھوں نے قتل کر دیا اس کی خبر جب انبالہ پہنچی تو ہجرت کرنے والے تمام مسلمان سہم کر رہ گئے۔ اس لئے جس کے جو ہاتھ لگا اس نے اٹھا لیا اور پاکستان کی جانب چل دیا۔ سو افتخار کاظمی کا یہ کہنا کہ ہم نے پھر دو زہریلے بم بنائے تھے جن میں سے ایک ناصر اور دوسرا میرے پاس تھا صحیح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اس واقعہ کے بہت سے انبالہ کے بزرگ شاہد ہیں کہ انہوں نے واقعی بم بنایا تھا اور اس کا دھماکہ قبرستان کے قریب کیا تھا۔ جب کہ دوسرا بم کمشنر کے آفس کے باہر پھینکا تھا جو پھٹا نہیں اب اگر شرارت ہوتی تو پھر قبرستان ہی کافی تھا لیکن یہ جو کمشنر کے آفس کے باہر پھینکا گیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شعوری کوشش تھی جس کے پس منظر میں آزادی کا جذبہ کارفرما تھا۔ سو ناصر کاظمی اور افتخار کاظمی نے اس دور کے استحصالی نظام اور انگریز سامراج کے خلاف یہ پہلا قدم اٹھایا تھا۔ اب افتخار کاظمی کے بقول یہ جو دوسرا واقعہ سامنے آیا ہے اس سے ناصر کاظمی کی جدوجہد آزادی میں عملی طور پر شریک ہونے کی مزید تصدیق ہوتی ہے گو انہوں نے پہلے دھماکے کو بھی بہت خفیہ رکھا اور ڈپٹی کمشنر کی جانب سے دھماکہ کرنے والے کی نشاندہی کرنے والے کو انعام دینے کی پیشکش کے باوجود کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی۔ اسی طرح انہوں نے جو زہریلے بم بنائے ان کے بارے میں بھی کسی کو نہ بتایا بلکہ افتخار کاظمی نے پہلی مرتبہ اپنے انٹرویو میں راقم کے سامنے اظہار کر کے ناصر کاظمی اور اپنے ایک اور کارنامے کے حوالے سے ناصر کی وفات کے بہت بعد ایک مرتبہ پھر چونکا دیا۔ ناصر کو اس خطہ سرسبز پر پہلا قدم رکھتے ہی جو خوشی ہوئی تھی اس سے ان کے جذبہ حب الوطنی اور جدوجہد کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ انتظار حسین سے مکالمہ کرتے ہوتے کہتے ہیں۔

"پاکستان جب قیام میں آیا تو کچھ دوستوں عزیزوں پر مشتمل چھوٹا سا ہمارا ایک قافلہ۔ جب ہم نے واہگہ بارڈر کراس کیا تو میرے ابا نے پرچم سبز ہلالی دیکھا اور کہا بیٹا مبارک ہو تمہیں پاکستان مل گیا تو میں نے ابا سے کہا کہ تمہیں بھی مبارک ہو"۔ ۴۲

پہلے ناصر کاظمی کے والد کا اپنے بیٹے یعنی ناصر کاظمی کو یہ کہتے ہوئے مبارک باد دینا کہ تمہیں پاکستان مبارک ہو سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے والد بھی آزادی سے متعلق ناصر کاظمی کے جذبات و احساسات سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ کچھ عرصہ پولیس اور فوج کی ملازمت کے دوران انہیں یقیناً یہ بھی علم ہو گا کہ ان کا فرزند بم بھی بنا چکا ہے اور اس کا دھماکہ بھی کر چکا ہے۔ اس لئے ناصر کاظمی کے تحریک پاکستان میں حصہ لینے کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ انہوں نے دشمنوں سے بچنے کے لئے اور وقت پڑنے پر انہیں نیست و نابود کرنے کے لئے وہ قدم اٹھا رکھا تھا جس کے بارے میں اور کوئی دوسرا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ناصر کاظمی کی یہی حب الوطنی ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں بھرپور انداز میں ظاہر ہوتی ہے جب ناصر اس دھرتی پر دشمن کی یلغار کے خلاف لفظوں کے ہتھیار اٹھائے ہوئے حملہ آور ہوتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے شاعری اور دور غلامی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انتظار حسین سے کہا تھا۔

"بات یہ ہے کہ جس طرح عطر کی شیشی آپ کھولتے ہیں تو خوشبو آپ کو آتی ہے تو پھول اور باغ تو نظر نہیں آتے۔ تو شاعری میں یہ تمام واقعات براہ راست تو آپ کو نظر نہیں آئیں گے البتہ وہ جو یادیں ہیں جو زمانہ تھا ہماری غلامی کا اور جس میں ہم جینے کے لئے کوشش کر رہے تھے ان دنوں کی تگ و دو کو شاعری کے آہنگ میں، رنگوں میں، لفظوں میں، آپ دیکھ سکتے ہیں۔" ۶۳ے

سو ناصر کاظمی کے یہاں جہاں آزادی کے نغمے پھوٹتے ہیں وہاں وہ نئی نسل کے بارے میں نئی بشارتیں بھی سناتے ہیں۔ وہ اس خطہ سرسبز کو اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام اور نعمت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

"روایت پرستوں کی نسل نہ کشتی کھینے پر قادر تھی نہ کشتی توڑنے پر۔ کشتی چلی تو ساتھ چل پڑے اور بغیر کرایہ ادا کئے رک گئی تو ساتھ میں وہ بھی رکے کھڑے ہیں۔ نئی نسل کشتی بنانا بھی جانتی ہے اور کشتی کھینا بھی اور اتھاہ سمندروں کے ڈھکے اور کھلے رموز کو بھی سمجھتی ہے۔ وہ خوش و خرم

موجوں پہ سیر کرنے کی قائل نہیں بلکہ قلزموں کی رگیں مروڑنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔"۔ ۶۴

ناصر کاظمی کے عشق اور حیرانیاں

یوں تو ناصر کاظمی نے مظاہر فطرت سے ٹوٹ کر عشق کیا مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایسے عشق بھی کئے جن کی کسک انہوں نے تمام زندگی محسوس کی۔ ان کے عشق کی یہ کوک ہوک بن کر ان کے اشعار میں ڈھلتی رہی اور ان کی غزلیں سننے والوں کے دلوں میں اترتی چلی گئیں۔ اداسی کی لہریں ناصر کے دل سے نکل کر ان کے اشعار پڑھنے والوں کے دلوں میں گھر کرنے لگیں۔ ناصر کی اداسی نے سب کو اداس کر دیا اور پھر اس اداسی کا ساتھ اس کے گرد و نواح کے ماحول میں بھی رچ بس گیا۔

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ناصر کا دل اداس ہوتا تو یہ اداسی پورے شہر پر چھا جاتی۔ اداسی اور رتجگے ناصر کی شاعری کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ انہوں نے اداسی اور رتجگوں کو لفظوں کے ایسے پیراہن عطا کئے کہ ہر طرح کے لفظوں کے لباس سے اداسی محسوس ہونے لگی۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ یاد آنے والے نے اپنی یادوں کا اس شدت سے احساس دلایا کہ ناصر کے دل کی اداسی در و دیوار تک یادوں کی زلفوں کا سایہ لئے ہوئے چھا گئی پھر ناصر کو یوں کہنا پڑا۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

اور پھر جب بچھڑنے والے کی یاد نے ناصر کو تڑپا کے رکھ دیا تو قطع تعلق کے باوجود ناصر کو یہ کہنا پڑا۔

اے دوست ہم نے ترک تعلق کے باوجود

محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

ناصر نے جسے چاہا اسے ٹوٹ کر چاہا۔ ان کے کلام میں ان کی چاہتوں کے کئی گلاب کئی سرسوں کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے سرسوں کے پھول کو اپنا ہم عصر بھی کہا تھا۔ انتظار حسین سے مکالمہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

''اصل میں سرسوں کا پھول تو ایک ۔۔ آپ کو پتا ہے سرسوں کا پھول کس چیز کا نام ہے وہ محض بظاہر تو آپ کو ایک پتی سی' زرد سی نظر آتی ہے وہ تو ایک موسم ایک رنگ ایک تہذیب کا نام ہے تو وہ پوری تہذیب میری ہم عصر تھی۔'' ۶۵ے

''سرسوں کا پھول ناصر کاظمی اور ان کی شاعری کی علامت بن گیا۔ ناصر نے سرسوں کے پھول ہی کو کیوں پسند کیا اس کا تجزیہ کیا جائے تو ایک بات یہ سامنے آتی ہے کہ یہ پھول اپنے رنگ کے ساتھ پوری ایک تہذیب کا استعارہ ہے اور دوسرے اس سے ناصر کی شاعری کے مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان نے ناصر کی شاعری پر مضمون لکھتے ہوئے اس کا عنوان ''سرسوں کے پھول کا ہم عصر'' رکھا ہے یہ مضمون ڈاکٹر سہیل احمد خان کی کتاب طرفیں میں موجود ہے۔'' ۶۶ے

سرسوں کے پھول میں اپنی ایک جاذبیت اور خوشحالی کے ساتھ ساتھ جو یاس اور افسردگی کی کیفیت ہے یہی ناصر کی شخصیت میں بھی نمایاں تھی۔ اس کا چہرہ سرسوں کے پھول کی طرح دمکتا تھا اور دل یاس' افسردگی کے ساتھ روتا تھا۔ اس کی باتوں کی بارش میں سننے والے بھیگتے تھے اور لطف اٹھاتے تھے اور جب وہ چڑیوں کی طرح چہچہاہٹوں کے ساتھ ساتھ اداس ہوتا تھا تو اس کی اداسی چاروں جانب پھیل جاتی تھی۔ ناصر کی زندگی چڑیوں' کبوتروں' درختوں' چاند' دریاؤں' جھیلوں' لہلہاتے کھیتوں' سرسبز پہاڑوں' بارشوں' پھولوں' ندیوں' چشموں' صحراؤں کے استعاروں سے عبارت تھی۔ وہ ان مظاہر قدرت سے ٹوٹ کر عشق کرتا رہا اور انہیں خوبصورت لفظوں اور لطیف جذبوں کے پیراہن عطا کرتا رہا۔

احساس تحیر ناصر کی شخصیت میں ہمیشہ نمایاں رہا۔ ایک بچے کی طرح حیران ہونے کی حس مرتے دم تک بیدار رہی۔ ناصر جب بچہ تھا تو پہلے پہل وہ پرندوں کی

آوازیں سن کر انہیں دیکھ کر حیران ہوا۔ پھر ہرے بھرے درختوں کو دیکھ کر چونکا درخت کے بارے میں ناصر کا کہنا تھا۔

"اس طرح درخت ہے آپ کو پتا ہے یہیں سے دنیا شروع ہوتی ہے سو یہ درخت Growth کا Symbol ہے اور میری شاعری کا جزو اعظم ہے۔" ۶۷

درخت کو ناصر نے تخلیق کی علامت قرار دیا اور تمام عمر اس سے محبت کی۔ ایسے ہی چڑیاں ناصر کو بہت عزیز رہیں ناصر کہتے ہیں۔

"بچپن میں چڑیوں کے گھونسلوں اور ان کے بچوں کے کھوج لگانے کا بڑا جنون تھا۔ لیکن اس سے چڑیوں کو ستانا مقصود نہیں تھا بلکہ راجہ کے موتی چرانے والی چڑیا کی تلاش تھی۔ اور اب تک ہے۔۔۔۔ بچے سکول میں کہتے آجا پیاری چڑیا آ جا۔ اس وقت یہ چڑیا محض چڑیا تھی۔ کئی روپ میں دیکھی جب میں کالج کی چھٹیوں میں لاہور سے واپس گھر گیا تو اپنے محلے کی ایک گلی میں کئی دن تک اداس پھرتا رہا آخر ایک دن آڑی نے مجھے بتایا۔۔۔ کہ وہ چڑیا اڑ گئی۔ اس "وہ" کے لفظ نے بچپن کی ساری کہانیوں کو ایک نئے معنی پہنا دیئے۔"

آگے چل کر ناصر کہتے ہیں۔

"ہمارے شہر میں منہ اندھیرے سے پو پھٹنے سے کچھ دیر پہلے ایک اندھا فقیر ہر روز بلا ناغہ گلی میں سے گاتا ہوا گزر جاتا

تینوں غافلا جاگ نہ آئی

تے چڑیاں بول پیاں

یہ چڑیاں محض منڈیروں کی چڑیاں نہیں پوری دھرتی کے کردار ہیں اردو ادب میں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں یہ ضرب المثل کس نے نہیں سنی۔

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت ۶۸

ناصر نے تمام عمر چڑیوں سے عشق کیا وہ صبح سویرے جب چڑیوں کو بولتے سنتے تو اداس ہو جاتے۔ اسی طرح بارش بھی ناصر کاظمی کے عشق کا ایک استعارہ رہی۔

ان کا بچپن پہاڑی علاقوں میں گزرا جہاں بارشیں بہت ہوتی تھیں۔ وہ بارش میں بھیگے ہوئے پنچھیوں کی آوازیں سنتے اور سر دھنتے۔

"بیگم ناصر کاظمی کا کہنا ہے کہ بارش ہوتے ہی وہ باہر نکل جانے کو بے چین ہو جاتے اور کبھی چھتری لے کر اور کبھی بغیر چھتری ہی کے چلے جاتے ہمیشہ یہی ہوا کہ جیسے بوندیں پڑیں ان کی رم جھم کشاں کشاں ناصر کو گھر کھینچ لاتی۔" ۶۹ے

بارش کے حوالے سے ناصر کی شاعری میں جا بجا موضوع بکھرے پڑے ہیں انہوں نے اپنے تیسرے شعری مجموعے کا نام پہلی بارش رکھا۔ اس حوالے سے ان کے یہ اشعار دیکھئے۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا
پہلی بارش بھیجنے والے
میں تیرے درشن کا پیاسا تھا

پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے
پھر کاگا بولا گھر کے سونے آنگن میں
پھر امرت رس کی بوند پڑی تم یاد آئے۔

ناصر کاظمی اپنے شہر کے حوالے سے لکھتے ہیں

"انبالے کے دیہاتوں میں زیادہ زمینیں بارانی تھیں۔ جب مہینوں پانی نہ برستا کھیت کھیتیاں پیاس کے مارے خشک اور شق ہو جاتیں تو نگری نگری ننھے منے بچے ننگ دھڑنگے ٹولیاں بنا کر گھر سے نکلتے۔ ہاتھوں میں پیتل کی پراتیں ہوتیں ان کا ایک سرغنہ بھی ہوتا جس کی کمر کے گرد ایک پٹکا بندھا ہوتا۔ بعضوں کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی لکڑیاں ہوتیں۔ منہ پر کالک ملے جلتی

بلتی دوپہروں میں یہ ٹولیاں اس درد سے گاتیں کہ تانبے کا آسمان پگھل جاتا۔ پھر وہ جل تھل ہوتا کہ گلی گلی کی عورتیں تانبے کے پیسوں اور آٹے کی مٹھیوں سے بچوں کی جھولیاں بھر دیتیں۔ بچے گاتے اور ان کے ساتھ بوڑھے اور نوجوان بھی ناچتے۔

ھے مرے داتا دیہہ دے
چڑیوں نوں گھونٹ پانی
دے۔۶۹

ناصر نے چڑیوں سے جو محبت کی اس کا عکس جمیل ان کی نثر اور نظم دونوں میں ظاہر ہوا۔ ناصر کا تمام پرندوں سے بہت پیار تھا۔ وہ انتظار حسین سے گفتگو کے دوران کہتے ہیں۔ اور اپنے کسی کسی شاعر نے تو پرندوں کو دیکھا ہے اور ان کا کچھ بنایا بھی ہے۔ نصرتی جب یہ کہتا ہے۔

نہ میں فاختہ کی وفا میں ہوں کم

"تو فاختہ پوری دھرتی کی دکھ بھری کتھا سناتی نظر آتی ہے اور میر کے یہاں تو فاختہ ہے ہی ایک دکھیا ہیروئن۔ پھر سور داس کے یہاں کوئل اور ہرن فن اور حسن کی علامتیں ہیں۔ نظیر اور اسماعیل میرٹھی تو خیر ہیں ہی پرندوں کے رسیا۔" ۷۰

سو نظیر اور اسماعیل میرٹھی کی طرح ناصر بھی پرندوں کے رسیا تھے۔ ان کی تخلیقات میں کبوتر، چڑیاں، فاختہ، طوطے، مرغابیاں، مرغ اور ہر طرح کے پرندوں کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ ناصر کو اپنی ان تمام محبتوں سے بچھڑنے کا بہت قلق رہا۔ بسنت ہو یا برسات، خزاں ہو یا بہار ہر موسم اپنی جدی جدی معنویت کے ساتھ ان کی تحریروں میں نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ جب ان تمام محبتوں کو یاد کرتے ہیں تو انتظار حسین سے ایک اور مکالمے میں کہتے ہیں۔

"ہم نے اس زمانے میں صبح کی ہے جس زمانے میں بے وحدتی اور بے یقینی کی حکمرانی ہے دنیا میں اب کیا رہ گیا ہے ------ تجھٹ ---- وہ درخت جن

کی چھاؤں میں کھیلتے کھیلتے رات ہو جاتی تھی کٹ گئے۔ وہ دوپہریاں جن سے دلوں میں حرارت تھی ٹھنڈی پڑ گئیں۔ وہ پرندے جو منہ اندھیرے جگاتے تھے خاموش ہو گئے۔ آبادیوں اور فطرت میں فاصلہ نہ تھا۔ موسم ہمارے ساتھی تھے۔ جب آم پکتے تھے تو ان کی خوشبو کی لپٹ رات کو سونے نہ دیتی تھی۔ وہ آزاد بہتی ندیاں نہ جانے کہاں گم ہو گئیں۔ میرا ماتھا تو اس روز ٹھنکا تھا جب ہمارے شہر میں بجلی لگی تھی دو تین راتیں گلیوں اور بازاروں میں میلہ سا لگا رہا۔ بڑے بوڑھے اور بوڑھیاں حیران کہ اب روشنی بھی قید ہو گئی۔ پروانے ششدر کہ اب چراغ کے سر پر اندھیرا ہو گا اس دن کے بعد سے تازہ ہوا، کھلی چاندنی اور معطر اندھیروں کا مزا جاتا رہا پھر کسی خوشبو اور کسی کرن نے راستہ نہیں روکا ایک دریا تھا کہ روانی میں بہہ رہا تھا تھم گیا۔" ۲۷

اس اقتباس سے ناصر کی حیرانیوں کی مزید تصدیق ہوتی ہے ناصر کی شخصیت میں فطرت کی تصویروں کا کس قدر عمل دخل تھا۔ ان کی تحریروں کے علاوہ اس کی عام گفتگو سے بھی جھلکتا ہے۔ ناصر کے یہاں ہجرت اور ہجر کی کڑی دھوپ کا استعارہ ان ہی موسموں، پرندوں اور مناظرِ فطرت سے عبارت ہے جو ناصر کی زندگی میں خوشبو اور کرن کی صورت تھے۔ وہ جہاں بھی گیا اپنی حیرانیوں کو ہمیشہ اپنا ہم سفر کئے رکھا۔ وہ حیران ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ وہ پہلے تو خود حیران ہوتے اور پھر جب ایک قصہ گو کی طرح اپنی حیرانیوں کا تذکرہ اپنے دوستوں سے کرتے تو پھر انہیں حیران کرتے۔ ناصر تمام عمر خود بھی حیران ہوتے رہے اور اوروں کو بھی حیران کرتے رہے۔ وہ بنیادی طور پر جمال پرست تھے فطرت کا حسن جہاں کہیں بھی انہیں دکھائی دیتا وہ دیکھتے ہی رہ جاتے۔ وہ جہاں غنچوں کو چٹختے ہوئے دیکھ کر بھرپور زندگی کو محسوس کرتے وہاں انہیں پتوں کو گرتا دیکھنے کی آرزو بھی ہوتی۔ اس طرح سے وہ قانون قدرت کو اپنی آنکھوں میں پوری طرح عیاں کرتے۔ یہ فانی زندگی بھی پتوں کی طرح ہے کچھ پتے گر کر ختم ہو جاتے ہیں اور بہت سے پتے شاخوں پر ہری ہری آنکھیں کھول کر زندگی کی بشارت کو ہنس ہنس کر سنتے ہیں۔

ناصر نے پہلی مرتبہ نسوانی خوشبو کو اس وقت محسوس کیا۔ جب وہ نوشہرہ میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم تھا۔ اس زمانے میں' پانچویں چھٹی کا طالب علم تھا۔ عمر کوئی دس گیارہ برس کی ہو گی جب اس نے پہلی مرتبہ ایک لڑکی کو جو قرآن پڑھنے ناصر کی والدہ کے پاس آتی تھی اپنے دل کی آنکھ سے دیکھا۔ یہ اس کی پہلی حیرانی تھی۔ یہ ایسی محبت تھی جسے ناصر نے صرف ایک جملے میں اپنی ڈائری میں بیان کیا ہے اور جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ وہ حیرانی جس سے ناصر کے تخلیقی سوتے پھوٹے وہ ڈکشائی کی وادی میں ایک پھول سی لڑکی تھی جو ناصر کی والدہ کے پاس قرآن پڑھنے آتی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ دونوں لڑکیاں قرآن پڑھنے آتی تھیں۔ ہمارے یہاں عشق کے معاملے میں مکتب سے کلیشے چلا آرہا ہے اس کا پرتو یہاں بھی محسوس ہوتا ہے۔ ناصر نے اپنی اس محبت کا ذکر بھی اپنی ڈائری میں کیا جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ اس لڑکی کو ناصر نے پھول سی لڑکی کہا تھا اس وقت ناصر آٹھویں میں اور وہ پانچویں میں پڑھتی تھی۔ یعنی ناصر کی عمر تیرہ برس کی تھی اور اس کی دس برس کی۔ ناصر نے اس لڑکی کا نام حمیرا بتایا جسے وہاں بالو کہہ کر پکارتے تھے۔ ناصر کے اس عشق کا علم نہ صرف ان کی والدہ کو بلکہ زباں زد عام تھا۔ وہ سر عام ملتے اور ایک دوسرے کی محبت بھری خوشبو سے پذیرائی کرتے۔ جیلانی کامران نے بھی اپنے خط میں اس کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ناصر جب اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھ رہے تھے تو انہوں نے ایک دن کالج کے کاریڈور میں انہیں دھاڑیں مار کر روتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ بقول جیلانی کامران وہ دیواروں سے لپٹ رہا تھا اور حمیرا حمیرا کہہ رہا تھا۔

ناصر کاظمی نے اپنی شاعری کے محرکات میں ایک دو عشقوں کے ہاتھ کا ذکر واضح انداز میں کیا ہے۔ اب پہلا عشق تو یہی ہے جس کا تذکرہ افتخار کاظمی' عنصر کاظمی' جیلانی کامران نے بھی مختلف حوالوں سے کر دیا ہے۔ خود ناصر نے بھی اسے اپنا پہلا عشق قرار دیا ہے۔ ہمیں اب ان کے دوسرے عشق کا کھوج لگانا ہے اگر یہاں یہ کہا جائے کہ دوسرا عشق کہیں دودھ والی سے تو نہیں ہو گیا جس کا ذکر ناصر نے اس ڈائری میں بھی کیا ہے تو اس کی نفی بھی اس ڈائری سے ہو جاتی ہے جہاں ناصر یہ کہتے ہیں وہ مجھے گھورتی تھی صرف یکطرفہ گھورنے کو ہم عشق نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح جس طرح

ناصر نے نوشہرہ میں قرآن پڑھنے آنے والی لڑکی کی ایک مرتبہ سرسری سے تعریف کر دی تھی۔ جہاں تک حمیرا کا تعلق ہے اس کے شواہد ملتے ہیں کہ یہ ناصر کا پہلا عشق تھا جس کے سبب ان کے یہاں تخلیقی رویوں نے جنم لیا۔ یہاں یہ بھی واضح ہے کہ اس کا علم نہ صرف ناصر کی والدہ بلکہ اوروں کو بھی تھا مگر راستے میں کئی مجبوریاں حائل تھیں۔ ہمارے معاشرے میں ہر عشق کا انجام شادی ہی سمجھا جاتا ہے سو یہاں بھی ناصر کاظمی یہی کہنا چاہتے تھے کہ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہونا چاہتے تھے مگر مجبوریوں کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ سو یہاں جو مجبوری محسوس ہوتی ہے وہ ایک تو یہ کہ وہ دھوبی کی لڑکی تھی اور ناصر کاظمی سید زادے۔ ایک سید کے گھر دھوبن کا آنا نہ صرف اس زمانے میں بلکہ آج بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ خاندانی سید اپنے رشتے سیدوں کے یہاں ہی کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ناصر کاظمی نے اس کو ڈرائی کلینز کی بیٹی کہہ کر اس کا سماجی مرتبہ کچھ بلند کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈرائی کلینز ہوتا تو دھوبی ہی ہے۔ اس لئے ناصر کی والدہ اس لڑکی کو پسند کرنے کے باوجود جو خاموش تھیں اس کی وجہ یہی حمیرا کا سماجی پہلو تھا۔ لیکن یہاں یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ ناصر کاظمی نے اسے ٹوٹ کر چاہا مگر یہ چاہت ناصر کی لڑکپن کی تھی اسی لئے تو انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ حمیرا اب یاد تو نہیں بھولی بھی نہیں۔ لیکن وہ جس نے ناصر کے دل و دماغ کو ایک کئے رکھا وہ کوئی اور تھی۔ یوں تو ناصر نے بچپن ہی میں اپنی کزن شفیقہ بیگم بانو جنہیں وہ تیکن بھی کہا کرتے تھے پسند کر لیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب شفیقہ بیگم پانچویں کلاس میں پڑھتی تھیں۔ ان کی دلچسپی کی وجہ سے دونوں کے والدین کی انڈر سٹینڈنگ بھی ہو چکی تھی۔ اس بارے میں بیگم ناصر کاظمی یعنی شفیقہ بیگم کا کہنا ہے۔

> "انبالہ میں ناصر کاظمی ہمارے گھر آیا جایا کرتے تھے۔ رشتہ داری جو تھی۔ میں پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی وہ مجھے پسند کرتے تھے۔ پھر ہمارے والدین نے زبانی طور پر ہماری منگنی کر دی۔ پاکستان بننے کے بعد ہم لاہور آ گئے ناصر بھی لاہور چلے آئے۔ وہ اکثر ہمارے گھر آتے اور دیر تک دلچسپ اور حیران کن باتیں کرتے رہتے اور میں کان لگائے سنتی رہتی۔ ان کی باتیں سننے

کو بہت جی چاہتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ سنتے ہی چلے جائیں۔ انہیں باتیں کرنے کا بہت شوق تھا وہ باتیں کرتے اور مجھ سمیت ہمارے سارے گھر والے محو ہو کر سنتے۔ پھر ہماری شادی ہو گئی۔" ص ۳۷

اب اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے بقول شفیقہ بیگم کے ناصر ان میں بھی دلچسپی لیتے تھے اور پانچویں کلاس ہی سے انہیں پسند کرتے تھے اور شفیقہ بیگم بھی انہیں پسند کرتی "بیتجتا" دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد شفیقہ بیگم اور ناصر کاظمی کی محبت مثالی رہی انہوں نے جس طرح سے ناصر کاظمی کی زندگی کے باغیچے کو سرسبز و شاداب اور آباد و شاد کیا اس کی ہریالی آج بھی تر و تازہ ہے۔

ناصر کاظمی نے اپنی ڈائری میں جہاں اپنے ایک دو عشقوں کا ذکر کیا ہے اس سے مراد بیوی ہو سکتی بلکہ محبوبہ ہی ہے۔ سو پہلی محبوبہ تو حمیرا عرف بالو تھی جب کہ دوسری کا نام سلمیٰ لیا جاتا ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ سلمیٰ نامی کوئی لڑکی ان کی زندگی میں نہیں آئی۔ ناصر اختر شیرانی کی شاعری سے متاثر ضرور تھے مگر ان کی محبوبہ سے نہیں کہ وہ بھی اپنی محبوبہ کا نام سلمیٰ رکھ دیتے۔ دراصل یہ ایک فرضی نام تھا کیونکہ ناصر کاظمی ایک ایسے تہذیبی اور مذہبی معاشرے کے فرد تھے جہاں عشق و عاشقی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ خاص طور پر سید گھرانوں میں سو ناصر کاظمی نے پہلے عشق کا اظہار تو بلا خوف اس لئے کر دیا کہ جس سے وہ محبت کرتے تھے نہ تو اس کا کوئی سماجی مرتبہ تھا اور نہ ہی اسے ان کے خاندان سے کوئی واسطہ تھا مگر جہاں انہوں نے ڈوب کر عشق کیا اس کا نام مرتے دم تک اپنی زبان پر نہیں لائے۔ یہی وہ اعلیٰ روایت تھی جو ناصر نے اپنے پیشہ ور شعرا کی زندگی سے حاصل کی تھی۔ پہلے زمانے میں عاشق مر جاتے تھے مگر محبوب کا نام زبان پر نہیں لاتے تھے۔ کسی سے عشق یوں بھی ہوتا تھا کہ پانی میں عکس دیکھ لیا اور تمام عمر یہ کہتے ہوئے گزار دی کہ ایک بار دیکھا دوسری بار دیکھنے کی ہوس۔ کبھی چلمن سے نگاہیں ملتیں اور نگاہ کے تیر دل کے پار اتر جاتے۔ سو اسی طرح کا ایک تیر انبالہ ہی میں ناصر کے دل کے بھی پار اترا تھا اور ایسا پار اترا کہ ناصر تڑپ کر رہ گئے اور پھر اس کے فراق میں تمام عمر تڑپتے رہے۔ ان کی شاعری میں ہجر، اداسی، غم اور دکھوں کے جو چراغ روشن ہیں ان میں ناصر کے سچے جذبوں کا لہو شامل

ہے۔ ناصر نے جس سے بھرپور عشق کیا اس کا نام تک زباں سے ادا نہ کیا اور نہ ہی اپنے کسی دوست کے سامنے اس کا ذکر کیا۔ اس لئے کہ وہ کسی کی رسوائی نہیں چاہتے تھے اس لئے بھی کہ جس سے انہیں عشق تھا وہ بھی سید زادی تھی۔ ناصر کے اس عشق کا سوائے اس کے بچپن کے دوستوں یا پھر بھائی اور بیگم کے کسی اور کو قطعاً" علم نہیں۔ ان کی بیگم اور بھائی نے بھی اس کا کبھی کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔ بیٹوں نے بھی اس پر کبھی کھل کر کوئی بات نہیں کی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری کے تمام موسم ناصر کے اسی سچے اور کھرے عشق سے عبارت ہیں۔ اگر وہ حمیرا کا نام لے لے کر آہیں بھی بھرتے رہے تو وہ حمیرا نہیں تھی بلکہ وہی سید زادی تھی سلمٰی کا جہاں نام لیا وہاں بھی وہی مراد تھی۔ ناصر کی شاعری میں چاند' چھب' مانوس اجنبی' ہجر کی رات کا ستارہ' ہم نفس' ہم سخن' آنکھیں' زلفیں' نرم گفتار' سمن بو' آہو' انگشت حنائی' جگنو' دلنشیں' پیکر ناز اس کے علاوہ اور بہت سے ایسے خوبصورت استعارے ہیں جو ناصر کی یادوں کو چمکاتے ہیں۔ یاد اور اداسی ناصر کاظمی کی شاعری کی روح ہے۔ برگ نے کی تمام غزلیں اسی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد دیوان اور پہلی بارش میں ناصر کاظمی کی اس محبت کی مہکاریں اسی طرح سے محسوس ہوتی ہیں جس طرح سے برگ نے میں محسوس ہوئیں۔ یہ ناصر کی شخصیت کی ایک اور عظمت ہے جو پہلی مرتبہ اجاگر ہو رہی ہے۔ ناصر نے جب ایف۔ اے کی تعلیم مکمل کی اور وہ انبالہ واپس گیا تو اس سید زادی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس سے ناصر کاظمی کے دل پر قیامت ٹوٹ گئی۔ اس کے تمام روشن خواب چکنا چور ہو گئے۔ ناصر کاظمی نے اپنے اس عشق کو تمام عمر چھپائے رکھا اس نے آنسو بھی بہائے تو کسی کو بھنک تک نہ پڑنے دی کہ وہ کس لئے آنسو بہا رہا ہے۔ اس نے آہیں بھی بھریں تو بھی کسی کا نام نہ لیا اور لیا بھی تو اور کسی کا۔ ناصر کاظمی کے اس عشق کے بارے میں راقم نے ناصر کاظمی کی بیگم سے استفسار کیا تو انہوں نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"اس قصے کو اب جانے دیجئے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا ذکر بھی نہ کیجئے۔ بہت الجھنیں ہوں گی۔" ۸۹

اس بارے میں ناصر کاظمی کے بھائی عنصر کاظمی نے کہا۔

"ہو سکتا ہے ایسی کوئی بات ہو۔ ہمیں تو صرف حمیرا کے بارے میں علم ہے
جسے بالو کہہ کر پکارتے تھے۔"

شاعری کی ابتدا اور پہلا دور ::

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ناصر آٹھویں کلاس میں ڈکشائی کے اسکول کے طالب علم تھے۔ ۱۹۳۷ء کا زمانہ تھا۔ بقول ناصر کاظمی اس وقت ان کی عمر تیرہ برس تھی۔ ان کی پہلی محبت یہیں سے پروان چڑھی اور اسی زمانے میں ناصر نے شاعری شروع کی۔ اس بارے میں ناصر کی ڈائری کا حوالہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔ افتخار کاظمی کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں ناصر مجھے نظمیں سنایا کرتا تھا جو رومانوی جذبوں سے بھرپور ہوا کرتی تھیں۔ اس ضمن میں افتخار کاظمی کی گفتگو کا اقتباس درج کیا جا رہا ہے۔

"جب ناصر کاظمی آٹھویں میں پڑھتا تھا تو ایک کتاب فن شاعری پڑھتا تھا۔ نویں کلاس میں ناصر پہلے تو سائنس لی لیکن پھر اردو میں چلا گیا ایک دفعہ چھٹیوں میں ناصر انبالہ آیا تو اس نے مجھے ایک نظم دکھائی۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور ناصر نے باقاعدہ مشاعروں میں جانا شروع کر دیا۔ میٹرک کے بعد اس نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا ناصر کے دو ہی مشاغل تھے کبوتر بازی اور شاعری۔" ۷۵ے

اس اقتباس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ناصر نے آٹھویں جماعت سے شاعری شروع کی اور ابتدا میں نظمیں کہیں۔ وہ خود بھی اپنی ڈائری میں ان ننھی منی نظموں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ افتخار کاظمی کی گفتگو سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ پہلے انہوں نے نظمیں لکھیں اور پھر غزل کی طرف مائل ہو گئے۔ غزل کے بارے میں بھی ناصر کا کہنا ہے کہ انہوں نے آٹھویں جماعت ہی سے غزلیں کہنا شروع کر دی تھیں اور ان کی غزلوں کو ان کی والدہ اور محبوبہ حمیرا دونوں پسند کرتے تھے اس کے بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں جا کر ان کی شاعری میں نکھار آیا۔

ناصر کاظمی انتظار حسین کو اپنی زندگی کا آخری انٹرویو بستر مرگ پر دیتے ہوئے

کہتے ہیں۔

"گھر کا ماحول بھی شعر و شاعری کا تھا۔ گھر میں ہمارے میر انیس پڑھا جاتا تھا۔ نانا میری موسیقی کا شوق رکھتے تھے اور میر نظیر حسین ناشاد' میر نیرنگ یہ ہمارے شہر میں اچھی فضا تھی۔ کتابیں بھی گھر میں تھیں بچپن میں ہم نے شیخ سعدی پڑھا۔ فردوسی پڑھا یہ سب چیزیں پڑھائی جاتی تھیں میں بچپن میں قرآن حکیم' پورا آہنگ' پورا لحن جو تھا وہ شعر کی طرف تھا پھر ایک اور بات جو مجھے سب سے زیادہ اہم نظر آتی ہے۔ جب میں نے پہلا شعر کہا مجھے یاد نہیں۔ مگر یوں لگتا ہے یہ شعر میرا پہلا شعر تھا۔"

قبول ہے جنہیں غم بھی تری خوشی کے لئے
وہ جی رہے ہیں حقیقت میں زندگی کے لئے

"تو مجھے یوں لگا۔ اتنی خوشی ہوئی کہ شاید اس سے پہلے مجھے کسی چیز کی خوشی نہیں ہوئی۔ اگر مجھے شعر کے علاوہ اتنی خوشی کسی اور کام کی ہوتی تو میں شاعری نہ کرتا تو دراصل آج بھی اگر مجھے کوئی ایسی خوشی مل جائے جو شعر کا بدل ہو تو میں شاعری چھوڑ دوں لیکن شاعری سے زیادہ مجھے خوشی نہیں ملتی اور تم جانتے ہو تم خود تخلیقی آدمی ہو کہ تخلیقی آدمی ایک سطر بھی اچھی لکھ کر' ایک جملہ بول کر' ایک شعر لکھ کر جتنی خوشی حاصل کر سکتا ہے شاید کسی اور کام میں نہیں تو پھر شاعری میں میں نے ایک جادو اور دیکھا پرانے اساتذہ کا جب کلام پڑھتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ زمانے اور صدیاں میرے ساتھ ہمکلام ہیں بلکہ میں ان صدیوں میں پہنچ گیا ہوں۔ یہ جادو کیا ہے؟ گویا شاعری مردہ لمحوں کو زندہ کر دیتی ہے وہ وقت جو مر گیا جسے کوئی بھی زندہ نہیں کر سکتا۔ شاعر زندہ کر سکتا ہے اور اسی لئے شاید کہا تھا مولانا نے

شاعری جزو ایست از پیغمبری

تو غالباً اسی لئے شاعری شروع کی اور اب تک اس میں بس زور آزمائی کر رہے ہیں۔ تک بندی کر رہے ہیں کہیں بات بن جاتی ہے کبھی نہیں بنتی اب یوں لگتا ہے کہ شعر کی تھوڑی سمجھ آئی ہے۔" ۶۷

آگے چل کر ایک سوال کے جواب میں ناصر کاظمی مزید کہتے ہیں۔
''اصل میں غزل کی روش پر تو میں نہیں چل نکلا مجھے غزل قطعہ' رباعی' آزاد نظم وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں رہا مجھے تو شاعری سے سروکار ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ شاعری صرف مصرعے لکھنے کا نام نہیں شاعری تو ایک نقطہ نظر ہے زندگی کو دیکھنے کا۔ چیزوں کو دیکھنے کا۔ ان کو ایک خاص موزوں طریقے سے بیان کرنے کا نام شاعری ہے۔ تو غزل تو اتفاقیہ ایک صنف مجھے پسند تھی چونکہ میرا ایک پس منظر تھا اس میں۔ میں نے زیادہ تر غزل کی شاعری پڑھی۔ پھر یوں دیکھئے کہ اردو کا بہترین سرمایہ تو غزل میں ہی ہے۔ تو جس زمانے میں میں نے شعر کہنا شروع کیے اسلامیہ کالج لاہور میں تھا۔ یہاں فیض احمد فیض' راشد اور میرا جی کا طوطی بول رہا تھا اور اس کے بعد دوسری نسل تھی یوسف ظفر اور ان کے ساتھی غزل واقعی مشاعرہ میں پڑھنا بہت مشکل تھا لیکن یہ ہے کہ میں ترنم سے پڑھا کرتا تھا میرے ساتھ حمید نسیم' حفیظ ہوشیارپوری تھے ان کو بھی بڑے ادب سے سنا جاتا تھا تو ان دو تین شاعروں کے علاوہ غزل کا چراغ ویسے بھی نہیں جلتا تھا لیکن دراصل میں نے غور کیا کہ غزل کے خلاف لوگ نہیں تھے بلکہ غزل میں Cliche کی پرانی ڈگر جو تھی اس کے خلاف تھے وہ کہتے تھے میاں نئی بات کرو۔ تو اگر غزل میں نئی بات کہی جا سکے اور غزل کا احوال' تمہیں پتہ ہے کہ دلی شہر کا سا ہے۔ یہ بار بار اجڑتی ہے اور بار بار بستی ہے۔''^٧٧

اس طویل اقتباس سے ناصر کاظمی کے شاعری کے بارے میں بنیادی رویے کا پتہ چلتا ہے اور انہوں نے بڑے پتے کی باتیں اس مکالمے میں بیان کر دی ہیں۔ انہوں نے شاعری کو زندگی اور اشیا کو دیکھنے کا مخصوص سلیقہ قرار دیا ہے پھر انہوں نے غزل کو اردو ادب کا بہترین سرمایہ بھی کہا ہے اور غزل وہ ہے جو دلی کی طرح کئی بار اجڑی اور کئی بار بسی۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید غزل کی بھی واضح انداز میں تعریف کر دی ہے۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ ناصر کاظمی کی اصل شاعری ان کی لاہور آمد کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہے اور وہ زمانہ طالب علمی ہی میں اپنی پہچان کرانے میں کامیاب

ہو جاتے ہیں۔

ناصر کاظمی کے لاہور آنے کے جو شواہد ملتے ہیں وہ ۱۹۴۳ء۔ ۱۹۴۴ء۔ ۱۹۴۵ء کا زمانہ ہے۔ ناصر کاظمی کی پہلی ڈائری کے مطابق ۷ ۱۹۴۳ء میں ان کی عمر تیرہ برس کی تھی اور وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ اس کا مطلب ہے انہوں نے ۱۹۳۸ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا اور میٹرک کا امتحان ۴۱ ۔ ۱۹۴۰ء میں پاس کیا اس کے بعد وہ لاہور آگئے۔ غالباً یہ زمانہ ۱۹۴۳ء کا ہے جب انہوں نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں داخلہ لیا اس زمانے میں قابل دید تھے۔ گھر میں بہت لاڈلے تھے والد کی معقول تنخواہ تھی سو انہوں نے اپنے بیٹے کو لاہور تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ناصر نے ہوسٹل میں باقاعدہ اپنا ایک ذاتی ملازم بھی رکھا ہوا تھا۔

ناہید قاسمی اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

"احمد ندیم قاسمی سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ انہوں نے کالج میں بالکل ایک الگ کمرہ لے رکھا تھا یوں تو کالج میں ذاتی ملازم رکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس کے پاس ایک ملازم بھی تھا جو ان کی لئے الگ سے کھانا پکاتا اور چیزیں سنبھالے رہتا تھا۔ وہ اپنی شخصیت کو ہمیشہ سنوارے رکھتے۔ شاندار پوشاک سے لے کو مہذب رویوں' وضع داری اور شائستہ گفتگو تک' اپنے کالج کے زمانے میں بھی وہ ایک شہزادے کی طرح رہے ساتھی انہیں یونس کہتے تھے۔" ۸۔۷

سو ناصر کاظمی کے حقیقی معنوں میں تخلیقی دور کی ابتدا لاہور ہی سے ہوئی اس ابتدائی دور میں ناصر کاظمی کے ساتھیوں میں حمید نسیم' شہرت بخاری' جیلانی کامران' عبدالمجید بھٹی شامل تھے۔ حمید نسیم ان دنوں اسلامیہ کالج ہی میں پڑھتے تھے عبدالحمید لکھتے ہیں۔

"جب وہ یا حمید نسیم اسلامیہ کالج کے کسی مشاعرے میں غزل پڑھتے تھے تو انہیں نہایت خاموشی سے سنا جاتا تھا اس میں رعب سخن اور ترنم کی دلکشی برابر کارفرما تھے اب کم ہی لوگوں کو یاد ہو گا کہ ان کے ترنم میں کتنی جاذبیت اور دل کشی تھی اور جب انہوں نے ترنم سی پڑھنا چھوڑ دیا تو اس کی ایک

یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی شاعری کو گلے کے زور سے نہیں منوانا چاہتے تھے یہی وقت تھا جب ناصر کی شاعری اور شخصیت دونوں ابھر رہے تھے ظاہراً" وہ کم ہی کسی سے اصلاح لیتے تھے اور نہ کسی کو اپنا استاد ماننے کے روا دار تھے بلکہ ذہنی طور پر اپنا شمار اساتذہ ہی میں کرتے تھے لیکن مختلف صحبتوں میں بیٹھ کر کبھی نہ کبھی ان کے کسی نہ کسی شعر میں اگر اصلاح نہیں تو تبدیلی ہو جاتی تھی۔ دو مثالوں کا تو خود میں بھی شاہد ہوں ان کی ایک غزل میں، جس کا مطلع ابھی سنا چکا ہوں، دو شعروں کی ترمیم حفیظ ہوشیار پوری کے زیر اثر ہوئی تھی اصل شعر کچھ اس طرح تھے۔

کچھ رات کچھ پتنگے سہمی ہوئی سی شمعیں
دل سوز ہیں مناظر بزم سحر گہی کے
اب تک مری نگاہیں حیرت زدہ ہیں ناصر
وہ آچکے کبھی کے وہ جا چکے کبھی کے

ان کی ایک اور مشہور غزل کا ایک شعر شروع میں یوں تھا۔۷۹

دل نے خیال ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

عبدالحمید صاحب کے اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ناصر کو زمانہ طالب علمی ہی میں شہرت حاصل ہونا شروع ہو گئی تھی اور یہ کہ وہ اپنا استاد کسی کو نہیں مانتے تھے البتہ دوستوں کی محفلوں میں خاص طور پر حفیظ ہوشیارپوری کے مشورے کو ضرور مان لیتے تھے۔ عبدالحمید ناصر سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"ناصر کی وہ غزل کہ جس کی وساطت سے ہمارا تعارف ہوا ان کے مطبوعہ کلام نہیں ہے۔ یہ غزل ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی غالباً" میرے پاس محفوظ ہے اور یہی غزل ہے جو پہلی بار انہوں نے ریڈیو پر اپنے بے پناہ ترنم سے سنائی تھی شاید اس کے چند اشعار آپ سننا چاہیں

تمنا خون بن کر زیب مژگاں ہوتی جاتی ہے
بجھا جاتا ہے دل ہستی فروزاں ہوتی جاتی ہے

نظر سے دور ہے اور دل میں پنہاں ہوتی جاتی ہے
تجلی دوست کی جان رگ جاں ہوتی جاتی ہے
یہ ذکر خیر و شر یہ جنت و دوزخ کے افسانے
طبیعت اور بھی مائل بہ عصیاں ہوتی جاتی ہے
مجھے حیراں نگاہی آخر اس عالم میں لے آئی
جہاں اس کی نظر میری نگہباں ہوتی جاتی ہے
ترے اہل وفا کو اور مشکل ہو گیا جینا
قیامت کیا یہ اے حسن پشیماں ہوتی جاتی ہے
گزرتے جا رہے ہیں سانحات زندگی ناصر
شب غم رفتہ رفتہ صبح احزاں ہوتی جاتی ہے ۸۰؎

یہ پہلی غزل تھی جو ناصر کاظمی نے لاہور ریڈیو سے سنائی۔ اس زمانے میں ناصر کو بہت سے مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا اور وہ مقبول ہوتے چلے گئے۔ افتخار کاظمی نے جو کالج کے زمانے میں ناصر کاظمی کے شراب پینے کا ذکر کیا ہے اس کی تائید عبدالحمید کے مضمون سے بھی ہوتی ہے۔

"واقعہ یہ تھا کہ ایک شام ناصر ایک دوست کے ساتھ جن کا نام لینا غیر ضروری ہے سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ میں کہ جس کا اب وجود نہیں دیر تک اکل و شرب میں مصروف رہے۔ ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی اور جس حالت میں انہیں وہاں سے اٹھایا گیا اور ان کی رات بسر ہوئی وہ دیکھنے والوں کے بیان کے مطابق مکمل بے ہوشی اور زندگی اور موت کے درمیان کشمکش تھی مجھے بھی اس بات کا رنج تھا اور حفیظ ہوشیار پوری کو بھی۔ میرا رنج شاید زیادہ دیرپا تھا۔ میرے دل سے خواہش ہی نکل گئی کہ ناصر اب میرے پاس آئیں اور وہ بھی کافی دنوں تک میرے پاس نہیں آئے ایک شام وہ بہر حال میرے پاس آگئے اور آتے ہی کہا کہ ایک غزل سنانے آیا ہوں اور ساتھ ہی اپنی دلآویز ترنم میں غزل شروع کی۔

"ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی"

اس غزل میں مجھے جو شعر پسند آیا وہ یہ تھا

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا

یوں بھی گزر گئی شب فرقت کبھی کبھی

یہاں واقعہ کی طرف بھی اشارہ تھا اور اس سے کہیں زیادہ وہ فن تھا جس کے تحت ایک واقعہ اپنی واقعیت یا انفرادیت کو کھو کر ایک مستقل نفسیاتی یا فلسفیانہ حقیقت کا حامل ہو جاتا ہے۔" ۸۱

عبدالحمید نے جو کاروان ادب کے مالک تھے یہ واقع بیان کر کے ایک تو اس بات کی تائید کر دی کے ناصر کبھی کبھار مے نوشی بھی کر لیتے تھے دوسرے اس واقعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ افتخار کاظمی نے جس شرطیہ مے نوشی کی طرف اشارہ کیا تھا وہ یقیناً یہی تھا۔ ناصر کاظمی ایک حساس آدمی تھا اسے معلوم تھا کہ اس واقعہ سے عبدالحمید ناراض ہوں گے اس لئے وہ کافی دن غیر حاضر رہنے کے بعد جب حمید صاحب سے ملے تو اس نے ایک ایسی غزل تخلیق کی ہوئی تھی جو اس کی شہرت میں خشت اول بنی۔

شہرت بخاری نے اس دور میں ناصر کاظمی سے اپنی پہلی ملاقات کا یوں ذکر کیا ہے۔

"وہ غزل پڑھ رہا تھا اور اس کو ہم سن حیرت و رشک سے اسے دیکھ رہے تھے حاضرین میں سے بعض آگے بڑھ بڑھ کر اپنی خوش مذاقی کا ثبوت فراہم کر رہے تھے جن لوگوں نے ڈاکٹر تاثیر اور پروفیسر سید عابد علی عابد کو مشاعرہ سنتے دیکھا ہے انہیں یاد ہو گا یہ دونوں استاد نوجوانوں کا شعر نہایت توجہ سے سنتے تھے جو شعر اچھا ہوتا اس کی تعریف کرنے میں نہ صرف یہ کہ بخل سے کام نہ لیتے تھے بلکہ بعض اوقات تعریف کرنے میں مبالغہ کر جایا کرتے تھے۔ عابد صاحب تو یوں بھی اچھا شعر سن کر اپنے آپ میں نہ رہتے تھے اس وقت ان دونوں کی خصوصی توجہ اس کی (ناصر کاظمی) طرف تھی اور وہ بار بار داد دے رہے تھے جب یہ شعر آیا۔

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

تو عابد صاحب پر ایک خاص قسم کی اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اب تک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے بڑی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے ہلے اور بلند آواز سے کہا "پھر پڑھو ۔۔۔۔ اسے پھر پڑھو۔ اس نے مکرر، مکرر یہ شعر پڑھا۔ عابد صاحب قریب بیٹھے ہوئے شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کر کر کے شعر کی داد دے رہے تھے لیکن جب یہ شعر پڑھا گیا۔

اے دوست ہم نے ترک تعلق کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

تو عابد علی پر وجد طاری ہو گیا وہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو گئے پھر بیٹھ گئے اور زانوؤں پر ہاتھ مار مار کر بار بار پڑھنے کے لئے کہہ رہے تھے ایک عابد علی اور ڈاکٹر تاثیر ہی پر منحصر نہیں تھا اسلامیہ کالج کا یہ کشادہ کمرہ جہاں یہ تاریخی فرش مشاعرہ ہو رہا تھا داد و تحسین کے نعروں سے گونج اٹھا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا در و دیوار لرز رہے تھے۔ اور جیسے ہر طرف کوئی صد رنگ تیز روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی دیر تک ایک عجب عالم رہا مشاعرہ جاری رہا لاہور کا شاید ہی کوئی قابل ذکر استاد یا مبتدی شاعر ایسا ہو گا جو اس مشاعرے میں شریک نہ تھا ایسا مشاعرہ پھر منعقد نہ ہوا کم از کم میں نے نہیں دیکھا تھا اپنی نوعیت کا یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں میں نے شرکت کی تھی۔"

آگے چل کر شہرت بخاری لکھتے ہیں۔

"خدا خدا کر کے مشاعرہ ختم ہوا بہت سے لوگوں نے اسے گھیر لیا وہ مجھے بے حد مانوس معلوم ہو رہا تھا۔ میں جلدی سے باہر نکل کر دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا وہ حمید نسیم کے ساتھ باہر نکلا تو میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا ابھی میں کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور کہا بڑی اچھی غزل سنائی تم نے میں حیران رہ گیا۔

مجھے اپنی غزل بہت بری لگ رہی تھی بلکہ شرمناک ـــــ میرے ذہن میں جتنے تعریفی الفاظ اس وقت فراہم ہوئے وہ میں نے اسے کہے وہ بڑا خوش تھا۔ کچھ باتیں چلتے چلتے، سیڑھیاں اترتے اترتے ہمارے درمیان ہوئیں۔ پھر ہم نے اپنا اپنا راستہ لیا معلوم نہیں اس شاعر میں۔ اس کی آواز میں اور اس کی غزل میں ایسی کون سی بات تھی کہ میں دیر تک سوچتا رہا کہ میں غزل کیوں کہتا ہوں باقی شاعر اگر ایسے شعر نہیں کہہ سکتے تو غزل کیوں کہتے ہیں؟

ناصر کاظمی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی گہرا سانولا رنگ۔ بھرا بھرا ہنستا چہرہ۔ موٹی موٹی پر کشش بے قرار سی آنکھیں۔ کالی شیروانی۔ وہ کیسا خوبصورت لگ رہا تھا۔"
۸۲ـ

ناصر کاظمی کو زمانہ طالب علمی ہی میں جو پذیرائی ملی وہ بہت کم شاعروں کا نصیب ہے۔ ناصر نے زمانہ طالب علمی میں جس قسم کے شعر کہے ان میں سے یہ غزل ہی نمونے کے طور پر کافی ہے جس پر ڈاکٹر تاثیر اور سید عابد علی عابد جیسے کہنہ مشق اساتذہ پھڑک اٹھے اور ناصر کو بار بار سنا۔ ناصر جب چھٹیاں گزارنے انبالے جاتے تو افتخار کاظمی سے اپنے ان شعری معرکوں کے تذکرے کرتے پھولے نہیں سماتے تھے بالآخر وہ ایف اے کرنے کے بعد لاہور سے انبالہ آگئے۔ لاہور میں ناصر کاظمی کی شاعری کا یہ پہلا کامیاب دور تھا۔

ہجرت، درد اور خوشبو ::

ناصر کاظمی لاہور میں تعلیم کے دوران میں آنے والے وقت کی آواز سن چکے تھے۔تحریک پاکستان ان دنوں زوروں پر تھی۔ لاہور میں منٹو پارک۔ موچی دروازہ اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے ہال میں آزادی کے نعرے گونج رہے تھے ناصر کاظمی کے دل میں ہندو انگریز سامراج کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو چکی تھی اس نفرت کا اظہار انہوں نے بم بنا کر کیا تھا ایک بم تو قبرستان میں پھٹا اور دوسرا جو کمشنر ہاؤس کے قریب پھینکا گیا تھا۔ نہ پھٹ سکا۔ لیکن حکومت اس حرکت پر الرٹ ہو چکی تھی اور بم پھینکنے

والے کے لئے انعام بھی مقرر کیا تھا۔ لیکن اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ ناصر کاظمی نے ہندو ذہنیت کو بہت قریب سے دیکھا تھا انبالہ میں بھی ہندو دکانداروں کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی مسلمان ان سے سودا سلف خریدنے جاتا تو وہ ڈوئی سے اجناس یا کوئی اور شے اس کے تھیلے میں دور سے ڈالتے۔ اکثر مسلمانوں کو ہندوؤں کے گھروں میں آنے اور ان کے برتنوں میں پانی پینے کی ممانعت تھی گو ناصر کاظمی ہندوؤں کے تہواروں کو اسی طرح عقیدت و احترام سے مناتے مگر سب کی ذہنیت ایک سی نہ تھی۔ انبالہ ایک چھوٹا سا شہر تھا مگر یہاں کے لوگ حد درجہ سیدھے اور محبت کرنے والے تھے ناصر نے اس شہر کی گلیوں اور محلوں میں اپنی زندگی کے خوشگوار ترین دن بسر کئے۔ ریلوے سٹیشن تو اس کی توجہ کا خاص مرکز تھا۔ ریل کا آنا اور اس کا رخصت ہونا ناصر کاظمی کے لئے رومانوی استعارہ تھا وہ تقریباً روزانہ انبالہ ریلوے سٹیشن جاتا اور گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھتا یہ اس کی بچپن کی عادت تھی جب وہ نوشہرہ میں اپنے والدین کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ انبالہ میں ناصر کاظمی نے بہت سی حیرانیاں اپنے دل میں بسائیں۔ یہ اس کی جنم بھومی تھی اس دھرتی پر اس نے پہلے پہل پرندوں کی آوازوں کو سنا۔ بارشوں کو برستے دیکھا۔ پھولوں کی مہکاروں کی محسوس کیا۔ آسمان کے سفیروں سے ملاقات کی، پتنگیں ہواؤں میں اڑائیں، آموں کے باغوں کی مہک کو دل میں بسایا۔ یہاں کی بارانی زمینوں کی ٹھنڈی باس کو محسوس کیا۔ یہیں پر اس نے پڑھنا سیکھا اور یہیں پر سب سے پہلے اس کا نام لکھا۔ یہی وہ بستی تھی جو ناصر کاظمی کی امنگوں کا گہوارہ تھی۔ یہی وہ شہر تھا جس میں اس نے اس مانوس اجنبی کو حیرانی کے ساتھ دیکھا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں بسا لیا۔ یہی وہ قریہ تھا جو ناصر کاظمی کے لئے جنت کا ٹکڑا تھا۔ یہیں وہ ننگے پاؤں گھوما کرتا تھا۔ یہاں اس کے عزیز تھے دوست تھے ماں باپ تھے بزرگوں کی قبریں تھیں۔ خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ یہیں سے ناصر نے سازوں کی آواز میں بات کرنا چاہی تھی اور یہیں پر اس نے شطرنج کی بساط بچھائی تھی۔ یہیں سے اس نے سفر کو وسیلہ ظفر بنایا اور اسی شہر میں اس کی تمناؤں اور خواہشوں نے پہلے پہل آنکھ کھولی۔ ناصر کاظمی برگ نے کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب شاعری فنکار کے لئے باعث ننگ نہ تھی۔

گیت گانے والا گاؤں گاؤں، نگری نگری گھومتا پھرتا تھا اور بات بات پر عشق و محبت دلیری و شجاعت، سیر و تفریح اور ان جانے دیسوں کے نغمے گاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی بہت ہی سیدھا سادا اور رس بھرا ساز ہوتا تھا جس کی دھن پر اس کے سارے گیت ڈھلتے تھے اور گلے سے باہر نکلتے ہی دلوں میں اتر جاتے تھے۔ وہ جن لوگوں میں بیٹھ جاتا ان کے دلوں کا تار ملا لیتا۔ جانی پہچانی دھرتی کا ہر گوشہ اور دھڑکنوں کے سارے مسکن جاگیر تھے۔ پاس پڑوس کے سارے باسی اس کی آواز پر فریفتہ تھے۔ کہنے والا ایک تھا اور سننے والے ہزاروں اور ان ہزاروں کے دل اس کی مٹھی میں تھے۔"۸۳

ناصر کاظمی نے اس دیباچے میں جن دنوں کی بات کی ہے وہی دن اس کے لئے خوشگوار حیرتوں کا باعث تھے اور یہ حیرتیں اسی قریہ میں روشنی کی طرح بکھری ہوئی تھیں جس کے بارے میں ناصر نے کہا تھا۔

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریہ کی روشنی

ناصر کاظمی اپنے اس خوبصورت شہر کو انتظار حسین کی روبرو یوں یاد کرتے ہیں۔ (انتظار حسین نے ناصر کاظمی کا آخری انٹرویو بستر مرگ پر لیا تھا)

"انتظار حسین دراصل میں بظاہر جسمانی طور پر تو اب نہیں چلتا پھرتا کہ کچھ عرصے سے بیمار ہوں مگر میرا ذہن، میری آنکھیں، میری یادیں اسی طرح چلتی پھرتی ہیں تمہارے ساتھ گلیوں میں۔ درختوں میں اور اب تم نے جو ماضی کی بات چھیڑی ہے تو وہ طویل بات ہے اتنا ہے کہ جب پاکستان وجود میں آیا تو ایک بستی تھی انبالہ۔"

یہاں ناصر کاظمی نے مندرجہ بالا شعر پڑھا اور پھر آگے چل کر کہتے ہیں۔

"تو وہاں سے میں ہجرت کر کے آیا تھا۔ وہاں میں نے جنم لیا۔ والد میرے فوج میں تھے ایک چھوٹا سا معاشرہ تھا ہمارا گھر پرندوں، بچوں، پھولوں، درختوں اور ننھی ننھی پیچ در پیچ گلیوں کا معاشرہ تھا۔ اس میں سب لوگ، امیر غریب بڑے سکھ اور امن سے رہتے تھے اور بڑے بڑے علما بھی رہتے

تھے لیکن ایک عجیب بات تھی اس معاشرے میں کہ جو بظاہر غریب ننھے منے لوگ تھے ان کی عزت بھی اتنی ہی تھی جتنی کہ بڑے لوگوں کی بلکہ شاید ان سے بھی زیادہ۔ ایک وثیقہ نویس بھی اتنی عزت رکھتا تھا اس معاشرے میں جتنی شاید ایک وزیر یا امیر کبیر نہیں رکھتا تھا۔

ناصر نے بستر مرگ پر نقاہت اور بیماری کے باوجود اپنی یادوں کے در وا کر کے اس منظر کی نقاب کشائی کر دی ہے جو انبالہ سے لاہور کو مسکن بناتے وقت انہیں در پیش تھے۔ ناصر لاہور سے ایف اے کرنے کے بعد جب انبالہ گئے تو انہوں نے اپنے والدین سے اس وقت لاہور کے لئے ہجرت کو کہا تھا مگر ان کے والد نے ناصر کی اس بات پر یقین نہیں کیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے ناصر نے یہاں تک والد سے کہہ دیا تھا کہ آپ کو حقہ تک اٹھانا بھول جائے گا اور پھر وہی ہوا جو ناصر نے کہا تھا چنانچہ تیرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ناصر نے اپنی زندگی کا ایک منفرد قیمتی سرمایہ جو کبوتروں کی صورت میں تھا انبالہ کے ایک رئیس باوا سنت سنگھ کے حوالے کیا اور اپنے والدین عزیز و اقارب کے ساتھ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۷ء بروز اتوار لاہور کی راہ لی۔ ۸۴؎ ہجرت کرتے وقت ناصر کاظمی کے والدین اور عزیزوں بلکہ انبالہ کے باسیوں کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ روپڑ سے چلنے والی مسلمانوں کے ٹرین کو راستے میں روک کر ہندو اور سکھوں نے تمام مسلمانوں کو شہید کر دیا ہے۔ اس سانحہ کا اثر انبالہ کے باسیوں پر پڑنا فطری بات تھی۔ سب کے سب انجانے خوف سے سہمے ہوئے تھے اس کے رد عمل میں راولپنڈی میں ہندوؤں کی ایک ٹرین کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا اس لئے حالات کافی مخدوش تھے۔ ہندو جاٹوں اور سکھوں کے جتھے مسلمانوں کے قافلوں پر جگہ جگہ حملہ آور ہو رہے تھے۔ جہاں کہیں نہتے مسلمانوں کو دیکھتے انہیں لوٹتے بھی اور تہہ تیغ بھی کرتے بہت سی مسلمان عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ بہت سی مسلمان خواتین کو اغوا کر لیا گیا۔ ظلم و بربریت کی یہ ہولی جگہ جگہ پر مسلمانوں کے خون سے کھیلی جا رہی تھی وہ لوگ جو صدیوں سے ایک جگہ ایک مقام پر اکٹھے رہتے چلے آ رہے تھے جو ایک دوسرے کے تہواروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے یہ سارا منظر ناصر کاظمی کی آنکھوں کے سامنے تھا ہر کسی کو یہی دھڑکا تھا کہ کہیں سکھوں اور ہندوؤں کا

کوئی جتھا ان پر حملہ آور نہ ہو جائے جان و مال سے زیادہ سیدانیوں کی عزت اور عصمت کی حفاظت کی فکر تھی تمام راستے یہی دھڑکا لگا رہا لیکن خدا کا شکر ہے کہ انبالہ کے مسلمان خیر و عافیت کے ساتھ اس خطہ سر سبز اور اس جنت بے نظیر کی دھرتی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ آج کل انبالہ کے پرانے مکینوں کے مسکن زیادہ تر سرگودھا' گوجرانوالہ' ملتان اور لاہور میں ہیں جبکہ یہاں کے پرانے باسی پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

یہی وہ ہجرت تھی جو ناصر کی تخلیقات میں یادوں کی خوشبو کی طرح محسوس ہوتی ہے اور یہی وہ ہجرت تھی جو انتظار حسین اور ناصر کاظمی کے مابین دوستی اور تخلیق کی قدر مشترک بنی۔ ناصر کاظمی کی شاعری ہو یا نثر یادوں کی خوشبو جگہ جگہ اپنی پہچان کراتی محسوس ہوتی ہے ناصر کاظمی نے انتظار حسین سے مکالمہ کے دوران کیا تھا۔

"بات یہ ہے کہ جس طرح عطر کی شیشی آپ کھولتے ہیں تو خوشبو آپ کو آتی ہے تو پھول اور باغ تو نظر نہیں آتے تو شاعری میں میری یہ تمام واقعات براہ راست تو آپ کو نظر نہیں آئیں گے البتہ یہ ہے کہ وہ جو یادیں ہیں جو زمانہ تھا ہماری غلامی کا اور جس میں ہم جینے کی کوشش کر رہے تھے ..... تک دو کو میری شاعری کے آہنگ میں' رنگوں میں' لفظوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔"۸۵

ناصر کاظمی کی یادوں کے یہ رنگ "برگ نے"' "دیوان"' "پہلی بارش" میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ناصر نے ہجرت کے اس درد کو آنے والے روشن دنوں کے آئینے میں بدلتے ہوئے بھی دیکھا اور اپنی یادوں کو مایوسیوں کا مسکن بنانے کی بجائے نئی امیدوں اور تمناؤں کا گہوارہ بنایا۔ وہ کہتے ہیں۔

مایوس نہ ہو اداس راہی
پھر آئے گا دور صبحگاہی
اے منتظر طلوع فردا
بدلے گا جہان مرغ و ماہی
پھر خاک نشیں اٹھائیں گے سر

مٹنے کو ہے ناز کجکلاہی
انصاف کا دن قریب تو ہے
پھر داد طلب ہے بیگناہی
پھر اہل وفا کا دور ہو گا
ٹوٹے گا طلسم کم نگاہی
آئین جہاں بدل رہا ہے
بدلیں گے اوامر و نواہی۔۸۶

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہجرت کا عمل ناصر کاظمی اور انتظار کی تخلیقات میں بہت ابھر کر آیا ہے۔ ناصر نے ہجرت کو جس طرح سے محسوس کیا اس کا کچھ تو اظہار ہو چکا ہے۔ انتظار حسین کے نزدیک ہجرت کیا ہے اس بارے میں انتظار حسین ناصر کاظمی سے ہم کلام ہوتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ہر فن کار کے ہاں ہجرت کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور کئی سطحوں پر یوں ہمارے یہاں اس وقت ہجرت ایک وقت کا مسئلہ سمجھی جاتی ہے اور اکثر شاعروں اور افسانہ نگاروں کے لئے تو وہ ایک Obsession بن گئی ہے بلکہ جہاں افسانہ کسی رخ پر چلتا نظر نہ آیا تو فسادات کا ذکر لے آئے یا ہجرت کا۔ ان تحریروں میں آج کل کی ہجرت کی بات بھی پوری طرح نہیں آتی اور اگر آ بھی جائے تو وہ کوئی ادب نہیں بنتی۔ ہجرت تو انسان کی تاریخ ہے۔ جنت کی ہجرت سے لے کر آج تک کی ہجرت تک انسان نے جس جس طرح ہجرت کی ہے دیس چھوڑے ہیں اور دیس بسائے ہیں جب تک ان کا کوئی عکس تہہ میں جاری و ساری نہ ہو تو پھر وہ ہجرت کی داستان کیا ہوئی۔"

آگے چل کر انتظار حسین مزید کہتے ہیں۔

"میں نے ابھی کہا تھا کہ ہر فن کار کے یہاں ایک بچہ ہوتا ہے اس بچے کو گم شدہ جنت کی دھن رہتی ہے لیکن جنت کو آنکھوں میں چھپائے پھرنا فن کا منتہا نہیں ہے۔ جنت تو وہ ہے جو باہر آئے۔ انسان نے جب بھی ایک جنت چھوڑی ہے دوسری جنت بسائی ہے اس کا تو یہ دعویٰ رہا ہے کہ مجھے

کس کس جنت سے نکالو گے میں اپنی جنت ساتھ لئے پھرتا ہوں تم مجھے ریگستان میں چھوڑ دو گے میں خانہ کعبہ کھڑا کر دوں گا' اگر ہم اس نکتہ کو سمجھ لیں تو پھر رونے دھونے کا سوال تو ختم ہی ہو جاتا ہے۔ پرانی جنتوں کی یاد میں رونا دھونا خواہ وہ جنت میرا بائی کی ہو یا میر اور نظیر کی۔ جہاں یہ رونا دھونا نظر آئے تو سمجھ لو کہ یہ ہے پرانی نسل کی آواز اور ظاہر ہے کہ تخلیق کا معاملہ جنت کو رونا نہیں ہے بلکہ نئی جنت تعمیر کرنا۔" ۸۷

انتظار حسین نے ہجرت کی جو تعریف کی ہے اس کے سبب ہجرت کا عمل بامعنی ہو گیا ہے۔ اس تعریف کی حوالے سے اگر ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن کو دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ناصر کاظمی نے جہاں کھوئی ہوئی جنت کو یاد کیا وہاں اس نے تعمیر کی ایک نئی جنت بھی بسائی۔ ناصر کاظمی ان سچے تخلیق کاروں میں شامل ہے جو اپنی جنت ساتھ لئے پھرتے ہیں جہاں لفظوں کے خیمے لگا دیئے ایک نئی جنت آباد ہو گئی۔ سو ناصر کاظمی نے بھی ایک جنت چھوڑ کر دوسری جنت بسالی۔ یہ جنت بھی پہلی کی طرح خوبصورت تھی مگر پہلی والی جنت کی کچھ یادیں ہمیشہ اس کی دامن گیر رہیں۔

پہلی سکونت ::

ناصر کاظمی جب لٹے ہوئے قافلے کے ہمراہ لاہور پہنچا تو اس لٹے ہوئے قافلے کے لئے لاہور میں کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ پہلے کسی مہاجر کیمپ میں ڈیرہ کیا وہاں سے فین روڈ پر کچھ عرصہ کے لئے ٹھکانہ ملا مگر وہ بھی چھن گیا بالآخر پرانی انارکلی میں رہنے کو ایک مکان مل گیا۔ اس بارے میں صغرابی بی لکھتی ہیں:

"آخر وہی ہوا جو ہونا تھا ایک دو بستر اور بکسوں کے سوا کچھ نہ لا سکے۔ جس تکیہ کے غلاف میں نقدی نوٹ سی رکھے تھے وہ بھی اس وقت راستے میں گم ہو گیا ادھر والد صاحب کی پنشن ہو گئی۔ گھر کا سامان کچھ ساتھ نہ تھا آخر فین روڈ پر ایک کوٹھی میں قیام کیا جس میں بہت سامان تھا۔ فرش، قالین، چینی کے برتن، ہر طرح کا فرنیچر، ستار، سارنگی،

شطرنجی میزیں، سنگھار میز، الماریاں۔ ایک دو ماہ اس گھر میں رہے پھر ملٹری نے حکم دیا کہ یہ کوٹھی کسی افسر کو الاٹ ہو گئی ہے آپ خالی کر دیں۔ ناصر نے کچھ سامان، شطرنجی میز، دو پلنگ، مسہری اور دو چار برتن لے لئے کہ جب کوئی مکان مل جائے گا استعمال کریں گے۔ آخر پرانی انار کلی میں ایک مکان ان کے تایا زاد بھائی نے دلوا دیا۔ مکان کافی بڑا اور کئی منزلہ تھا۔ ناصر کی والدہ نے اپنے ماموں کو بلا لیا۔ اوپر کی منزل انہیں دے دی۔ اس کے بعد ممانی صاحبہ نے اپنی بیٹیوں کو بلا لیا ایک منزل میں ماموں جان دوسری منزل میں ماموں کی چھوٹی بیٹی اور نیچے ناصر کی والدہ، ایک بیٹھک اور پیچھے کا کمرہ اور باورچی خانہ ماموں کی بڑی بیٹی نے سنبھال لیا جس طرح ہو سکا ناصر کے والد نے گزارا کیا کیونکہ سب نازک مزاج اور کھلی ہوا کے رہنے والے تھے اس واسطے تمام دن صبح و شام، موری میں پانی ڈالتے اور دھوتے کہ بدبو نہ آئے۔ ادھر پیسے کی تنگی، اشرفیوں کا ہار توڑا ایک ایک کر کے فروخت کیا اور وقت گزارا، ناصر نے نوکری کی جستجو شروع کر دی۔ سیالکوٹ میں ملازم بھی ہو گیا۔ مگر اچانک ناصر کے والد بیمار ہو کر ہسپتال داخل ہو گئے۔ ناصر کو اطلاع دی گئی۔ ناصر فوراً پہنچا مگر اگلے روز ہی والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ۸۸"

ہجرت کے بعد ناصر کاظمی اور ان کے خاندان نے جن حالات کا سامنا کیا وہ اقتباس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے نہایت کسمپرسی کے عالم میں دن بسر کئے یہاں تک کہ زیور بیچ کر گزارا کیا۔ ناصر کاظمی جس نے شہزادوں کی سی زندگی بسر کی تھی انار کلی کے ایک معمولی مکان کے ایک کمرے میں رہ رہا تھا۔ اس کمرے کے بارے میں انتظار حسین کا کہنا ہے کہ اتنا تاریک تھا کہ دن کو بھی رات کا گمان ہوتا تھا۔ اسی میں ناصر کی کتابیں بکھری ہوتیں۔ یہیں پر وہ شاعری کے جگنو تلاش کرتا۔ ہجرت کی صعوبتوں نے ناصر کاظمی کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا مگر ایک نئی جنت بسانے کی آرزو نے اسے حوصلہ دیا مگر یہ حوصلہ بھی اس وقت ماند پڑ گیا جب ناصر کاظمی کی عزیز ترین متاع ان

کے والد ان سے جدا ہو گئے۔ یہ سانحہ ناصر کو ۳۰ مئی ۱۹۴۹ء کو پیش آیا۔۸۹۔ ابھی ناصر اس دکھ سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۹ء کو ان کی والدہ انتقال کر گئیں۔۹۰۔ ناصر کاظمی کی دنیا ایک مرتبہ پھر اندھیر ہو گئی۔ اب ناصر تھا اور اس کا چھوٹا بھائی عنصر جس سے ناصر کو بے حد پیار تھا اور ناصر کاظمی نے اپنے اس چھوٹے بھائی کی پرورش اپنے بچے کی طرح کی۔ عنصر کاظمی کا کہنا ہے "کہ والد اور والدہ کے انتقال کے بعد میرا سب کچھ پاپا ہی تھے۔ وہی میرے والد تھے اور وہی ماں۔ انہوں نے مجھے اتنا پیار دیا کہ مجھے سر پر کبھی یتیمی کا سایہ ہی محسوس نہیں ہوا۔ میں انہیں ہمیشہ بھائی جان کی بجائے پاپا جی ہی کہا کرتا تھا۔۹۱"

والد اور والدہ کے انتقال کے بعد ناصر کاظمی کی اداسی اور گھنیری ہو گئی۔ بے روزگاری نے ناصر کو اور زیادہ غمگین کر دیا۔ والد کے انتقال کے بعد ناصر نے اپنا رسالہ نکالنے کی ٹھانی یہ رسالہ نکلا بھی مگر چل نہ سکا۔

ناصر کاظمی نے بے روزگاری سے تنگ آ کر اپنا رسالہ اوراق نو نکالا۔ قیام پاکستان کے بعد پہلے تو ناصر کاظمی نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کی کلاس میں داخلہ لے لیا کچھ دن کالج گئے مگر پھر بی۔ اے کرنے کے لئے کلاس میں باقاعدگی نہ رہی سو بی۔ اے ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ انتظار حسین نے ناصر کاظمی سے ان کے آخری انٹرویو میں دریافت کیا تھا کہ تم نے کچھ رسالے وسالے بھی نکالے تھے اس پر ناصر نے کہا تھا:

> "ہاں ایک پرچہ اس زمانے میں ---------- نوکریاں وغیرہ غربت میں ڈھونڈیں پہلے ملتی نہیں تھیں' پھر ایک ملی' تو پھر ایک پرچہ نکالا "اوراق نو" ---------- وہ یہاں پڑا ہے ذرا اس کا ٹائٹل دیکھو اور اندازہ کرو میں اور ریاض قادر ---------- یہی یہی ---------- جلد والا ---------- میں اور ریاض قادر دو سر پھرے تھے۔ ریاض قادر' سر عبدالقادر اور عبدالرحمٰن چغتائی مصور مشرق اس کے سرپرست تھے اور یہ دیکھو تمہیں اس کا ٹائٹل دکھاتا ہوں ---------- یہ سب سے پہلے ڈبل پرنٹنگ شاید خاکسار نے

کی اور پرچوں میں بعد میں۔۔۔ ۹۲"

اوراق نو نہ چل سکا تو ناصر کاظمی ہمایوں کے ایڈیٹر ہو گئے ہمایوں جیسے ادبی مجلّہ کا ایڈیٹر ہونا ناصر کے لئے باعث اعزاز تھا مگر کچھ عرصہ بعد یہ بھی بند ہو گیا اس بارے میں ناصر کاظمی انتظار حسین کو بتاتے ہیں :

" "ہمایوں" کے بارے میں علامہ اقبال کا بڑا مشہور فقرہ ہے کہ جب ہمایوں کا اجرا ہوا تو انہوں نے میاں بشیر احمد مرحوم کو لکھا کہ اس ہمایوں کو کوئی شیر شاہ زک نہیں پہنچا سکتا اور ایسا ہوا عجیب بات ہے انتظار کہ ــــــــــــ زک پہنچائی اور یہ میرے ہاتھوں بند ہوا (انتظار حسین ہنستے ہیں) مجھے اس کی بہت تکلیف بھی ہے اور ایک بات یہ ہے کہ پہلا سالنامہ ہے ہمایوں کا اس پر یہ دیکھئے مصور عبدالرحمٰن چغتائی کی اسکیچنگ ہے جو مجھے انہوں نے دی تھی یہ میں نے پہلی بار ہمایوں میں تبدیلی کی تھی۔۔۔ ۹۳"

ناصر کاظمی آگے چل کر بتاتے ہیں :

" اس رسالے کا پانچ برس مدیر رہا بلکہ نائب مدیر، مجھے میاں بشیر احمد یاد آ گئے تو اب اس کے بعد ایک اور پرچہ ــــــــــــ جب ہمایوں بند ہوا تو پہلے میں نے سوچا کوئی کاروبار کریں پھر ایک اور پرچہ نکالا ان دنوں ۱۹۵۷ء کا سن تھا تمہیں یاد ہے تمہارے ساتھ مل کر۔ تم میرے ساتھ مدیر تھے۔ یہ پرچہ "خیال" آزادی نمبر نکالا جس کا ٹائٹل حنیف رامے نے بنایا تھا یہ میرے پرانے بیماروں میں سے تھا مگر اب بہت صحت مند ہو گیا ہے اور یہ دیکھئے "خیال" تمہارا نام بھی اس میں ہے اور اتفاق ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ بعد میں اس کو کتابی صورت میں بھی مرتب کیا گیا یہ دیکھئے لکھنؤ کا مورچہ۔ کیسی کیسی تصویریں ہم نے جمع کیں۔ سارا سارا دن ہم پھرتے تھے۔ دیکھو اس میں دلی کا مورچہ تمہیں دکھاؤں۔ یہ دیکھئے ۔ یہ دیکھئے۔ معاف کیجئے۔ دیر ہو گئی تصویریں ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔ یہ پرچہ اور یہ ہیں میری

کتابیں۔ کتابیں کیا دراصل یہ کتاب ہے "برگ نے" یہ میری غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے اور آخری بھی اب تک۔ یہ سن ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا اس میں ستر کے قریب غزلیں ہیں اور تمہیں پتہ ہے کہ جب یہ کتاب چھپی تو میرے لئے میری زندگی میں سب سے نیا واقعہ تھا اور اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا اور تیسرے ایڈیشن کے میں اب تک انتظار میں ہوں۔ ناشر کہتے ہیں کریں گے اور اس کے بعد یہ دو۔ انتھالوجیز ہیں۔ بہترین شاعری ---------- سن ۱۹۶۳ء کی اور ۱۹۶۹ء کی یہ حلقہ ارباب ذوق کی طرف سے میں نے مرتب کی تھیں۔ یہ دونوں کتابیں اور اس میں تمام اردو کے شعرا کا سال کا بہترین کلام انتخاب کیا تھا اور اس کے بعد یہ کتاب ہے جس کو مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے دیکھ کر۔ یہ اس کتاب کا نام ہے۔ "فراق گورکھپوری کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ غزل۔ تو یہ انتخاب حال ہی میں شائع ہوا ہے اس کے علاوہ میری تین چار کتابیں ہیں جو مرتب کر رہا ہوں اور انشاء اللہ اب شائع ہوں گی۔۔۔۹۴"

اس اقتباس میں ناصر کاظمی نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی ابتدائی تخلیقی زندگی پر روشنی ڈال دی۔ لاہور میں آمد کے بعد وہ "پہلے اوراق" نو نکالتے رہے اس کے بعد ہمایوں کے ایڈیٹر ہو گئے اس رسالے کے بند ہو جانے سے ناصر کاظمی کی مالی مشکلوں میں اضافہ ہو گیا۔ ناصر نے ہمایوں کے یادگار شمارے شائع کئے اس کے اچانک بند ہو جانے سے انہوں نے انتظار حسین کے ساتھ مل کر "خیال" نکالا اس کا "۱۹۵۷ء نمبر" بقول انتظار حسین :۔

"کیا پاکستان، کیا ہندوستان، تمام مورخوں اور محققوں پر بھاری تھا۔۔۹۵"

بقول انتظار حسین :

"یہ رسالہ بھی نہ چل سکا ناصر کہتے کہ بہت خط و کتابت کر رہا ہوں بہت بلٹیاں بھیج رہا ہوں بہت آرڈر اور بہت منی آرڈر آ رہے

ہیں مگر گھر کا نقشہ چغلی کھاتا تھا کہ یہاں کوئی منی آرڈر موصول نہیں ہوا۔ وہ ذخیرہ عرصہ تک گھر میں رکھا رہا۔ آخر ایک ناشر کے ہاتوں اونے پونے فروخت ہوا۔۹۶"

ناصر کاظمی کو مسلسل مالی طور پر ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا مگر ادبی اعتبار سے ان کا قد مزید بلند ہو رہا تھا وہ باقاعدگی کے ساتھ حلقہ ارباب ذوق کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ پاک ٹی ہاؤس میں بے شمار ان کے چاہنے والے ان کی آمد اور ان کی سحر انگیز گفتگو کے منتظر ہوتے۔ لاہور میں ان کا حلقہ احباب کافی وسیع ہو گیا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے جو دوست یہاں تھے ان سے تجدید ملاقات ہو گئی۔ نئے دوستوں میں انتظار حسین' احمد مشتاق' شیخ صلاح الدین' حنیف رامے' عبدالحمید' منیر احمد شیخ' صلاح الدین محمود' غالب احمد' سجاد باقر رضوی' مظفر علی سید' نور عالم' شہزاد احمد' ہوش ترمذی' مختار صدیقی' انور جلال' انور شبنم دل' ریاض قادر' اے حمید' صوفی جبار' چودھری انوار احمد' سعید محمود شامل تھے۔ نوجوانوں میں اسلم انصاری' انوار انجم اور احمد عقیل روبی نمایاں تھے۔ جبکہ قیام پاکستان سے پہلے حمید نسیم' حفیظ ہوشیارپوری' عبدالمجید بھٹی' جیلانی کامران' شہرت بخاری' سید عابد علی عابد' ڈاکٹر تاثیر' حفیظ جالندھری' احسان دانش' احمد ندیم قاسمی' قتیل شفائی' جگر مراد آبادی' اختر شیرانی سے ان کی ملاقات ہو چکی تھی۔

ناصر کاظمی کو پاکستان میں بحیثیت جدید شاعر شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب عسکری صاحب نے اس شاعر کو اپنے کالموں کا موضوع بنایا۔ اس ضمن میں انتظار حسین اپنے مضمون "چار گھڑی یاروں کا میلہ" میں لکھتے ہیں:

"۱۹۴۸ء کے اواخر کی بات ہے عسکری صاحب گزرتے گزرتے "نظام" کے دفتر میں آکر مجھ سے کہہ گئے کہ پانچ بجے ایک صاحب آئیں گے ناصر کاظمی ان کا نام ہے مجھے آنے میں دیر ہو جائے تو انہیں بٹھا لینا۔ میں نے بے تعلقی سے یہ سنا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ بتائے ہوئے وقت پر ایک نوجوان آیا سانولی رنگت' چھریرا بدن' کالی اچکن' عسکری صاحب کا پوچھا' میں نے کہا بیٹھ جایئے آتے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ شخص بے پروائی سے سگریٹ پیتا رہا۔ میں بے تعلق بیٹھا اپنا کام کرتا رہا۔

عسکری صاحب آئے تو ہم تینوں اٹھ کر کیفے اورینٹ میں، جو اب معدوم ہو چکا ہے، جا بیٹھے۔ وہاں ناصر کاظمی نے غزلیں سنانی شروع کیں۔ مجھ پر کچھ ان غزلوں نے اثر کیا۔ کچھ عسکری صاحب کی بے تحاشا داد نے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ آج میں ایک نئے شاعر سے متعارف ہوا ہوں۔ اس نشست میں ناصر نے یہ غزل بھی سنائی تھی:

یہ شب یہ خیال و خواب ترے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

جو عسکری صاحب نے عالم فریفتگی میں وہیں نقل کر لی پھر ۱۹۴۹ء کے آغاز کے ساتھ ساتھ یہ غزل "ساقی" میں شائع ہوئی اور ساتھ ہی جھلکیاں میں اعلان ہوا کہ پاکستان کو بالآخر ایک شاعر میسر آگیا ہے۔۔۹٦"

بقول انتظار حسین: یہ ناصر سے ان کا پہلا تعارف تھا اس کے بعد ملاقات ہوئی تو وہ موسم پت جھڑ کا تھا۔ اس موسم میں انتظار حسین اور ناصر کاظمی کی ملاقات نے بہار کی صورت اختیار کر لی۔ انتظار حسین کا یہ مزاج ہے کہ وہ پہلی ملاقات یا تعارف میں کسی سے نہیں کھلتے بالکل بڑے روکھے انداز میں ملتے ہیں اور ہاتھ بھی پورا نہیں ملاتے مگر جب کسی کی کسی بات سے متاثر ہو جائیں تو پھر ان کا ملنا اور طرح کا ہوتا ہے یہاں بھی انہوں نے ناصر کاظمی سے پہلے بے رخی برتی مگر جب کھلے تو کھلتے چلے گئے اور مرتے دم تک دوستی نبھائی۔ انتظار حسین، احمد مشتاق، شیخ صلاح الدین، حنیف رامے کے ساتھ ناصر کاظمی کی ملاقاتیں تخلیقی ہوا کرتی تھیں۔ کئی ایک یادگار مکالمے ان کے مابین ہوئے جو اب تاریخ ادب کا حصہ ہیں۔ احمد مشتاق نہ صرف اچھے شاعر ہیں بلکہ وہ ناصر کے بہت قریب ہونے کے ناتے سے بھی انہیں بے حد عزیز تھے۔ ناصر جب کوئی نئی غزل کہتے تو سب سے پہلے احمد مشتاق ہی کو سناتے۔ انتظار حسین، شیخ صلاح الدین اور حنیف رامے کے مابین مختلف موضوعات پر جو مکالمے ہوئے انہیں احمد مشتاق ہی قلمبند کرتے رہے۔ شیخ صلاح الدین جن سے ناصر نے مغربی ادب کے بارے میں بہت فیض حاصل کیا ان مکالموں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ناصر، انتظار حسین، حنیف رامے اور میں برسوں دوپہروں، سہ پہروں، شاموں، راتوں کو چائے خانوں، سڑکوں، بند راہوں پر یوں ہی

پھول برساتے رہے۔ ہواؤں میں فضاؤں میں گلزار کھلاتے رہے' آباد کرتے رہے ان کے کچھ پرتو اور آثار خوشبو کی ہجرت اور رفتار کا بدن میں مکالمات کی صورت میں محفوظ ہیں۔ ان دو مکالموں کے بعد تیسرا اور چوتھا مکالمہ اس لئے نہ ہوا کہ مکالمہ کے تصور سے انتظار حسین کو اور ناصر کو تکبر کی بو آتی تھی اور تکبر کے خیال سے وہ ڈر گئے کیونکہ مکالمے تو افلاطون نے لکھے تھے یا پھر مہاتما بدھ سے منسوب ہیں جو ہم تک پہنچے ہیں۔ افلاطون کے مکالمے صرف افلاطون کے ذہن کی تخلیق تھے اور ہمارے مکالمے چار مختلف ذہنوں کی۔ مگر اگر ان کو بغور اور تعصب کے بغیر پوری صلاحیتوں کے تعاون سے پڑھا جائے تو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک خلق جدید ہے جو بظاہر چار ذہنوں' تخیلوں کے تعاون سے وجود میں میں آئی ہے مگر ہر انفرادی ذہن اور تخیل سے آزاد ہے۔۹۷

شیخ صلاح الدین

اقتباس از ناصر کاظمی "ایک دھیان"

شیخ صلاح الدین کے اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دوست محض آپس میں گپیں ہی نہیں لگاتے تھے بلکہ ادب اور اس کی رویوں کے حوالے سے سنجیدہ گفتگو بھی کرتے تھے۔ اکثر ان کی گفتگو اردو انگریزی ادب اور فلسفہ کے حوالے سے ہوتی تھی۔ شیخ صلاح الدین بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ان کی کاظمی سے ملاقات ہوئی تو ناصر کاظمی کے گفتگو کے سحر نے انہیں بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔

ناصر بہت ذہین تھے وہ تمام مغربی ناقدین اور شاعروں سے آشنا ہونے کے باوجود بحث کو زیادہ سنجیدگی کی طرف مائل نہیں ہونے دیتے تھے اور ہلکی پھلکی تنقید کر کے ایسی بات کہہ جاتے تھے کہ سب سننے والے ورطہ حیرت میں پڑ جاتے تھے۔ شاعری ہو یا تنقید یا پھر عام گفتگو ناصر اپنے سننے والوں کو ہمیشہ حیران کرنے کا گر جانتے تھے۔

ان کی یہ حیرانیاں ان دنوں بھی رنگ لائیں جب وہ ٹی ہاؤس آتے تو نوجوانوں کا ایک جمگھٹا ان کے اردگرد ہوتا۔ ان کی گفتگو میں ایک ایسا سحر تھا کہ ہر

نوجوان ان کی جانب کھنچا چلا آتا تھا۔ انتظار حسین لکھتے ہیں کہ

"یوں ناصر کی شخصیت میں بہت جادو تھا اور بھیگتی مسوں والوں پر تو جانے وہ کیا پڑھ کر پھونکتا تھا کہ وہ اس کے ہو رہتے تھے۔ آدمی ٹٹول کر چاہے کوئی لاتانی ہاؤس پہنچتے پہنچتے وہ ناصر کا بن جاتا تھا سو مظفر علی سید کو باری باری کر کے غالب احمد، حنیف رامے اور احمد مشتاق سے دستبردار ہونا پڑا۔ ناصر نے دھیرے دھیرے سب اچھا مال سمیٹ لیا اور مظفر کے لئے خالی شہزاد احمد چھوڑ دیا۔ مگر اس حوصلہ مند نے اسی خاک کی چٹکی سے ایک نیا جہان تعمیر کرنے کی ٹھانی۔۔۔۹۸"

ناصر کاظمی کی شخصیت کی تفہیم کے لئے انتظار حسین کا یہ مضمون ہر اعتبار سے اہم ہے اس مضمون میں انتظار حسین نے ناصر کاظمی کی پہلو دار شخصیت کی ایک ایک کر کے گرہیں کھولی ہیں۔ اس اقتباس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ناصر کاظمی نوجوان تخلیق کاروں میں کس قدر محبوب تھا اور اس کی بنیادی وجہ ناصر کاظمی کی وہ رومانوی شاعری تھی جس کے اشعار میں ہر نوجوان اپنے دل کو دھڑکتے ہوئے محسوس کرتا تھا ایک مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ ناصر کاظمی نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے ایک غزل سنائی اور مظفر علی سید نے کھمبے سے ٹکریں مار مار کر خود کو لہو لہان کر لیا۔ ایک مرتبہ مظفر علی سید نے احمد مشتاق سے رات ستاروں کے سائے میں خاموش رستے پر چلتے ہوئے ایک غزل سنی۔ بقول انتظار حسین پھر لرزتے ہاتھوں سے مشتاق کی ہتھیلی تھامی۔ مشتاق نے محسوس کیا کہ کوئی گرم بوند ہتھیلی پر گری ہے وہ ایک تازہ آنسو تھا جو ابھی مظفر کی آنکھ سے ٹپکا تھا اور مظفر نے رقت بھری آواز سے کہا مشتاق' میں اس غزل کی داد اسی طرح دے سکتا ہوں۔ مشتاق تنگ ظرف نکلا اگلے دن یہ خبر ناصر تک پہنچی ناصر سے ہم سب یاروں تک پہنچی۔

واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے
بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا

میرا مطلب یہ نہیں کہ ناصر نے یہ شعر اس واقعہ سے متاثر ہو کر لکھا اگرچہ ہے یہ شعر اسی زمانے کا۔۔۹۹"

ناصر کاظمی نے شاعری میں اپنا جانشین احمد مشتاق کو قرار دیا تھا اور اندازہ کیجئے مظفر علی سید جیسا جید نقاد ان دونوں شاعروں ہی سے اس قدر متاثر ہوا کہ ایک کے شعر سن کر لہو لہان ہو گیا۔ تو دوسرے کے شعر سن کر آنسو بہا دیئے۔ یہی ناصر کی شاعری اور شخصیت کا کمال تھا۔ ناصر کی شخصیت کے حوالے سے ناصر کو پوری طرح جاننے کے لئے انتظار حسین، شیخ صلاح الدین، عبدالحمید، منیر احمد شیخ، صلاح الدین محمود اور صغرا بی بی کی تحریریں نہایت اہمیت کی حامل ہیں جبکہ ناصر کاظمی کی شخصیت کے ابھی کئی ایسے گوشے منکشف ہونے باقی ہیں جن کے راوی وہ پان فروش، تانگے والے، وہ چھابڑی والے، وہ کبوتر باز، وہ مالی، وہ لوک فنکار ہیں جن کی ناصر سے دوستی تو تھی مگر ان کے پاس قلم نہیں ہے کہ کچھ لکھتے۔ ناصر کاظمی کا وہ تانگے والا دوست جس نے ناصر کا صرف ایک شعر سن کر اس سے کبھی کرایہ نہیں لیا اور ہمیشہ ناصر کا گھر جانے کے لئے انتظار کرتا رہا، کس قدر باذوق تھا وہ جہاں رات کا ایک بجتا وہ ٹولنٹن مارکیٹ پہنچ جاتا۔ یہی صورت پان والوں کی تھی بلکہ ناصر کی دوستی تو ہر دوکاندار سے تھی وہ سودا سلف خریدنے جاتے اور دیر تک ان سے محو گفتگو رہتے۔ ناصر کے احباب میں صرف دانشور، سی ایس پی، فوجی، وکیل، ادیب، شاعر اور پڑھے لکھے لوگ ہی شامل نہیں تھے بلکہ ہر طبقے کے چھوٹے بڑے لوگ شامل تھے انہیں سب محبوب تھے اور وہ سب کا محبوب تھا۔ ہمیشہ ناصر نے نفیس لباس زیب تن کیا۔ سردیوں میں براؤن رنگ کا سوٹ پہنے انگلیوں میں قینچی کا سگریٹ سلگائے دبائے ہوئے ناصر کاظمی جب چل رہا ہوتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے گرد و نواح سے بے خبر اپنی ہی دھن میں چلا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ہم عصر سب شعرا میں مختلف تھا اپنی شخصیت کے اعتبار سے بھی اور شاعری کے اعتبار سے بھی۔ وہ دوستوں کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا تھا اور دوستوں کے غم کو اپنا غم تصور کرتا تھا۔ منیر احمد شیخ مرحوم لکھتے ہیں:

"جب کوئی ادیب شاعر دانشور کسی اچھی سی سرکاری نوکری کو حاصل کر لیتا تو اس کے سبھی ساتھی ماتم کرتے سوائے ناصر کاظمی کے۔ ناصر کاظمی اپنے دوستوں سے لڑتا جو یہ کہتے کہ اس شخص نے تو مصالحت کر لی ہے اور اب سیل ہو گیا ہے ادب کی خدمت اسے عزیز

ہوتی تو یہ سودا کبھی نہ کرتا۔ ناصر کہتا آپ سب الو کے پٹھے ہیں آپ چاہتے ہیں کہ وہ اس ٹی ہاؤس میں ساری عمر بیٹھا شاعری کرتا رہتا۔ بیکار بیٹھا بیٹھا مریض بن جاتا۔ ناکارہ ہو جاتا۔ اپاہج ہو جاتا پھر لوگ اس پر رحم اور ترس کھاتے تو آپ خوش تھے ادب ودب جائے بھاڑ میں بھائی صاحب پہلی چیز زندگی میں صحت' قوت اور انسانیت ہے۔ آپ کے یہاں کھانے کو کچھ نہیں آپ معاشرے کو درست کیسے کریں گے۔ اختر محمود' غالب احمد' مظفر علی سید اور نور عالم جب سرکاری ملازمتوں پر چلے گئے تو وہ واحد شخص تھا جو سب سے لڑتا اور کہتا کہ انہوں نے ٹھیک کیا ہے خدا کا شکر ہے کہ یہاں سے نکلے ہیں۔۔۔۱۰۰"

اس اقتباس سے ناصر کاظمی کی زندگی کے حقیقت پسندانہ رویوں کے بارے میں مثبت سوچ کا پتہ چلتا ہے۔ جو لوگ ناصر کاظمی کو محض گپی یا لپاڈیہ کہتے ہیں ان کے لئے منیر احمد شیخ کی تحریر کا یہ اقتباس لمحہ فکریہ ہے ایک ایسا شخص جو سب سے پہلے اہمیت روزگار کو دیتا ہو اور ادیب کو معاشرہ میں باعزت دیکھنا چاہتا ہو بھلا اس کی تمام گفتگو کو محض ہنسی میں اڑا دینے سے تو اس کی بات کا وزن کم نہیں ہوتا اب تک ہم نے ناصر کی شخصیت کا جو جائزہ لیا ہے اس میں یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک تخلیق کار تھا ایک ایسا تخلیق کار جو زندگی کو حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے دیکھنے کا عادی تھا۔ وہ اچھے خواب ضرور دیکھتا تھا اور صدق دل سے ان کی تعبیر کا بھی متمنی ہوتا مگر جب کسی اور کی خواب کی اچھی تعبیر نکلتے دیکھتا تو اس پر خوش ہوتا اپنے مخصوص تکیہ کلام سے کہتا ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ جب منیر احمد شیخ' جو گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار تھے وزارت اطلاعات کے لئے منتخب ہوئے تو تمام دوستوں نے مخالفت کی مگر ناصر کاظمی نے مشورہ دیا کہ تم ان کی باتوں میں مت آؤ تم ضرور جاؤ۔ شاعری اور ادب کا کسی جگہ سے تعلق نہیں ہوتا۔ یوں منیر احمد شیخ نے وزارت اطلاعات میں شمولیت اختیار کر لی اور ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر پہنچے مگر عمر نے وفا نہ کی حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ ناصر کی ایک خوبی یہ تھی کہ ان کے بہت سے دوست تھے وہ دوست بنانے اور دوستی نبھانے کا ڈھنگ جانتے تھے پھر کوئی

دوست یہ سمجھتا کہ میں ہی ان کا سب سے گہرا دوست ہوں۔ راقم جب ۱۹۶۷ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد بسلسلہ ملازمت لاہور آیا تو ناصر کاظمی سے عزیز داری کے سبب ملاقات ہوئی اور میں نے خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے ایم۔ اے اردو میں داخلہ چاہئے میں نے بی۔ اے میں اردو نہیں پڑھی تھی آپشنل کے طور پر اردو پڑھی ناصر کاظمی مجھے سید وقار عظیم کے پاس لے گئے جو قائم مقام صدر شعبہ اردو تھے۔ انہوں نے میرا تعارف کرایا کہ یہ میرا عزیز ہے شعروغیرہ بھی کہتا ہے کیا ہی اچھا ہو اگر آپ اسے اپنی زیر سایہ تعلیم کا موقع فراہم کریں۔ انہوں نے مجھے کچھ دنوں بعد آنے کے لئے کہا جب میں کچھ دنوں بعد پہنچا تو سید صاحب نے ڈاکٹر عبادت بریلوی کو ناصر کاظمی کا حوالہ دیتے ہوئے میرا داخلہ کرا دیا۔ جب میں یہ خوشخبری لئے ناصر کاظمی کے گھر پہنچا اور باہر سے بیل دی تو انہوں نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا کہ میں سید صاحب سے ملا تھا انہوں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ میں نے ناصر کاظمی سے کہا کہ میں تو آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں داخلہ تو ہو گیا ہے اس پر انہوں نے کہا کہ پھر سید صاحب نے مجھے کسی اور کے بارے میں کہا ہو گا چلو تمہیں مبارک ہو اب دل لگا کر پڑھنا۔ اس کے بعد میں رخصت ہو گیا۔

ناصر کاظمی کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ دوسروں کے کام آ کر بے حد خوشی محسوس کرتے تھے۔ خاص طور پر جب انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ کوئی نوجوان بہت ذہین ہے اور تخلیق کار بھی ہے وہ ہر ممکن ہر محاذ پر اس کی مدد کرتے۔ یہ صفت ناصر کاظمی کے علاوہ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی میں بھی تھی اس لئے جہاں نوجوان ادیبوں نے ناصر کو گھیرا ہوتا تھا وہاں باقر صاحب کو بھی ان کے شاگردوں نے ہمیشہ گھیرے رکھا۔ ناصر کاظمی کی باقر صاحب سے بھی بہت دوستی تھی انہوں نے ان کے شعری مجموعے "تیشہ لفظ" کا دیباچہ بھی لکھا۔ سجاد باقر رضوی ایک روز احمد عقیل روبی کو دوستوں کے درمیان گھرا دیکھ کر کہنے لگے۔ "لاہور کے گنبد بے در میں جتنی چاہے گرد اڑاؤ مگر ناصر کاظمی سے بچ کر رہنا اس کا ڈسا پانی نہیں مانگتا" باقر صاحب چلے گئے تو گوہر نوشاہی کہنے لگا "رضوی صاحب سب کو یہی کہتے ہیں ناصر کاظمی ہماری نئی نسل کا مقدر ہے اس سے کوئی بچ نہیں سکتا نہ ہم بچے ہیں اور نہ تم بچ سکتے ہو۔ ناصر کاظمی سے چند ملاقاتوں کے

بعد پتہ چلا گوہر نوشاہی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ میں نے باقر صاحب کو یقین دلایا کہ ناصر کاظمی سے ملنا گھاٹے کا سودا ہے کون اپنا وقت اور نیند برباد کرے۔۔۔۱۰۱"

اصل میں باقر صاحب اپنے شاگردوں کو ناصر سے دور رہنے کے لئے اس لئے کہتے تھے کہ وہ جانتے تھے کہ وہ طالب علم جو حصول علم کے لئے یہاں آئے ہوئے ہیں اگر ناصر کاظمی سے دوستی ہو گئی تو پھر ناصر کاظمی ہی کے ہو رہیں گے اس لئے کہ ناصر کاظمی کی مقناطیسی پرکشش شخصیت کے باقر صاحب نہ صرف قائل بلکہ گھائل بھی تھے۔ ناصر کاظمی باقر صاحب کی بہت قدر کیا کرتے تھے بقول عقیل روبی وہ اکثر کہا کرتے تھے کچھ سیکھنا ہے تو پروفیسر سجاد باقر رضوی کے پاس بیٹھو اگر کچھ ضائع کرنا ہے تو میں حاضر ہوں لیکن بقول عقیل روبی ناصر کاظمی نے ایسے ایسے در کھولے جہاں روشنی ہی روشنی تھی۔ اس روشنی نے نہ صرف ۲ مارچ ۱۹۷۲ء تک اپنے عہد کی نسل کو متاثر کیا بلکہ آنے والے دور پر بھی اپنی شخصیت اور شاعری کی روشنی پھیلا دی۔ یہ روشنی آج کے تخلیق کاروں اور آنے والے اگلے دور کے تخلیق کاروں کے لئے ایسا حصار ہے جس سے بچ نکلنا کسی بھی سچے تخلیق کار کے لئے ممکن نہ ہوگا وہ ناصر کاظمی جس نے کہا تھا کہ

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

یہ تو اس کی فراخ دلی تھی کہ وہ آنے والے دور اور آنے والی نئی نسل سے پر امید تھا۔ وگرنہ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ایک ہی ناصر کاظمی پیدا ہوا ہے جو اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے ایک چونکا دینے والا ایسا تخلیقی جادوگر تھا جس کا جادو ہر پڑھے لکھے اور ان پڑھے کے سر چڑھ کر بولتا تھا اور آج بھی بولتا ہے۔ اس کی پہلو دار شخصیت ہمیشہ ایک معمہ رہی اور اس معمہ کو وہی حل کر سکا جسے ناصر کاظمی کا قرب حاصل ہوا جبکہ اس کی شاعری کی خوشبو نے ہر دھڑکتے دل کی دھڑکن کو مزید تیز کر دیا۔ ناصر کاظمی نے گو یہ شعر کسی اور کے لئے کہا ہوگا مگر یہ اس کی اپنی شخصیت کا ایک مکمل آئین تھا

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ

عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

ناصر کاظمی اور مشاعرے ::

ناصر کاظمی کی شاعری کا چرچا عام ہو چکا تھا وہ ہر جگہ مشاعرے میں مدعو کئے جاتے تھے۔ "برگ نے کے بعد ناصر کاظمی نے چودہ سو لائنوں کی "سر کی چھایا" لکھی جو "سویرا" میں شائع ہوئی اس کے بعد بھی تخلیقی کام جاری رہا۔ بہت سی نظمیں کہیں، غزلیں لکھیں۔ ۱۹۶۰ء میں وہ مشرقی پاکستان گئے۔ شہرت بخاری بھی ہمراہ تھے وہاں کے ماحول نے ناصر کو بہت متاثر کیا۔ شہرت بخاری کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستان کے پانیوں۔ ملاحوں، درختوں، جنگلوں، پرندوں، جزیروں نے ناصر کو حیران کیا۔ اور یہیں سے اس نے "پہلی بارش" کی غزلیں لکھنی شروع کیں۔ انتظار حسین کا کہنا ہے:

> "کہ ناصر ۱۹۵۹ء میں رائٹرز گلڈ کے وفد کے ساتھ مشرقی پاکستان گیا تھا (جبکہ شہرت بخاری نے سن ۱۹۶۰ء میں کہا تھا) دوسرے ادیب وہاں سے رشوگلے اور جھرنا کی باتیں کرتے آئے ناصر نے آکر ہمیں اور قسم کی داستانیں سنائیں "ستوپا" "مہاتما بدھ" دھیان کے کھیت، سبز جھیلوں میں تیرتا چاند اور ہلکورے لیتی کشتی اور بھٹیالی۔ ٹھنڈی رات جزیروں کی۔ جنت ماہی گیروں کی۔ چکمہ قبیلے کے لوگ اور وہ آدمی جس کا باپ مکھی بن گیا۔ ۱۰۲"

اس اقتباس سے بھی ناصر کاظمی کی شخصیت ایک مختلف انداز سے سامنے آتی ہے یہ ناصر کاظمی کا پہلا غیر ملکی سفر تھا اس سے پہلے اس نے مختلف مشاعروں کے سلسلے میں ملک کے گوشے گوشے کا سفر کیا تھا۔ اس نے مشرقی پاکستان کی خوبصورتیوں کو اپنے دل میں بسا لیا اور پھر "پہلی بارش" میں لفظوں کا پیراہن عطا کیا۔ ناصر کاظمی کو بس کے سفر سے چڑ تھی گاڑی کا سفر بڑے شوق سے کرتے تھے اور وہ بھی ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں۔ جہاز کا سفر بھی پسند تھا ایک مرتبہ بہاولپور گئے تو مشاعرے میں شرکت کی۔ کبوتر بازوں سے ملے رات کو سندھ ایکسپریس پر سوار کرانے کے لئے عقیل روبی، نیاز لکھویرا

اور ڈاکٹر سہیل احمد خان گئے تو عقیل روبی نے اپنے شاگرد گارڈ کو کہا ناصر صاحب کا دھیان رکھنا جب گاڑی چل دی تو ڈاکٹر سہیل احمد خان نے عقیل روبی سے پوچھا "یار روبی لاہور سے ہوائی سروس بہاولپور آتی ہے۔ عقیل روبی نے جواب دیا ہوائی سروس تو ملتان بھی نہیں آتی' کیوں؟ کچھ نہیں میں نے ناصر کاظمی سے پوچھا کہ آپ کب آئے تو اس نے جواب دیا کل جہاز سے آیا تھا۔ سو ناصر کاظمی کو اس قسم کی حیرتیں بکھیرنے کی بچپن ہی سے عادت تھی۔ اب گارڈ کا واقعہ سن لیجئے۔

احمد عقیل روبی لکھتے ہیں:

"دو دن بعد ریلوے گارڈ پریشان میرے پاس آیا اور کہنے لگا عقیل روبی صاحب یہ کیسا مسافر آپ نے میرے سپرد کرایا تھا۔"

کیوں کیا ہوا میں نے پوچھا

بہاولپور سے گاڑی چلی تو لودھراں رکی۔ لودھراں سے چلی تو میں نے دیکھا ناصر کاظمی گاڑی سے اتر کر پیدل چل رہے ہیں میں نے گاڑی رکوائی پیچھے بھاگ کر ان کے پاس گیا انہیں گاڑی میں سوار ہونے کے لئے کہا تو کہنے لگے آپ گاڑی لے جائیں میں پیدل آ جاؤں گا۔ میں نے لاکھ منتیں کیں مگر وہ نہ مانے آدھ گھنٹہ اس تکرار میں گزر گیا آخر مسافروں کی بحث و تکرار کے بعد میں نے گاڑی چلا دی آخر یہ ناصر کاظمی کیا چیز ہیں؟

عقیل روبی آگے چل کر لکھتے ہیں میں نے گاڑی کے واقعہ کا ذکر کیا تو کہنے لگے۔

عجیب بے وقوف تھا تمہارا وہ گارڈ۔ میں کہہ رہا تھا جاؤ۔
گاڑی لے جاؤ مگر وہ بہ ضد تھا کہ گاڑی میں بیٹھو
مگر آپ گاڑی سے اترے کیوں؟ میں نے پوچھا

کوئی خاص وجہ نہ تھی مجھے کھڑکی میں سے چاند اکیلا اور اداس نظر آیا مجھ سے اس کا اکیلا پن برداشت نہیں ہوا گاڑی رکی تو میں اتر گیا۔

پھر میں نے پوچھا

پھر کیا چاند کے ساتھ چلتا ہوا ملتان آ گیا۔ چھ بجے پہنچا ریاض انور

کے گھر ناشتہ کیا' سو گیا شام کو انوار انجم سے ملا۔ عرش صدیقی سے ہیلو ہیلو کی۔ رات گاڑی پکڑی لاہور آ گیا۔ یاد رہے کہ لودھراں سے ملتان کا فاصلہ تقریباً ۴۰ میل ہے جو ناصر نے بقول ان کے پیدل طے کیا۔

یہ ناصر کی شخصیت کا ایک اور انوکھا پہلو ہے چاند ہمیشہ ناصر کی کمزوری رہا چاند کی اداسی دور کرنے کے لئے ناصر کا چالیس میل پیدل چلنا ان کی چاند سے جنون کی حد تک محبت کا آئینہ دار ہے۔

یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہر سننے والے کو حیران کرتا ہے۔ ناصر کی ان ہی باتوں کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا۔

"ہم دونوں کسی مشاعرے کے سلسلے میں ہم سفر ہوئے تو میرا جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ باتیں نہیں کر رہا بلند آواز میں شعر سوچ رہا ہے اور اس کی گفتگو ہمیشہ شعر و ادب کے بارے میں ہوتی تھی اور اشعار کے حقیقی مفہوم کو اجاگر کرنے کے لئے وہ زبان و بیان اور جذبہ و خیال کے بے شمار نکات کھولتا جاتا تھا۔[۱۰۳]"

یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی کے حیرت کدہ میں جھانکنے والے احمد ندیم قاسمی بھی تھے جو ناصر کی گفتگو سنتے اور ان کا جی چاہتا کہ سنتے جائیں۔ ناصر کاظمی نے احمد ندیم قاسمی کے ہمراہ بہت سے مشاعرے پڑھے۔ مشاعروں کے بارے میں ناصر کاظمی نے انتظار حسین سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا:

"لاہور میں نیشنل وار فنڈ کا ایک مشاعرہ تھا اس میں یگانہ چنگیزی تھے اس مشاعرے میں' میں یگانہ کو اب بھی بہت بڑا شاعر مانتا ہوں لیکن کمال یہ ہے یگانہ چنگیزی ہوٹ ہوئے اور مجھے دوبارہ سنا۔ یہ تصویر دیکھئے۔ بہرحال۔ پھر پاکستان بنا۔ تو ایک مرتبہ پاکستان بننے کے بعد دو چار میں نے مشاعرے پڑھے۔ گورنمنٹ کالج کا مشاعرہ تھا۔ اس میں میں نے ترنم سے چار غزلیں پڑھیں اور اس میں حضرت جوش بھی تھے حضرت حفیظ جالندھری تھے۔ احسان دانش تھے ندیم قاسمی تھے۔ قتیل شفائی تھے تو ان کے سائے میں میری غزلیں بھی چلیں اور مجھے احساس ہوا کہ میں مشاعرے میں بھی چل سکتا

ہوں۔ مشاعرے میں تمہیں پتہ ہے شعر پڑھنا بڑا مشکل ہے۔ بہر حال اس کے بعد پھر یکایک یہ ہوا کہ مجھے یہ خیال آیا کہ مجھے ترنم کی وجہ سے داد ملتی ہے اور وہ آخری مشاعرہ تھا۔ اس کے بعد میں نے ترنم سے کبھی غزل نہیں پڑھی۔۔۔۱۰۴"

اس اقتباس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مقبولیت جو ناصر کو قیام پاکستان سے پہلے مل چکی تھی وہ قیام پاکستان کے بعد مشاعروں میں جاری رہی۔ ناصر کاظمی شاعری کے بارے میں بہت حساس تھے جونہی انہیں یہ احساس ہوا کہ کہیں لوگ ان کے ترنم کو تو داد نہیں دے رہے انہوں نے ترنم چھوڑ دیا مگر ترنم چھوڑنے کے بعد بھی انہوں نے جو بھی مشاعرہ پڑھا وہ لوٹ لیتے اور کہیں ان کے مقابلے میں اوروں کو بھی داد ملتی۔

آگے چل کر ناصر کاظمی کہتے ہیں:

"ندیم صاحب اور قتیل صاحب خاص طور پر میرے مشاعرے کے ہم سفر ہیں۔ مجھے لے جاتے ہیں اور پاکستان کا شاید ہی کوئی مشاعرہ ہو جہاں میں نہ بلایا گیا ہوں۔۔۔۱۰۵"

ناصر کاظمی نے جب ترنم چھوڑ کر تحت اللفظ پڑھنا شروع کیا اس میں بھی ایک خاص رچاؤ ہوتا تھا آواز بھاری ہونے کے سبب وہ تحت اللفظ بھی بہت عمدہ پڑھتے تھے۔ ان کی شاعری کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پاکستان کے ہر مشاعرے میں مدعو کیے جاتے تھے۔ ناصر کاظمی نے "پہلی بارش" کی پچیس غزلوں کے علاوہ بے شمار فیچر لکھے۔ مضامین لکھے۔ ترجمے کیے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۵۸ء کو محکمہ سماجی بہبود میں لائزون افسر مقرر ہو کے یہاں ۲۲ دسمبر ۱۹۵۸ء تک کام کیا پھر ویلج ایڈ میں نائب مدیر "ہم لوگ" اور اسسٹنٹ پبلیسٹی افسر مقرر ہو گئے یہ زمانہ یکم جنوری ۱۹۵۹ء سے لے کر ۳۱ جولائی ۱۹۶۱ء تک کا ہے۔ یہ زمانہ پاکستان میں مارشل لا کا تھا ناصر کو رت جگوں کی عادت تھی صبح کو تھوڑی دیر کے لئے سوتے اور پھر جاگتے اور دفتر پہنچتے۔ ایک مرتبہ لیٹ دفتر پہنچے تو ایک میجر صاحب ان کے منتظر تھے انہوں نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو ناصر نے کہا کہ میری راتیں جاگتی ہیں صبح گیارہ بجے تو مجھے چیزیں بھی دھندلی نظر آتی ہیں جب ذرا صاف دکھائی دینے لگتی ہیں تو دفتر چلا آتا ہوں اس کے ساتھ ہی جب میجر صاحب

کو معلوم ہوا کہ وہ ناصر کاظمی سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں تو انہوں نے اٹھ کر انہیں سلوٹ کیا اور کہا کہ آپ کی "برگ نے میری شیلف کی زینت ہے۔ فوجی افسر ہوں یا سول افسر ناصر کاظمی کے بہت سے چاہنے والے ہر جگہ موجود تھے۔ احمد عقیل روبی نے اپنی کتاب "مجھے تو حیران کر گیا وہ" میں یہ لکھا ہے کہ ناصر سی۔ ایس۔ پی اور فوجی افسروں سے مرعوب ہو جاتے تھے اور ان سے دوستیاں بتانا فخر سمجھتے درست نہیں۔ ناصر کاظمی بنیادی طور پر شاعر تھے ان کی کبھی یہ خواہش نہیں رہی کہ وہ سی۔ ایس۔ پی افسر بنیں یا فوجی افسر ہوں وگرنہ وہ فوج کو نہ چھوڑتے البتہ نئی نسل کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے وہ سی۔ ایس۔ ایس کرنے کا مشورہ ضرور دیتے تھے ایسا ہی مشورہ انہوں نے انوار انجم کو بھی دیا تھا۔ ناصر کاظمی اگر فوجی افسر سے مرعوب ہوتے تو وہ واقعہ جو منیر احمد شیخ نے اپنے مضمون "چراغوں کا دھواں" میں بیان کیا ہی اس طرح سے رونما ہوتا کہ فوجی افسر ناصر کو سیلوٹ کرتا۔ ناصر کاظمی کو یہ فخر تھا کہ اس کے فین امیر و وزیر افسروں اور کلرکوں سے لے کر عام چھابڑی والے بھی ہیں۔ اس پسند میں تمام کمال ناصر کی پر کشش شخصیت اور اس کی دلوں میں اتر جانے والی شاعری میں تھا۔ ناصر کاظمی گو خود ترقی پسند نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی اعلان کیا مگر ترقی پسندوں کو انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے چونکا دیا۔ بقول انتظار حسین :۔

"بعض ترقی پسندوں کو ناصر کے گزر جانے کے بعد یہ پتا چلا ہے کہ ناصر تو عوام کے دکھ درد سے بھی آشنا تھے "دیوان" کی جن غزلوں نے ان سادہ دل ترقی پسندوں کو ورطہ حیرت میں غرق کر رکھا ہے وہ ان یاروں کے لئے حیرت انگیز نہیں ہو سکتیں جنہوں نے گرم و سرد راتوں میں ناصر کو خاک نشینوں اور گدڑی پوشوں سے گھلتے ملتے دیکھا ہے۔ یہ گھلنا ملنا کسی نظریے کے واسطے سے نہیں تھا اور نظریے کے واسطے سے گھلنے ملنے کی منزل تو کم ہی کم آتی ہے اور دور ہی دور سے اظہار محبت ہوتا ہے درمیانی فاصلہ طے نہیں ہوتا۔"

سو ناصر کی محبتوں میں بھی انفرادیت تھی وہ لوگوں کے دکھ درد سمجھتا بھی تھا اور بانٹتا بھی تھا، مگر بس میں سفر کرنے کے سخت خلاف تھا۔ جب کوئی ایسا ناخوشگوار تجربہ

ہوتا تو اپنے کپڑوں کی کریز خراب ہونے کا تذکرہ ضرور کرتا اور اس کا موجب ان میلے لوگوں کو ٹھہراتا جو اس کے ساتھ بس میں بیٹھے لگے رہتے۔

ناصر کاظمی کی شادی خانہ آبادی :::

پاک ٹی ہاؤس ،کافی ہاؤس، چینیز لنچ ہوم اور لاہور کی سڑکیں ناصر کاظمی کی ہمراہی تھیں۔ دوست آہستہ آہستہ برسر روزگار ہو کر لاہور کو خیر باد کہہ رہے تھے دوستوں میں سے اکثر بیاہے بھی جا رہے تھے اور ناصر مزید تنہا ہوتے جا رہے تھے۔ اب ناصر کاظمی پرانی انارکلی سے کرشن نگر کے کشادہ مکان میں منتقل ہو چکے تھے۔ ناصر اور عنصر دونوں بھائیوں میں بے حد محبت تھی۔ ناصر نے عنصر کو دسویں جماعت کے بعد اپنی خالہ کے پاس منٹگمری حالیہ ساہیوال بھیج دیا۔ بچپن میں ناصر کاظمی کے والدین اور سید انوار الحق جو کہ ناصر کے خالو تھے اور خالہ کے مابین ناصر کی شادی کے سلسلے میں بات چیت ہو چکی تھی۔ شفیقہ بیگم سید انوار الحق کی بڑی بیٹی ہیں۔ عنصر نے اپنی خالہ اور خالو کو انبالہ میں ہونے والی انڈر سٹینڈنگ یاد دلائی تو وہ راضی ہو گئے مگر سب سے بڑی رکاوٹ ناصر کاظمی کی نوکری تھی اور ناصر کاظمی کو گویا نوکری سے چڑ سی تھی۔ اس زمانے میں وہ ہمایوں کے مدیر تھے۔ اس لئے ناصر کے خالہ اور خالو کو یہ شکایت بھی نہیں رہی کہ لڑکا بے روزگار ہے اور یوں شادی طے ہو گئی۔ ناصر کاظمی نے شفیقہ بیگم کو جنہیں تیکن اور بانو بھی کہہ کر پکارتے تھے بچپن میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ پانچویں جماعت کی طالبہ تھیں۔ ناصر کا بچپن ہی سے ان کے گھر یعنی اپنی خالہ کے یہاں آنا جانا تھا اور ناصر بچپن ہی سے شفیقہ بیگم کو بھی پسند کرتے تھے۔ شفیقہ بیگم بھی ناصر کاظمی کی باتوں کی بارش میں بھیگ چکی تھی۔ وہ کہتی ہیں کہ ناصر آتے اور گھنٹوں باتیں کرتے اور ہم سب گھر والے انہیں سننے میں محو ہوتے۔ سو یہ باتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شفیقہ بیگم کا مقدر بن گئیں۔ ناصر کاظمی اپنی غیر مطبوعہ ڈائری میں شادی کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

" میری شادی : چھ جولائی ۱۹۵۲ء کو رات بارات منٹگمری گئی' حلقہ

ارباب ذوق اور کافی ہاؤس سے برات جمع کی۔ باراتیوں میں نور عالم۔ شیخ صلاح الدین۔ شاہد حمید۔ صفدر میر۔ خواجہ اسد اللہ۔ تانا فیض رسول۔ بھائی حامد حسین۔ اصغر حسین۔ شاکر حسین۔ عنصر اور بڑی بھابھی شامل تھے۔ ۷ جولائی کی پہلی گھڑی نکاح ہوا۔۱۰۶"

اس کے ساتھ ہی ڈائری میں یہ بھی لکھا ہے کہ حفیظ ہوشیارپوری نے شادی کی تاریخ نکالی جو اخبارات میں بھی شائع ہوئی :۔

شاعر شہر طرب شاداں شدہ
عید شاعر شہر طرب

ریڈیو کی ملازمت اور تخلیقی کام ::

حفیظ ہوشیار پوری عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے کمال کے آدمی بھی تھے ۔ریڈیو کے سٹیشن ڈائریکٹر بھی تھے بعد میں ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ہوئے۔ شاعر ہونے کے ناتے سے انہیں علم تھا کہ شاعروں اور ادیبوں کے کیا مسائل ہو سکتے ہیں اور یہ حساس طبقہ کھل کر دل کا حال بھی کسی سے کہہ نہیں پاتا سو شیخ صلاح الدین بتاتے ہیں:

" حفیظ ہوشیار پوری نے شعرا اور ادیبوں کو روزگار دلوانے کے لئے ریڈیو سے سکرپٹ رائٹر مقرر کئے جانے کے لئے بی۔ اے کی تعلیم کی شرط میں ترمیم کرا کے ایف اے کرادی۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ ناصر کو نوکری کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ریڈیو کی نوکری مناسب رہے گی اور تخلیقی کام بھی جاری رہے گا سو ریڈیو پر کنٹریکٹ پر سکرپٹ رائٹر مقرر کرنے کے لئے ایف۔ اے تعلیم ضروری ہو گئی اور یوں ناصر کاظمی ریڈیو پر ۱۹۶۴ء میں سکرپٹ رائٹر ہو گئے۔ اس نرمی کا ناجائز فائدہ صوفی تبسم مرحوم نے بھی اٹھایا حالانکہ وہ بطور پروفیسر گورنمنٹ کالج سے ریٹائر ہوئے تھے۔۱۰۷"

شیخ صلاح الدین نے حفیظ ہوشیارپوری کی جو خصوصیت بیان کی ہے اس کی تائید ناصر کاظمی کے حفیظ ہوشیار پوری پر لکھے گئے خاکے سے بھی ہوتی ہے۔ ناصر کہتے

ہیں "حفیظ نے حسب معمول وقت کم ہونے کی معذرت کی ریڈیو کا کنٹریکٹ نکال کر مجھے دستخط کرنے کو کہا۔ میری عمر اس وقت سولہ برس ہوگی اور میرے پاس صرف چار پانچ غزلیں ہی اس قابل تھیں کہ کسی ادبی مجلس میں سنائی جاسکیں میں کچھ چپ سا ہو گیا۔ پھر خیال آیا حفیظ سے میری کوئی دوستی بھی نہیں کوئی تعلق بھی نہیں اور نہ ہی دنیائے ادب میں مجھے کوئی جانتا ہے یہی سوچ کر میں نے دعوت قبول کرلی۔ـ۱۰۸"

حفیظ ہوشیارپوری اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ تھے اب جبکہ انہیں ناصر کا خیال آیا تو ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے ان کی یہ غزل تو بہت مشہور ہوئی۔

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

سو ناصر کاظمی سے محبت کرنے والے حفیظ ہوشیارپوری نے ناصر کو ریڈیو پر کنٹریکٹ پر سکرپٹ رائٹر رکھوا دیا۔ ناصر نے ریڈیو پر بطور سکرپٹ رائٹر کے پہلا کنٹریکٹ یکم جولائی ۱۹۶۴ء کو سائن کیا یہ ایک سال کے لئے تھا۔۱۰۹۔ اس کنٹرکٹ کے تحت ناصر کاظمی کی ماہانہ تنخواہ پانچ سو روپے مقرر ہوئی۔ پھر ہر سال یہ کنٹریکٹ آگے بڑھتا رہا اور ناصر کاظمی ریڈیو کے لئے تخلیقی کاموں میں مصروف ہو گئے ان کا کام تھا فوری طور پر فیچر لکھنا' سکرپٹ لکھنا اور آرٹسٹوں کے تلفظ درست کرانا۔ اس زمانے میں ریڈیو سے نشر ہونے والی ہر آواز کے تلفظ کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اگر کوئی غلط تلفظ براڈ کاسٹ ہو جاتا تو تلفظ ادا کرنے والے سے فوراً پوچھ گچھ ہوتی تلفظ کی صحیح ادائیگی کے لئے ریڈیو کے ڈیوٹی روم میں لغات بھی رکھی ہوتی تھیں پھر اس زمانے میں ریڈیو میں مصطفیٰ علی ہمدانی' مظفر احمد' اخلاق احمد دہلوی اور عزیز الرحمان خان جیسے مایہ ناز اناؤنسر بھی ہوتے تھے جن کی ادبی حیثیت بھی مسلم تھی سوائے عزیز الرحمان کے۔ ناصر کاظمی کے بعد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بھی سکرپٹ رائٹر مقرر ہو گئے دونوں کو ایک ہی کمرہ بیٹھنے کو ملا۔ ریڈیو کے ڈپٹی کنٹرولر موسیقی کے پروگراموں کے سپیشلسٹ پروڈیوسر اعظم خان ان دنوں موسیقی کے پروگرام براڈ کاسٹ کرتے۔ ناصر کاظمی کو بچپن ہی سے جو موسیقی سے دلچسپی تھی اس نے یہاں بھی رنگ دکھایا۔ ناصر کے قریبی

دوستوں میں مشہور کلاسیکی گائیک استاد امانت علی خان اور موسیقار حسن لطیف شامل تھے حسن لطیف پڑھے لکھے موسیقار تھے ماچس کی ڈبیا کو بجاتے ہوئے گانے کی دھن بناتے تھے جبکہ استاد امانت علی خان کی پٹیالہ گھرانے کی گائیکی تو پسند تھی ہی وہ چاہتے تھے کہ استاد امانت علی خان کی درد ناک آواز سے غزل گوائی جائے مگر استاد امانت علی خان ہاتھ نہیں آتے تھی، محمد اعظم خان کہتے ہیں :۔

"ناصر کاظمی بہت محبت کرنے والے انسان تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں شاعر تھے ۔ وہ اور صوفی صاحب ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے صوفی صاحب کو اکثر شکایت رہتی وہ سگریٹ اور چائے بہت پیتے ہیں اس لئے وہ ناصر سے قدرے تنگ تھے۔ جبکہ ناصر چین سموکر تھے سگریٹ بجھنے ہی نہیں دیتے تھے۔ ناصر کاظمی کی خواہش تھی کہ استاد امانت علی خان سے کسی طرح غزل گوائی جائے میں نے کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں میں اڑھائی ماہ تک استاد امانت علی خان کے پیچھے لگا رہا مگر وہ قابو نہیں آتے تھی جب بھی ان سے غزل گانے کے لئے کہا جاتا وہ کہتے "بڈا" مارے گا یعنی فتح علی خان جن کے ساتھ وہ سنگت میں گاتے تھے پھر اپنے بھائی کے علاوہ والد استاد اختر علی خان سے بھی ڈرتے تھے جو ریڈیو میں موسیقی کا درس دیتے تھے۔ بالآخر کاظمی اور میں نے انہیں تیار کر ہی لیا۔ ناصر نے ان دنوں ایک مشہور پروگرام لکھا۔ سفینہ غزل۔ یہ ایک ایسا پروگرام تھا جس کو سننے کے لئے لوگ منتظر ہوتے۔ ناصر کاظمی نے بڑی محنت کے ساتھ ولی دکنی سے حسرت موہانی تک کے شعرا کا تعارف لکھا اور پھر ان کی غزلوں کو استاد امانت علی خان۔ مہدی حسن۔ غلام علی۔ فریدہ خانم اور اقبال بانو کی آواز میں گوایا گیا۔ استاد امانت علی خان نے ناصر کاظمی کی فرمائش پر اپنی زندگی کی جو پہلی غزل گائی وہ آتش کی یہ غزل تھی :

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

اس غزل کو استاد امانت علی خان نے اس عمدگی کے ساتھ گایا کہ جس کسی

نے سنا اس نے اسے اپنے دل میں آباد کر لیا۔ تب سے اب تک یہ غزل دلوں پر حکومت کرتی چلی آ رہی ہے۔ ناصر کاظمی جوہر شناس تھا اس نے کلاسیکی موسیقی کے شہزادے کو غزل کا شہزادہ بنا دیا۔ یہ غزل بہت مقبول ہوئی۔۔۔ ۱۱۰"

سفینہ غزل ناصر کاظمی کا ریڈیو پر مقبول ترین پروگرام تھا جسے اعظم خان نے پیش کیا۔ ناصر کاظمی اس کا سکرپٹ بھی لکھتے اور پھر خود تحت اللفظ شعرا کا تعارف کراتے اس پروگرام میں ناصر کاظمی نے میر۔ درد۔ غالب۔ مومن۔ مصحفی۔ داغ۔ شیفتہ۔ انشا۔ حسرت موہانی۔ حالی اور یگانہ چنگیزی کے علاوہ اور دوسرے کلاسیکی شعرا کا کلام بڑے بڑے سنگروں سے گوایا۔ ناصر کاظمی روزانہ ریڈیو انتظامیہ کی مانگ کے مطابق سکرپٹ لکھتے اور پروڈیوسر انہیں پیش کر دیتے۔ اسی زمانے میں صوفی تبسم بھی روزانہ لاہور ریڈیو سے اقبال کے ایک شعر کی تشریح پیش کیا کرتے تھے۔ ناصر کاظمی ریڈیو میں بھی ہر ایک کے دل پسند تھے۔ اے حمید۔ابوالحسن نغمی۔ باسط خان مرحوم۔ اکرم بٹ۔ عبدالشکور بیدل۔ مصطفیٰ علی ہمدانی مرحوم ۔ اخلاق احمد دہلوی مرحوم۔ صوفی تبسم مرحوم ۔ شمس الدین بٹ۔ اعظم خان۔ سید اسلام شاہ۔ جمیل اک۔ مسعود قریشی ۔ چودھری بشیر احمد۔ اظہار کاظمی ۔ بشیر زیدی اسیر کے علاوہ اور بہت سی شخصیات سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ فن کار انہیں شاہ جی کہتے ہوئے بڑی محبت سے ملتے تھے۔

ناصر کا ایک خط ::

قدرت اللہ شہاب نے ناصر کاظمی کا ایک خط شہاب نامہ میں شائع کیا ہے۔ اس زمانے میں قدرت اللہ شہاب کا تقرر بطور سفیر ہوا تھا اس خط میں ناصر کاظمی نے خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ بیرون ملک کسی بھی صورت میں ملازمت کے لئے جانے کے خواہش مند ہیں۔ گو قدرت اللہ شہاب نے ناصر کاظمی کی یہ آرزو تو پوری نہ کی لیکن ناصر کاظمی کا یہ خط سنبھال کر رکھ لیا جو انہوں نے ۳۱ اگست ۱۹۶۳ء کو لاہور سے لکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قدرت اللہ شہاب ناصر کاظمی کے ادبی مرتبہ سے پوری

طرح آگاہ تھے۔ وگرنہ وہ کبھی بھی خط سنبھال کر نہیں رکھتے اور نہ ہی اسے اپنی کتاب میں شائع کرنے کے آرزو مند ہوتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قدرت اللہ شہاب نے جن کے لئے ناصر کو ملازمت دلوانا دائیں ہاتھ کا کام تھا بجائے ان کے کام آنے کے ان کا خط شائع کر کے تنگ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ وہ چاہتے تو اس خط کو نجی سمجھ کر نظرانداز بھی کر سکتے یا پھر ایسا ہوا ہوتا کہ انہوں نے ناصر کو نوکری دلوا دی ہوتی تو پھر اس خط کے شائع کرنے کی بھی ایک اہمیت ہوتی مگر انہوں نے نہ تو ناصر کو نوکری دلوائی بلکہ خط شائع کر کے ایک طرح سے کم ظرفی کا ثبوت دیا ملاحظہ کیجئے ناصر کاظمی کا خط قدرت اللہ شہاب کے نام

نیو بلڈنگ نزد ٹیوب ویل

بوڈ ہینٹر روڈ کرشن نگر لاہور

۳۱ اگست ۱۹۶۳ء

محترمی و مشفقی جناب شہاب صاحب تسلیم

دو تین ماہ سے ارادہ کر رہا ہوں کہ آپ کو خط لکھوں مگر تین ماہ سے بیمار پڑا ہوں۔ پاؤں میں فریکچر ہو گیا تھا۔ بہرحال اب حالت بہتر ہے اور چلنے پھرنے لگا ہوں۔ آپ کے تبادلے کی خبر سے بالخصوص ادیب حضرات خاصے پریشان ہیں ۔ معلوم نہیں آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے مجھے آپ سے ایک ضروری کام تھا کام کیا بلکہ دو سال سے ایک مصیبت میں گرفتار ہوں مگر اب آپ کے تبادلے کے بعد معلوم نہیں آپ سے کیسے اور کہاں ملاقات ہو۔

اگر واقعی آپ بطور سفیر جا رہے ہیں تو مجھے اس کی خوشی بھی ہے اور ذرا سی تشویش بھی۔ تاہم اس سلسلے میں میری تمنا ہے کہ اگر آپ مجھے کسی حیثیت میں بھی اپنے سفارت خانے میں لے جا سکیں تو مجھ پر بڑا کرم ہوگا اور اس طرح میری ایک دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی اگر وہاں ممکن نہ ہو تو کوئی اور صورت نکالیے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں دو ایک برس ملک سے باہر رہوں اور یہ کام آپ کے ذریعے ہو تو مجھے بے حد خوشی

ہو گی۔

مجھے چیف سیٹلمنٹ کمشنر صاحب سے بھی ایک جائز کام ہے اگر اس سلسلے میں بھی آپ میری امداد فرما سکیں تو ممنون ہوں گا۔

فقط آداب

نیاز مند

ناصر کاظمی۔۱۱۱

یہ خط پڑھنے سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی بیرون ملک جانے کی کس قدر خواہش رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس خط سے ناصر کاظمی کے قدرت اللہ شہاب سے تعلقات کی نوعیت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنے بھی گئے گزرے نہیں تھے۔ اس خط کے بارے میں شیخ صلاح الدین کا کہنا ہے:۔

" ناصر نے قدرت اللہ شہاب کو یہ خط دانستہ لکھا تھا کہ پھر ہمیشہ کے لئے اس سے پیچھا چھڑایا جا سکے۔ اسے یقین تھا کہ قدرت اللہ شہاب یہ کام تو کرے گا نہیں اس طرح سے ایک بہانہ مل جائے گا۔ ناصر کی قطعاً" یہ آرزو نہیں تھی کہ وہ وطن چھوڑ کر باہر جاتے۔ اگر قدرت اللہ شہاب ناصر سے مخلص ہوتا تو خط محفوظ کرنے کی بجائے اس کا کام کرتا۔۔۱۱۲"

شیخ صاحب ناصر کاظمی کے قریبی دوستوں میں سے ہیں وہ ناصر کے بارے میں وہ کچھ جانتے ہیں جو شاید اور کوئی اتنا نہ جانتا ہو۔ اس لئے ان کا یہ کہنا کہ ناصر نے قدرت اللہ شہاب کو یہ خط دانستہ لکھا تھا ہو سکتا ہے صحیح ہو مگر خط کا انداز یہ بتاتا ہے کہ ناصر کے دل میں یقیناً ایسی خواہش چھپی ہوئی ہو گی ۔ وہ باہر کی دنیا کی حیرتوں کو بھی دیکھنے کے متمنی تھے دوسرے یہ کہ ناصر کاظمی نے پاکستان میں مالی اعتبار سے کبھی اچھے دن نہیں دیکھے تھے وہ چاہتے تھے کہ وہ بھی باہر جائیں اور کچھ آسودگی ہو۔ ہمارے یہاں ایک عرصے سے یہ تاثر عام ہے کہ بیرون ملک جانے والے خوب کماتے ہیں سو ناصر نے اپنے دوستوں کے معاملے میں بھی جب کبھی انہیں اچھی ملازمت ملتی تو انہیں روشن مستقبل کو اپنانے کا مشورہ دیتے اور خود اپنے لئے بھی وہ چاہتے تھے کہ ان کے حالات بدلیں۔ انہوں نے اپنی زندگی جس قدر مالی مشکلات میں گزاری اس کا اندازہ ان

کی ریڈیو کی ملازمت سے لے کر ان کی وفات تک بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ناصر کی پرسنل فائل اور سروس بک ::

ریڈیو سے ناصر کاظمی کی پرسنل فائل دیکھنے سے معلومات کا ایک اور دفتر کھل جاتا ہے۔ اس فائل میں ناصر کاظمی کا نہ تو کوئی بائیو ڈیٹا ہے نہ ہی کوئی درخواست اور نہ ہی کوئی پوچھ گچھ کا کوئی کاغذ۔ ناصر کاظمی کے کنٹریکٹ کے کاغذات چند ضروری درخواستیں جو انہوں نے مختلف موقعوں پر لکھیں انگریزی اور اردو میں موجود ہیں۔ پرسنل فائل سے پتہ چلتا ہے کہ جب ناصر ریڈیو پر ملازم ہوئے تو انہیں ماہانہ ۵۰۰ روپے ملا کرتے تھے اور تب اس دار فانی سے کوچ کرنے سے پہلے ان کی تنخواہ مورخہ یکم جولائی ۱۹۷۱ء کے کنٹریکٹ کے مطابق چھ سو ستر روپے ماہانہ تھی۔ ۱۱۳

ناصر کاظمی کے لئے ریڈیو کی نوکری اس اعتبار سے بہتر تھی کہ وہ ان کے مزاج کے مطابق تھی انہوں نے جہاں ریڈیو کے لئے بہت سا کام اپنے مزاج کے خلاف بھی کیا وہاں بیشتر کام ایسا تھا جو تخلیقی اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران چونکہ ناصر کاظمی کا تمام کام لکھنے لکھانے سے متعلق ہوتا تھا اس لئے انہوں نے اپنے مطالعے میں کسی طور پر بھی کمی نہ آنے دی۔ ادب۔ آرٹ۔ موسیقی اور فلسفہ سے ان کی خصوصی دلچسپیوں کا اظہار تخلیقی اعتبار سے ریڈیو پر بھی ہوا۔ اس دوران انہوں نے پورے ملک میں منعقدہ ریڈیو اور ٹی وی کے مشاعروں کے علاوہ دوسرے مشاعروں میں بھی شرکت کی۔

شیخ صلاح الدین احمد ناصر کاظمی کے فنون سے دلچسپی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "اس شخص کو ادب۔ آرٹ۔ موسیقی۔ فلسفہ میں بہت گہری دلچسپی تھی۔ جنوں کی حد تک وہ فلسفہ نہ صرف پڑھتا تھا بلکہ جیتا تھا۔ وہ جس فلسفی یا ادیب سے متاثر ہوتا اس کے ذہن کو اپنے اندر رچا لیتا اس کی زندگی اس فلسفہ کے مطابق ڈھل جاتی۔ اس کی گفتگو چال ڈھال سوچ تک بدل جاتی۔ اس کی سوجھ بوجھ بہت گہری تھی وہ کسی بھی پسندیدہ شاعر، مصنف، ناول نگار

اور فلسفی کی روح تک پہنچ جاتا اور اپنی سوجھ بوجھ کو اپنے دوستوں تک منتقل کرنے کے لئے بے تاب رہتا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

شاعروں میں لورکا، رامبو، ملارمے، بادلیئر، والیری، پاؤنڈ، رلکے، ورلین، لارنس، فلسفیوں میں ماری تاں، بریدیو، کارکے گار، سارتر، بیوبر، ہائیڈگر، مارسل، کروچیٹ، جے بی بینٹ۔ مصوروں میں شاگال، رواؤ، ایل گریکو، رینار اور موسیقاروں میں ویگنر اس کے پسندیدہ تھے ناول نگاروں میں آندرے ۔ یلڈ، لارنس وندھم لوئیس پسند تھے۔" ۱۱۴

ناصر کاظمی کی پرسنل فائل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریڈیو پر ان کی ماہانہ تنخواہ انتہائی قلیل تھی ۔ مگر ناصر کاظمی نہایت قناعت پسند تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی ذات کے گنبدوں میں تخلیقی گونج کو سنتے رہتے اور سناتے رہتے۔ اب ان کے بچے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ملاحظہ کیجئے پرسنل فائل کے حوالے سے کچھ اقتباسات:۔

۱۔ یکم جولائی ۱۹۶۷ء کو ناصر کاظمی نے سٹیشن ڈائریکٹر کو ایک خط لکھا کہ میرے بیٹے باصر سلطان کاظمی عمر ۱۲ سال دسویں کلاس میں اور حسن سلطان کاظمی عمر ۱۱ سال نویں کلاس کے طالب علم ہیں اس قواعد و ضوابط کے مطابق مجھے انکم ٹیکس میں چھوٹ دی جائے۔

۲۔ ۶۸۔۷۔۱ سے ۶۹۔۶۔۳ تک ناصر کاظمی کو پانچ سو ستر روپے ماہانہ کا کنٹریکٹ دیا گیا۔ ناصر کاظمی نے ۷۵ روپے سالانہ ٹیکس ادا کیا۔

۳۔ مورخہ ۷۰۔۳۔۲ کو ناصر کاظمی نے کچھ کتابیں خریدیں اس بارے میں مندرجہ ذیل خط لکھا۔

"بخدمت جناب ریجنل ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان لاہور

گزارش ہے کہ میں سالانہ تقریباً ۲۵۰ روپے کی کتابیں اپنے مطالعے اور فیچروں کے حوالہ جات کے لئے خریدتا ہوں ان کتابوں پر انکم ٹیکس میں رعایت دی جاتی ہے ازراہ کرم میری آمدنی میں سے خریداری کتب کی رقم کاٹ لی جائے اور بقایا رقم پر انکم ٹیکس لگایا جائے تاکہ میں قانونی طور پر رعایت سے فائدہ اٹھا سکوں یہ رعایت اس وقت سے عنایت کی جائے جب سے مجھ پر انکم ٹیکس عائد ہوا

ہے۔

نیاز مند

ناصر کاظمی

سٹاف آرٹسٹ ریڈیو پاکستان لاہور

۲ اپریل ۱۹۷۰ء" ۔ ۱۱۵

۴۔ ۱۸-۵-۷۰ کو ناصر نے ۱۹ مئی کے ٹی۔ وی کے مشاعرہ میں شرکت کے لئے اجازت طلب کی۔

۵۔ "۱۸-۵-۷۱ سٹیشن ڈائریکٹر مسعود قریشی نے ڈائریکٹر جنرل اجلال حیدر زیدی کو خط لکھا کہ ناصر کاظمی ستر دنوں سے سخت علیل ہیں انہیں ایک دن خون کی الٹی آئی اور انہیں ہسپتال لے جایا گیا۔ ان کی تنخواہ بہت کم ہے اور وہ بھاری رقم ادویات پر نہیں خرچ کر سکتے وہ غریب آدمی ہیں اور رائٹرز کمیونٹی کے ایک معزز رکن ہیں۔ ریڈیو کے رولز اجازت نہیں دیتے کہ ان کے علاج پر بھاری رقم خرچ کی جائے میں نے متعلقہ حکام سے ان کے علاج کے لئے بات چیت کی ہے جن میں ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن اے۔ اے حنفی اور ایس۔ اے۔ ایس اکاؤنٹنٹ شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حکومت، سٹاف ویلفیئر فنڈز سے دو ہزار روپے کی منظوری دے سکتی ہے اس کے علاوہ ہسپتال میں کمرہ کا کرایہ اور ادویات کے دوسرے اخراجات کے لئے مزید اٹھارہ سو روپے درکار ہیں۔ میں آپ سے اس رقم کی منظوری کے لئے سفارش کرتا ہوں اس ضمن میں روزنامہ مشرق میں انتظار حسین نے لاہور نامہ میں ناصر کی بیماری کے حوالے سے کالم بھی لکھا ہے جو اس کے ساتھ منسلک ہے۔ اگر ریڈیو ناصر کاظمی کے لئے کچھ کر سکا تو یہ ریڈیو کے لئے نیک نامی کا باعث ہوگا۔

مسعود قریشی۔ ۱۱۶

۱۷/۵/۲۸"

۶۔ ۲۷-۵-۷۱ کو ترمذی صاحب کو خط لکھا۔ یہ خط اے۔ وی۔ ایچ کمرہ نمبر ۱۳ میو ہسپتال لکھا گیا یہ خط یوں ہے۔

برادرم ترمذی صاحب

میری طبیعت رفتہ رفتہ ٹھیک ہو رہی ہے کل ارادہ ہے دفتر آنا شروع کردوں لیکن گرمی کی وجہ سے مروڑ پھر شروع ہو گیا لیکن اب امید ہے کہ پیر کے روز دفتر آنا شروع کروں۔ درخواست رخصت حامل رقعہ کے ساتھ بھجوا رہا ہوں اسے ٹھکانے پر پہنچا دیں اور رسید سے مطلع فرمائیں۔ محترمی مسعود قریشی کی خدمت میں آداب عرض کردیں اور انہیں میری درخواست رخصت کے بارے میں ضرور اطلاع کردیں

آپ کا ناصر کاظمی ۷-۵-۱۱

۷۔ ۳۱-۵-۷۱ کو ناصر کو ناصر کاظمی نے درخواست دی کہ میں ۶-۳-۷۱ سے ۹-۵-۷۱ تک میڈیکل چھٹی پر تھا اور البرٹ وکٹر ہسپتال (میو ہسپتال) میں زیر علاج تھا اب میں صحت یاب ہو گیا ہوں اور ۳۱ مئی کو ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا ہوں۔

۸۔ ۶-۳-۷۱ پروفیسر عالمگیر خان معالج ناصر کاظمی کا میڈیکل سرٹیفکیٹ کہ ناصر کاظمی ہلکے پھلکے کام کے لئے فٹ ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور درخواست میڈیکل سرٹیفکیٹ کے ساتھ ہے کہ مجھے ۶-۳-۷۱ سے ۳-۶-۷۱ کے لئے بیماری کی رخصت دی جائے۔ اس کے بعد پھر درخواست دی کہ مجھے ۶-۶-۷۱ سے ۸ مئی تک کی رخصت دی جائے اس کے ساتھ ہی میڈیکل سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے میو ہسپتال کا ہے۔

۹۔ ۳۰ اپریل ۱۹۷۱ء کو ریجنل ڈائریکٹر مسعود قریشی کو اے وی ایچ کمرہ نمبر ۱۳ میو ہسپتال سے خط لکھا جو مندرجہ ذیل ہے۔

محترمی جناب قریشی صاحب

تسلیم!

پچھلے ہفتے امید تھی کہ ہسپتال سے رہائی مل جائے گی۔ خون کی کمی کے پیش نظر نیا خون دیا گیا اس کے بعد شدید بخار رہا۔ اب کمزوری کا وہی حال ہے اور آج یا کل آئرن کا ٹونل ڈاؤن دیا جائے گا۔

رخصت کی درخواست بھجوانے سے میں تاخیر ہوئی آج ترمذی صاحب کو

بھجوائی ہے بے حد مقروض ہو گیا ہوں تنخواہ ملے تو کچھ کام چلے۔ دعا فرمائیں اور فرصت ہو تو بذریعہ فون یاد فرمائیں۔

نیاز مند

ناصر کاظمی۔۱۱۸

۱۰۔ ۷۱-۵-۲۷ ناصر کاظمی نے ریجنل ڈائریکٹر کو درخواست دی کہ مجھے ۹ مئی سے ۲۹ مئی تک مزید رخصت دی جائے اور میری یہ رخصت میری پچھلی رخصت ۶ مارچ سے ۸ مئی کی رخصت سے منسلک کر دی جائے میں ابھی تک اے وی ایچ میو ہسپتال میں زیر علاج ہوں اس کے ساتھ پروفیسر عالمگیر خان کا میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی ہے جس میں ان کی بیماری کی وجہ سے رخصت کی سفارش کی گئی ہے' اس سرٹیفکیٹ میں ناصر کی عمر ۴۶ برس درج ہے اور یہ عمر تاریخ پیدائش ۱۹۲۵ء کے حوالے سے ہے' جب کہ میٹرک سرٹیفکیٹ میں عمر یکم دسمبر ۱۹۲۳ء کے مطابق ہے۔

۔ ۷۱-۱۰-۲۹ کو ناصر کاظمی نے پھر ریجنل ڈائریکٹر کو درخواست دی کہ مجھے ۷۱-۱۰-۲۰ سے ۷۱-۱۱-۶ تک میڈیکل رخصت دی جائے' یہ چھٹی منظور کر لی گئی۔

۔ ناصر کاظمی نے ۷۱-۱۱-۱۷ کو درخواست دی کہ میری رخصت میں بوجہ بیماری ۷۱-۱۱-۷ سے ۷۱-۱۲-۱۱ تک توسیع کی جائے ' اس کے ساتھ بھی ڈاکٹر عالمگیر خان کا میڈیکل سرٹیفکیٹ منسلک ہے' اس درخواست کے حوالے سے محکمانہ کارروائی میں لکھا گیا تھا کہ ناصر کاظمی نے ۷۱-۱۱-۷ سے ۷۱-۱۲-۱۱ تک بیماری کی رخصت طلب کی تھی' اب ناصر کاظمی مورخہ ۷۱-۱۱-۱۸ کو بغیر میڈیکل فٹ نس سرٹیفکیٹ کے ڈیوٹی پر آ گئے ہیں اور انہوں نے درخواست کی ہے۔ ۷۱-۱۱-۱۸ سے ۷۱-۱۱-۱۱ تک ان رخصت عام رخصت مراد لی جائے' یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ بغیر فٹ نس سرٹیفکیٹ کوئی رول نہیں ہے' وہ ۷۱-۱۲-۱۱ سے پہلے جوائن کریں' جب کہ ڈاکٹروں نے انہیں آرام کا مشورہ دے رکھا ہے' اس لئے ان سے کہا جائے کہ پہلے میڈیکل فٹ نس سرٹیفکیٹ فراہم کریں' تا کہ ان کی

درخواست پر مزید غور کر سکیں۔

۔۔ اس کے ساتھ ہی ناصر کاظمی کی ۸ نومبر ۱۹۷۱ء کو لکھی گئی ریجنل ڈائریکٹر کے نام درخواست ہے کہ میری ۷۱-۱۱-۱۸ سے ۷۱-۱۲-۱۱ تک کی منظور کی ہوئی رخصت کینسل کی جائے اور میں ۱۸ نومبر کو ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا ہوں۔

۔۔۔ ۱۹۷۲-۱-۱۷ ریجنل ڈائریکٹر مسعود قریشی نے ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل اجلال حیدر زیدی (تمغہ قائد اعظمؒ) کو ٹیلیکس دیا۔

مسٹر ناصر کاظمی سٹاف آرٹسٹ ریڈیو پاکستان لاہور دوبارہ شدید بیمار ہیں' لاہور کا تمام دانشور طبقہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ریڈیو پاکستان کو ان کی اس بیماری کے موقع پر خصوصی امداد کرنی چاہیے' ہم سے جو ہو سکا' ہم نجی طور پر کر چکے ہیں اور انہیں دو ایڈوانس ترقیاں بھی دے دی گئی ہیں' لیکن انہیں اپنے علاج معالجے کے لئے کم از کم دو ہزار روپے درکار ہیں۔ میں نے پہلے بھی ڈائریکٹر جنرل کو ان کے بارے میں لکھا' لیکن افسوس اس پر عمل درآمد نہیں ہوا' میری درخواست ہے کہ ناصر کاظمی کو فوری طور پر بینولیسٹ فنڈ سے یہ رقم فراہم کی جائے۔

پیغام ختم

۱۵۔ اس کے ساتھ انتظار حسین کا کالم جو ناصر کے بارے میں روز نامہ مشرق میں شائع ہوا تھا' منسلک ہے۔

کالم کا نام تھا' نئے مسیحا پرانے بیمار۔ انتظار حسین نے کالم یوں شروع کیا۔

لاہور نامہ : شاعر کی بیماری نے نئے منصوبے کا انتظار نہیں کیا ::

''سٹاف آرٹسٹ ریڈیو پاکستان کی پس ماندہ مخلوق ہے۔ سنتے ہیں کہ ایک نیا صحتی منصوبہ عمل میں آنے والا ہے' منصوبے کے عمل میں آنے پر ہر ایک

امیر و غریب کو علاج کی سہولتیں میسر ہوں گی اور ہر چھوٹے بڑے کا دوا دارو مقدر ہو گا۔

یہ مژدہ جاں فزا ہے، مگر ایک شاعر اس وقت ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اور غالب کا یہ شعر پڑھتا ہے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ناصر کاظمی نے اصل میں بیمار پڑنے میں عجلت کی۔ یہ کام تھوڑے عرصے کے لئے ملتوی ہو جاتا تو کتنا خوب ہوتا۔ نیا صحی منصوبہ عمل میں آنے والا ہے، اس کے بعد شاعر کو علاج کی ساری سہولتیں میسر ہوتیں اور شاید اس وقت تک ریڈیو پاکستان کے سٹاف آرٹسٹوں کو بھی سرکاری طور پر طبی امداد کی رعایت حاصل ہو چکی ہوتی۔

اس وقت صورت احوال یہ ہے کہ نیا صحی منصوبہ محض ایک بشارت ہے، حقیقت میں ابھی نہیں بنا ہے، ریڈیو پاکستان کا نقشہ یہ ہے کہ جو لوگ وہاں مستقل ملازم کی حیثیت سے بھرتی ہوتے ہیں، انہیں اور بہت سی مراعات کے ساتھ سرکاری طور پر طبی امداد کی سہولت بھی حاصل ہے، وہ جو سٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے اس ادارے سے منسلک ہیں، انہیں یہ سہولت حاصل نہیں، ادیبوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اس ادارے میں بالعموم سٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔

لاہور ریڈیو اسٹیشن میں جائیے تو آج بھی وہاں چند نامی گرامی ادیب ضرور نظر آئیں گے، ان میں کوئی افسانہ نگار ہے، کوئی شاعر ہے، کوئی ڈرامہ نگار ہے، مگر یہ مخلوق یہاں اب بہت اکھڑی اکھڑی نظر آتی ہے، جس اطمینان اور احساس آسودگی کے ساتھ مستقل ملازمین اپنے اپنے آراستہ کمروں میں بیٹھے کام کرتے اور چائے پیتے نظر آتے ہیں، وہ اطمینان اور احساس آسودگی ان ادیبوں کے یہاں نظر نہیں آتا، وہ سٹاف آرٹسٹ جو ہوئے۔

ادیب کے لئے بھی کوئی جگہ ہوتی ہے' لیکن جو آئے ہیں' شاید انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ناصر کاظمی کون ہے' کوئی جان کر انجان بن جائے تو الگ بات"۔

۱۶۔ مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۷۱ء کو ریجنل ڈائریکٹر مسعود قریشی نے ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل اجلال حیدر زیدی کے نام پھر پیغام بذریعہ ٹیلیکس بھیجا کہ ناصر کاظمی کی حالت بہت خراب ہے اور انہیں ایک بڑے آپریشن کا سامنا ہے' اس پیغام میں ۱۷ جنوری کے ٹیلیکس کا بھی حوالہ دیا گیا اور ادیبوں کی جانب سے وزیر اطلاعات حکومت پاکستان کو ۱۷۔ جنوری کی شام بھیجی گئی ٹیلیگرام کا بھی حوالہ دیا گیا کہ ادیبوں کی جانب سے ایک قرار داد پاس ہوئی ہے' جس میں احمد ندیم قاسمی' صفدر میر' خدیجہ مستور' ظہیر کاشمیری' ڈاکٹر انور سجاد' میرزا ادیب اور انتظار حسین نے واضح کیا ہے کہ اگر ناصر کاظمی کی فوری امداد نہ کی گئی تو وہ بطور احتجاج ریڈیو کے لئے لکھنا چھوڑ دیں گے۔

مسعود قریشی نے ناصر کاظمی کی مخدوش مالی حالت کی بنا پر درخواست کی' ان کی فوری طور پر مدد کی جائے' اس کے ساتھ ہی مسعود قریشی نے ادیبوں کی جانب سے منظور کی گئی قرار داد کا پورا متن بھی ڈائریکٹر جنرل کو روانہ کیا' اس قرارداد کے نیچے الطاف فاطمہ کے دستخط ہیں۔

ناصر کاظمی کی وفات ::

۱۷۔ ۲۔۳۔۷۲ ناصر کاظمی کی موت کا سرٹیفیکیٹ۔ معدہ کے کینسر کی وجہ سے ۲ مارچ کو صبح ۵ بجے انتقال ہو گیا' معالج پروفیسر عالمگیر خان ایس ایم مسعود۔

۱۸۔ ۲۔۳۔۷۲ کو اے حمید صدر یونین اور ابوالحسن نغمی نے ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کو بہ توسط ریجنل ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان جو خط لکھا' وہ مندرجہ ذیل ہے۔

سٹاف آرٹسٹ ہی تو پروگرام کی روح ہوتا ہے اور سٹاف آرٹسٹ ہی ریڈیو پاکستان کی سب سے پس ماندہ مخلوق ہے' اگر یہ جائزہ لیا جائے کہ ریڈیو پاکستان کے پروگراموں پر کیسے رفتہ رفتہ زوال آتا چلا گیا تو منجملہ اور وجوہ کے ایک وجہ یہ نکلے گی کہ سٹاف آرٹسٹ کو اب سے پہلے ریڈیو کی تنظیم میں جو مقام حاصل تھا' وہ اس سے چھن گیا۔ یہ بات کسی قدر تفصیل طلب ہے' اس وقت تو ذکر یہ ہے کہ ایک شاعر بیمار ہے اور اسے علاج معالجے کی سہولتیں حاصل نہیں ہیں' کیوں حاصل نہیں ہیں؟' جب کہ وہ ایک سرکاری محکمہ سے وابستہ ہے اور سرکاری محکموں میں کام کرنے والوں کو اپنے محکموں کی طرف سے یہ سہولتیں حاصل ہیں۔ اس شاعر کو یہ سہولتیں اس لئے حاصل نہیں کہ جس محکمہ سے وابستہ ہے' اس نے اپنے وابستگان میں ایک تمیز قائم کر رکھی ہے' تمیز یہ کہ فلاں مستقل ملازم ہے اور فلاں فلاں محض اپنی ادبی' فن کارانہ لیاقت اور شہرت کی بنا پر اس ادارے میں گھس آیا ہے' بس اول الذکر کو تو زندگی کی ساری سہولتیں حاصل ہوں گی اور موخر الذکر کو ان سہولتوں سے محروم رکھا جائے گا۔ کاروبار میں ایسا ہونا لازمی تھا۔ اس افسر شاہی کاروبار نے پورے ملک میں ادیب اور فن کار کی یہی حیثیت مقرر کی تھی' جو ادیب جو فن کار براہ راست ان کے شکنجہ میں پھنس گیا' اسے تو انہیں پوری پوری سزا دینی چاہیے۔

آثار تو یہی ہیں کہ افسر شاہی کا شکنجہ اب ڈھیلا پڑے گا۔ توقع کرنی چاہیے کہ اس کے اثرات ریڈیو پاکستان پر بھی مرتب ہوں گے' سٹاف آرٹسٹوں کی قدر کی جائے گی' ان کے تخلیقی جوہر سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھایا جائے گا اور انہیں زندگی کی سہولتیں میسر آئیں گی۔

مگر ناصر کاظمی تو آج بیمار ہے' اس کی موذی بیماری کل کا انتظار کرنے کے لئے تیار نہیں ہے' عراق سے تریاق ضرور آئے گا' مگر مار گزیدہ کے لئے تریاق کی اس وقت ضرورت ہے۔

جو چلے گئے' انہیں کبھی کوئی قائل نہ کر سکا' قومی زندگی میں

جناب محترم۔

ہمارے بے حد عظیم رفیق کار اسٹاف آرٹسٹ جناب ناصر کاظمی ۲ مارچ کو وفات پا گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ضابطہ اور قاعدے کی مجبوری کی بنا پر محکمہ انہیں کسی قسم کی طبی امداد نہ دے سکا' اس افسوس میں یقیناً آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں گے' امید ہے جب کارپوریشن کا قیام عمل میں آ جائے گا تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ فوری مسئلہ مرحوم کی گریجویٹی کا ہے' آپ نے کمال فیاضی اور حسن سلوک سے ۱۷ فروری کو یونین کے نمائندوں سے گفت و شنید کرتے ہوئے فرمایا تھا' گریجویٹی کی موجودہ شرح مضحکہ خیز ہے' صنعتی مزدوروں کو سال پیچھے ۳۰ یوم کی گریجویٹی ملتی ہے' اب مناسب اور بروقت مہربانی یہ ہو گی کہ ناصر کاظمی مرحوم کی بیوہ کو تمیں یوم سالانہ کی شرح سے گریجویٹی منظور فرما کر رقم کے اجرا کا حکم جلد از جلد صادر فرمائیں' نوازش ہو گی۔

ابوالحسن نغمی   اے حمید

جنرل سیکرٹری۔۱۱۹   صدر

۱۹۔ اس فائل میں فارم اے بھی شامل ہے' جس میں ناصر کاظمی نے اپنی وفات کے بعد اپنی بیگم شفیقہ کاظمی کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا' ان کے بعد اپنے بھائی عنصر کاظمی کو۔ اس کے بعد فائل میں بیگم ناصر کاظمی اور بھائی عنصر کاظمی کی جانب سے ناصر کاظمی کی گریجویٹی حاصل کرنے کے سلسلے میں خط و کتابت شروع ہو جاتی ہے اور وہ خط و کتابت ہی پر ختم ہو جاتی ہے' سروس بک میں ناصر کاظمی کی تنخواہ کا تذکرہ اور میٹرک کا سرٹیفکیٹ بھی شامل ہے۔

اس فائل کے مطالعہ سے ناصر کاظمی کی ریڈیو کی ملازمت کے دوران

ان کی علالت کے واقعات کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مطالعہ سے ان کی گہری دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے' وہ باقاعدہ ہر سال اپنے مطالعہ کے لئے کتابیں خرید کر پڑھتے رہے' جس کا ثبوت کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں انکم ٹیکس کی رعایت کا خط ہے' وہ جب تک ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت میں رہے' انہوں نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیے اور بیماری کے دوران میں بھی جب یہ محسوس کیا کہ وہ قدرے بہتر ہیں' وہ دفتر چلے آئے' حالانکہ ڈاکٹروں نے انہیں آرام کا مشورہ دے رکھا تھا اور وہ بیماری کے عالم میں بھی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے باقاعدگی کے ساتھ رخصت کی درخواست بھیجتے رہے' اس پرسنل فائل کی درخواستوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی مئی ۱۹۷۱ء ہی سے بیمار رہنے لگے تھے اور اس ماہ سے وہ میو ہسپتال اے وی ایچ کے کمرہ نمبر ۱۳ میں زیر علاج رہے' ان کے معالج پروفیسر عالمگیر خان تھے۔ بیماری کے دوران ناصر کاظمی کی مالی حالت کا اندازہ بھی اس فائل میں شامل خط و کتابت سے ہوتا ہے کہ وہ ادویات کے اخراجات اٹھانے کے قابل نہیں تھے اور مقروض ہو گئے تھے' انہیں جو تنخواہ ملتی تھی' وہ نہایت قلیل تھی۔ اور یہ بھی ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ جس کی جانب انتظار حسین نے اپنے کالم لاہور نامہ میں بھی اشارہ کیا ہے کہ ریڈیو پر تخلیقی کام کرنے والے سٹاف آرٹسٹ کو بیماری کی صورت میں ریڈیو سے کوئی سہولت حاصل نہیں تھی اور نہ ہی اب ہے' وہ حساس طبقہ ادیب' شاعر اور فن کار جو ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں کی روح ہیں اور جن پر ان دونوں اداروں کا دارومدار ہے' انہیں روزانہ ماہانہ کی فیس دے کر اور وہ بھی بہت معمولی فارغ کر دیا جاتا ہے اور وہ لوگ جو ریڈیو اور ٹی وی کی ایڈمنسٹریشن۔ یا تکنیکی شعبوں یا پروگرام سیکشن میں کام کرتے ہیں' انہیں معقول تنخواہوں کے علاوہ ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں' اس زمانے میں بھی ریڈیو پر شاعر اور ادیب یا فن کار کو جو ایک پروگرام کا معاوضہ ملتا تھا' وہ ریڈیو یا ٹی وی آنے جانے ہی میں صرف ہو جاتا تھا' آج بھی یہی صورت حال ہے' ٹی وی کی فیس ریڈیو سے پھر بھی بہتر ہیں۔ ریڈیو کے سٹاف آرٹسٹ کو صرف پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ

ملتی تھی، بیمار ہونے کی صورت میں کوئی طبی الاؤنس نہیں ملتا تھا' سو ناصر کاظمی بھی ریڈیو کی اس ظالمانہ پالیسی کے شکار رہے اور اپنی ادویات کے لئے دو ہزار روپے کی امداد تک حاصل نہ کر سکے' وہ ریڈیو جس کے پروگراموں کو ہواؤں کے دوش پر پہنچانے میں ناصر کاظمی نے اپنا خون جگر صرف کیا تھا' وہ آخر دم تک ریڈیو کی امداد کا منتظر رہا' حالانکہ ریڈیو کے ریجنل ڈائریکٹر مسعود قریشی نے حکام بالا کو کئی مرتبہ ناصر کاظمی کی بیماری کے بارے میں ٹیلیکس کے ذریعے آگاہ کیا' مگر ظالم بیورو کریسی نے اس نابغہ روز گار کے زخموں پر مرہم رکھنے کی زحمت گوارا نہ کی' مسعود قریشی اور حفیظ ہوشیار پوری ریڈیو کے دو اہم آفیسر تھے' جنہوں نے ناصر کاظمی کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی' شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ حفیظ ہوشیار پوری بہت اچھے شاعر تھے' اس لئے ان ہی کی کوششوں سے ناصر کاظمی نے ریڈیو پر پہلی غزل پڑھی اور پھر ان ہی کے توسط سے سکرپٹ رائٹر مقرر ہوئے' یہی صورت مسعود قریشی کی بھی تھی' مسعود قریشی بہت ذہین اور سلجھے ہوئے شاعر ہیں' وہ جب تک ریڈیو پر رہے' ہر ایک نے ان کے گن گائے' انہوں نے ناصر کاظمی کی بیماری کے دوران ڈائریکٹر جنرل کو ناصر کی بیماری کے سلسلے میں خصوصی امداد کے لئے جو خط لکھے' ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ناصر کو بہت محبوب سمجھتے تھے اور انہوں نے بحیثیت شاعر اور ریجنل ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان لاہور ناصر کے ساتھ دوستی اور انسانی ہمدردی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ حفیظ ہوشیار پوری اور مسعود قریشی ریڈیو کی دو ایسی شخصیات ہیں' جنہوں نے افسر ہوتے ہوئے بھی ناصر کاظمی کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھا۔ اس زمانے میں ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل سید اجلال حید زیدی تھی' ان کا تعلق انبالہ کے ساتھ ہی شاہ آباد کے سید گھرانے سے ہے' شاہ آباد اور انبالہ کے سادات آپس میں رشتہ دار بھی ہیں اور اس طرح وہ بھی یقیناً دور سے ناصر کاظمی کے عزیز تھے۔ حیرت ہے کہ انہوں نے بھی بحیثیت ڈائریکٹر جنرل ناصر کاظمی کے لئے کچھ نہیں کیا' حالانکہ وہ ناصر کاظمی کے ادبی مرتبہ سے بخوبی آگاہ تھے اور ناصر کاظمی کو انبالہ کے زمانے سے جانتے تھے' ریڈیو کے وزیر اطلاعات اور ڈائریکٹر جنرل کو لاہور کے ادیبوں کی جانب سے ایک قرار داد بھی

بھیجی گئی' جو الطاف فاطمہ کے دستخطوں سے تھی' اس قرار داد پر دستخط کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی' صفدر میر' خدیجہ مستور' ظہیر کاشمیری' ڈاکٹر انور سجاد' میرزا ادیب اور انتظار حسین نے ریڈیو انتظامیہ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ ناصر کاظمی کے علاج معالجے پر توجہ دیتے ہوئے ان کی فوری مدد کرے' ورنہ وہ ریڈیو کے لئے لکھنا بند کر دیں گے' اب یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس قرار داد کے بعد ادیبوں نے لکھنا بند بھی کر دیا تھا یا نہیں' اس ضمن میں انتظار حسین سے معلوم کیا گیا تو انہوں نے کہا۔

"مجھے کچھ یاد نہیں ہے' ہو سکتا ہے' ہم نے لکھنا بند کر دیا ہو' مگر ہم تو ناصر کی تیمار داری میں مصروف تھے اور پھر یہ نوبت ہی نہیں آئی' ناصر انتقال کر گئے"۔ ۱۳۰

اصل میں جن ادیبوں نے قرار داد بھیجی تھی' وہ ریڈیو پر عارضی طور پر لکھتے تھے' اس لئے ان کے نہ لکھنے کے شواہد ملنا مشکل ہیں' لیکن ایک بات قابل ستائش ہے کہ ان ادیبوں نے اپنے ساتھی کی بیماری کی نزاکت کا احساس حکام بالا کو ضرور دلایا'

ناصر کاظمی کا آخری انٹرویو ::

انتظار حسین نے اس ضمن میں نہ صرف حق دوستی ادا کرتے ہوئے ناصر کاظمی کی مسلسل تیمار داری کی' بلکہ ٹی وی کے لئے بستر مرگ ہی پر ناصر کاظمی کا ایک یادگار انٹرویو ریکارڈ کیا' کہا جاتا ہے' جب یہ انٹرویو ریکارڈ ہوا تو اس زمانے کے کئی ایک شاعروں اور ادیبوں نے ٹی وی حکام سے رابطہ کر کے انہیں مجبور کیا کہ ان کا بھی انٹرویو ریکارڈ کیا جائے' اس وجہ سے ناصر کاظمی کا انٹرویو ٹیلی کاسٹ ہونے میں دیر ہو گئی' پھر بھی یہ انٹرویو ایک یادگار تھا' جو ناصر کاظمی کی زندگی کا آخری انٹرویو تھا' یہ انٹرویو ناصر کاظمی کی کتاب "خشک چشمے کے کنارے" میں شامل ہے۔

ناصر کاظمی کا یہ انٹرویو محرم کے ختم ہوتے ہی ناصر کے تعزیتی

پروگراموں کے ذیل میں دکھایا گیا' یہ انٹرویو ۵۵ منٹ کا تھا' بقول انتظار حسین مختلف پروگراموں میں اس کے اقتباس پیش کئے گئے مکمل انٹرویو نہیں دکھایا گیا تھا۔

شیخ صلاح الدین ناصر کاظمی کے گہرے دوستوں میں سے تھے' مگر وہ ناصر کی تیمار داری کے لئے ایک مرتبہ ہی گئے' وہ کہتے ہیں۔ "مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ناصر کاظمی نہیں بچے گا' اس لئے میں نے خیال کیا کہ اب اس کے بیوی بچوں کا اس پر حق زیادہ ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے بچوں کے ساتھ گزارنا چاہیے' اس لئے میں باقاعدگی سے نہیں گیا"۔۔۔۱۲۱

شیخ صاحب اب بھی پندرہ رمضان کو ہر سال باقاعدگی کے ساتھ اپنے مرحوم دوست کے گھر جاتے ہیں اور بہت سا وقت ان کے ساتھ ناصر کو یاد کرتے ہوتے گزارتے ہیں۔

ہمہ جہت شخصیت کے چند پہلو ::

ناصر کاظمی کے چھوٹے فرزند حسن سلطان کاظمی کا کہنا ہے کہ پاپا جن دنوں بیمار تھے' ان دونوں باصر سلطان کاظمی گورنمنٹ کالج یونین کے سیکرٹری منتخب ہوئے تھے اور اشرف عظیم صدر چنے گئے تھے' یہ ایک خوشی کا مرحلہ تھا' گورنمنٹ کالج کے طالب علم باصر کو کندھے پر اٹھائے پھولوں کے ہار پہنائے جلوس کی صورت میں ہسپتال پہنچے تھے' یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد واقعہ تھا' پاپا بہت خوش تھے اور انہوں نے ہسپتال ہی میں اس خوشی میں مٹھائی تقسیم کرائی تھی۔۔۔۱۲۲

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:۔

"میں ان چند لمحوں کو اپنی عزیز یادوں کے سرمایہ میں داخل کر چکا ہوں' جو یکم مارچ کو میں نے اس کے ساتھ بسر کئے' میں البرٹ وکٹر ہسپتال پہنچا تو ناصر کے پاس سجاد باقر رضوی تشریف فرما تھے' میں اس کے پاس صرف

ایک گھنٹہ بیٹھا' اس دوران ناصر مسلسل بولتا رہا' سانس کی تکلیف کی شکایت کی' گھر جانے کی اجازت کی تمنا ظاہر کی' پھر اس نے خلوص و محبت کے ان بے بہا جذبات کا اظہار کیا' جن میں زندگی بھر کوئی رخنہ نہیں پڑا تھا' دوسرے شاعروں کے اشعار کی طرح اسے میرے بھی سینکڑوں شعر یاد تھے اور اس روز بھی اپنی موت سے صرف بارہ ' تیرہ گھنٹے پہلے وہ میرا ایک ایسا شعر پڑھ رہا تھا' جو شاید ابھی کہیں چھپا بھی نہیں' مگر میں نے اسے کسی طویل سفر کے دوران سنایا ہو گا' میں اسی احساس تفاخر کے ساتھ اپنا یہ شعر پیش کرتا ہوں کہ ناصر اسے اپنی زندگی کے آخری روز پڑھ رہا تھا اور رو رہا تھا' شعر یہ تھا۔

مرے نصیب میں بنجر زمیں کی رکھوالی
کنویں اداس مرے کھیت بے ثمر میرے

یا تو اس شعر میں ناصر کو اپنے پورے سوانح دکھائی دے رہے تھے یا وہ اس طرح بھی مجھ سے محبت کا اظہار کر رہا تھا' مگر وہ شعر پڑھتے ہوئے رو کیوں رہا تھا؟ پھر جب میں نے اس سے اجازت چاہی اور اس کے دونوں ٹھنڈے ہاتھوں سے اپنے دونوں گرم ہاتھ ملائے تو اس نے میرے ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے اور یہ ہاتھ ناصر کے آنسوؤں سے بھیگ گئے' اس وقت میں اگر وہاں ایک لمحہ بھی رکتا تو بچوں کی طرح رو دیتا"۔ ۱۲۳

شہرت بخاری لکھتے ہیں کہ ناصر کاظمی آٹھویں محرم کو اپنے بھائی عنصر کے ساتھ کرشن نگر میں شبیہہ ذوالجناح کے جلوس کی زیارت کے لئے بڑی مشکل سے پہنچے' ذوالجناح قریب آیا تو میں نے آگے بڑھ کر اسے بوسہ دیا اور اپنے مولا سے استفسار کیا۔ "مولا کیا میں صحت مند ہو جاؤں گا؟ ذوالجناح نے سر ہلا دیا' میں نے سوچا یہ میرا وہم ہو گا' میں نے پھر بوسہ دیا' پھر سوال کیا مولا میں اچھا ہو جاؤں گا؟ ذوالجناح نے اب کے پھر نفی میں گردن ہلا دی"۔ شہرت بخاری کہتے ہیں' اس واقعہ سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ زندہ نہیں رہے گا' اہل بیت نبویؐ سے اس کی شیفتگی سے میں آگاہ تھا' اس کی باتوں نے گویا میرے دل میں خنجر اتار دیا۔ ۱۲۴

سو محب محمدؐ و آل محمدؐ، شیرازی کبوتروں سے واقعات کربلا سننے والا، پرندوں سے ہم کلام ہونے والا، درختوں کی چھاؤں کے لئے دعائیں مانگنے والا، آسمان کے ننھے سفیروں سے دوستی رکھنے والا، باغوں میں گھومنے پھرنے والا، چاند کے ساتھ سفر کرنے والا، راتوں کا ساتھ دینے والا، دریاؤں کی موجوں کی گنگناہٹ کو دل میں بسانے والا، سرسبز پہاڑوں کے منظروں سے محبت کرنے والا، چشموں اور ندیوں کے سبز پانیوں کو آنکھوں میں بسانے والا، کھیتوں اور کھلیانوں کی باتیں کرنے والا، اپنوں اور پرایوں سے محبت کرنے والا اور اداس رتوں میں روشن دنوں کے خواب بننے والا، موسیقی کے اسرار و رموز پر سر دھننے والا، سرسوں کے پھول کی چاہت میں آج کی شب خود سرسوں کے پھول کا سا ہو گیا تھا، یہ یکم مارچ ۱۹۷۲ء کی شب تھی اور ایک عظیم غزل گو اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ لاہور کے گھنے درخت اسے دیکھنے کی تمنا میں خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے، آسمان پر چاند پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ اپنے محبوب کا متلاشی تھا، چڑیاں اپنے اپنے گھونسلوں میں صبح سویرے چہچہانے کی آرزو لئے گم ہو چکی تھیں، ناصر کاظمی کے شیرازی کبوتر آج چپ سادھے ہوئے تھے، ناصر کاظمی کے پاس ان کی متاع عزیز شریک حیات جس نے ناصر کو زندگی کے لئے حوصلے دیئے، شفیقہ کاظمی، پیارا بھائی جسے ناصر نے بہت چاہا اور جو اپنے بڑے بھائی کے ساتھ سایہ کی طرح رہا، عنصر کاظمی اور ناصر کے جگر کے ٹکڑے باصر سلطان کاظمی اور حسن سلطان کاظمی جنہوں نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا، حسرت سے اپنے پیارے پاپا کو زندگی کے آخری سانس لیتے دیکھ رہے تھے۔ ناصر کاظمی کی آنکھوں میں چمک تھی، یہ چمک وہ محبت تھی، جو وہ اپنے ان پیاروں پر نچھاور کر رہا تھا۔ باصر اور حسن کو آدھی رات کو گھر بھیج دیا گیا، اب ناصر کاظمی کے پاس ان کی زندگی کے دو سہارے شفیقہ کاظمی اور عنصر کاظمی تھے۔ ۲ مارچ ۱۹۷۲ء صبح ساڑھے تین بجے ناصر کاظمی کی حالت خراب ہو گئی، سانس اکھڑ رہی تھیں، ڈاکٹر ماجد نوروز ناز ک صورت حال کو دیکھتے ہوئے ایمبولینس میں باصر اور حسن کو کرشن نگر کے گھر سے لینے چلے گئے، دونوں بچے پہنچے تو ناصر کاظمی کھلی آنکھوں سے آخری سانس لے رہے تھے، انہوں نے باصر اور حسن کو اپنے دائیں اور بائیں بازوؤں میں لیا اور دونوں کو اپنی زندگی کا آخری پیار دیتے ہوئے گلے لگا لیا۔ شفیقہ کاظمی اور عنصر کاظمی

نے ناصر کاظمی کے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور زندگی بھر سب کو حیران کرنے والا بے مثال شاعر صبح ۵ بجے ان چڑیوں کو اداس کر گیا' جو صبح سویرے ناصر کو اداس کرتی تھیں' ناصر جن کی آوازیں سن کر اداس ہو جاتا تھا' آج صبح سویرے ان چڑیوں کی چہچہاہٹ' گہری خاموشی میں ڈوب چکی تھیں' ناصر کاظمی نے بھی اپنی موت کا کیا وقت چنا تھا' وہ وقت جب وہ زندگی میں بہت اداس ہوتا تھا' اسی وقت سب کو اداس کر گیا' لیکن اسے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ گیا:

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

ناصر کاظمی جیسا کوئی ہو یا نہ ہو' دنیا بھی اسی طرح دائم رہے گی اور ناصر کی شاعری بھی ہمیشہ زندہ رہے گی اور یقیناً ہر دور کی غزل میں اس کا نشان ملے گا۔

وہ ہجر کی رات کا ستارا وہ ہم نفس وہ ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ

وہ واقعی ہجر کی رات کا ستارا تھا' ایک ایسا ستارا جس کی روشنی شاعری کی صورت میں ہمیشہ دلوں میں گھر کیے رہے گی' اس کا پیارا نام ہمیشہ غزل کی آبرو کہلائے گا۔

آنکھوں میں کٹی پہاڑ سی رات
سو جا دل بے قرار کچھ دیر
دنیا تو سدا رہے گی ناصر
ہم لوگ ہیں یادگار کچھ دیر

زندگی کی پہاڑ رات کو ناصر نے کیسے بسر کیا' یہ پہلا باب شاید ناصر کاظمی کے شام و سحر کا احاطہ کر سکے' اب اس کا بے قرار دل سو گیا ہے' مگر اس کی یادیں اب بھی زندہ ہیں۔ ناصر کی موت کی خبر سنتے ہی ریڈیو نے ۲ مارچ کی شب کو ریڈیو میں منعقدہ ہونے والا مشاعرہ ملتوی کر دیا' اس کی جگہ ناصر کاظمی کی یاد میں خصوصی پروگرام نشر کیا گیا' اور ۔سنل کالج ناصر کاظمی کے انتقال کے سوگ میں بند کر دیا گیا' ادبی حلقوں میں تعزیتی قرار دادیں پاس ہوئیں' اخبارات نے اگلے روز ناصر کاظمی کی موت کی خبریں

نمایاں طور پر شائع کیں' ناصر کاظمی کا جنازہ شام ۵ بجے ان کے گھر کرشن نگر سے اٹھایا گیا' جنازے میں تمام اہل قلم حضرات کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبہ سے تعلق رکھنے والے فن کاروں' مصوروں' مزدوروں' تانگے والوں' ٹیکسی والوں' دوکان داروں' چھابڑی فروشوں' صحافیوں' اساتذہ اور طالب علموں نے بڑی تعداد میں شرکت کی' نماز جنازہ مومن پورہ کے قبرستان کی مسجد میں ادا کی گئی اور ناصر کاظمی کو مومن پورہ کے دائیں گوشے میں سپرد خاک کر دیا گیا' انکی قبر پر جو کتبہ لگایا گیا ہے' اس پر بھی یہی شعر ہے:

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

آج ناصر کاظمی کے سبھی چاہنے والے کہتے ہیں:

جنہیں ہم دیکھ کے جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے

باغ سنسان ہو گیا ناصر
آج وہ گل خزاں نے چھین لیا

اور ناصر نے اپنی زندگی میں ٹھیک ہی تو کہا تھا:

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفل سخن میں
ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

○

ناصر کاظمی مرحوم کی تصنیفات ::

انبالہ شہر مشرقی پنجاب میں میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے مطابق یکم دسمبر ۱۹۲۳ء

کو جنم لینے والا سید ناصر رضا المعروف ناصر کاظمی ۲ مارچ ۱۹۷۲ء بمطابق ۱۵ رمضان المبارک ۴۹ برس کی عمر میں داغ مفارقت دے گیا' وہ جب تک جیا' بڑے ڈھنگ اور سلیقے کے ساتھ زندگی بسر کی' شعر کہے' نثر لکھی' روز نامہ' روز نامچے تحریر کئے' پرندوں' درختوں' ستاروں' چاند' آبشاروں' باغوں' دریاؤں' ندیوں' پہاڑوں' کبوتروں' چڑیوں اور فطرت کے ایک ایک رنگ کو اپنا ہمراز بنایا اور موسیقی' شطرنج' پتنگ' گھڑ سواری' سیر سپاٹے اور شکار سے اپنا دل بہلایا' اس نے ۴۹ برس کی عمر میں جو حیرانیاں تخلیق کیں' اس کے اپنے ہم عصر شعرا میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی' جس نے اس طرح کی متنوع تخلیقی زندگی گزاری ہو۔

ناصر کاظمی نے اپنی تخلیقی زندگی کی ابتدا تیرہ برس کی عمر میں کی اور ابتدا میں نظمیں اور پھر غزلیں کہیں' اسے بطور شاعر مقبولیت اس وقت حاصل ہوئی' جب وہ ایف اے کا طالب علم تھا اور پھر جب پاکستان بننے کے بعد اس کے اشعار کی مہک گوشے گوشے میں پھیلی تو محمد حسن عسکری نے کہا کہ پاکستان کو نیا شاعر ناصر کاظمی کے روپ میں مل گیا ہے' ناصر کاظمی نے ابتدا میں غزلیں کہیں اور یہ غزلیں ہی اس کی شاعری کی پہچان بنیں۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ برگ نے کے نام سے ان کی زندگی ہی میں ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کی غزلیں مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہیں' جن کا ذکر ہم پہلے باب میں کر چکے ہیں' وہ مختلف ادبی جریدوں اوراق نو ۵۱-۱۹۵۵ء ہمایوں ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۷ء خیال ۱۹۵۷ء کے مدیر رہے' ان کا منظوم ڈرامہ سر کی چھایا اور نظم نشاط خواب پہلی مرتبہ ۱۹۵۷ء میں سویرا میں شائع ہوئی۔ ۵۸-۴-۱۰ تا ۵۸-۱۲-۲۲ وہ محکمہ سماجی بہبود میں لائیزاں آفیسر رہے اور ۵۹-۱-۱ تا ۶۴-۷-۳۱ تک و یلج ایڈ محکمہ میں ہم لوگ کے نائب مدیر اور اسسٹنٹ پبلسٹی آفیسر رہے۔ ۶۴-۷-۱ تا دم آخر وہ ریڈیو پاکستان کے سٹاف آرٹسٹ رہے' ان کی کتاب خشک چشمے کے کنارے میں ریڈیو کی ملازمت کی تاریخ ۶۴-۸-۱ دی گئی ہے' جو درست نہیں' اصل تاریخ ۶۴-۷-۱ ہے۔ (ملاحظہ کیجئے ضمیمہ کے حصہ میں ناصر کاظمی کا ریڈیو کنٹریکٹ) اپنی زندگی ہی میں انہوں نے امریکن سوسائٹی از کینتھ ایس لن کا ترجمہ کیا' اس کے علاوہ ریڈیو کے لئے

بہت سے فیچر اور مضمون لکھے' دوستوں سے تخلیقی مکالمے کیے' ان کی یہ تحریریں مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہیں' اس دوران انہوں نے انتخاب ولی' انتخاب میر' انتخاب انشا' انتخاب نظیر' انتخاب داغ' انتخاب غالب' انتخاب انیس' انتخاب شاد عظیم آبادی' انتخاب قلق لکھنوی' انتخاب مصحفی اور انتخاب مومن کیا' اس کے علاوہ انہوں نے روزنامچے لکھے' پھر ان روز ناموں میں سے ایک انتخاب چند پریشاں کاغذ کے نام سے کیا۔ ناصر کاظمی کی زندگی میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' صرف ان کی غزلوں کا مجموعہ برگ نے کتابی صورت میں ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا' اس کے بعد ناصر کاظمی کے فرزندوں باصر سلطان کاظمی اور حسن سلطان کاظمی نے ان کے دیگر مجموعے شائع کرائے' ان میں دیوان (غزلیں) ۱۹۷۲ء' پہلی بارش (غزلیں) ۱۹۷۵ء' نشاط خواب (نظمیں)' ۱۹۷۷ء سر کی چھایا (منظوم ڈرامہ) ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ ناصر کاظمی کے نثر پارے جس میں ان کے مضامین' ریڈیو فیچرز' مقالے' اداریے' مکالمے' انٹرویو شامل ہیں' خشک چشمے کے کنارے کے نام سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئے' ناصر کا انتخاب کردہ کلام میر ۱۹۸۹ء' انتخاب نظیر ۱۹۹۰ء' انتخاب ولی ۱۹۹۱ء اور انتخاب انشا ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ باصر سلطان کاظمی اور حسن سلطان کاظمی اب ناصر کاظمی کی ڈائریاں' البم' انتخاب داغ' انتخاب انیس' انتخاب غالب' انتخاب شاد عظیم آبادی' انتخاب قلق لکھنوی' انتخاب مصحفی اور انتخاب مومن ترتیب دے رہے ہیں۔

○::○

حواشی

۱:۔ افتخار حسین کاظمی، انٹرویو مقالہ نگار، ۷ مئی ۱۹۹۳ء

۲:۔ ناہید قاسمی، ناصر کاظمی، فن اور شخصیت، ص: ۱۱

۳:۔ صغرا بی بی، "بم، کبوتر اور شاعری" مضمون مشمولہ "ہجر کی رات کا ستارہ" مرتبہ احمد مشتاق، نیا ادارہ، لاہور، جنوری ۱۹۷۶ء

۴:۔ ناصر کاظمی، ڈائری نمبرا

۵:۔ عنصر کاظمی، انٹرویو مقالہ نگار، ۳ مارچ ۱۹۹۳ء

۶:۔ ناصر کاظمی ڈائری نمبرا

۷:۔ ناصر کاظمی ڈائری نمبرا ص: ۳

۸:۔ ناہید قاسمی، "ناصر کاظمی فن اور شخصیت" ص: ۱۵، ۱۶

۹:۔ ایک مکالمہ، رفتار کا بدن، رسالہ سویرا ۱۹، ۲۰، ۲۱، ص: ۲۸۹

۱۰:۔ ناصر کاظمی، ڈائری نمبر ۳

۱۱:۔ ناصر کاظمی، ڈائری نمبرا

۱۲:۔ عنصر کاظمی، انٹرویو مقالہ نگار، ۳ مارچ ۱۹۹۳ء

۱۳:۔ ناصر کاظمی ڈائری نمبرا

۱۴:۔ ناصر کاظمی ڈائری نمبرا ص: ۱

۱۵:۔ ڈاکٹر اجمل نیازی، انٹرویو مقالہ نگار، ۷ جون ۱۹۹۳ء

۱۶:۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی، انٹرویو مقالہ نگار، ۳ اپریل ۱۹۹۳ء

۱۷:۔ ناصر کاظمی، "خشک چشمے کے کنارے" ص: ۱۸۲

۱۸:۔ ناصر کاظمی غیر مطبوعہ ڈائری نمبرا

۱۹:۔ ناصر کاظمی ڈائری نمبرا

۲۰:۔ انتظار حسین، ٹی وی انٹرویو۔

۲۱:۔ ناصر کاظمی ڈائری نمبرا

۲۲:۔ افتخار کاظمی، انٹرویو مقالہ نگار، ۷ مئی ۱۹۹۳ء

۲۳:۔ انتظار حسین، "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق، ص: ۲۶

۲۴:۔ انتظار حسین، "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق، ص: ۲۶

۲۵ـ: ناصر کاظمی، ''خشک چشمے کے کنارے'' ص: ۱۵
۲٦ـ: انتظار حسین، ''ہجر کی رات کا ستارا'' مرتبہ احمد مشتاق، ص: ۳۳
۲۷ـ: منیر احمد شیخ، ''ہجر کی رات کا ستارا'' مرتبہ احمد مشتاق ص: ٤٦
۲۸ـ: منیر احمد شیخ، ''ہجر کی رات کا ستارا'' مرتبہ احمد مشتاق ص: ٦۵
۲۹ـ: شفیقہ کاظمی، انٹرویو مقالہ نگار، ۳ مارچ ۱۹۹۳ء
۳۰ـ: عنصر کاظمی، انٹرویو مقالہ نگار، ۳ مارچ ۱۹۹۳ء
۳۱ـ: انتظار حسین، ''ہجر کی رات کا ستارا'' مرتبہ احمد مشتاق، ص: ۲۹، ۲۸
۳۲ـ: شہرت بخاری، انٹرویو مقالہ نگار، ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء
۳۳ـ: انتظار حسین، ''ہجر کی رات کا ستارا'' مرتبہ احمد مشتاق، ص: ۳۰
۳٤ـ: افتخار کاظمی انٹرویو مقالہ نگار ۷ مئی ۱۹۹۳ء
۳۵ـ: ناصر کاظمی ڈائری نمبرا
۳٦ـ: ناصر کاظمی ڈائری، نمبرا
۳۷ـ: صغرا بی بی مضمون ''بم، کبوتر اور شاعری'' ص: ۱٤
۳۸ـ: احمد عقیل روبی، ''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' ص: ۳۵
۳۹ـ: افتخار کاظمی انٹرویو مقالہ نگار، ۷ مئی ۱۹۹۳ء
٤۰ـ: احمد عقیل روبی، ''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' ص: ۳٤، ۳۵
٤۱ـ: احمد عقیل روبی، ''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' ص: ۱۰٤
٤۲ـ: ناصر کاظمی غیر مطبوعہ ڈائری ''چند پریشاں کاغذ'' مملوکہ باصر سلطان کاظمی، حسن سلطان کاظمی
٤۳ـ: ناصر کاظمی غیر مطبوعہ ڈائری۔
٤٤ـ: ناصر کاظمی ڈائری نمبرا
٤۵ـ: ناصر کاظمی، ''میں کیوں لکھتا ہوں'' خشک چشمے کے کنارے، ص: ۱۲
٤٦ـ: ناصر کاظمی، دیباچہ برگ نے، مکتبہ خیال لاہور ۱۹۸۷ء
٤۷ـ: انتظار حسین، مکالمہ، خشک چشمے کے کنارے، ص: ۳٦۷
٤۸ـ: احمد عقیل روبی، ''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' ص: ۱۹

۴۹ ـ: ایضاً"
۵۰ ـ: انتظار حسین، "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق، ص: ۳۲، ۳۳
۵۱ ـ: شفیقہ بیگم انٹرویو مقالہ نگار، ۳ مارچ ۱۹۹۳ء
۵۲ ـ: صغرا بی بی، "بم کبوتر اور شاعری" مطبوعہ ہجر کی رات کا ستارا مرتبہ احمد مشتاق، ص: ۱۱
۵۳ ـ: ناصر کاظمی، سویرا مطبوعہ "خشک چشمے کے کنارے"، ص: ۱۳
۵۴ ـ: صغرا بی بی مضمون "بم کبوتر اور شاعری" مطبوعہ ہجر کی رات کا ستارا مرتبہ احمد مشتاق ص: ۱۱
۵۵ ـ: افتخار کاظمی، انٹرویو مقالہ نگار، ۷ مئی ۱۹۹۳ء
۵۶ ـ: صغرا بی بی مضمون "بم کبوتر اور شاعری" مطبوعہ ہجر کی رات کا ستارا مرتبہ احمد مشتاق ص: ۱۱
۵۷ ـ: صغرا بی بی بم کبوتر اور شاعر "مطبوعہ ہجر کی رات کا ستارہ ص: ۱۳۔
۵۸ ـ: ناہید قاسمی "ناصر کاظمی۔ شخصیت اور فن" ص: ۳۲
۵۹ ـ: ایضاً" ص: ۳۳
۶۰ ـ: انتظار حسین، آخری انٹرویو "خشک چشمے کے کنارے" ص: ۳۵۶
۶۱ ـ: ناصر کاظمی، خوشبو کی ہجرت، خشک چشمے کے کنارے، ص: ۲۳۶
۶۲ ـ: انتظار حسین آخری انٹرویو خشک چشمے کے کنارے ص: ۳۵۵
۶۳ ـ: انتظار حسین آخری انٹرویو خشک چشمے کے کنارے ص: ۳۵۸
۶۴ ـ: "ناصر کاظمی خشک چشمے کے کنارے" ص: ۱۸
۶۵ ـ: ناصر کاظمی مکالمہ انتظار حسین "خشک چشمے کے کنارے" ص: ۳۶۶
۶۶ ـ: ڈاکٹر سہیل احمد خان، "طرفیں" ص: ۴۷، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۸ء
۶۷ ـ: ناصر کاظمی مکالمہ انتظار حسین، "خشک چشمے کے کنارے" ص: ۳۶۵
۶۸ ـ: ناصر کاظمی، مکالمہ انتظار حسین، ص: ۳۱۲، ۳۱۳ "خشک چشمے کے کنارے"

۶۹ ۔: ناہید قاسمی "ناصر کاظمی شخصیت اور فن" ص : ۴۹

۷۰ ۔: ناصر کاظمی مکالمہ انتظار حسین "خشک چشمے کے کنارے" ص : ۳۱۳، ۳۱۴

۷۱ ۔: ناصر کاظمی مکالمہ انتظار حسین "خشک چشمے کے کنارے" ص : ۳۱۷، مطبوعہ ماہ نو کرچی، مارچ ۱۹۵۵ء

۷۲ ۔: ناصر کاظمی مکالمہ انتظار حسین، "خشک چشمے کے کنارے" ص : ۳۲۸، نیا اسم نیا دور کراچی، شمارہ ۷ ۔ ۸

۷۳ ۔: شفیقہ بیگم، انٹرویو مقالہ نگار ۳۔ مارچ ۱۹۹۳ء

۷۴ ۔: ایضا"

۷۵ ۔: افتخار کاظمی، انٹرویو، مقالہ نگار، ۷ مئی ۱۹۹۳ء

۷۶ ۔: ناصر کاظمی، "خشک چشمے کے کنارے" انٹرویو انتظار حسین، ص : ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲

۷۷ ۔: ایضا"

۷۸ ۔: ناہید قاسمی، "ناصر کاظمی شخصیت اور فن" ص : ۲۷

۷۹ ۔: عبدالحمید، "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق، ص : ۱۹

۸۰ ۔: عبدالحمید، "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق، ص : ۲۱

۸۱ ۔: عبدالحمید، "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق، ص : ۱۸

۸۲ ۔: شہرت بخاری، "کھوئے ہوؤں کی جستجو" ص : ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۷ء

۸۳ ۔: ناصر کاظمی، "برگ نے" (اعتبار نغمہ) مکتبہ خیال لاہور، جنوری ۱۹۸۷ء

۸۴ ۔: عنصر کاظمی، انٹرویو مقالہ نگار، ۳، مارچ ۱۹۹۳ء

۸۵ ۔: ناصر کاظمی، "خشک چشمے کے کنارے" مکالمہ انتظار حسین، ص : ۳۵۸

۸۶ ۔: ناصر کاظمی، برگ نے، ص : ۲۳، ۲۴

۸۷ ۔: ناصر کاظمی، "خشک چشمے کے کنارے" خوشبو کی ہجرت ایک مکالمہ ص : ۲۴۸ مطبوعہ سویرا شمارہ ۱۷ ۔ ۱۸

۸۸ ـ: صغرا بی بی مضمون "بم کبوتر اور شاعری" مطبوعہ ہجر کی رات کا ستارا مرتبہ احمد مشتاق ص: ۱۳۔ ۱۴

۸۹ ـ: عنصر کاظمی' انٹرویو مقالہ نگار' ۳ مارچ ۱۹۹۳ء

۹۰ ـ: عنصر کاظمی' انٹرویو مقالہ نگار' ۳ مارچ ۱۹۹۳ء

۹۱ ـ: عنصر کاظمی' انٹرویو مقالہ نگار' ۳ مارچ ۱۹۹۳ء

۹۲ ـ: ناصر کاظمی' "خشک چشمے کے کنارے" مکالمہ انتظار حسین' ص: ۳۶۸

۹۳ ـ: ناصر کاظمی' "خشک چشمے کے کنارے" مکالمہ انتظار حسین' ص: ۳۶۹

۹۴ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" مکالمہ انتظار حسین' ص: ۳۶۸' ۳۶۹

۹۵ ـ: انتظار حسین' "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق' ص: ۴۲

۹۶ ـ: انتظار حسین' "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق' ص: ۴۲' ۴۳

۹۷ ـ: ناصر کاظمی' "خشک چشمے کے کنارے" مکالمہ انتظار حسین' ص: ۲۱۴

۹۸ ـ: انتظار حسین' "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق' ص: ۳۵

۹۹ ـ: انتظار حسین' "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق' ص: ۳۵

۱۰۰ ـ: منیر احمد شیخ' "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق ص: ۶۹

۱۰۱ ـ: احمد عقیل روبی' "مجھے تو حیران کر گیا وہ" ص: ۱۹

۱۰۲ ـ: انتظار حسین' "ہجر کی رات کا ستارا" مرتبہ احمد مشتاق' ص: ۴۹

۱۰۳ ـ: احمد ندیم قاسمی فنون اپریل' مئی ۱۹۷۵ء ناصر کی یاد میں" ص ۱۰۰

۱۰۴ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" مکالمہ انتظار حسین' ص: ۳۷۲' ۳۷۳

۱۰۵ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" مکالمہ انتظار حسین' ص: ۳۷۲' ۳۷۳

۱۰۶ ـ: ناصر کاظمی' غیر مطبوعہ ڈائری مملوکہ باصر سلطان کاظمی ۔ حسن سلطان کاظمی

۱۰۷ ـ: شیخ صلاح الدین گفتگو مقالہ نگار' ۲۶ جون ۱۹۹۴ء

۱۰۸ ـ: ناصر کاظمی، ''خشک چشمے کے کنارے''، ص: ۱۹۰
۱۰۹ ـ: ناصر کاظمی پرسنل فائل مملوکہ ریڈیو پاکستان لاہور۔
۱۱۰ ـ: محمد اعظم خان گفتگو مقالہ نگار ۲٦ جون ۱۹۹۴ء
۱۱۱ ـ: قدرت اللہ شہاب ''شہاب نامہ'' سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۷ء ص: ۸٦۷
۱۱۲ ـ: شیخ صلاح الدین گفتگو مقالہ نگار، ۲٦ جون ۱۹۹۴ء
۱۱۳ ـ: ناصر کاظمی پرسنل فائل مملوکہ ریڈیو پاکستان لاہور۔
۱۱۴ ـ: شیخ صلاح الدین، ''ناصر کاظمی ایک دھیان''، ص: ۱۰۴
۱۱۵ ـ: ناصر کاظمی پرسنل فائل مملوکہ ریڈیو پاکستان لاہور۔
۱۱٦ ـ: ناصر کاظمی پرسنل فائل مملوکہ ریڈیو پاکستان لاہور۔
۱۱۷ ـ: ناصر کاظمی پرسنل فائل مملوکہ ریڈیو پاکستان لاہور۔
۱۱۸ ـ: ناصر کاظمی پرسنل فائل مملوکہ ریڈیو پاکستان لاہور۔
۱۱۹ ـ: ناصر کاظمی پرسنل فائل مملوکہ ریڈیو پاکستان لاہور۔
۱۲۰ ـ: انتظار حسین گفتگو مقالہ نگار، ۲٦ جون ۱۹۹۴ء
۱۲۱ ـ: شیخ صلاح الدین گفتگو مقالہ نگار، ۲۲ جون ۱۹۹۴ء
۱۲۲ ـ: حسن سلطان کاظمی گفتگو مقالہ نگار، ۲٦ جون ۱۹۹۴ء
۱۲۳ ـ: ناہید قاسمی، ''ناصر کاظمی شخصیت اور فن'' (مضمون احمد ندیم قاسمی فنون اپریل ۱۹۷۲) ص: ۵۷، ۵۸
۱۲۴ ـ: شہرت بخاری ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' ص: ۲۳۵

○::○

باب دوم

اردو غزل

ـــــــ روایت اور ارتقا

□☆⁘☆□

اردو غزل' روایت' ارتقا ::

محمد قلی قطب شاہ (۱۵٦۵ء - ۱٦۱۱ء) کو اردو زبان کا پہلا شاعر اور غزل گو تسلیم کیا گیا ہے' اگرچہ اس سے پہلے بھی شعرا کا کلام ملتا ہے' لیکن وہ اولین صاحب دیوان شاعر ہے' جس نے اپنا دیوان فارسی طریقے سے بہ اعتبار حروف تہجی ترتیب دیا' اس نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور ممکن حد تک تمام موضوعات کو اپنی شاعری کے دائرے میں داخل کیا' تاہم "مذہب" اور "عشق" دو ایسے موضوعات ہیں' جنہیں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور انہی سے باقی موضوعات کے سلسلے نکلتے ہیں' بقول ڈاکٹر جمیل جالبی۔ "غزل سے اس کی دل بستگی کا سبب یہ ہے کہ غزل کا موضوع عشق ہے اور قطب شاہ کے لئے شاعری کا محرک عشق اور صرف عشق ہے' باقی باتیں ذیلی حیثیت رکھتی ہیں یا پھر جذبہ عشق ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔"۱

قلی قطب کی نظمیں بھی ہیت کے اعتبار سے غزل ہیں تاہم نظم اور غزل کی ہیت ایک ہونے کے باوجود فرق یہ ہے کہ محبوب کی تعریف جب غزل میں آتی ہے تو یہاں محبوب حسن کا ایسا اشارہ بن جاتا ہے جو بڑی حد تک مجرد اور مذکر ہے۔ اس کی ہر غزل ایک گیت کی طرح ایک جذبے اور ایک موڑ کی ترجمان ہے۔ روایت سے اس کی غزل کا تعلق ضرور ہے مگر اس کی طبع آزاد سطحی اثرات قبول کرکے رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں ایمجری اور تخیل کا کوئی نظام پیدا نہیں ہوتا اور اس کی شاعری زیادہ

ترفیشی کے ذیل میں آتی ہے۔

حسن شوقی (۱۵۴۰ء - ۱۶۳۳ء) اپنے دور کا مسلم الثبوت استاد تھا۔ غزل کے ابتدائی نقش و نگار جو دکن کے مختلف شعرا لطفی۔ مشتاق۔ محمود۔ فیروز اور خیالی کے ہاں بنتے سنورتے نظر آتے ہیں' حسن شوقی کے ہاں پہلی بار یکجان ہو کر ایسے رنگ روپ سے آشنا ہوتے ہیں جو نہ صرف منفرد ہے بلکہ اردو غزل اپنا مزاج بدلتی اور نئے ادبی معیارات کی طرف بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔۔۲

اس حوالے سے حسن شوقی کے ہاں غزل کا ایک واضح تصور موجود ہے۔ وہ محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے اور عشقیہ جذبات کے مختلف رنگوں اور کیفیات کو غزل کے مزاج میں رچاتا نظر آتا ہے۔ خیال' اسلوب' لہجے اور طرزِ ادا میں وہ فارسی روایت کی پیروی کرتا ہے۔ حسن شوقی نے فارسی غزل کے اتباع میں سوز و ساز کو اردو غزل کے مزاج میں داخل کیا اور آج سے تقریباً چار سو سال پہلے ایک ایسا روپ دیا کہ نہ صرف اس کے ہم عصر اس کی غزل سے متاثر ہوئے بلکہ بعد کے شعرا بھی اسی روش پر چلتے رہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> "یہ قدیم اردو غزل کی روایت کا وہ الگ دھارا ہے جس میں محمود' فیروز' خیالی' حسن شوقی' محمد قلی قطب شاہ اور پھر شاہی' نصرتی' ہاشمی اور ان کے بعد ان گنت شعرائے غزل اپنا خون جگر شامل کر کے اس روایت کو ولی دکنی تک پہنچا دیتے ہیں اور ولی دکنی ان سب آوازوں کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی الگ آواز بنا لیتا ہے۔ اس روایت کے راستے میں حسن شوقی ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔"۔۳

حسن شوقی کی غزل کے اثرات اشرف' تائب' رحیمی' قریشی اور یوسف کے ہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان سب شعرا نے نہ صرف شوقی سے کسب فیض کا اعتراف کیا ہے بلکہ ان کے ہاں ردیف' قافیہ' تراکیب اور لفظوں کے جماؤ تک میں شوقی کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔ ان شعرا کی غزل میں حسن شوقی کی روایت "ایک نئے انداز اور نکھار کے ساتھ ابھرتی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ حسن شوقی جہاں ایک طرف اپنے اسلاف سے اردو غزل کی روایت کا اثر قبول کرتا ہے تو دوسری طرف اسے ایک نیا

اسلوب دے کر آنے والے شعرا تک پہنچا دیتا ہے۔ اور ان شعرا سے یہ سلسلہ ولی تک پہنچتا ہے اور اس کی غزل میں رنگ جماتا ہے۔" ولی اپنے سے پہلے شعرا کی صدیوں کی کوشش و کاوش اور امکانات کو سمیٹ کر انھیں شمالی ہند کی زبان سے ملا دیتا ہے اور اس طرح اردو غزل کو اپنے نئے امکان اور ایک نئے رنگ روپ سے آشنا کرتا ہے:

روایت یونہی بنتی اور بدلتی ہے اور جب سینکڑوں شاعر برسوں تک اپنے خون جگر سے روایت کے درخت کی آبیاری کرتے ہیں تب کہیں تخلیق" کا ایک سدا بہار پھول کھلتا ہے جسے کوئی ولی کہتا ہے' کوئی حافظ' سعدی' میر' غالب' اقبال کا نام دیتا ہے۔ کوئی دانتے اور چوسر کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور ہم حسن شوقی جیسے شاعروں کو بھول جاتے ہیں۔" ۴

جب ولی دکنی (۱۶۶۸ء ۔ ۱۷۲۵ء) نے غزل کو ذریعہ اظہار بنایا تو اس وقت کم و بیش ساری دکنی روایت میں غزل کا تصور یہ تھا کہ اس سے محض عورتوں سے "باتیں کرنے" یا ان کی باتیں کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ ولی سے پہلے کی غزل میں کسی گہرے تجربے' احساس یا حیات و کائنات کے شعور کا پتا نہیں چلتا۔ البتہ محمود اور حسن شوقی کے ہاں اس تصور میں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ ولی نے اسی روایت کو اپنا کر اس میں زندگی کے رنگا رنگ تجربات تنوع اور داخلیت کو سمو کر غزل کے دائرے کو پوری زندگی پر پھیلا دیا۔ یوں کہہ لیجیے کہ ولی دکنی کی شاعری میں سارے قدیم دور کی روح بھی بول رہی ہے اور ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں کو نئے امکانات سے متعارف بھی کرا رہی ہے۔ چنانچہ غزل کی وہ روایت جو آئندہ دور میں اپنے عروج کو پہنچی اس کا سرچشمہ ولی کی غزل ہے۔ غزل عاشقانہ شاعری کی ایک صنف ہے اور اس میں حسن و عشق سے پیدا ہونے والے جذبات و احساسات کی مختلف کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ ولی کی شاعری میں بھی حسن و عشق کا یہی جلوہ نظر آتا ہے لیکن یہاں ایک ایسے سوز اور عشق کے ایسے سادہ و پیچیدہ تجربے کا اظہار ہوتا ہے جو اردو شاعری میں ایک بالکل نئی چیز ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی۔

"ولی کے تصور عشق میں وفاداری بشرط استواری کا عقیدہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں عاشق نہ بوالہوس ہے کہ حسن پرستی شعار کرے اور

نہ ہرجائی ہے کہ در در جھانکتا پھرے۔ اس وفاداری کے سبب سے اس کے ہاں جلنے' تڑپنے اور اندر ہی اندر عشق کی آگ میں سلگنے کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ شاہی اور نصرتی کی طرح اپنے "شکار" سے کھیلتا نظر نہیں آتا بلکہ معشوق کی ہر ہر ادا اور اس کے خد و خال سے گرمی عشق کو تیز کر کے اپنی کیفیت' جذبے اور سوز کو گہرا کرتا ہے۔"۵

ولی کے ہاں عشق کے اس جذبے کی صراحت کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"بات دراصل یہ ہے کہ ولی ایک تندرست ذہن رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں انفعالیت پسندی نہیں تھی۔ وہ اپنے آس پاس اور گرد و پیش کو دیکھ سکتے تھے۔ ان کی آنکھیں باہر کی طرف بھی کھلی تھیں۔ اس صورت حال نے ان کے یہاں ایک خارجی زاویہ نظر بھی پیدا کیا ہے۔ اس خارجی زاویہ نظر نے انہیں حسن سے قریب کیا ہے اور وہ اس کو صحت مندی کے ساتھ دیکھنے کی طرف کچھ اس طرح متوجہ ہوئے ہیں کہ ان کا مزاج بن گیا ہے۔ چنانچہ وہ اس حسن کو ایک عام صحت مند انسان کی طرح دیکھتے ہیں۔ ایک ایسے انسان کی طرح جو زندگی کو بسر کرنا اور برتنا چاہتا ہے اور جس کے پیش نظر زندگی مسرت کے مترادف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس مسرت کو ذہنی تعیش سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔"۶

چنانچہ ولی کے ہاں عشق ایک شائستگی ہے' سنجیدگی اور گہرائی ہے۔ اردو غزل میں پہلی بار عشق کا تصور ایک ارفع سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ اسی تصور عشق کے ذریعے ولی تصوف کی روایت کو اپنے موضوعات کے پھیلاؤ اور کم و بیش ساری علامات کے ساتھ اردو شاعری کے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ اور اپنے نئے لہجے اور زندہ آوازوں سے ان میں ایک ایسا رنگ بھر دیتا ہے جو آنے والے شاعروں کے لیے شائستگی و لطافت' نرم روی' بے نیازی اور درویشانہ قناعت کا اعلیٰ معیار قائم کر دیتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ولی نے خواص کے ساتھ ساتھ اردو غزل کا رابطہ عوام سے پیدا کیا اور یوں اردو غزل کی تحریک ایک خاص حصار سے نکل کر عوامی سطحوں کو چھونے لگی۔ آزاد

لکھتے ہیں :

"گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انہیں کی غزلیں گانے لگے۔ ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے۔" ۷ے

ولی کی غزل کا یہ نیا رنگ پورے ہندوستان میں پھیل گیا اور اس دور کے نامور شعرا نے ولی کے چراغ سے روشنی حاصل کی اور اس کی غزل کی مہکاروں سے اپنے ایوان سخن کو معطر کیا۔ ولی کے معاصرین اور فوراً بعد کی نسل نے ولی کے رنگ سخن ہی میں شعر کہنے کی کوشش کی۔ بعض شعرا نے اس کے مختلف رنگوں میں سے ایک رنگ (ایہام گوئی) لے کر اسے اس کثرت سے استعمال کیا کہ جلد ہی اس رنگ کے خلاف رد عمل کی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ چنانچہ اس رد عمل میں جو شاعری ابھری وہ بھی ولی ہی کا ایک دوسرا رنگ تھا۔ اس طرح مختلف ادوار میں مختلف شعرا سامنے آئے جن پر ولی کی استادی کی مہر واضح طور پر ثبت ہے۔ ۸ے

ولی نے نئی زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بقول نور الحسن ہاشمی:

"ولی سے پہلے یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ برج بھاشا یا اردو میں شعر کہنا تفریح کی حد تک تو غنیمت ہے لیکن اردو زبان کو لوگ اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ یہ اعلیٰ تفکر کی حامل ہو سکے گی۔ وہ اس کو محض ایک بولی کی حیثیت دیتے تھے اور اپنے تصور کی لطافتوں' باریکیوں اور نزاکتوں کا بار اٹھانے کے ناقابل سمجھتے تھے اور اسی لئے اس کو محض تفنن طبع کے طور پر منہ لگاتے تھے لیکن ۱۷۰۰ء میں ولی اور ۱۷۲۰ء میں ان کے دیوان کی آمد نے اس غلط فہمی کو تمام تر دور کر دیا۔ کثرت مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ گلی گلی ولی کا کلام پڑھا' گایا اور سنایا جانے لگا۔ عوام تو اس کے منتظر ہی تھے کہ کوئی ایسا کلام ملے جو ان کی اپنی زبان میں ہو اور اچھا ہو۔ ولی نے اس دیرینہ اور شدید تمنا کو پورا کر دیا۔ گویا ولی ایک تاریخی ضرورت بن کر سامنے آئے۔" ۹ے

اہل دکن اور اہل شمالی ہند کے میل جول سے نئی نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ اردو زبان میں داخل ہوئے۔ ولی نے اس دور کی زبان کو اپنے کلام میں محفوظ

کرکے ایک تاریخی فرض انجام دیا۔ اس عہد کے شعرا میں شاہ حاتم نے ولی کے تتبع میں اپنا اردو دیوان مرتب کیا۔ آبرو، یکرنگ، مضمون، شاکر ناجی اور فائز دہلوی وغیرہ ولی کی زمینوں میں غزلیں لکھنے اور فارسی کے مضامین کو اردو کے روپ میں پیش کرنے پر آمادہ ہو گئے اور جہاں پہلے حافظ، سعدی، جامی اور خسرو کا نام گونجتا تھا وہاں ولی کی غزل کا سکہ چلنے لگا۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد صادق سے اتفاق کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ولی کی غزل کی تحریک فارسی زبان کے غلبے کے خلاف مقامی زبانوں کا رد عمل ظاہر کرنے کی تحریک تھی۔" (ترجمہ)۔۱۰

ولی کے کلام کے زیر اثر شمالی ہندوستان میں اردو غزل کا ایک باقاعدہ دور شروع ہوا اور میر، سودا اور درد نے اس صنف کو آسمان شاعری کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ان شعرا نے ایک جانب ولی کی قائم کردہ شعری روایات کو اپنی شاعری میں جگہ دی اور دوسری جانب اپنی افتاد طبع سے ایسے گلہائے رنگا رنگ تخلیق کئے کہ ناقدین کو موضوعات اور اسالیب ہر اعتبار سے یہ دور اردو کا سنہرا دور قرار دینا پڑا۔۱۱ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "ولی کی حیثیت ایک پل کی ہے۔ اس کے ہاں نہ صرف دکنی دور کی اہم خصوصیات موجود ہیں بلکہ اس نے غزل کے اصل مزاج کو اپنانے کی کوشش بھی کی ہے اور یوں اس کی غزل کے ڈانڈے اٹھارھویں صدی کی اس غزل سے بھی جا ملتے ہیں جس نے دہلی میں فروغ حاصل کیا۔"۔۱۲

ولی دکنی کے فوراً بعد کی نسل میں مظہر جان جاناں (۱۶۹۸ء۔ ۱۷۸۲ء) اور سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۵ء۔ ۱۷۶۳ء) کا نام اس اعتبار سے اہم ہے کہ انہوں نے ولی اور میر و سودا کے عہد کے درمیانی عرصے میں ولی کی روایت سے استفادہ کرکے اسے اور زیادہ مضبوط بنایا۔ چونکہ مظہر جان جاناں کا نام ایہام گوئی کے خلاف فعال کردار ادا کرنے کی بنا پر نمایاں ہے انہوں نے اردو غزل میں ایہام گوئی اور بلا ضرورت ہندی الفاظ کے استعمال کے خلاف قدم اٹھا کر جو کام کیا اس کی ایک مستقل اور دائمی اہمیت و افادیت ہے۔ اس سے اردو میں اصلاح زبان کی ایک ایسی باقاعدہ اور مستقل تحریک کا آغاز ہوا جس نے اردو کا رشتہ مضبوطی اور استواری سے فارسی زبان و ادب کے ساتھ جوڑ دیا۔ سراج

اورنگ آبادی کو جمیل جالبی نے ولی کے بعد اور دور میر و سودا سے پہلے کے درمیانی عرصے کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔

"ان کے خیال میں سراج کی پر گوئی، جوش طبع اور رنگ سخن کو کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچتا۔ سراج میں مختلف عشقیہ کیفیات میں تمیز کرنے اور انہیں الفاظ کی گرفت میں لے آنے کی زبردست صلاحیت ہے۔ عشق نے ان کے اندر ایک ایسا آہنگ اور احساس موسیقی پیدا کیا ہے کہ الفاظ ولی سے کہیں زیادہ شگفتہ اور تر و تازہ نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں اظہار بیان میں ایک نیا پن اور ایک توازن ہے۔ یہاں دل و دماغ بیک وقت مل کر ایک وحدت بناتے ہیں۔ اسی تخلیقی عمل میں سراج کی عظمت کا راز چھپا ہوا ہے اور یہی وہ شعور ہے جو انہیں صف اول کا شاعر بنا دیتا ہے اور ولی کی روایت ریختہ تیزی سے اپنا چولا بدل کر اتنی آگے بڑھ جاتی ہے کہ میر کی شاعری امکان کے افق پر ابھرنے لگتی ہے۔" ۱۳

میر تقی میر (۱۷۲۲ء - ۱۸۱۰ء) کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے پوری اردو کے حسن کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ آشکار کیا۔ ٹھیٹھ بول چال کی زبان سے انہوں نے شاعری کی زبان وضع کی اور فارسی اثرات کی خوش آہنگ آمیزش سے ایک نوزائیدہ زبان کو ایمائی اظہار کی ایسی ایسی رفعتوں تک پہنچا دیا کہ باید و شاید۔ میر کے یہاں حسن کاری اور تہ داری کی بنیادیں دراصل زبان کی جڑوں میں پیوست ہیں۔ ان کی سلاست، صفائی، لطافت، اگرچہ بے ارادہ اور بے کاوش معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے پیچھے جو زبردست تخلیقی جوہر ہے وہ ایسا بھید بھرا معنیاتی زیر و بم پیدا کرتا ہے کہ وجود کے بمت سے سر اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ میر کی آواز کا جادو ہر عہد میں محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ ان کے لہجے کی خوش آہنگی اور تاثیر اور درد مندی کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ ان کے یہاں بحروں اور آوازوں کے ترنم، گونج اور تھرتھراہٹوں سے پورا پورا کام لیا گیا ہے۔ ان کے یہاں خاموشی اور سناٹے بولتے ہیں۔ میر کی عظمت کے کئی گوشے ہیں لیکن سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے پوری زبان کے پورے امکانات کو روشن کیا۔" ۱۴ میر اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے زبان کو شاعری بنایا وہ

شاعر کے ساتھ ساتھ زبان ساز بھی تھا۔ اس اعتبار سے اس کی اہمیت باقی رہے گی۔ میر نے اپنی زبان اور ادب کی تمام روایتوں کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ ان سے ایک حد تک رشتہ بھی قائم رکھا۔ اردو زبان کے قواعد اور مزاج کو دیکھتے ہوئے اس نے ہندوستانی زبانوں کو پوری اہمیت دی اور جب اسے بیک وقت اپنے دل و دماغ کی کوئی بات کرنی ہوتی تو اس نے فارسی اور عربی تہذیب کی آواز کو اپنے اظہار میں سمویا۔" ۱۵

چنانچہ میر کے فن میں زبان، اور لہجے نے بڑا کام کیا ہے۔ ان کا لہجہ نرم اور شیریں ہے جو غزل کے مزاج کے ساتھ گہری مناسبت رکھتا ہے۔ بقول عبادت بریلوی:

"ان کے ہاں زندگی اور فن کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے اور ان دونوں میں ایک ایسی متوازن ہم آہنگی نظر آتی ہے جس سے وہ ستر پردوں میں بھی پہچان لئے جاتے ہیں۔" ۱۶

میر کے ہم عصروں میں سودا اور میر درد کے نام نمایاں ہیں۔ مرزا محمد رفیع سودا (۱۷۰۳ء۔ ۱۷۸۳ء) نے اردو زبان اور شاعری کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ فارسی شاعری سے لگاؤ کے باوجود ان کے تمام تر شہرت ان کی ریختہ گوئی کی مرہون منت ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

"سودا کے اردو کلام کے پس منظر اور ان کی فنی کرشمہ سازی کو سمجھنے کے لیے ان کا فارسی کلام آئینہ کا کام دیتا ہے۔ غزلوں میں نظیری اور صائب کا رنگ نمایاں ہے۔ سودا بلا شبہ ہماری زبان اور ادب کے معمار ہیں ان کا دور بلند قامت اساتذہ کا دور ہے جس میں حاتم سے لے کر میر تک سبھی شامل ہیں۔ دیوان زادہ حاتم گواہ ہے کہ سودا کی متعدد غزلیں اس دور کی مقبول طرحوں میں کہی گئی ہیں جس سے تقابلی مطالعے کے لیے نئی راہ نکلتی ہے اور اس دور کے مزاج اور معیار تک رسائی ہو سکتی ہے۔" ۱۷

خواجہ میر درد (۱۷۱۹ء۔ ۱۷۸۵ء) نے اپنے محدود دائرے میں رہ کر غزل کو وسیع کیا اور اس میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا کی۔ انہوں نے حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ انسانی زندگی کے جذباتی نظام کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ انہوں نے تصوف کو غزل میں داخل کیا اور حیات و

کائنات کے اسرار و رموز کو غزل کا موضوع بنایا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے غزل کی فنی روایت کو بڑی چابک دستی سے برتا ہے اور اس میں ایک اجتہادی شان بھی پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں ایک نئی زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ تصوف کے مخصوص زاویہ نظر نے انہیں بعض فلسفیانہ مسائل تک پہنچایا ہے چنانچہ ایسے فلسفیانہ مسائل کے ذریعے انہوں نے زندگی اور اس کے مختلف مظاہر کی ماہیتوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ انسان کی حقیقت کا سراغ لگایا ہے اور زندگی اور کائنات میں اس کے مرتبے کو معین کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو غزل نے دہلی میں نصف صدی کا دور بھی نہ گزارا ہو گا کہ اقتصادی بد حالی اور معاشرتی انتشار کے سبب بیشتر شعرا دہلی کو خیر باد کہہ کر ادھر ادھر نکل گئے۔ شعرا کی ایک معقول تعداد آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ میں نظر آتی ہے۔ ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> "شجاع الدولہ کے عہد میں اردو گو شعرا کی سرپرستی مسلم ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں آرزو نے دہلی سے آنے والوں کے لیے راستہ کھولا۔ آصف الدولہ کے عہد میں سودا، میر، انشا، جرأت، مصحفی سب موجود تھے۔" ۱۸۰

دہلی سے آنے والے شعرا میں سے جرأت، انشا، مصحفی، رنگین وغیرہ رفتہ رفتہ لکھنؤ کے طربیاتی ماحول سے مانوس ہوتے چلے گئے۔ ان شعرا ہی کی وجہ سے یہاں اردو غزل کے چرچے اور ہنگامے عروج پر پہنچے اور انہوں نے آہستہ آہستہ ایک دبستان کی شکل اختیار کر لی۔ جس نے آتش اور ناسخ کے عہد میں اپنی واضح شناخت کرائی۔

آتش (۱۷۶۵ء - ۱۸۴۶) اردو غزل کی روایت میں غالباً پہلا شاعر ہے جس کے ہاں زندگی کے بارے میں ایک اثباتی نقطہ نظر پایا جاتا ہے اور یاس و نا امیدی، لذت و ہوس یا سکون و جمود کے بجائے صحت مند نشاط و سرشاری اور زندگی سے بھرپور پر امید اور رجائی انداز نظر ملتا ہے۔ آتش کے عام لہجے میں بھی ایک متحرک کیفیت ہے۔ وہ غم ہو یا خوشی دونوں میں حرکت کے پہلو ڈھونڈ لیتا ہے۔ اور مجموعی طور پر یہ تاثر دیتا ہے کہ یہ غم یا خوشی انسان کے لیے اس کی عظمت و قوت کی ضامن ہے۔ آتش نے

اپنے کلام میں جہاں جہاں فارسیت کا سہارا لیا ہے وہاں بھی مذاق سلیم کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ان کی لفظی صنعت گری اور تراکیب اردو کے مزاج سے شیر و شکر ہو جاتی ہیں اور غزل کے لہجے میں ایک طرح کا وزن اور وقار پیدا کرتی ہیں۔

ناسخ (۱۷۷۲ء۔ ۱۸۳۸ء) کی غزلوں میں ایسے مضامین جن کو روایتی اعتبار سے غزل میں کم ہی جگہ ملتی ہے، افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ ناسخ اس اعتبار سے اہم شاعر ہیں کہ انہوں نے غزل میں اپنے عہد کے سارے شاعروں سے زیادہ توسیع کی۔ اور ان کے معاصرین پر یا ان کے بعد غزل میں جاری رہنے والی توسیع میں جس کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے، ناسخ کا بھی اثر ہے۔ ناسخ کی اس توسیعی کوشش میں خالص غزل تو رہ گئی لیکن دخیل موضوعات کو ناسخ کے یہاں خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اخلاق، عبرت، گردش لیل و نہار، پند و نصائح، خود داری، عزت نفس، عالی ظرفی، شرافت و نجابت کا احساس، ایثار و قربانی اور اسی قبیل کے دوسرے مضامین جب ان کی غزلوں میں نمودار ہوتے ہیں تو خوش گوار اثر پیدا کرتے ہیں اور ایسے مضامین باندھنے میں وہ اپنے ہم عصر شعرا سے کہیں آگے رہتے ہیں۔ حقیقت میں ناسخ کا مطالعہ ایک شاعر کے مطالعے سے کہیں زیادہ ایک اسلوب، ایک تحریک اور ایک دور اور اس کے ادبی عزائم کے مطالعہ کی حیثیت رکھتا ہے جس نے مجموعی طور پر اردو زبان کے ادبی رجحانات کو ایک طویل زمانہ تک کسی بھی دوسری تحریک سے زیادہ متاثر کیا۔ آتش، ناسخ کے معاصر تھے اور بحیثیت شاعر، ان سے بہتر تھے مگر مجموعی اثر و نفوذ میں ناسخ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ خود آتش کے شاگرد، آتش سے زیادہ ناسخ کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری چاہے دب گئی ہو مگر اردو میں لسانی انتشار اور قوانین شعر کی غیر معیاری کیفیت جو عرصہ تک مسلط رہی ہے، ناسخ کی وجہ سے دور ہوئی۔[۱۹]

کم و بیش اسی دور میں دہلی میں شاہ نصیر دہلوی (۱۷۶۱ء۔ ۱۸۳۸ء) کی غزل کا چرچا ہوا۔ آزاد لکھتے ہیں:

"آغاز شاعری کا کنارہ جرأت اور سید انشا سے ملا ہوا تھا اور انجام کی سرحد ناسخ، آتش اور ذوق میں واقع ہوئی تھی۔"[۲۰]

شاہ نصیر کا تعلق شعرا کے اس طبقے سے ہے جس کے نزدیک شعر و شاعری

وجدانی و الہامی، ذوقی و جذباتی اظہار سے زیادہ ایک لسانی آرٹ ہے۔ قافیہ بندی، مشکل پسندی، غزل در غزل اور خارجیت کی روایت اردو غزل میں سودا کے طفیل قائم ہو چکی تھی۔ شاہ نصیر نے اپنا رشتہ اسی روایت سے جوڑا اور سنگلاخ زمینوں، مشکل ردیف قافیوں میں مضمون آفرینی، بسیار گوئی۔ مسلسل نگاری اور قافیہ بندی کر کے زبان و بیان پر اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کا مذاق سخن وہی تھا جو لکھنؤ میں انشا، مصحفی اور جرأت وغیرہ نے عام کر دیا تھا۔ ایک ہی زمین میں کئی غزلیں لکھنا اور اس کا خیال رکھنا کہ کوئی قافیہ چھوٹنے نہ پائے، اس زمانے میں استادی کی دلیل تھا۔ چنانچہ شاہ نصیر اس میدان کے بھی شہ سوار تھے۔ شاہ نصیر کے ہاں موضوعات میں تنوع نہیں ہے۔ بیشتر مضامین خارجی حسن کے بیان سے متعلق ہے یا پھر کچھ اخلاقی مضامین تمثیلی انداز میں ملتے ہیں۔ بقول مصحفی، "ان کی غزلوں کے اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ دہلی میں بھی مذاق سخن کا رخ میر، درد و قائم کی روایت سے ہٹ کر سودا کی روایت کی سمت میں تھا۔" ۲۱

محمد حسین آزاد نے شاہ نصیر کے کلام کی خصوصیات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"کلام کو اچھی طرح دیکھا گیا۔ زبان، شکوہ الفاظ، چستی ترکیب میں سودا کی زبان تھی اور گرمی و لذت اس میں خداداد تھی۔ انہیں اپنی اپنی تشبیہوں اور استعاروں کا دعویٰ تھا اور یہ دعویٰ بجا تھا۔ نئی نئی زمینیں نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھیں جن میں بڑے بڑے شہ سوار قدم نہ مار سکتے تھے۔" ۲۲

دہلی کے عام مزاج سے ہٹ کر غزل کہنے پر مولوی عبدالسلام ندوی نے شاہ نصیر کو دہلی کا شیخ ناسخ قرار دیا ہے۔ ۲۳

ذوق (۱۷۹۵ء - ۱۸۵۴ء) کی غزل زبان و بیان کے حوالے سے دبستان دہلی میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ ذوق نے الفاظ کی نشست، محاورات و امثال کے برمحل استعمال، فن عروض سے واقفیت، موسیقیت اور موزوں موضوعات کی بدولت کلام میں بہت حسن پیدا کیا ہے۔ غزل کا موضوع عشق ہے اور اکثر محبوب کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے، جس کی بنا پر مشرقی تہذیب اور اس ماحول کی صنف نازک کا نقشہ آنکھوں کے

سامنے آ جاتا ہے۔ تاہم ذوق کی غزل میں جذبات و احساسات کی اس شدت کا فقدان ہے جو میر اور غالب کا خاص جوہر ہے۔ ذوق اپنی شخصیت اور ماحول کی بنا پر دبے دبے اور گھٹے گھٹے رہتے ہیں۔ طبیعت کا میلان زبان کی طرف زیادہ ہے۔ کہیں کہیں جذبہ و احساس کی کیفیت کے تحت بہت اچھے اشعار بھی کہہ گئے ہیں۔ سید فیاض محمود لکھتے ہیں

"ذوق کے بارے میں کچھ دیر سے یہ خیال مسلم حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ ان کے ہاں نہ خیالات کی بلندی ہے' نہ احساسات کی گہرائی اور نہ جذبات کی صداقت' بلکہ ان کے خیالات عامیانہ اور فرسودہ ہیں اور وہ فقط اپنے زور بیان سے ایک پوری ربع صدی کی ادبی فضا پر چھا گئے تھے۔ یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہر دور میں سخن فہم لوگوں کی شرح غالباً" ایک جیسی ہوتی ہے۔ البتہ ہر دور کا مزاج الگ ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ذوق معمولات سے زیادہ بحث کرتے ہیں اور ذہن کو دعوت فکر نہیں دیتے اور نہ آسودگی طلب قاری کو کوئی اعصابی صدمہ پہنچاتے ہیں مگر ان کے ہاں عمق نظر اور شدت احساس بالکل مفقود نہیں اگرچہ وہ محاورہ کی چمکیلی سطحوں میں چھپ ضرور جاتے ہیں مگر اپنے بعض اشعار میں ایسی آفاقیت کے حامل ہیں کہ جو کسی شاعر کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتی ہے۔ ۲۴

ذوق شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' شاہ نصیر نے اہل دہلی کی روایت کی برعکس سودا اور ناسخ کا اثر قبول کر کے غزل کو خارجیت کا مرقع بنا دیا۔ ذوق اور ان کے تلامذہ کے ذریعے یہ روایت مزید آگے بڑھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵ء - ۱۸۶۲ء) کے ہاں بھی شاہ نصیر اور ذوق کی شاگردی کے باعث اسلوب شعر گوئی کے لحاظ سے شاہ نصیر کے اثرات پختہ تو ہو گئے۔ ذوق کی وفات بعد غالب ظفر کے استاد بنے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے یہ سلسلہ درہم برہم کر دیا اور ظفر' غالب سے استفادہ نہ کر سکے۔ بلکہ یہ کہنا موزوں ہو گا کہ جب غالب کا یہ تعلق قائم ہوا تو ظفر کا اسلوب پختہ ہو چکا تھا۔ شعر و شاعری سے ظفر فطری مناسبت رکھتے تھے اور یہ جوہر انہیں ورثے میں ملا تھا۔ کہنے کو تو وہ ایک بادشاہ تھے لیکن ان

کے اختیارات معدوم تھے۔ چنانچہ قدرتی طور پر یہ احساس ایک کسک بن کر ان کے دل میں موجود رہتا تھا اور وہ اپنے دل کا ابال اشعار میں نکال لیتے تھے۔ احساس محرومی نے زیادہ شدت کے ساتھ انہیں فقر اور تصوف کی طرف بھی مائل کر دیا تھا اور اس طرح بالخصوص عبرت پذیری کے اشعار ان کی زبان پر رواں ہو جاتے تھے۔ چنانچہ درد و غم، تصوف اور عبرت پذیری کے مضامین ان کے ہاں نمایاں ہیں۔ شاہ نصیر کی طرح انہوں نے سنگلاخ زمینیں بھی استعمال کی ہیں۔ وہ مشکل قوافی کے بھی شائق ہیں اور لمبی ردیفوں سے بھی وابستگی رکھتے ہیں۔ زبان کو شستہ اور رفتہ بنانے میں بہادر شاہ ظفر کا بڑا ہاتھ ہے۔ عربی اور فارسی مرکبات کے علاوہ انہوں نے ہندی اور پنجابی کے الفاظ بھی بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کیئے ہیں۔ قلعہ معلیٰ، روزمرہ اور محاورہ کی ٹکسال تھا۔ انہوں نے وہاں کے روزمرہ اور محاورہ کو بھی اپنے کلام میں محفوظ کر لیا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ شاہ نصیر اور ذوق سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ دہلی میں شاہ نصیر کی روایت کے ساتھ ساتھ ایک اور دبستان شعر بھی فروغ پا رہا تھا۔ اس دبستان شعر کا تعلق غالب اور مومن سے ہے۔ یہ دبستان اظہار کے ساتھ خیالات کو بھی بڑی اہمیت دیتا تھا اور دہلویت اور لکھنوئیت کے درمیان امتزاج کا قائل تھا۔ چنانچہ غالب اور مومن کے ساتھ ان کے تلامذہ بھی اسی امتزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مومن خاں مومن (۱۸۰۱ء - ۱۸۵۵ء) اردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ غزل کی صنف ان کا خاص میدان ہے۔ وہ غزل کی فضا میں پیدا ہوئے اور غزل کی روایت ہی میں ان کی نشوونما ہوئی اس لیے غزل کی روایت کا رنگ ان کی شخصیت میں اس طرح رچ گیا کہ یہ صنف ان کا مزاج بن گئی۔ چنانچہ انہوں نے اس روایت کو بڑی خوش اسلوبی سے برتا اور اپنے تجربات سے اس روایت میں بعض ایسے اضافے کیے جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان تجربات میں ان کی رومانیت کے ساتھ ملی جلی واقعیت پسندی اور اظہار کی پہلو دار کیفیت کے مختلف روپ خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتے ہیں۔ مومن کی انفرادیت کا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ایسے موضوعات کو جو انسانی زندگی میں بہت عام ہیں اور جن کو ہر شاعر ہر دور میں پیش کرتا رہا ہے، ایسی وسعتیں دی ہیں اور ان میں ایسی گہرائیاں پیدا کی ہیں کہ ان کی انفرادیت کا قائل ہونا

پڑتا ہے۔ جذباتی معاملات کے جن تجربات کو مومن نے پیش کیا ہے وہ بیک وقت ان کے ذاتی اور انفرادی تجربات بھی معلوم ہوتے ہیں اور عمومی اور اجتماعی بھی۔ ان کے ہاں روایت کا رنگ تو رچا ہوا نظر آتا ہے لیکن اس میں وہ انفعالیت پسندی نظر نہیں آتی جو غزل کی روایت میں عام رہی ہے۔ اس کے برعکس ان کے ہاں فعالیت پسندی کی لہر سی دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے اور شروع سے آخر تک جذباتی اور ذہنی صحت مندی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں غم نہیں ہے البتہ غم کا احساس اور اس کا عرفان ضرور ہے۔ ان کی غزلیں زندگی کے حسن اور اس کے نشاط و انبساط کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں یاسیت یا قنوطیت نام کو نہیں ہے۔ وہ زندہ رہنے کا درس دیتی ہیں اور محبوب کو ایک منبع نور اور سرچشمہ کیف و سرور بنا کر پیش کرتی ہیں۔ چنانچہ ان میں عشق انسان ایک عام جذبہ ہی نہیں بلکہ عالم کیف و سرور کی ایک لغزش مستانہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی صورت حال کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں غالب کی غزلوں کی طرح ذہن نہیں ملتا اور شعور کی کار فرمائی زیادہ نظر نہیں آتی۔ فکری اور فلسفیانہ پہلو بھی کم کم دکھائی دیتا ہے۔ حیات و کائنات کے بنیادی، ما بعد الطبیعیاتی اور اخلاقی مسائل بھی اس میں نظر نہیں آتے۔ دراصل تصوف کے رستے سے یہ رجحانات اردو غزل میں داخل ہو چکے تھے اور مومن سے قبل، اور خود ان کے زمانے میں، ان سب کو غزل میں داخل کرنے کی ایک عظیم روایت قائم ہو چکی تھی۔ لیکن مومن کو تصوف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ ان پہلوؤں کو اپنی غزل میں اجاگر نہ کر سکے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی مومن کی انفرادیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ان کے زمانے میں ناسخ کی شاعری کا بڑا شہرہ تھا حالانکہ ناسخ کی شاعری، شاعری سے کہیں زیادہ پہلوانی تھی لیکن ان کے اثر کا یہ عالم تھا کہ غالب جیسی عظیم شخصیت کے شاعر تک ایک زمانے میں اس کے اثر سے بچ نہیں سکے تھے۔ غالب کے مختصر سے دیوان میں بھی بعض شعر ایسے ملتے ہیں جن میں ناسخ کا اثر نمایاں ہے۔ لیکن مومن اس زمانے کے واحد شاعر ہیں جن کے یہاں یہ اثر نہیں ملتا۔ مومن تو اپنا مخصوص انفرادی رنگ نکالنے ہی کو صحیح شاعری سمجھتے تھے۔ پر خلوص احساس اور صحیح مشاہدے کے بغیر وہ شاعری

کی تخلیق کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ خود ان کی شاعری میں یہ دونوں پہلو نمایاں ہیں"۔۲۵

غالب (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء) کی اردو غزل میں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں بت شکنی کا میلان نمایاں نظر آتا ہے۔ روایت پرست ہونے کے باوجود انہوں نے روایت سے بغاوت کی اور اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی۔ انہوں نے نئے موضوعات کی مدد سے اردو غزل کو بہت وسعت دی اور اپنی جدت پسند طبیعت کی وجہ سے اظہار و بیان میں بھی تازگی پیدا کی۔ ان کی غزل میں انسان کی عظمت کا احساس، زندگی میں نئے امکانات کی تلاش کا جذبہ، معنی خیز احساسات کو اظہار بیان کی گرفت میں لانے کی کوشش اور کائنات کی دلفریب اور دلکش اشیا سے لطف اندوز ہونے کی حرص پوری طرح نمایاں ہے۔ غالب کا مزاج بنیادی طور پر فلسفیانہ ہے۔ اور یہ کسی نوع کی پابندیاں قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ وہ حسن و عشق کے موضوعات کو اپنی گرفت میں لینے کے بعد حیات و کائنات کے اخلاقی، مابعد الطبیعیاتی، نفسیاتی اور عمرانی معاملات کو بھی اپنی غزل کا موضوع بناتے ہیں۔ ان کا میلان عینیت کی طرف ہے۔ وہ انسان کے لیے ایک مثالی ماحول کی تمنا کرتے ہیں۔ انہوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ انحطاط و زوال کا شکار تھا۔ تہذیب کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ غالب نے اس صورت حال کو شدت سے محسوس کیا۔ چنانچہ ان کے یہاں جو شدید غم ہے اس کی نوعیت بظاہر انفرادی نظر آتی ہے کہ غور کرنے پر اس میں ایک اجتماعی آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا سارا غم دراصل سماجی اقدار کی ناہمواری کی پیداوار ہے۔ سجاد باقر رضوی کے بقول:

"غالب کا کمال یہ ہے کہ اس نے نظام واحساس کو مربوط کرنے کی کوشش کی اور اس طرح فرد کو داخلی شکست و ریخت سے بچایا۔ عقل اور جذبے کی جو دوئی بعد میں پیدا ہوئی غالب کے ہاں نہیں ہے۔ اس کے یہاں مکمل ہم آہنگی کی صورت نہ سہی۔ یہ ایک نظام میں پروئے ہوئے ضرور ہیں۔ نظام حیات کو مربوط کرنے کی کوشش غالب کو اپنے عہد کا زندہ شاعر بنا دیتی ہے۔ غالب کے بعد طرز احساس کی یہ اکائی قائم نہ رہ سکی اور اس کی وجہ نئے

سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی عوامل تھے۔"۲۶ے

غالب کی غزل اس اعتبار سے صنف غزل کی معراج ہے کہ اس میں انہوں نے حافظ کا جمال اور رومی کا جلال دونوں یکجا کر دیئے ہیں۔ وہ نہ تو تخیل کی سہل کاریوں میں کھوئے ہیں اور نہ ان پر مرمٹتے ہیں۔ ان کے ہاں خرد اور تخیل کا ایسا موزوں امتزاج ہے کہ اس سے بڑھ کر کہیں نظر نہیں آتا اور یہی ان کے فن کی سب سے بڑی اساس ہے۔

غالب کو اگر ہم ان کے پورے عہد کے تناظر میں رکھ کر دیکھیں تو وہ اس عہد کے شعری منظر میں سب سے ممتاز و منفرد نظر آتے ہیں۔ اردو غزل اس دور میں تین واضح اسلوب اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ اسلوب ہم ذوق، مومن اور غالب سے منسوب کر سکتے ہیں۔ ذوق نے عوام پسندانہ مسلک اختیار کیا وہ محاورہ کی خوبی اور عام فہمی پر زیادہ توجہ دیتے رہے۔ ذوق نے عام طور پر معاشرے کی ضرورت پوری کی اور اسی لیے وہ اپنے زمانے میں مقبول ہوئے۔ مومن کا اسلوب امیرانہ ہے اور اس میں عیش امروز کا فلسفہ جاری و ساری ہے اور زندگی سے کماحقہ، لطف اندوز ہونا۔ نفاست و رکھ رکھاؤ۔ تہذیب و شائستگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے امکانات حیات سے بہرہ ور ہونا ان کی اور ان کے تلامذہ کی شاعری کا ماحصل ہے۔ تیسرا اسلوب غالب کا ہے۔ یہ اسلوب ذوق و مومن دونوں سے مختلف ہے۔ اس میں سکون کو جگہ تلاطم ہے۔ سطحی بہاؤ کی جگہ گہرائیوں میں غوطہ زنی ہے۔

استراحت کی جگہ سینہ کاوی ہے۔ آہستہ روی کی جگہ طوفان خیزی ہے۔ سرسری نظر کی جگہ ژرف نگاہی ہے اور عام تجربات کی جگہ فکر انگیزی ہے جو ملتہب ہو کر جذبے کی شدت اختیار کر لیتی ہے۔ تخیل کی وسعت اور فکر کی شدت سے جذبے کی کیفیت پیدا کرنے کی یہ قدرت اردو شاعری کو غالب کا عطیہ ہے اور یہ اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت کہی جا سکتی ہے۔۔۲۷ے

انیسویں صدی کا آخری ربع اردو غزل کے حوالے سے یوں اہم ہے کہ اس میں لکھنؤ اور دلی کی شعری روایت داغ اور امیر مینائی کی صورت میں باقی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد امیر اور داغ سمیت دہلی اور زیادہ تر لکھنؤ کے شاعروں کا ایک

بڑا گروہ رامپور میں جمع ہو گیا تھا جہاں یہ شعرا اپنے اپنے وطن اور دبستان شاعری کی سر بلندی کے لیے شعر کہتے وقت بڑی کاوش کرتے تھے۔ چنانچہ امیر و داغ کے وہ دیوان جو قیام رامپور کے زمانے کی کمائی ہیں، حاصل عمر ہیں۔

امیر مینائی (۱۸۲۹ء - ۱۹۰۰ء)، داغ (۱۸۳۱ء - ۱۹۰۵ء) اور جلال لکھنوی (۱۸۳۴ء - ۱۹۰۹ء) کے ہاں قدر مشترک زبان کی صفائی اور سلاست ہے۔ بقول ناظر حسن زیدی "یہ تینوں شاعر اس زمانے کے ہیں جب اردو زبان ڈھائی سو سال کی مشق اور منجھائی کے بعد صاف اور فصیح ہو چکی تھی۔"[۲۸]

گویا بیسویں صدی میں داخل ہونے والی غزل زبان کے معاملے میں ناسخ کی اصلاح زبان اور ان کے بعد مومن و غالب کے عہد کی زبان سے براہ راست متاثر نظر آتی ہے۔ تاہم اسلوب کے حوالے سے ان تینوں میں خاص فرق یہ ہے کہ داغ اپنی شوخ بیانی اور تیکھے پن کے حوالے سے جرأت کی معاملہ بندی کے پیرو ہیں جبکہ امیر مینائی اور جلال لکھنوی الفاظ کی معنوی دلالتوں سے مضمون پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں اور داغ کے ہاں نظر آنے والے ابتذال سے اپنا دامن صاف رکھتے ہیں۔ امیر مینائی پر تصوف کا اثر بہت گہرا ہے۔ مذہبی تعلیم اور تصوف کی بدولت ان کے مزاج میں معرفت الٰہی، فقر و استغنا، خود داری اور توکل جیسے اوصاف پیدا ہوئے جو ان کی غزلوں میں صاف نظر آتے ہیں۔ امیر کی زبان لکھنؤ کی فصیح، سلیس اور آراستہ زبان ہے جس کی سادگی میں بھی بناؤ ہیں۔ وہ الفاظ کے مختلف معانی سے فائدہ اٹھا کر مضمون نکالتے ہیں جو دبستان لکھنؤ کا معمول ہے۔ اکثر معاملات اور کیفیتوں کو تشبیہ و استعارہ کے انداز میں ادا کرتے ہیں جنھیں ان کے تخیل کی خلاقی بڑے رنگین پیکروں میں دکھاتی ہے۔ دبستان لکھنؤ سے تعلق کی بنا پر ان کے کلام میں رنگینی اور مرصع کاری ہے۔ وہ مضمون آفرینی اور پیکر تراشی سے بہت شوخ تصویریں بناتے ہیں۔ انتخاب الفاظ میں بھی وہ نازک اور لطیف اسما کے استعمال سے حسن کاری، رنگینی اور شوخی کا حق ادا کرتے ہیں۔ داغ کی شاعری کا عام انداز شوخی بیان، معاملہ بندی اور تیکھا پن ہے۔ بعض غزلیں سرا سر ایسی ملتی ہیں کہ صفائی و سلاست میں جواب نہیں رکھتیں اس کے باوجود زبان میں متانت اور دل نشینی کا جوہر بھی جلوہ گر ہے۔ اس منزل میں آ کر ان کے

اشعار ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئے ہیں۔ جلال لکھنوی کے کلام میں صحت الفاظ، مضمون آفرینی اور شوخ بیانی کا ہلکا سا رنگ ہے۔ انہیں اپنی زبان دانی پر ناز تھا، عروض، لغت اور فنون شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ ان میں الفاظ کی معنوی دلالتوں سے مضمون پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ جہاں وہ تمام آرائش و اہتمام سے الگ ہو کر سیدھی سادی زبان میں بات کہتے ہیں تو ان کے کلام میں داغ اور امیر کی سی صفائی پیدا ہو جاتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس عہد کی غزل کے لیے ان شعرا کا دم غنیمت تھا۔ کیونکہ یہ دور شاعری کی نئی تحریکوں کے سبب روایتی غزل گوئی کے لیے سود مند نہیں تھا۔ غزل کی گرم بازاری ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ غزل پر زوال آگیا تھا۔ عصری تقاضے اتنے شدید تھے اور قومی، ملی اور ذاتی مسائل اتنے گمبھیر تھے کہ غم دوراں کی شدت نے غم جاناں کو بھلا دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود غزل کا چراغ بجھنے نہیں پایا اور قریباً تمام شعرا نے (چاہے اکثر نے رسمی طور پر ہی سہی) غزلیں کہیں۔ حالی کا غزل پر سب سے بڑا اعتراض اس کے روایتی عشق پر تھا۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ غزل کو بہ اعتبار اسلوب اور مضامین زندگی کی طرح وسیع ہونا چاہیے۔ حالی کے اس نظریے کو کہیں کہیں قابل التفات سمجھا گیا اور غزل کے دائرے کو وسیع کرنے کی کوششیں ہوئیں چنانچہ اکثر شعرا جہاں ایک طرف غزل کے روایتی انداز سے دست کش نہیں ہوئے وہاں دوسری طرف غزل میں ایک ایسا ذہن لے کر آئے جو بیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی شعور کو لے کر ابھرتا ہے۔ بقول ابواللیث صدیقی:

> "یہ غزل صرف زلف و رخ کی کہانی اور ہجر و وصال کی داستان نہیں اس میں زندگی کی پوری وسعتیں سما گئی ہیں۔ اسی لیے اس غزل میں میر و غالب کے دور کے مقابلے میں زیادہ وسعت ہے۔" [۲۹]

غزل کی اس نئی روایت میں واضح طور پر اخلاقی لب و لہجہ ملتا ہے۔ جذبات کے بہاؤ کے بجائے ایک قسم کا ٹھہراؤ اور توازن موجود ہے۔ ان شعرا میں شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، آرزو لکھنوی، ثاقب لکھنوی، اثر لکھنوی، جلیل مانکپوری وغیرہ نمایاں ہیں۔

شاد عظیم آبادی (۱۸۴۶ء - ۱۹۲۷ء) کی شاعری کا عام آہنگ ناصحانہ اور اخلاقی

نہیں ہے۔ ان کے یہاں جذبات انسانی اور واردات قلبی کی بچی تصویریں بھی ہیں جو میر کے رنگ سے قریب تر ہیں۔ لیکن میر کے یہاں اکثر ایک طرح کی سپردگی اور پامالی ملتی ہے۔ شاد کے یہاں اس کے برعکس حرکت، ولولہ اور شوق کی فراوانی ہے۔ عام طور پر ان کی وہ غزلیں جو نسبتاً طویل بحروں میں ہیں ایک خاص غنائی کیفیت کی حامل ہیں۔

عزیز لکھنوی (۱۸۸۲ء - ۱۹۳۵ء) بنیادی طور پر غزل کے کلاسیکی انداز کے علم بردار رہے۔ اپنے دیگر لکھنوی معاصرین کی طرح یہ بھی غالب و میر کی عظمت کے معترف ہیں۔ لیکن اس اعتراف کے باوجود ان کا اپنا ایک مخصوص لب و لہجہ ہے جس میں غالب کے خیال کی گہرائی، میر کا سوز و گداز اور ان کی سادہ زبان ایک نئے سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔

آرزو لکھنوی (۱۸۷۳ء - ۱۹۵۱ء) کی غزل پر لکھنؤ کی غزل کے روایتی عناصر کی چھاپ لگی ہوئی ہے لیکن ان کے کلام میں وہ رنگ نہیں ملتا جس کے لیے لکھنؤ کی روایتی غزل بدنام تھی بلکہ ایک نئے دور کا شعور، نئے مسائل کا احساس، ایک جذبہ اور کیفیت کا بیان، غزل کی زبان اور اس کے استعاروں میں ملتا ہے۔

ثاقب لکھنوی (۱۸۶۹ء - ۱۹۴۹ء) کے یہاں بھی میر و غالب کی روایت کی بازیافت موجود ہے۔ سرسری مطالعے سے ہی ثاقب کے ہاں بکثرت ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں غالب کا رنگ و آہنگ موجود ہے۔ میر کے بارے میں انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ بڑی حد تک میر کا اثر صرف زبان و بیان تک محدود ہے۔ میر و غالب کے اتباع کے باوصف ان کے یہاں اساتذۂ لکھنؤ کی شعری روایات کی جھلک بھی کہیں کہیں موجود ہے۔

اثر لکھنوی (۱۸۸۵ء - ۱۹۶۷ء) نے بھی میر سے فیض پایا ہے اور اساتذہ میں غالباً صرف میر ہی کا اثر قبول کیا ہے۔ ان کی شاعری میں تخیل کے ساتھ زبان کا عنصر زیادہ ملے گا۔ فلسفۂ اخلاق، تصوف و معرفت کی جھلک بھی اکثر اشعار میں ملتی ہے۔

جلیل مانکپوری (۱۸۶۷ء - ۱۹۴۶ء) کی غزل روایتی شاعری کا نمونہ ہے۔ وہ ان نئے تجربات، احساسات، جذبات، واقعات اور معاملات کو موضوع غزل نہیں بناتے

جن کو ان کے دیگر معاصرین نے قبول کیا۔ ان کی زبان صاف' شستہ اور متروکات سے پاک ہے۔ مضمون کو زبان پر ترجیح دیتے ہیں۔ کہیں کہیں معاملہ بندی میں جرات اور ان کے مقلدین کا پرتو نظر آتا ہے۔ بعض ایسے اشعار بھی ہیں جو محض رعایت لفظی کا نمونہ ہیں۔

یاس یگانہ چنگیزی (۱۸۸۴ء - ۱۹۵۶ء) بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کی شخصیت اور شاعری کے تیور اور انداز بالکل جدا ہیں - وہ غالب پرستی کی روایت کی شکست کے لیے صف آرا ہوئے لیکن اپنی انانیت کے لے میں کہیں سے کہیں جا نکلے۔ ان کے لب و لہجہ میں جرأت گفتار اور ہمت کردار کا اچھوتا امتزاج ملتا ہے۔ یگانہ کی غالب شکنی کے باوجود اس عہد کی اردو غزل غالب اور میر کی روایت سے آزاد نہیں ہو سکی۔ غالب اور میر غزل کے دو مختلف اسالیب اور آہنگ کے ترجمان ہیں چنانچہ "بیسویں صدی کے پہلے دو عشروں میں شروع شروع میں امیر و داغ اور بعد میں غالب و میر کا پرتو نظر آئے گا۔" ۳۰

بیسویں صدی میں اردو غزل کو سب سے سازگار ماحول اس وقت میسر آیا جب غزل کے اس کلاسیکی روپ کو جو میر' درد' مصحفی اور آتش کے ہاتھوں پروان چڑھا تھا اور غالب کی شکل میں اوج کمال کو پہنچا تھا' دوبارہ زندہ اور متحرک کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اسے غزل کے احیائی دور کا نام دیا جاتا ہے۔ اس دور میں حسرت موہانی' فانی بدایونی' سیماب اکبر آبادی ' اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی جیسے شعرا نے بقول اختر انصاری "اپنے رچے ہوئے کلاسیکی مزاج شعری کی بدولت غزل کی قدیم اور فرسودہ علامتوں میں ذاتی تخیلی جذبات کا رنگ بھرا اور ان میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑا دی۔ مجموعی حیثیت سے ان شعرا کی تابانی فکر نے غزل کے ماحول کو جگمگا کر رکھ دیا اور بیسویں صدی کی غزل فی الواقع اور فی الاصل شعر و فن کی معراج معلوم ہونے لگی۔ اصغر اور فانی نے اپنی اپنی جگہ پر اور اپنی اپنی شاعری کے جداگانہ رنگ کے باوجود انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی روایت پرست اور انحطاط زدہ غزلیہ شاعری کو جن تغیرات سے دوچار اور جن توانائیوں سے مالا مال کیا وہ در حقیقت بیسویں صدی کی غزل کے اعلیٰ ترین اکتسابات اور برگزیدہ ترین مقامات ہیں جن میں

اردو کی کلاسیکی غزل کی بازیافت کے ساتھ ساتھ دور جدید کے فکری عناصر بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور سموئے ہوئے ہیں۔" ۳۱

ان شعرا نے اردو غزل کے احیا اور اسے دوبارہ مقبول بنانے کے لئے جو معیار قائم کیے وہ بعد میں آنے والی اردو غزل کے لیے قابل قدر اثاثہ قرار پائے۔ حسرت۔ موہانی (۱۸۷۵ء۔ ۱۹۵۱ء) اس دور کے میر کارواں ہیں۔ وہ اپنے اسلوب کی حیرت انگیز جامعیت کی بدولت رئیس المتغزلین کہلائے۔ انہوں نے اردو کے قدیم شعرا کا نہایت تفصیل کے ساتھ مطالعہ کر رکھا تھا۔ اس مطالعہ نے حسرت کو اردو غزل کی روایت سے آگاہ کرایا اور اس ورثہ میں انہوں نے اپنے مزاج اور فن کا بڑا اضافہ کیا۔ بقول احتشام حسین "حسرت کے نگار خانہ غزل میں کئی اساتذہ کی تصویریں نظر آتی ہیں لیکن اس نگار خانہ کی مجموعی بہار اور رونق اپنا ایک الگ حسن رکھتی ہے۔ ان کے رنگ سخن میں جو آراستگی اور شائستگی ہے اس کی مشاطگی صدیوں کے تہذیبی ارتقا نے کی ہے۔" ۳۲

حسرت نے بلاشبہ اردو غزل کو ایک ایسی پاکیزگی بخشی جو عشق و عاشقی کی رنگینی و رعنائی کے باوجود آلودہ نہیں ہے، ان کے یہاں خیال یا بیان کی پستی نہیں، البتہ کہیں کہیں شوخی میں اس قسم کے بعض اشعار بھی نکل آئے ہیں، جو خود ان کے بقول فاسقانہ ہیں، لیکن ان میں بھی وہ حسن موجود ہے، جو صداقت کے ساتھ لازم و ملزوم ہے، اردو غزل میں حسرت کے مقام و مرتبے کے بارے میں اختر انصاری کی یہ سطور فیصلہ کن حیثیت رکھی ہیں:

"اگر شعر و ادب کے کسی میوزیم میں اردو کی تین سو سال کی کلاسیکی غزل کی نمائندگی کا مسئلہ درپیش ہو اور اس مقصد کے لئے کسی ایک اور صرف ایک شاعر کا انتخاب مقصود ہو تو وہ شاعر حسرت کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا"۔ ۳۳

اس دور میں سیماب اکبر آبادی (۱۸۸۹ء۔۔ ۱۹۵۱ء)، اصغر گونڈوی (۱۸۸۴ء۔۔۱۹۳۶ء)، جگر مراد آبادی (۱۸۹۰ء۔۔ ۱۹۶۱ء)، نے اپنے اپنے انداز سے اردو غزل کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا۔

حسرت کے معاصرین میں فانی بدایونی (۱۸۷۹ء - ۱۹۴۱ء) اپنے مخصوص لب و لہجے اور ایک آفاقی غم کی ترجمانی کے لئے ممتاز ہیں۔ فانی کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے ناقدین نے لکھا ہے کہ یوں تو اکثر شعرا نے میر و غالب کے اتباع کا دعویٰ کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میر کے غم کی فکر کا جیسا امتزاج فانی کے یہاں ملتا ہے' ویسا اور کہیں نظر نہیں آتا' ان دو عناصر اور فانی کی اپنی رو داد غم سے جو انفرادی رنگ پیدا ہوا ہے' وہی فانی کا رنگ سخن ہے۔

اقبالؒ کی ابتدائی غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے داغ سے کسب فیض کرنے کے باوجود اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی اور داغ کے کلام میں غزل کی روایت کی تمام جہتوں کو ٹٹولنے کے بعد ان شعری اسرار و رموز اور علامتوں کو اپنے کلام میں اسی طرح استعمال کیا کہ وہ اپنے کلاسیکی مفہوم کے ساتھ نئی معنویتیں بھی لے کر آئیں۔ ۱۹۰۵ء کے بعد قیام یورپ کے دوران لکھی جانے والی اقبالؒ کی غزلیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اقبالؒ، بقول فرمان فتح پوری:

"زندگی کے بارے میں کسی خاص نقطہ نظر کی تلاش میں ہیں اور علم، فکر، شعور و ادب اور اخلاق و مذہب' سب کو انسان کی عملی زندگی سے ہم آہنگ دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں۔"۔ ۳۴

چنانچہ اقبالؒ کی غزل کے یہ تین برس ان مخصوص خیالات کی ترجمانی اور تبلیغ کے رنگ کے آئینہ دار ہیں' جن سے آگے چل کر اقبالؒ کے فلسفہ حیات کی تشکیل و تمیز ہوئی' بقول مولانا صلاح الدین احمد:

"یہاں سے ان کی غزل کا وہ دور شروع ہوتا ہے' جو اقبالؒ کی غزل گوئی کا سب سے تابناک دور ہے"۔ ۳۵

اسی تسلسل میں ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ رائے اقبالؒ کی غزل کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

"آغاز کار ہی (بالخصوص بانگ درا میں) اقبالؒ نے غزل کی روایت سے اپنی وابستگی کو قائم رکھا تھا اور زیادہ تر غزل کے پرانے اسلوب کو استعمال کرتا رہا تھا' لیکن "بال جبریل" تک آتے آتے' اس کے اسلوب میں ایک انقلابی

تبدیلی پیدا ہو گئی' یہی دراصل اقبالؒ کی عطا ہے کہ اس نے غزل کا ایک نیا اسلوب رائج کیا۔ جدید اردو غزل نے نہ صرف موضوع کے سلسلے میں غزل کے افق کو وسیع کرتے وقت اقبالؒ کی خوشہ چینی کی ہے' بلکہ اسلوب کے ضمن میں بھی اقبالؒ ہی سے اکتساب کیا"۔۔۔۳۶

چنانچہ اقبالؒ نے جہاں غزل میں الفاظ کو نئی معنویت کے ساتھ استعمال کر کے اسے آگے بڑھنے کے کئی راستے دکھا دیئے' وہاں غزل میں ایسے مضامین بھی برتے جو اس سے پہلے یا تو سوچے ہی نہ جا سکے تھے اور اگر کبھی خیال میں آتے بھی تھے تو ان کا اظہار نظم میں کر دیا جاتا تھا' یوں اقبالؒ نے حالی کی یہ خواہش پوری کر دی کہ

"غزل کو باعتبار ذہن اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہئے۔۔۔ شعر میں ہمیشہ ایک قسم کے مضامین سنتے سنتے نفرت ہو جاتی ہے' غزل کو محض ہوا و ہوس کے مضامین میں محدود رکھنا ٹھیک نہیں ہے' بلکہ اس کو ہر قسم کے جذبات کا آرگن بنانا چاہئے"۔ ۔۔۳۷

چنانچہ اقبالؒ نے غزل میں زندگی کی نئی لہر دوڑا کر اسے ایک ایسے بلند مقام پر پہنچا دیا جہاں' وہ ہر آنے والے شاعر کی توجہ کھینچتی رہی۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں نظم کو عروج حاصل ہوا اور شاعری کے ایسے نئے معیار وضع ہوئے' جنہوں نے غزل کی راہ میں بے پناہ دشواریاں حائل کیں' لیکن جونہی اردو شاعری پر ان معیاروں کی گرفت ڈھیلی پڑی تو غزل کو از سر نو پھولنے پھلنے کا موقع ملا اور ایک بار پھر نئے عزم کے ساتھ غزل کے نئے امکانات کی دریافت کا عمل شروع ہوا' چنانچہ ایسے شاعر بھی غزل کی طرف راجع ہوئے جو اس سے پہلے نظم کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا چکے تھے' یہ بات اردو غزل کے لئے نیک فال ثابت ہوئی' کیونکہ اس کے بعد اس نے جس تیزی کے ساتھ اپنا سفر طے کیا ہے' اس کی مثال گزشتہ دھائیوں میں کم ہی نظر آتی ہے' اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے صدیق کلیم لکھتے ہیں:

"۱۹۵۰ء سے ایک بار پھر غزل کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے' یہاں تک کہ نظم کے شعرا بھی غزل گو بن کر رہ گئے ہیں' میرے نزدیک اس کے اسباب کچھ

اس طرح ہیں کہ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک کو قانوناً ممنوع قرار دیا گیا اور نظم کی اہمیت کم ہونے لگی' جس کے سبب حلقہ ارباب ذوق کے شعرا نے بھی غزل ہی کی طرف رجوع کیا' چنانچہ ہمارے ادبی رسالوں میں غزلوں کی پھر سے بھرمار شروع ہوئی اور مشاعرہ تو قطعاً غزل کی چیز بن کر رہ گیا"۔ ۳۸ے

چنانچہ مخدوم محی الدین' جاں نثار اختر' غلام ربانی تاباں' احمد ندیم قاسمی' اسرار الحق مجاز' معین احسن جذبی اور فیض احمد فیض جیسے اہم شعرا نے غزل کے اس احیائی دور میں نظم کے ساتھ ساتھ غزل کے میدان میں قدم رکھا اور کلاسیکی اسالیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئے لہجوں کی بازیابی کے عمل سے خود کو گزارا۔

"یہ نئی غزل ایک نئے احساس کی ترجمان تھی' جس نے غزل کے ڈکشن' ایمیجری اور موضوعات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں"۔ ۳۹ے

اقبالؒ نے جدید غزل کے لئے جو راستہ بنایا' شاد' حسرت' اصغر' آرزو' فانی' جگر' یگانہ اس راستے سے آ ملنے والی مختلف پگڈنڈیاں قرار دی جا سکتی ہیں' ان سب کا سنگم فراق گورکھپوری ہے' فراق سب کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے جدید غزل کے لئے ایک وسیع میدان تیار کر دیتے ہیں' فراق نے میر کی طرف مراجعت کے باوجود اردو غزل کو اپنے ذاتی تجربات کی بدولت بہت کچھ دیا ہے۔

"فطرت کے جلوؤں' حسن کی خوابناک اور نشاط آور کیفیتوں' جذبہ عشق کی اداسیوں' نفسیاتی تہہ داریوں' زندگی کی پیچیدگیوں' تہذیب' انسانیت کے درد آمیز نغموں' جمالیاتی صورتوں' اپنے عصر کی انقلابی صداقتوں اور جذبہ لطیف کی پرچھائیوں کو جس عالمانہ بے خودی کے ساتھ فراق پیش کر سکتے ہیں' وہ انہی کا حصہ ہے' جدید غزل کے ارتقا میں ان کے شاعرانہ آہنگ اور لہجے میں تاثرات کا بڑا ہاتھ ہے"۔ ۴۰ے

"چنانچہ ایک طرف تو فیض' فراق' جذبی اور مجاز نے غزل کو حسیاتی نزاکتوں سے محروم کئے بغیر غزل کی معنوی سرحدوں میں توسیع کی کوشش کی تو دوسری طرف' ناصر کاظمی نے معنوی توسیع کی بجائے غزل کے

لہجے کو اور زیادہ نجی اور نرم و نازک بنانے کی سعی کی۔ اور اس میں ناصر کاظمی سے بڑھ کر کوئی دوسرا شاعر کامیاب نہ ہو سکا۔"۔۴۱

ناصر کاظمی کا تعلق جدید شاعروں کے اس گروہ سے تھا' جنہوں نے اپنی اندرونی مضطرب شخصیت اور غزل کی ہیئت میں زبردست ہم آہنگی محسوس کی اور جو خارجی مسائل سمیت اپنے خیالات و تجربات کا بہتر اظہار غزل ہی میں کر سکتے تھے' شعرا کے اس گروہ نے' جس میں ناصر کاظمی کے علاوہ منیر نیازی' ابن انشا' عزیز حامد مدنی اور کچھ دوسرے لوگ شامل تھے' غزل کو محدود نظریے سے آزاد کیا اور اردو غزل میں قابل قدر تجربے اور اضافے کیے۔ ناصر کاظمی کی غزل کا ذکر کرتے ہوئے سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

"انہوں نے تاریخی اعتبار سے غزل کا پرچم اس وقت بلند کیا' جب کہ سارے برصغیر میں اردو شاعری کا سب سے بڑا اظہار نظموں میں ہو رہا تھا' ان کی غزلوں میں اردو غزل کی عظیم شعری روایت اس طرح رچ بس گئی ہے کہ انہیں باقی شاعروں کے برعکس روایت کا نقیب کہنا چاہیے۔ فیض اور ندیم کی طرح انہوں نے بھی ایک مدت تک اردو غزل کے پیش منظر پر قبضہ جمائے رکھا اور ملک کے گوشے گوشے میں ایسی غزلیں کہی جاتی رہیں' جن میں ناصر کاظمی کی جھلک صاف نظر آتی تھی"۔۔۴۲

محولہ بالا رائے کی روشنی میں دیکھا جائے تو ناصر کاظمی نئی غزل کے پیش رو قرار پائے ہیں۔ ناصر کاظمی اور ان کے ہم عصر شعرا نے مختلف سطحوں پر اپنے تجربے کی معنویت اور گہرائی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور مختلف استعاروں اور علامتوں کے ذریعے عصری زندگی کے دکھوں اور غیر اطمینان بخش حالات کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے' یہ شعرا اگر ایک طرف موجودہ حالات سے مایوس ہیں اور چاروں طرف پھیلی ہوئی ہمہ گیر تاریکی میں انہیں کچھ نہیں دکھائی دیتا تو دوسری طرف انہیں حسن سے بھی لگاؤ ہے اور زندگی بھی عزیز ہے' تاہم حسن سے یہ لگاؤ' محبوب کے حسن و جمال اور خوب صورتی کے تذکرے کے بجائے عشق کے اس اضطراب میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے' جو حسن و خوب صورتی سے تعلق کا ماحصل ہے' چنانچہ اس دور کی

واردات حسن و عشق کی وضاحت کرتے ہوئے فضیل جعفری رقم طراز ہیں:

"نئی غزل میں محبت اور معاملات محبت نفسیاتی اور جسمانی واردات ہیں' یہاں شدت جذبات سے جسم پگھل بھی سکتے ہیں اور حالات کی برف پگھلتے ہوئے جسم کو منجمد بھی کر سکتی ہے' یہاں یادیں بھی ہیں اور باتیں بھی' وصال بھی ہے اور ہجر بھی' لیکن سب کچھ وہی ہے' جسے نئے شاعروں نے خود محسوس کیا ہے' جسے انفرادی طور پر ہر شخص نے اپنے ڈھنگ سے برتا ہے' اس لئے ان عشقیہ اشعار میں ندرت بھی ہے اور متاثر کرنے کی صلاحیت بھی"۔۔۔ ۴۳

ہم ناصر کاظمی کے عہد کی جس نسل کا ذکر کر رہے ہیں' اس کے ہاں تخلیقی واردات کا سب سے بڑا استعارہ "یاد" ہے اور یہ اسے ایک نئے تجربے کے پہلو بہ پہلو رکھ کر ہر دور کی گہرائی اور معنویت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں' تاہم بنیادی رویے کے اشتراک کے باوجود ان لوگوں کا اپنا الگ الگ رنگ ہے' مثال کے طور پر ہجرت کا تجربہ ناصر کاظمی کو ایک طرف روایت کے لفظیاتی سٹرکچر کی معنویت کی طرف لے جاتا ہے اور دوسری طرف پوری قومی واردات کو' اپنی انفرادی کیفیات کے لحاظ سے فطرت' شہر اور انسانی رویوں کو استعاراتی منظروں میں سمیٹ لیتا ہے' یہی ہجرت کا تجربہ جب منیر نیازی کے ہاں آتا ہے تو وہ اس تجربے کی ایک اور جہت میں یاد اور خواب کو مخلوط کر کے ان سے ایک جہان نو تخلیق کرتا ہوا نظر آتا ہے' چنانچہ اس دور کے تجربوں میں ناصر کاظمی کے نئے طرز احساس کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی' اس کی وجہ یہ ہے کہ ناصر کاظمی کی غزل کی مقبولیت احساس کی تاریخ کا تقاضا تھی' ان کی غزلوں نے اجاڑ بستیوں' جلے ہوئے مکانوں اور بے سرو سامان لوگوں کے تجربے کو اظہار کی زبان دی' دلی جب میر کے زمانے میں اجڑی تھی تو میر نے پورے آشوب کو زبان عطا کی تھی' چنانچہ ناصر کاظمی کی میر کے تجربے کی طرف مراجعت بھی منطقی بات نظر آتی ہے' بقول سجاد باقر رضوی:

"مزاج کے اعتبار سے ناصر' میر کے قریب تھے' البتہ انہیں میر کا زندگی کرنے کا ڈھب نہیں ملا تھا' میر کی طبیعت کا سوز و گداز پھیلی ہوئی کائنات

میں اپنی ذات کو سمیٹنے کا سلیقہ' احساس نامرادی کے ساتھ قناعت' ایک خاص وضع کی زندگی' یہ سب کچھ انہیں اپنے عہد کے فلسفہ زیست سے ملا تھا' اس کے برعکس ناصر کاظمی رومانی مزاج کے حامل تھے' ان کا احساس نامرادی' طبیعت کا گداز' آئیڈیل اور حقیقت کے تضاد سے پیدا ہوا تھا' وہ پھیلنے کی خواہش کے باوجود سمیٹنے پر مجبور تھے' اس کا نتیجہ ان کی اداسی' تلون طبع اور شدید احساس تنہائی تھا' شخصیت کو منظم کرنے والا اصول ان کے پاس نہیں تھا' انہیں نہ کوئی فلسفہ زیست ملا تھا اور نہ ہی کسی نظریہ سے ان کی وابستگی تھی' لے دے کے چند عقائد تھے' جو ان کی تنظیم ذات کے بجائے زندگی میں جذباتی عنصر کو زیادہ تقویت پہنچاتے تھے' تاہم اگر میر سے انہوں نے اسلوب حیات نہ پایا تو اسلوب فن ضرور حاصل کیا"۔

"میر کے علاوہ ناصر کی شاعری پر دوسرا اثر فراق کا تھا۔ فراق کی شاعری کے رومانی والہانہ پن کا اثر ناصر کی شاعری پر یہ ہوا کہ نامرادی' تنہائی اور اداسی کے اندھیروں میں روشنی کی لکیریں تیرنے لگیں' لیکن ناصر کاظمی' فراق کے فکری رویوں سے کبھی ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ ناصر کاظمی غزل کی شاعری کو بہت نازک اور لطیف معاملہ سمجھتے تھے اور عقلی و فکری رویوں اور مضامین کو غزل کے لئے بوجھل جانتے تھے' یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں خطابت اور فکر کا عنصر کم ہے اور اسی لئے ان کی غزل میں اقبالؒ اور غالب کا کوئی مستقل رنگ نہیں ہے۔ غالب اور اقبالؒ کا اثر کہیں کہیں ایک آدھ شعر یا ایک دو مصرعوں میں نظر آ جائے گا' لیکن ان کی شاعری کا بیشتر حصہ ان اثرات سے خالی ہے۔۔ ۴۴

پروفیسر نظیر صدیقی ناصر کاظمی کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"ناصر کی غزلوں پر میر' مصحفی' غالب' اقبالؒ اور فراق کے اثرات واضح ہیں' لیکن اس کے باوجود ان کی انفرادیت نمایاں ہے' ان کی شاعری قدما کے گہرے مطالعہ اور فنی ریاضت کا ثبوت دیتی ہے"۔۔ ۴۵

ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں :

"ناصر کاظمی کی حیثیت ایک نئی آواز کی ہے' انہوں نے جو عظیم تجربہ اردو غزل میں کیا ہے' اس نے تو غزل کی فضا ہی بدل کر رکھ دی ہے' ان کے یہاں دوسرے جدید غزل گو شعرا کی طرح غزل کی روایت کا عام ماحول نہیں ہے' انہوں نے اپنی غزلوں میں ایک نیا ماحول قائم کیا ہے' ایک نئی فضا تیار کی ہے اور اس میں بڑی حد تک ان کی اس نئی ایمجری کو دخل ہے' جس کا تار و پود انہوں نے اپنے گرد و پیش سے لیا ہے"۔۔۔۴۶

اردو غزل کے تقریباً چار سو سالہ جائزے کی روشنی میں ہم نے قلی قطب شاہ کے عہد سے لے کر ناصر کاظمی کے زمانے تک کی غزل اور اس کی کروٹوں کا مطالعہ کیا' اس صنف لطیف کی سخت جانی ملاحظہ ہو کہ اس پر بڑے بھاری وقت آئے' لیکن اس نے کسی نہ کسی صورت اپنا وجود برقرار رکھا اور روایت کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے نئے سے نئے امکانات پیدا کرتی چلی گئی' دیگر اصناف سخن کی طرح اسے کسی بھی دور میں پامال صنف سخن کا داغ نہیں سہنا پڑا' اسے ہر دور میں ایسے ہنر مند شاعر میسر آتے رہے' جنھوں نے اپنے تجربے اور فن کاری سے اس میں نئی حرارتیں بھر دیں اور اپنے تخیل اور بلند فکری سے اسے ایسی مسکاریں بخشیں کہ چار صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کی خوشبو جوں کی توں قائم ہے' ولی' میر' غالب' اقبالؔ' حسرت اور ناصر کاظمی کو ہم شاہراہ غزل کے سنگ ہائے میل قرار دے سکتے ہیں۔ اقبالؔ کے بعد ناصر کاظمی نئی غزل کے علم بردار کے طور پر سامنے آتے ہیں اور نئی نسل کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں' ان کی شاعری کی ایمجری اپنے تمام ہم عصر شعرا سے مختلف ہے اور مخصوص لفظیات نئی حیرتوں کا باعث بنتی ہے' ناصر کاظمی اس دور میں اپنی پہچان دو حیرت انگیز بستیوں کے حوالے سے کراتے ہیں' ایک وہ جو اجڑ چکی ہے' ایک وہ جو ان کے خوابوں میں تعمیر ہو رہی ہے' ایک بستی میں کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے اور دوسری بستی میں نئی امنگوں کی آرزو' یہی وہ دور ہے' جس میں ناصر کاظمی شاعری کی حویلی ماضی کے مٹی گارے کی خوشبو کے ساتھ ساتھ نئے دور کی پختہ اینٹوں کے ساتھ اپنی پہچان کراتی ہے' آیئے اگلے باب میں ناصر کاظمی کی شاعری کی حویلی کے مختلف گوشوں کو دیکھتے ہیں۔

حواشی

۱ ـ: جمیل جالبی ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد اول، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۷، ص: ۳۱۸

۲ ـ: جمیل جالبی، ڈاکٹر، "دیوان حسن شوقی" (مرتبہ) انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۱ء ص: ۲

۳ ـ: جمیل جالبی، ڈاکٹر "تاریخ ادب اردو" (جلد اول)، ص: ۲۹۵

۴ ـ: جمیل جالبی، "دیوان حسن شوقی" (مرتبہ)، ص: ۴۸

۵ ـ: جمیل جالبی، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اردو" (جلد اول)، ص: ۵۴۲

۶ ـ: عبادت بریلوی، ڈاکٹر، "شاعری اور شاعری کی تنقید" اردو دنیا، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص: ۳۹

۷ ـ: آزاد، محمد حسین، "آب حیات" شیخ مبارک علی، لاہور ۱۹۰۵ء، ص: ۹۴

۸ ـ: عبادت بریلوی، ڈاکٹر، "شاعری اور شاعری کی تنقید" اردو دنیا، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص: ۳۹

۹ ـ: نور الحسن ہاشمی، سید، "دلی کا دبستان شاعری" اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص: ۳۵

۱۰ ـ: محمد صادق، ڈاکٹر، "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر" لاہور، یونیورسٹی

آکسفورڈ پریس ۱۹۹۴ء، ص : ۷۲

۱۱ ـ: رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو" (مرتبہ تبسم کاشمیری) علمی کتب خانہ، لاہور، س ـ ن ـ، ص : ۲۰۷

۱۲ ـ: وزیر آغا، "اردو شاعری کا مزاج"، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص : ۲۳۷

۱۳ ـ: جمیل جالبی، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اردو" (جلد اول) ص : ۵۷۱

۱۴ ـ: گوپی چند نارنگ، "اسلوبیات میر" ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۵ء، ص : ۸۴

۱۵ ـ: ناصر کاظمی، "خوشبو کی ہجرت، مکالمہ" سویرا، لاہور شمارہ ۱۷، ۱۸

۱۶ ـ: عبادت بریلوی، ڈاکٹر، "شاعری اور شاعری کی تنقید" ص : ۲۵

۱۷ ـ: محمد حسن ڈاکٹر، "کلیات سودا" (مرتبہ) جلد اول، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء ص : ۵۲، ۸۴

۱۸ ـ: ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، "لکھنؤ" کا دبستان شاعری"، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص : ۶۶

۱۹ ـ: شبیہہ الحسن، سید "تاریخ" ساہیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۸۴ء ص : ۱۳۶

۲۰ ـ: آزاد، محمد حسین، "آب حیات"، ص : ۳۳۴

۲۱ ـ: مصحفی، "تذکرہ ہندی" مطبوعہ دہلی، ۱۹۳۳ء، ص : ۳۶۱

۲۲ ـ: آزاد، محمد حسین، "آب حیات" ص : ۳۹۸ ـ ۳۹۹

۲۳ ـ: عبدالسلام ندوی، "شعر الہند" جلد اول، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء، ص : ۲۳۱

۲۴ ـ: فیاض محمود، سید، "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" جلد ہشتم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص : ۱۶۴

۲۵ ـ: عبادت بریلوی، ڈاکٹر، "شاعری اور شاعری کی تنقید" ص : ۳۱۲

۲۶ ـ: سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، "معروضات" پولیمر پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۰ء ص : ۵۸

۲۷ :۔ فیاض محمود، سید، "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" جلد ہشتم، ص: ۴۳۵

۲۸ :۔ ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر، مضمون مشمولہ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" جلد نہم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۲ء، ص: ۲۴۹

۲۹ :۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، مضمون مشمولہ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دہم، ص: ۱۰۶

۳۰ :۔ سرور، آل احمد، دیباچہ "انتخاب جدید" مرتبہ عزیز احمد، انجمن ترقی اردو، کراچی، س۔ن، ص: ۵

۳۱ :۔ اختر انصاری، "غزل کی سرگزشت" ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۵ء، ص: ۳۸، ۳۹

۳۲ :۔ احتشام حسین، سید، "حسرت کا رنگ سخن" مضمون مشمولہ "نگار" (حسرت موہانی نمبر) ۱۸۷۶ء، ص: ۱۸۶

۳۳ :۔ اختر انصاری، "غزل کی سرگزشت" ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۵ء، ص: ۱۰۳

۳۴ :۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، "اقبال" ۔ سب کے لئے" ص: ۳۶۵

۳۵ :۔ صلاح الدین احمد، مولانا، "تصورات اقبال"" جلد اول، المقبول پبلی کیشنز لاہور ۱۹۶۹ء، ص: ۲۱۸

۳۶ :۔ وزیر آغا، "اردو شاعری کا مزاج"، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص: ۲۷۱

۳۷ :۔ حالی الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، کشمیر کتاب گھر لاہور، س ن، ص: ۱۳۲، ۱۳۷

۳۸ :۔ صدیق کلیم، مضمون مشمولہ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" جلد دہم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۲ء، ص: ۴۲۴

۳۹ :۔ وارث علوی "تیسرے درجے کا مسافر" نگارشات لاہور ۱۹۸۶ء، ص: ۲۷۳

۴۰ ۔: حنیف فوق' ڈاکٹر" فنون جدید غزل نمبر" ۱۹۶۹ء' ص :۹۳
۴۱ ۔: محمد حسن ڈاکٹر "جدید اردو ادب" 'غضنفر اکیڈمی' کراچی ۱۹۷۳ء ' ص ۱۳۹:
۴۲ ۔: سجاد باقر رضوی' ڈاکٹر' "معروضات" پولیمر پبلی کیشنز ' لاہور ۱۹۹۰ء ص : ۱۶۸
۴۳ ۔: فضیل جعفری "چٹان اور پانی" 'شب خون 'کتاب گھر الہ آباد' ص :۹۹
۴۴ ۔: سجاد باقر رضوی' ڈاکٹر' "معروضات" پولیمر پبلی کیشنز ' لاہور ۱۹۹۰ء ص : ۱۶۳' ۱۶۴
۴۵ ۔: نظیر صدیقی پروفیسر "جدید غزل پاکستان اور ہندوستان میں" فنون جدید غزل نمبر ۱۹۶۹ء' ص : ۱۶۸
۴۶ ۔: عبادت بریلوی ڈاکٹر "اردو غزل میں ہیئت کے تجربے" ادب لطیف ۱۹۵۵ء

○::○

باب سوم

وہ ہجر کی رات کا ستارا
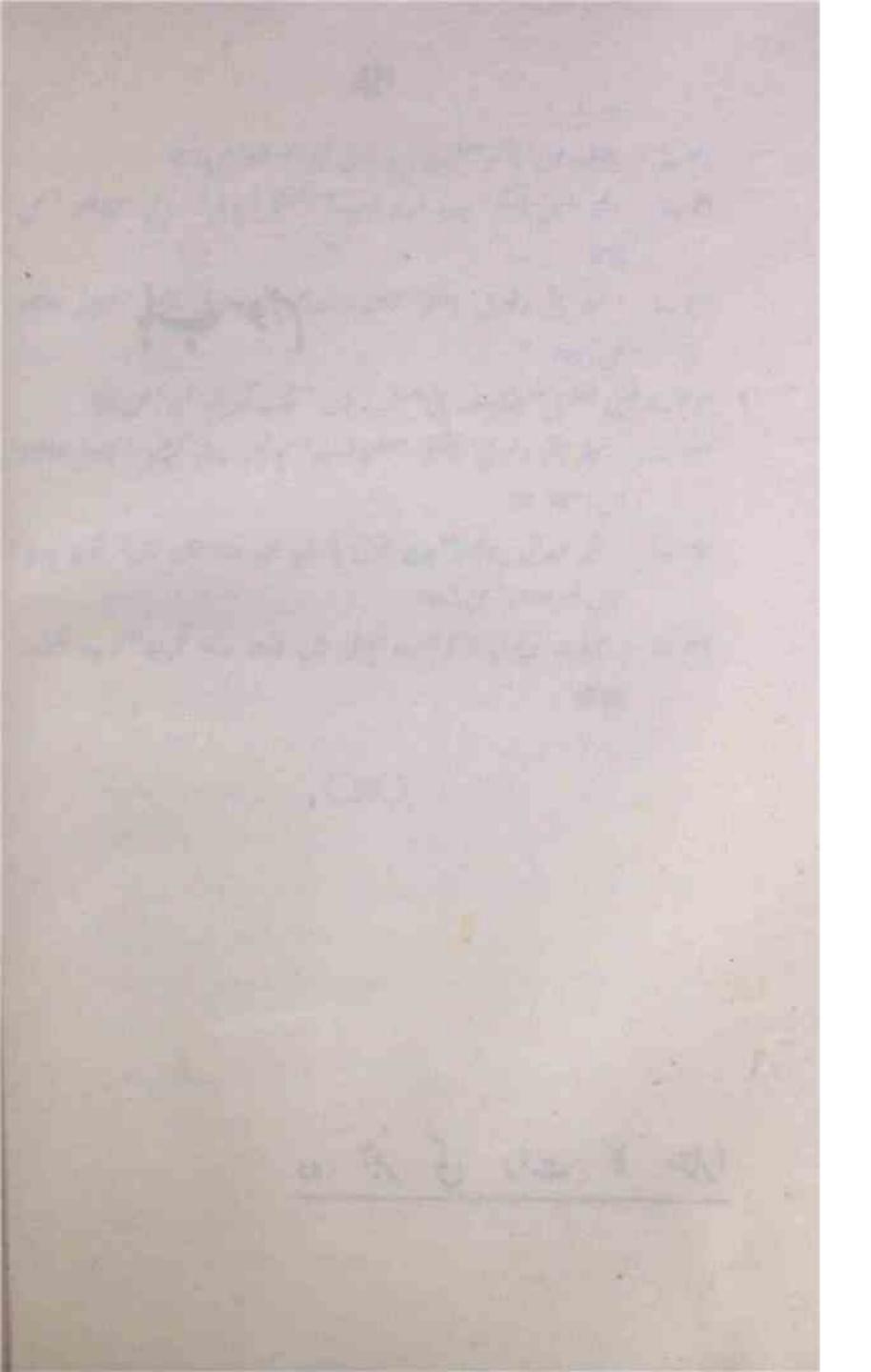
☐ ☆::☆ ☐

ناصر کاظمی کی شاعری ::

(الف)

"برگ نے" ::

☐ ☆::☆ ☐

غزلیں ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۷ء::

"برگ نے" ناصر کاظمی کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے، جو ناصر کاظمی کی زندگی میں شائع ہوا۔ ناصر کاظمی کو بطور شاعر تو زمانہ طالب علمی ہی میں شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ جب وہ ایف اے کا طالب علم تھا، اس کے اشعار پر سر دھننے والوں میں حفیظ ہوشیار پوری، سید عابد علی عابد اور ڈاکٹر تاثیر جیسے پر تاثیر اور معتبر اہل قلم شامل تھے، گو ناصر نے اپنی شاعری کی ابتدا نظم گوئی سے کی تھی اور ڈکشائی میں اپنی محبوبہ کے حوالے

سے کچھ نظمیں کہی تھیں' جن کا ہم پہلے باب میں ذکر کر چکے ہیں' مگر اس کے ساتھ ساتھ ناصر کاظمی نے اسی زمانے یعنی تیرہ برس کی عمر ہی میں غزل سے آشنائی کی۔ بقول افتخار کاظمی اس زمانے میں ناصر کاظمی اختر شیرانی سے متاثر تھے' اس لئے وہ غزل کے خارجی اور داخلی اسرار و رموز اور کیفیات قلبی اور معاملات حسن و عشق سے آشنائی حاصل کر چکے تھے۔ ناصر نے انبالہ شہر میں پہلی مرتبہ فطرت کی آواز سنی' پتوں کو تالیاں بجاتے ہوئے دیکھا' درختوں کو آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے پایا' پرندوں کو اپنے اپنے رنگ اور آواز پر نازاں دیکھا' اسی دھرتی پر ناصر نے سرسوں کے پھول سے قربت حاصل کی' یہیں سے اس نے سفر کو وسیلہ ظفر بنایا' ڈکشائی' شملہ' کسولی' سپاٹو' ڈیرہ دون' مری' ڈلہوزی' ایبٹ آباد' کشمیر' جیسی سرسبز و شاداب وادیوں کی سیر کی' یہاں کے پہاڑوں آبشاروں' ندیوں' چشموں اور خوش نما منظروں کو اپنا ہم راز بنایا' یہیں پر ناصر کو پہلے پہل بجلی کے کڑکنے اور دل کے دھڑکنے کا احساس ہوا' یہی وہ شہر نگاراں تھا' جہاں پیاسی دھرتی پر اس نے پہلی بارش کی دعا مانگی' اسی شہر میں اس نے ریل کو آتے جاتے دیکھا اور اسی شہر کے باغوں میں ناصر کاظمی کا بچپن اور لڑکپن گزرا' غرض انبالہ شہر کا ایک ایک ذرہ اس کے لئے ستارا تھا اور وہ خود بھی اس شہر کی آنکھ کا تارا تھا۔ ناصر نے جب انبالہ سے لاہور کا سفر کیا تو اس نے لاہور کو انبالہ کے بعد دوسرا حیرت کدہ پایا' جہاں باغات تھے' پرندے تھے' ستارے تھے' آسمان تھا' بدلتے موسموں کی خوشبوئیں تھیں' جاگتی آنکھوں کی حیرانیاں تھیں' رت جگوں کے موسم تھے' دوستوں کی محبت بھری خوشبوؤں کی مہکاریں تھیں' دوستوں کے ہمراہ باتوں کی بارشوں میں بھیگنا ناصر کا روز کا معمول تھا' وہ زندگی بھر خود بھی بھیگتا رہا اور اوروں کو بھی بھگوتا رہا' اس نے قیام پاکستان سے پہلے ۴۲-۱۹۴۱ء کے لگ بھگ انبالہ سے بسلسلہ تعلیم لاہور ہجرت کی' مگر بی۔اے کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پھر مراجعت کر گیا' اس دوران ناصر کاظمی لاہور میں کئی مشاعرے پڑھ چکا تھا اور حفیظ ہوشیارپوری کے توسط سے اس کی غزل کی آواز ریڈیو سے بھی بلند ہو چکی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد جب احمد ندیم قاسمی جیسے معروف شاعر نے ناصر کی غزل کی آواز کو سنا تو وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے:

"ناصر محدود شاعر نہیں ہے' وہ متنوع موضوعات کا شاعر ہے اور زندگی کے

حسن کے سینکڑوں پہلوؤں اور اس کی رنگا رنگی کا شاعر ہے اور اس حسن اور اس رنگا رنگی کو سب کے لئے عام کر دینے کی امنگ رکھنے والا شاعر ہے"۔

۱ے

فراق گورکھپوری جیسے کہنہ مشق اور غزل کے تیکھے شاعر نے کہا کہ "ناصر کاظمی کے لہجے میں وہ کھنک اور کھنک ہے، جس میں ہندوستان اور پاکستان دونوں میں بسنے والے اپنے دلوں کی دھڑکنیں سنیں گے، یہ کوئی معمولی صفت نہیں ہے"۔ے۲

اور جب محمد حسن عسکری نے پہلے پہل ناصر کاظمی کی غزل پر کان دھرے اور بقول انتظار حسین:

"اسی نشست میں ناصر کاظمی نے یہ غزل بھی سنائی تھی۔

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

جو عسکری صاحب نے عالم فرنگی میں وہیں نقل کرائی، پھر ۱۹۴۹ء کے آغاز کے ساتھ ساتھ یہ غزل ساقی میں شائع ہوئی اور ساتھ ہی جھلکیاں میں اعلان ہوا کہ پاکستان کو بالآخر ایک شاعر میسر آگیا"۔ے۳

محمد حسن عسکری کا یہ اعلان چھبیس برس کے نوجوان شاعر ناصر کاظمی کے لئے تقویت کا باعث تھا، یہ وہ زمانہ تھا، جب ایک طرف تو ترقی پسندوں کی تحریک نمایاں اثرات مرتب کر رہی تھی تو دوسری جانب اسلامی، پاکستانی ادب کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ناصر کاظمی نے خود کو ان دونوں نظریات سے الگ تھلگ کر کے اپنا نیا راستہ استوار کیا اور ناصر کا یہ راستہ نئی نسل کا راستہ تھا۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

"ترقی پسند ادیب تقسیم کے جواب میں ناقابل تقسیم تہذیب اور انسان دوستی کا راگ الاپ رہے تھے، عسکری صاحب نے پاکستانی ادب کی بات کرتے کرتے اسلامی ادب کا مضمون باندھنا شروع کر دیا تھا، میں بھی تھوڑا اس بحث میں الجھا، مگر گم شدہ چہروں، چڑیوں اور درختوں کی یادوں کا مداوا نہ ہو سکا، آخر کو یہ ہوا کہ میں نے ناصر کو پت جھڑ میں اداس ہوتے دیکھا اور اپنے

اندر کی بات باہر لایا۔ "ناصر صاحب! ہمارے ادھر شاما چڑیا ہوا کرتی تھی، وہ یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتی"۔

"شام چڑی؟ ناصر چونکا"۔ شام چڑی کی بات کیا ہے اور پھر اس نے شام چڑیا کو ایسے بیان کیا کہ میں نے جانا کہ شاما چڑیا کو میں نے اب دیکھا ہے، شام چڑیا کا مسئلہ میرے لئے اتنی ہی اہمیت رکھتا تھا، جتنا ترقی پسندوں کے لئے انسان دوستی کا اور عسکری صاحب کے لئے پاکستانی یا اسلامی ادب کا مسئلہ اہم تھا"۔۔۔۴

انتظار حسین کے اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نظریہ سے زیادہ اہم وہ زمینی رشتے ہیں، جنہیں ہم فطرت اور کائنات کی صورت میں دیکھتے ہیں اور آنکھوں میں بساتے ہیں۔ ناصر کاظمی کے نزدیک بھی اصل رشتہ زمین ہی سے تھا اور اسی زمین کے توسط سے اس کی پرندوں، درختوں، پہاڑوں، آبشاروں، ندیوں، دریاؤں، باغوں اور ہر اس شے سے قربت تھی، جس کے بدن سے اسے اپنی مٹی کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ ناصر کاظمی کی تمام شاعری اسی خوشبو کی بازیافت کا نام ہے، جب سے اس نے اس خوشبو سے آشنائی کی وہ اسی مہک کا رسیا رہا، اسے کبھی کھویا کبھی پایا، اسی خوشبو کے سبب اس کی زندگی کے رویے ہجر و وصال کے موسموں سے آشنا ہوئے، ان ہی موسموں سے ناصر کاظمی کے یہاں اداسیوں، یادوں، رت جگوں، سرسوں کے پھولوں، ستاروں، بسنتوں، چاند، بارشوں، پت جھڑوں، پرندوں اور درختوں کے استعاروں کے رنگ نمایاں ہوئے۔

ناصر کاظمی کی شاعری کا سب سے بلیغ استعارہ یاد اور اداسی ہے، احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے:

"ماضی کی یاد ہر انسان کا جذباتی سرمایہ ہوتی ہے، بس اتنا فرق ہے کہ شاعر ان یادوں کی تخلیقی بازیافت پر بھی قادر ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ناصر اس روشنی کو یاد کرتا ہے، جو کہیں ۔۔۔ بجھ رہی ہے اور کہیں ڈوب رہی ہے، چراغ اور چاند اس کے ہاں ماضی کی انہی بجھتی اور ڈوبتی روایات کی علامتیں ہیں"۔۔۔۵

احمد ندیم قاسمی نے اس اقتباس میں یادوں کو تخلیقی بازیافت کا نام دیا ہے۔

ناصر کاظمی کی شاعری یادوں کی تخلیقی بازیافت ہی کا نام ہے' اس میں ماضی کے چراغ بھی روشن ہیں اور مستقبل کے چاند بھی۔

احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ

"ناصر جب یہ کہتا ہے کہ اس کی اداسی منفی نہیں ہے' بلکہ اس اداسی سے تو خود آگاہی کے سوتے پھوٹتے ہیں تو ناصر کا معیار خود آگاہی محدود نوعیت کا نہیں رہتا ہمہ گیر اور ہمہ اثر حیثیت اختیار کر جاتا ہے' یہی خود آگاہی شاعر کو ایک خوش حال زندگی' ایک پر سکون معاشرے اور ایک شاداب تہذیب کے خواب دکھاتی ہے' یہی ناصر کی آئیڈیالوجی ہے' اس نے یقیناً اسے آئیڈیالوجی کا نام نہیں دیا' مگر زندگی اور انسان اور اس کے مستقبل کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر کے سوا آئیڈیالوجی اور ہوتی کیا ہے؟"

احمد ندیم قاسمی کے اس اقتباس سے ناصر کاظمی کا نظریہ فن واضح ہو جاتا ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ناصر کے یہاں یادیں تخلیقی بازیافت اور اداسی خود آگاہی کا عمل ہے' یہی دونوں رویے ناصر کو اس کے عہد کے غزل گو شعرا سے منفرد کرتے ہیں۔ ناصر نے اپنی غزل میں تخلیقی بازیافت اور خود آگاہی کی خوشبو سے ماضی' حال اور مستقبل کی تہذیبی' ثقافتی مہکاروں سے آشنا کیا۔ ناصر کاظمی کے یہاں ہجرت ان پرندوں کی طرح سے ہے' جو ایک مقام سے دوسرے مقام ہجرت کر کے نئے آشیانے بناتے ہیں' وہ ماضی کی مہکاروں کو یاد تو کرتا ہے' مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ نئی خوشبو سے بھی ناتہ جوڑتا ہے' اس بارے میں سلیم احمد کہتے ہیں:

"ناصر کی شاعری اور ہجرت کی واردات ہمارے تصور پر ایک ساتھ وارد ہوئی' بلکہ ناصر ہی نے ہمیں ہجرت کے المیہ کو محسوس کرنا سکھایا۔ ہجرت کے معنی صرف ایک سرزمین کو چھوڑنا نہیں تھا' یہ صدیوں کے انسانی رشتوں کو چھوڑنے اور ایک بالکل نئی صورت حال میں از سر نو زندگی شروع کرنے کا مسئلہ تھا۔ ناصر اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں جو بعض لوگوں کے نزدیک ان کی شاعری کا بہترین دور بھی تھا' ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ ماضی کی زندگی اپنے سارے حسن کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئی ہے اور ہمیں زندہ

رہنا ہے تو اس خاکستر سے نئی زندگی پیدا کرنا پڑے گی۔ ناصر کو ماضی کی زندگی بہت عزیز تھی، اس نے جلتے ہوئے شہروں اور سلگتی ہوئی بستیوں کا بہت سوگ منایا، مگر اس کے ساتھ ہی یہ ناصر تھا، جو شاخوں پر جلے بسیروں میں ایک نئی فصل گل کا سراغ ڈھونڈ رہا تھا"۔۔۔۶

سو ناصر کے یہاں ہجرت ان کے دور کے ہم عصر شعرا، ادیبوں کی نسبت کیفیت ملال کے ساتھ ساتھ مستقبل کے کئی روشن امکانات بھی لئے ہوئے ہے، یہاں اسکے نزدیک ایک حقیقی شاعر کا کردار ققنس کی طرح کا ہے، جو اپنی خاکستر سے دوبارہ جنم لے کر زندگی بسر کرتا ہے۔ ناصر کاظمی کا رشتہ زمین سے تھا اور وہ اس رشتے ہی کے حوالے سے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اپنی ترجیحات کا تعین کرتا تھا، مظفر علی سید کا کہنا ہے کہ

"جس نے مرتے مرتے لاہور کی چڑیوں اور درختوں کو سلام بھجوایا تھا، اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ تمام کلچر ایگری کلچر کی کوکھ سے نکلتا ہے، اگرچہ اپنے ہم عصر زمین پرستوں کے برعکس وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اپنے آپ نہیں نکلتا، بلکہ اس وقت نکلتا ہے کہ جب انسانی اجتماع اس میں اپنے تخیل کا گرم جیین داخل کرے، اسی توافق اور تلازم کا نام غزل کی اصطلاح میں وصل ہے اور اس کی غیر موجودگی کا نام فراق"۔۔۔۷

مظفر علی سید نے بھی ثقافت کا سرچشمہ زمین ہی کو قرار دیا ہے، چڑیوں، درختوں، باغوں، سرسوں کے پھولوں، ندی، نالوں، شہروں، بستیوں سب کی وابستگی زمین ہی سے ہوتی ہے، اسی لئے یہ اشیا ناصر کی شاعری کا خوب صورت زیور ہیں۔

منیر نیازی نے ناصر کے بارے میں لکھا ہے۔

"ناصر کاظمی کی شاعری یادوں اور خوابوں کا بیان ہے، اس کی شاعری کے بنیادی احساس کو میں اس طرح جانتا ہوں، جیسے کوئی اپنے دل کے زخم سے دوسرے کے دل کے زخم کو جانتا ہے، ناصر کی "برگ نے" اور "دیوان" دونوں کتابیں دو بستیوں کے خیالوں اور ملاپوں کی کتابیں ہیں، ایک بستی کی محفلیں، رسم و رواج، اس کے در و دیوار، اس کے بن، گل، زمینیں، دریا

اس کے آسمان پر چمکتے دمکتے چاند' اس پر گزرے ہوئے موسم اوراس فضا میں کسی انگشت حنائی کے اشارے اور پھر اس سے ہجرت اور ایک دوسری بستی کا سنسان اور اجنبی پن کہ جس میں ناصر اپنی چھوڑی ہوئی بستی کے شاعرانہ عکس کا جویا اور اس کے طیور کے لئے دعا کرتا دکھائی دیتا ہے۔"۸

ہجرت کے تجربے کے بارے میں آفتاب احمد کا کہنا ہے

"ہجرت کے تجربے نے ناصر کو اس حد تک اسی لئے متاثر کیا اور اسی لئے وہ اس کی جان کا روگ بن گیا کہ اس تجربے میں مقام و وقت دونوں سے ناصر کی دوری اور اجنبیت کا احساس بیک وقت جمع ہو گیا تھا' اگلے وقتوں اور پرانی صحبتوں کی یادیں ناصر کی شاعری کا اندوختہ بن کر رہ گئی تھیں' یہ اجنبی مسافر تمام عمر مقام و وقت کی ایک دنیا میں کھڑا مقام و وقت کی ایک دوسری ہی دنیا کے خواب دیکھتا رہا"۔۹

اب دیکھیے ناصر کاظمی کی غزل کے بارے میں جیلانی کامران کی رائے :

"ناصر کاظمی نے اپنی غزل کے ذریعے' اپنے زمانے اور اپنی ہم عصر نسلوں کے لئے شعری الہیات کا جو منظر مرتب کیا ہے' وہ ہمارے شعری ادب میں ایک بے حد قیمتی باب کا اضافہ ضرور کرتا ہے۔"

آفتاب احمد نے ناصر کاظمی کی شاعری میں ہجرت کی خوشبو کو یادوں کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے اسے ناصر کی شاعری کی کسک قرار دیا ہے' جب کہ جیلانی کامران نے شعری الہیات کے حوالے سے ناصر کی شاعری کو اہم قرار دیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے ناصر کاظمی کی شاعری پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"ناصر کاظمی نے اپنے عشق اور اس عشق سے لائے ہوئے درد کی دولت کے علاوہ ہر چیز پر آنکھ بند کر لی تھی' وہ فراق اور فیض وغیرہ سے بہت مختلف آدمی ہیں' اس کی دلیل ان کا عشقیہ رویہ ہے' جو زمانے کے اور غموں کو گھاس نہیں ڈالتا' نکتہ یہ ہے کہ عشقیہ شاعری ہونے کے باوجود ان کی شاعری متروک نہیں ہے"۔۱۰

آگے چل کر شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں :

"میں نے کہا ہے کہ یہ خیال کہ ناصر کاظمی میر کے پیرو ہیں' ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتا' یہ بات کچھ اور نقادوں نے بھی کہی ہے' لیکن وہ کاؤنٹر پوائنٹ کے طور پر ان کو غالب اور اقبالؔ کے شعور حیات و کائنات کے خوشہ چیں یا کم سے کم ان کی طرح کا شعور حیات و کائنات رکھنے والا بتاتے ہیں' میں نہیں جانتا کہ غالب میں شعور حیات کا وجود کیا معنی رکھتا ہے' اگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ غالب اور اقبالؔ کے کلام میں خارج کے مظاہر یا اجتماعی زندگی کا پرتو ملتا ہے تو بات صحیح ہے' لیکن میرے خیال میں ناصر کاظمی کے یہاں تو خارج کے مظاہر اور اجتماعی زندگی شاید سب سے کم اہم مرتبہ رکھتی ہو' ان کے کلام میں موسموں کا ذکر ضرور ملتا ہے' لیکن وہ سارے موسم روح اور دل کے موسم ہیں' جن کو شاعری نے وقتاً" فوقتاً" خارج میں کار فرما دیکھ لیا ہے' انہوں نے رنگ' پانی اور آواز کا زیادہ ذکر کیا ہے' لیکن منیر نیازی کی طرح نہیں۔ منیر نیازی پہلے خارج میں موسم کی تبدیلی محسوس کرتے ہیں' پھر ان کی داخلی واردات اس کے لئے اندر ہی اندر تقابلی تلازمے خلق کرتی ہے"۔ ۔ ۱۱

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مضمون میں ناصر کی شاعری کا بہت تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا اور مغربی شاعروں کے حوالے سے ناصر کے تخیل کا تقابل بھی کیا ہے' یہاں شمس الرحمٰن فاروقی نے واضح انداز میں ناصر کاظمی کی شاعری کے موسموں کو ان کے اپنے موسم قرار دیا ہے' یہ ایسے موسم ہیں' جن کا تعلق روح اور دل سے ہے' اس کے ساتھ ساتھ شمس الرحمٰن فاروقی نے واضح طور پر اس بات کی بھی نفی کی ہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری پر میر کے اثرات ہیں' ان کا کہنا ہے کہ ناصر کاظمی کے یہاں خارجی مظاہر اور اجتماعی زندگی کم اہمیت کی حامل ہے' خود ناصر کاظمی نے انتظار حسین سے مکالمہ کے دوران کہا تھا کہ

"اچھا لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنا لکھے۔ ایک شاعر کے شعر کو سن کے کچھ دیر آپ کو کسی اور کا شعر یاد نہ آئے' بس یہی اچھا لکھنا ہے'

اگر میرا شعر سن کے تمہیں غالب کا شعر یاد آئے تو جیسے ہاتھی کے پاؤں کے نیچے چیونٹی کا حال ہوتا ہے' وہی حال ہوگا میرا"۔ ۱۲

یہاں ناصر کاظمی نے خود بھی شمس الرحمٰن فاروقی کے کہے کی تصدیق کر دی ہے کہ ان کی شاعری پر میر سمیت کسی بھی شاعر کی شاعری کا سایہ نہیں ملتا۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان نے اپنے مضمون "سرسوں کے پھول کے ہم عصر" میں ناصر کاظمی کے درد کے حوالے سے منیر نیازی کی رائے یوں لکھی ہے۔

"میں اس کی شاعری کو ایسے پہچانتا ہوں' جیسے کوئی دوسرے کے درد سے اپنے درد کو جانتا ہے"۔ (مضمون مطبوعہ کتاب لاہور)۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان نے ناصر کی شاعری کے بارے میں کہا ہے:

"حکایاتی وضعوں کے ساتھ ساتھ ناصر کاظمی کے تخیل کی ساخت میں مقامی وضعیں بھی بار بار ظاہر ہوتی ہیں' یہ وضعیں ناصر کاظمی کے بچپن اس کے آبائی شہر چھوٹی عمر میں دیکھے ہوئے قصبوں اور اس ساری فضا کے ثقافتی ورثے سے منسلک ہیں' یہ وضعیں ایک ایسے ثقافتی علاقے سے پیوست ہیں' جہاں ہندی اور عجمی مزاج آپس میں ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے جو میر کے ساتھ ہم آہنگی محسوس کی' اس میں مزاج کی مماثلت کے ساتھ ساتھ زبان کا وہ شعور بھی ہے' جو ہندی مزاج کو عجمی مزاج کے ساتھ ملا دیتا ہے' ناصر کی شخصیت کے پیچھے جو ثقافتی علاقہ دکھائی دیتا ہے' اس میں دوہے' بھجن' گیت' لوریوں' پہیلیوں اور لوک گیتوں کی روایت' غزل کی روایت کے ساتھ ساتھ نظر آتی ہے"۔ ۱۳

ڈاکٹر سہیل احمد خان نے ناصر کاظمی کے کلام کی تفہیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا ہے کہ

"ناصر کاظمی کے ذہن کو اس کے اپنے تجربوں اور دلچسپیوں کے حوالے سے سمجھا جائے تو اس کی شاعری کی ساخت کو بھی ایک نئے طریقے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ناصر کاظمی کا داستانوں اور حکایات سے ربط' مصور' شاہسال اور شاعر لورکا سے اس کی وابستگی محسوس کرنا' ہندی شاعری اور دوہے

کی روایت سے گہرا واسطہ سور داس' میرا بائی اور کبیر کے سنگیت رس سے دلچسپی' میر اور فراق سے اس کی شیفتگی یہ تمام وہ عناصر ہیں' جو اس کے ذاتی تجربوں میں حل ہو کر نئی نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں"۔۔۔۱۴

یہاں ڈاکٹر سہیل احمد خان نے ناصر کاظمی کے کلام کی تفہیم کے لئے واضح طور پر یہ کہا ہے کہ انہیں ان کے تجربات اور مشاہدات کے تناظر اور اس کے ساتھ ساتھ اس ماحول کے حوالے سے دیکھنا ہو گا' جو ان کے ارد گرد تھا۔

بقول ڈاکٹر سہیل احمد خان

"ناصر کا سفر شہروں کے اجڑنے' قافلوں کے لٹنے اور اڑتی ہوئی خاک کے درمیان شروع ہوا تھا اور ساحلوں پر گانے والوں اور کشتیاں چلانے والوں کے گم ہونے پر ختم ہوا۔

حامدی کاشمیری کا کہنا ہے:

"واقعہ یہ ہے کہ ان کو نئے شعرا اپنے دل و جان سے قریب محسوس کرتے ہیں۔ ایسی قربت وہ ان کے دور یا تقسیم سے قبل کے دور کے کسی شاعر سے محسوس نہیں کرتے۔ اس کے دو خاص اسباب ہیں اول یہ کہ معاصر شاعری اجتماعیت سے کنارہ کش ہو کر شاعر کی نجی زندگی سے گہرے طور پر ہم رشتہ ہو گئی ہے۔ اس میلان کے مطابق ناصر کاظمی ان شعرا مثلاً راشد' میرا جی یا احمد ندیم قاسمی جو انسانیت اور اجتماعیت کو مطمح نظر بناتے ہیں سے کہیں زیادہ ہمارے لئے معنویت رکھتے ہیں۔ وہ ہر بات ذات کے حوالے سے کرتے ہیں ۔ دوم وہ ہنگامی نوعیت کے مسائل کے بجائے بعض آفاقی مسائل کی باز آفرینی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ وہ انداز نظر ہے جو نئی نسلوں کو بہت راس آتا ہے۔۱۵

یہ وہ آرا ہیں جن سے ناصر کاظمی کی شاعری کی تفہیم کے چراغ جلتے ہیں۔ تمام ناقدین نے ناصر کاظمی کی اداسی' تنہائی' یادوں' رت جگوں' محبت و عشق کی حکایتوں ' تہذیب و تمدن اور ہجرت کے موسموں کے حوالے سے ناصر کی شاعری کو نئی نسل کی شاعری قرار دیا ہے۔ جن کے معنی زندگی بسر کرنے کے ہیں۔ ناصر کاظمی ایک ایسے شاعر

ہیں جنہوں نے اقبال کے بعد غزل کو نہ صرف نیا پیراہن عطا کیا بلکہ اس غزل کو جو دلی کی طرح بار بار اجڑتی اور آباد ہوتی رہی پہلی مرتبہ استحکام عطا کیا۔ ناصر کاظمی نے ایک اعتبار سے غزل کی اجڑی ہوئی مانگ میں نئے سہاگ کا سیندھور بھر دیا اور یوں غزل پھر سے سہاگن ہو گئی۔ ناصر کاظمی کے دور میں غزل کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ میرا جی' ن۔ م۔ راشد اور مجید امجد نظموں کے نئے چراغ روشن کر رہے تھے۔ ترقی پسند شعرا اجتماعیت کی اقدار کو فروغ دے رہے تھے جبکہ اسلامی ادب اور پاکستانی ادب کے نئے مباحث عام تھے ایسے میں ناصر کاظمی نے غزل میں ہجرت اداسی' یادوں' تنہائی اور ہجر و وصال کے موسموں کو نئے معنی پہنائے۔ جس کے سبب ان کی شاعری پڑھنے والوں اور سننے والوں نے ان کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملائی اور یہ آواز ایک دکھ بھری آواز تھی جس کے پس منظر میں اجڑے ہوئے موسموں کی باس اور سکھ کے ان دیکھے موسموں کی آس تھی۔ آیئے اب اس پس منظر کے حوالے سے "برگ نے" پر ایک نظر ڈالتے ہیں لیکن پہلے اس بارے میں ناصر کاظمی کی رائے بھی تو لے لیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

"اصل میں غزل کی روش پر تو میں نہیں چل نکلا۔ مجھے غزل' قطعہ' رباعی' آزاد نظم وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ مجھے تو شاعری سے سروکار ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ شاعری صرف مصرعے لکھنے کا نام نہیں شاعری تو ایک نقطہ نظر ہے زندگی کو دیکھنے کا۔ چیزوں کو دیکھنے کا۔ ان کو ایک خاص موزوں طریقے سے بیان کرنے کا نام شاعری ہے۔ تو غزل تو اتفاقیہ ایک صنف مجھے پسند تھی۔ چونکہ میرا ایک پس منظر تھا اس میں میں نے زیادہ تر غزل کی شاعری پڑھی۔ پھر یوں دیکھئے کہ اردو کا بہترین سرمایہ۔ تو غزل ہی میں ہے تو جس زمانے میں میں نے شعر کہنا شروع کئے اسلامیہ کالج لاہور میں تھا۔ یہاں فیض احمد فیض' راشد' اور میرا جی کا طوطی بول رہا تھا اور اس کے بعد دوسری نسل تھی یوسف ظفر اور ان کے ساتھی۔ غزل واقعی مشاعرے میں پڑھنا بہت مشکل تھا لیکن یہ ہے کہ میں ترنم سے پڑھا کرتا تھا میرے ساتھ حمید نسیم اور حفیظ ہوشیار پوری تھے ان کو بھی بڑے ادب سے سنا جاتا تھا لیکن دراصل میں نے غور کیا کہ غزل کے خلاف لوگ نہیں تھے

بلکہ غزل میں cliche کی پرانی ڈگر جو تھی اس کے خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میاں نئی بات کرو تو اگر غزل میں نئی بات کہی جا سکے اور غزل کا احوال تمہیں پتہ ہے کہ دلی شہر کا سا ہے۔ یہ بار بار اجڑتی ہے اور بار بار بستی ہے۔ کئی بار غزل اجڑی لیکن کئی بار یہ زندہ ہوئی اور اس کا یہی امتیاز ہے کہ غزل میں شاعری اچھی ہوئی ہے شاید نظم کا اس آسانی کے ساتھ چراغ نہیں جلا۔ خود فیض نظم لکھتے ہیں لیکن غور سے دیکھئے ان کی ساری کی ساری شاعری غزل ہے تغزل ہی تو ہے جس کی وجہ سے فیض شاعر ہے۔ تو یہ ہے۔ غزل اس لئے میں نے اختیار کی اور جہاں تک جدید شاعری کا تعلق ہے اس میں ۔۔ کچھ خیالات اس زمانے میں نئے آئے تھے تو ان کا غزل برابر ساتھ دیتی رہی ہے اور میرا خیال ہے جو غزلیں میں نے کہی ہیں میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے اپنی دانست میں یہ سوچ کر کہیں کہ وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کریں اور اس میں میرے عصر کی روح ہو۔"[۱۶۰]

ناصر کاظمی نے بڑی سادگی کے ساتھ اپنے نظریہ فن کی وضاحت کر دی ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ غزل ہر دور کے تقاضے پورا کرنے کی اہل ہے اور یہ کہ گو فیض نے نظمیں بھی کہی ہیں مگر انہیں فیض بنانے میں غزل ہی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ناصر کاظمی نے یہاں یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس دور میں غزل کہنا کوئی معمولی بات نہیں تھی نظم کا دور تھا اور مشاعروں میں بھی نظم ہی چلتی تھی مگر ناصر ایسے شاعر تھے جن کا کلام بھی سنا جاتا تھا اور ترنم آواز بھی۔ مظفر علی سید کہتے ہیں:

"نوجوانی میں ناصر کاظمی مشاعروں میں سٹار ویلیو رکھنے والے شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔"[۱۷]

سو ناصر کاظمی "برگ نے" کی اشاعت سے پہلے ہی مشاعروں کے مقبول ترین شاعر تھے اور انہیں بار بار سنا جایا کرتا تھا۔ ناصر کاظمی نے جب "برگ نے" ترتیب دی تو اس کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا' ایسی تمام غزلیں جنہیں' وہ کمزور سمجھتے تھے' انہیں الگ کر دیا' پھر اس میں ناصر کے عشق کے ابتدائی دور کی نظموں کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا' یہ مجموعہ ناصر کاظمی کو بہت عزیز تھا اور اس کی اشاعت نے ناصر کاظمی

کی مقبولیت میں چار چاند لگا دیئے' اس مجموعہ کے بارے میں ناصر ایک دلچسپ واقعہ انتظار کو سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ناصر کی شادی پر سب کو تشویش تھی کہ اب وہ شاعری نہیں کرے گا' سو اس بارے میں جب ناصر سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔

"وہ بات بتاؤں۔۔ اگر اجازت ہو۔۔ دراصل مجھے کوئی تشویش اس لئے نہیں تھی کہ جب شادی ہوئی اور یہ دلہن بن کر میرے گھر آئیں تو میں نے انہیں کہا کہ ایک بات ہے' اگر آپ برا نہ مانیں تو عرض کروں' وہ یہ کہ میری ایک اور بیوی بھی ہے تو ایک دفعہ تو جیسے ان کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی' لیکن پھر میں نے انہیں اپنی یہ کتاب "برگ نے" دی۔ میں نے کہا وہ یہ ہے میری بیوی' تو بارے ان کو اطمینان ہوا" ۔ ۱۸ے

سو ناصر کاظمی کو "برگ نے" جس قدر عزیز تھی' اس اقتباس سے واضح ہو گیا ہے' اب کچھ ناقدین "برگ نے" کے دور کو ناصر کاظمی کی شاعری کا بہترین دور قرار دیتے ہیں' جب کہ خود ناصر کاظمی کا کہنا ہے کہ "ان کی شاعری کا "برگ نے" کے بعد ایک لحاظ سے بہتر اور زیادہ تخلیقی دور ہے" - ایک اعتبار سے ناصر کاظمی کا یہ کہنا درست بھی ہے گو وہ "برگ نے" کے بعد رسائل میں بقول ان کے بہت کم چھپے' مگر اس کے بعد انہوں نے جو شاعری کی' وہ اب "دیوان" - "سر کی چھایا" - "نشاط خواب" اور "پہلی بارش" کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔

ناصر کاظمی کی "برگ نے" کی غزلیں ہی ناصر کی پہلی پہچان ہیں' ان غزلوں میں ناصر کی زندگی کے موسموں کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے' مگر کسی طور پر بھی شاعری کے ان موسموں کو مغربی شاعری کے موسموں کے حوالے سے پہچاننا جائز نہیں۔ ناصر نے مغربی شعر و ادب پڑھا ضرور تھا' مگر اسے اپنے اوپر طاری نہیں کیا' یہی صورت ناصر کے یہاں میر و فراق' انیس و اختر شیرانی کی بھی رہی' اس نے ان شعرا کی شعروں کی گھٹاؤں کو ان کے اپنے اپنے آنگن میں برستے تو دیکھا' مگر اپنی شاعری کی حویلی میں برسنے نہ دیا' اس کی غزل میں عصری آوازیں تو ملتی ہیں' مگر نعرہ بازی نہیں ملتی' اس لئے کہ اس نے اپنی غزل کی بنت میں جذبے اور امیجری کو ملحوظ رکھا۔ بچھڑے ہوؤں کا دکھ' کھوئے ہوئے منظروں کی بازگشت' لٹتے ہوئے قافلوں کی آہیں' مانوس موسموں کی

باس، گرم سانسوں کی خوشبو، گہری کالی اڑتی زلفیں، سیاہ آنکھیں، چاند سا ماتھا، روشن ٹھوڑی، گلے میں سورج مکھی سا پھول، ہجر و وصال کی راتیں، اداسی، تنہائی، یادیں اور پھر اچھے دنوں کی آس، نئے موسموں سے آشنائی، زمانے سے بے پروائی، فطرت کے رنگوں سے عشق نے ناصر کی غزل کو ایک نیا پیراہن عطا کیا، جو اس سے پہلے دور کے اپنے عہد میں کسی اور کا نصیب نہیں تھا، اسی لئے اس کی غزل جس کسی نے بھی سنی، اسے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی آواز سمجھا اور اس کے ساتھ ہی نئی دنیا بسانے کی آرزو بھی کی، جس کسی نے ناصر کی غزل کی انگلی پکڑی، وہ اسی کے ساتھ ہو گیا، اس نے ناصر کے اشعار کی سرگوشیوں میں دل کی دھڑکن کی آواز سنی، پرندوں کو چہچہاتے دیکھا، درختوں کی سرسبز ڈالیوں کو قوت نو پاتے دیکھا، چڑیوں سے ہم کلام پایا، ماضی کے لوگ گیتوں کی بازگشت سنی۔ اور ایسی کہانیاں بھی سنیں، جو تھکے ماندوں کے لئے لوری کی صورت ہوتی ہیں، ایسی لوری جس میں روشن خواب پنہاں ہوتے ہیں۔ ناصر نے خوابوں میں کئی خواب بنے، آیئے اب اس کی اس بنت کاری کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں۔

ناصر کاظمی "برگ نے" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"آج کا شاعر نگری نگری گھومنے والا شاعر اور درباری سخن ساز دونوں کے مختلف مزاجوں کو ملا کے ایک نئی آواز پیدا کرنا چاہتا ہے، جو اس کے اپنے گرد و پیش اور اس کے اپنے آسمان و زمین سے بھی علاقہ رکھتی ہو، طباعت کی مدد سے چشم و گوش تک پہنچنے والا پرانے نغمہ پیرا کی بے ساختگی کو سخن ساز کی مہارت فن سے اس طرح باہم پیوست کرنا چاہتا ہے کہ دونوں یک جان ہو جائیں، اس طرح اس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ، گرفت اور قوت و تیزی کا اجتماع ہو گا، اگر وہ اس شک میں ڈوب جائے کہ اس کی آواز کہیں خلاؤں میں کھو کے رہ جائے گی تو شاید اسے بلند کرنے کا ہی کوئی جواز نہ رہ جائے"۔ ۱۹ے

ناصر کاظمی نے نہایت جامع انداز میں نئی شاعری کی تعریف کر دی ہے، اس نے نہ تو ایسی شاعری کے ناتے کسی بہت بڑے نظریے سے جوڑے ہیں نہ ہی مغربی یا مشرقی ناقدین فن کا ذکر کیا ہے، بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں اپنی سیدھی سادی اور

دلوں میں اترنے والی شاعری کی مہک کی پہچان یوں کرا دی ہے کہ یہ ایک ایسی میٹھی اور سریلی آواز ہو، جس کا تعلق اپنے گرد و پیش کے ماحول سے ہو اور وہ اپنے آسمان و زمین سے بھی نسبت رکھی ہو،

سو ناصر کاظمی نے اپنی اس پہلی متاع عزیز کا انتخاب اپنی زندگی کی محبوب ہستیوں یعنی اپنے والد مرحوم اور والدہ مرحومہ کے نام کر کے حق سعادت ادا کیا ہے، اس کی یہ پہلی غزل ناصر کے عہد شباب کی پہلی بھرپور خوشبو ہے:

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی
اے دوست ہم نے ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

ناصر کاظمی کی غزل کے اس آخری شعر پر تو اہل ذوق تڑپ اٹھتے تھے اور مشاعرے میں شریک اساتذہ بھی مکرر مکرر کہتے ہوئے اسے بار بار سنتے عبدالحمید لکھتے ہیں کہ:

"ان کی ایک اور مشہور غزل کا ایک شعر شروع میں یوں تھا ۲۰

دل نے خیال ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی"

عبدالحمید کا یہ بھی کہنا ہے کہ ناصر کاظمی نہ تو کسی سے اصلاح لیتے تھے، اور نہ ہی کسی کو اپنا استاد ماننے کے روادار تھے، وہ دوستوں کی محفل میں کلام سناتے اور جب کسی شعر کے بارے میں انہیں ذرا سا بھی وہم ہو جاتا تو یا تو اسے حذف کر دیتے یا پھر تبدیل کر دیتے ہیں، جیسا کہ اس شعر کو کیا ہے۔ ناصر کاظمی اپنے کلام پر بار بار نظر ثانی کرنے کے عادی تھے، یہی وجہ ہے کہ "برگ نے" کا انتخاب انہوں نے نہایت کڑا کیا ہے، اس کی نسبت دیوان میں ان کی شاعری کے موسم بدلتے محسوس ہوتے ہیں اور "دیوان" کی شاعری اپنے ارتقائی سفر کا استعارہ بن کر نمودار ہوتی ہے، اس کے بعد ناصر نے "پہلی بارش" کا انتخاب کیا جو "برگ نے" سے "پہلی بارش" تک شاعری کا ایک

یادگار پل ہے' سو ناصر کاظمی کی نظر حسن انتخاب بھی شاعرانہ تھی' یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی شعرا کے کلام سے جو انتخاب مرتب کیا ہے' اس میں بھی ناصر کا حسن نظر صاف دکھائی دیتا ہے۔

"برگ نے" میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کی جو غزلیں شامل ہیں' ان میں پہلی غزل اپنے بھرپور تغزل اور گرد و پیش کے حوالے سے ناصر کی شاہکار غزل ہے' دوسری غزل میں ناصر کی حیرانیاں ہجر کی کیفیات کے حوالے سے اجاگر ہوتی ہیں:

وہ بھی اداس اور مری رات بھی اداس
ایسا تو وقت اے غم دوراں نہ تھا کبھی
کیا دن تھے جب نظر میں خزاں بھی بہار تھی
یوں اپنا گھر بہار میں ویراں نہ تھا کبھی

اس غزل میں کھوئے ہوؤں کی جستجو اور ماضی کے موسموں کی بازگشت ہے' ناصر نے زمانہ حال میں دکھ درد کی جو لہر محسوس کی اسے اس غزل میں ماضی کے نوحے کے ساتھ پیش کر دیا' یہ وہ زمانہ تھا' جب بے یقینی کی فضا عام تھی' اس کے بعد کی غزل میں ناصر کی اداسی اور تنہائی ان موسموں کو یاد کرتی ہے' جب:

آنکھیں تھیں کہ دو چھلکتے ساغر
عارض کہ شراب تھرتھرائے
مہکی ہوئی سانس نرم گفتار
ہر ایک روش پہ گل کھلائے

اور پھر یہ یادیں یک دم خوشی کی ایک لہر سے دوسرا رخ اختیار کر جاتی ہیں' یہی ناصر کاظمی کی "اداسی' تنہائی کا وصف ہے کہ وہ دیرپا نہیں ہوتی' اسے روتے روتے اگر کوئی ہنسا دے تو وہ ہنس بھی پڑتا ہے' جیسے بادلوں میں اچانک سورج چمک اٹھے' یہی اس کی شاعری کا وصف بھی ہے' اس لئے اس غزل کے آخری شعر میں کہتا ہے:

کچھ پھول برس پڑے زمیں پر
کچھ گیت ہوا میں لہلہائے

اس کے بعد کی غزل تو صاف صاف نئے موسموں کی بشارت لئے ہوئے ہے

اور اس میں ناصر نے نہ صرف خود کو دلاسہ دیا ہے' بلکہ سوہنی دھرتی پر قدم رکھنے والے مایوس چہروں پر امید کی نئی کرنوں کو جگمگایا ہے' وہ کہتا ہے:

مایوس نہ ہو اداس راہی
پھر آئے گا دور صبحگاہی
پھر خاک نشیں اٹھائیں گے سر
مٹنے کو ہے ناز کجکلاہی
انصاف کا دن قریب تر ہے
پھر داد طلب ہے بیگناہی
پھر اہل وفا کا دور ہو گا
ٹوٹے گا طلسم کم نگاہی
آئین جہاں بدل رہا ہے
بدلیں گے اوامر و نواہی

گو یہ تمام غزلیں ۱۹۴۷ء سے پہلے کی ہیں' مگر اس زمانے کی ہیں' جب پاکستان کے قیام کے خد و خال واضح ہو چکے تھے' اس غزل کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر ناصر کاظمی ترقی پسندی کی طرف مائل ہوتے تو بڑے بڑے شعرا کو ترقی پسندی کے میدان میں بھی پیچھے چھوڑ دیتے۔ ناصر نے بدلتے ہوئے حالات اور بدلتی ہوئی قدروں کے حوالے سے آواز خلق کو نقارہ خدا کی صورت میں یوں پیش کیا کہ یاس' آس میں بدل گئی۔ انہوں نے انصاف کے دنوں کی بشارت دی' اہل وفا کو آئین جہاں بدلنے کا مژدہ سنایا اور خاک نشینوں کے جاگنے کی' ناز کجکلاہی کے مٹنے کی نشاندہی کی' دیکھئے یہ ایک ترقی پسند غزل ہے اور اس سے ناصر بھی ایک ترقی پسند اور انقلابی شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں' مگر ناصر نے خود کو ترقی پسند یا انقلابی شاعر نہ کہلوانا پسند کیا اور نہ ہی ایسا شاعر بننے کی شعوری کوشش کی' اس نے تو پانی کی جذباتی لہر کو محبت کی دھیمی آنچ ضرور پہنچائی' مگر اسے ابلنے نہ دیا' اس غزل میں بھی معرد کی کسک کے ساتھ ساتھ روشن دنوں کی ایک نوید بھی ہے' یہی ناصر کی جدید اور نئی شاعری ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد کی شاعری میں ماضی کی بازگشت نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور ناصر کی یادوں کے گلاب پوری طرح کھل اٹھتے ہیں' وہ ان رونقوں کو یاد کرتا ہے' ان لوگوں کو یاد کرتا ہے' جن کے ساتھ وہ اپنے دل کے تار ملاتا تھا۔ ہجرت کے بعد اس کی آنکھوں میں اس بہار کا منظر کھل اٹھتا ہے' جب گلستاں کا رنگ اور تھا' اس نے ہجرت کے دوران جو تباہی و بربادی دیکھی' جس طرح سے انسانی اقدار کو پامال ہوتے ہوئے دیکھا' اپنوں کو پرایوں میں دیکھا تو اس نے غزلوں میں نوحے رقم کئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کی غزلوں میں سے پہلی غزل اس کا نوحہ ہی تو ہے:

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو!
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

اس نوحے کے بعد ناصر کاظمی نئی زمین اور نئے موسموں کے حوالے سے زندگی کی بات کرتے ہیں اور زندگی بسر کرنے کی راہ سمجھاتے ہیں' ناصر کے یہاں میر کا سا درد تو ہے' مگر مایوسی نہیں' میر کی ہجرت اور ناصر کی ہجرت دو مختلف کیفیتوں اور تجربوں کا نام ہے' میر نے ہجرت حالات سے تنگ آ کر خود اپنی مرضی سے کی تھی اور پھر اس ہجرت کے دوران وہ قتل و غارت 'وہ انسانی بے قدری میر نے نہیں دیکھی تھی' جو ناصر نے دیکھی اور پھر ناصر کی ہجرت استحصالی قوتوں کی جانب سے زبردستی تھی' ایسی صورت حال میں ناصر کا دکھ' ناصر کا غم اور اداسی ایک مختلف نوعیت کی ہے' اسی لئے یہ ''خزاں والے'' کو اپنے ہی دل کی آواز لگتی ہے' ناصر کی اداسی اور تنہائی دیرپا نہیں ہوتی' اسے جب بھی امید کی ایک ہلکی سی کرن بھی دکھائی دیتی ہے' وہ بول اٹھتا ہے:

ختم ہوا تاروں کا راگ
جاگ مسافر اب تو جاگ
دن کا سنہرا نغمہ سن
ابلق شب نے موڑی باگ

۱۹۴۷ء کے واقعات کے مناظر جب ناصر کی آنکھوں میں گھومتے ہیں' وہ جب

لوگوں کو مصیبتوں میں گرفتار دیکھتا ہے، لٹے ہوئے قافلوں کی دردناک آوازیں سنتا ہے تو وہ پھر خدا کو پکارتا ہے اور کہتا ہے:

اوہ میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا
اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سناٹا
پیاسی دھرتی جلتی ہے
سوکھ گئے بہتے دریا
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں
نگری نگری کال پڑا

۱۹۵۰ء کی شاعری کا دور ناصر کاظمی کے سنبھلنے کا دور ہے، گہری اداسی کے مدھم پڑھنے کا دور ہے، رت بھگوں کے تخلیقی پن کا زمانہ ہے، شعور ذات کا عہد ہے، اسی دور میں ناصر نے چاند کو نئے معنی پہنائے اور شب فراق کو تخلیقی شب وصال بنایا، یادیں اس دور میں بھی ناصر کے کنج تنہائی میں پرورش پاتی رہیں:

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں
ایسا الجھا ہوں غم دنیا میں
ایک بھی خواب طرب یاد نہیں
رشتہ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں
یاد ہے سیر چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

یاد آتی ہیں دور کی باتیں
پیار سے دیکھتا ہے، جب کوئی

سو اس دور کی غزلوں میں ناصر کی یادوں کے چراغ ٹمٹماتے ضرور ہیں' مگر بجھنے نہیں پاتے اور نہ ہی ناصر انہیں بجھانے کا آرزو مند دکھائی دیتا ہے' یہ یادیں تو اس کی محبت کے پرندے ہیں' جن سے وہ ہر روز ہم کلام ہوتا ہے' پچھلی پروازوں کی داستانیں سنتا ہے اور نئی پروازوں کی باتیں کرتا ہے' اس دور کی غزلوں میں ناصر کے یہاں چاند کا استعارہ طلوع ہوتا ہے اور پھر یہی چاند زندگی بھر ناصر کی کمزوری بن جاتا ہے' یہاں تک کہ اس چاند کی خاطر اسے لودھراں سے ملتان تک کا سفر چاند ہی کی ہمراہی میں پیدل طے کرنا پڑتا ہے' اس واقعہ کو ہم پہلے باب میں بیان کر چکے ہیں' آیئے ہم ناصر کے اس دور کے چاند کو دیکھتے ہیں:

کئی دن رات سفر میں گزرے
آج تو چاند لب جو نکلا

رو میں چاند نے کیا بات سمجھائی مجھ کو
یاد آئی تیری انگشت حنائی مجھ کو

دیکھتے دیکھتے تاروں کا سفر ختم ہوا
سو گیا چاند مگر نیند نہ آئی مجھ کو

ترے وصال کی امید اشک بن کے بہہ گئی
خوشی کا چاند شام ہی سے جھلملا کے رہ گیا

دور شاخوں کے جھرمٹ میں جگنو بھی گم ہو گئے
چاند میں سو گئی چاندنی سو رہو سو رہو

جیسے چاند کی ٹھنڈی لو
جیسے کرنوں کی کن من

چاند کے ساتھ ساتھ اس دور میں ناصر نے رات کے استعارے کو بھی بڑی خوب صورتی کے ساتھ اپنی شاعری میں نئے معنی پہنائے ہیں۔ ناصر کی شاعری کا یہ دور ایک ایسا دور ہے، جس میں اسے اپنی ذات پر اعتماد کی فضا بحال ہوتی دکھائی دیتی ہے، شعور ذات کے اس دور میں اس پر اس کی شاعری کا راز منکشف ہوتا ہے۔ اور وہ شاعری کے گنبد میں اپنی آواز کی منفرد گونج محسوس کرتا ہے، اسے اس دور میں یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کی شاعری صرف اس کے دل کی دھڑکن کا سبب ہی نہیں، بلکہ اس ایک بے شمار چاہنے والوں کے دل کی دھڑکن ہے، وہ اب اپنی شاعری کو صرف اپنے دل کی خوشبو ہی نہیں سمجھتا، بلکہ سب کے دلوں کی مہکاریں گردانتا ہے، شعور ذات کے اسی ادراک کو ناصر بڑے اعتماد کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے:

دنیا تو سدا رہے گی ناصر
ہم لوگ ہیں یادگار کچھ

عروج پر ہے مرا درد ان دنوں ناصر
مری غزل میں دھڑکتی ہے وقت کی آواز

یہ عجیب بات ہے کہ جب کسی تخلیق کار کو اپنے تخلیق کار ہونے کا احساس ہو جاتا ہے تو پھر اس کے فن کی عمر بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اس کی اپنی عمر گھٹنے لگتی ہے، سو ناصر نے ۱۹۵۰ء میں جو بات کہی تھی، وہ ۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو پوری ہو گئی، اس نے مرتے ہوئے لاہور کے درختوں اور چڑیوں کو آخری سلام بھیجا، اس دور کی ایک غزل میں اس نے لاہور کی تعریف یوں کی تھی:

شہر لاہور تیری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ لائی مجھے

۱۹۵۱ء کے دور کی شاعری ناصر کی شاعری کا ارتقائی سفر ہے، اس دور میں بھی یادوں کے پرانے دریچے کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں، لیکن اس دور میں امیدوں کی برف پگھلنے کی بشارت بھی ملتی ہے:

چلو کہ برف پگھلنے کی صبح آ پہنچی

خبر بہار کی لایا ہے کوئی گل پارہ

چلے چلو انہیں گمنام برف زاروں میں
عجب نہیں یہیں مل جائے درد کا چارہ

یہاں ناصر اپنی اداسی کے حوالے سے اپنے محبوب کو جو خوبصورت بد دعا دیتے ہیں وہ کچھ اس طرح سے ہے

خیال ترک تمنا نہ کر سکے تو بھی
اداسیوں کا مداوا نہ کر سکے تو بھی
کبھی وہ وقت بھی آئے کہ کوئی لمحہ عیش
مرے بغیر گوارا نہ کر سکے تو بھی
تجھے یہ غم کہ مری زندگی کا کیا ہو گا
مجھے یہ ضد کہ مداوا نہ کر سکے تو بھی

ان اشعار میں ناصر نے اپنی ضدی طبیعت کی بھی عکاسی کی ہے۔ یہ ضدی طبیعت ناصر کی ثابت قدمی کی علامت ہے جسے وہ عشق کے تپتے صحرا میں ننگے پاؤں چلتے ہوئے قائم رکھتے ہیں۔ اس سفر میں وہ ہمت نہیں ہارتا امید کا دامن ہمیشہ تھامے رہتا ہے۔

یہ رات تمہاری ہے چمکتے رہو تارو
وہ آئیں نہ آئیں مگر امید نہ ہارو

اس امید کی چھاؤں میں وہ فکر تعمیر آشیاں کے ساتھ ساتھ خوف خزاں میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے

فکر تعمیر آشیاں بھی ہے
خوف بے مہری خزاں بھی ہے

فکر تعمیر آشیاں کے ساتھ ساتھ ناصر اپنی یادوں کے کنول بھی اس طرح کھلائے رکھتا ہے اور اسے جسے وہ بھلائے بھی بھول نہیں پاتا اسے ہی اپنی زندگی کا دم ساز اور ہمراز سمجھتا ہے

زندگی جس کے دم سے ہے ناصر
یاد اس کی عذاب جاں بھی ہے

یوں ناصر اپنی خوب صورت یادوں کو جب حقیقت کے آئینے میں دیکھتا ہے تو اسے عذاب جاں کے بغیر نہیں رہتا۔ صبح کا سماں ہمیشہ ناصر کے لئے اداسی کا سبب رہا ہے وہ صبح سویرے چڑیوں کی آواز سن کر اداس ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے پس منظر میں کوئی اداس واقعہ ہو جو چڑیوں کی چہچہاہٹ کی صورت اس کے دل پر قیامت بن کر ٹوٹتا ہو۔ ورنہ صبح کا وقت ہشاش بشاش ہونے کی علامت ہے۔ مگر ناصر کہتا ہے

کیسا سنسان ہے سحر کا سماں
پتیاں محو یاس' گھاس اداس
کوئی رہ رہ کے یاد آتا ہے
لئے پھرتی ہے کوئی باس اداس

یہاں ناصر نے پتیوں کے ساتھ گھاس کو اداس کہہ کر بامعنی بنا دیا ہے۔ ناصر کا شاعری کے بارے میں کہنا تھا کہ شاعری مردہ لمحوں کو زندہ کر دیتی ہے سو ناصر نے بھی اپنی شاعری سے بے جان چیزوں کو جاندار بنا دیا ہے گھاس ان میں سے ایک ہے۔ ناصر کے نزدیک درخت' شہر' چاند پھول' فطرت' رومینٹک چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک بڑی تہذیب کا نام ہے اور یہی تہذیب ناصر کی شاعری کا وصف خاص ہے اس دور کی غزلوں میں ناصر کاظمی کو جو غزل سب سے زیادہ پسند تھی وہ یہ ہے۔

ساز ہستی کی صدا غور سے سن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن

ناصر نے انتظار حسین سے اپنی زندگی کی آخری ملاقات میں یہی غزل غور سے سنائی تھی۔ ناصر کاظمی کا اس غزل کے بارے میں کہنا تھا۔

"یہ غزل اس میں تھوڑی سی خطابت ہے مگر یہ ہے کہ بعض وجوہ سے مجھے پسند ہے کہ طلوع و غروب کے مناظر ہیں حیرت اور عبرت کی دنیا میں کیا ہوتا ہے۔ کس طرح چیزیں ڈوبتی ابھرتی ہیں۔ کس طرح صبح و شامیں ہوتی ہیں اور کچھ قرآن کریم کے پڑھنے والوں کے لئے بھی"۔ ۲۱

ناصر نے اپنی اس غزل کو نہ صرف پسند کیا بلکہ بستر مرگ پر انتظار کے سامنے دھرایا بھی۔ ناصر کہتا تھا کہ کوئی بھی شاعر بغیر قرآن کریم کے مطالعہ کے بڑا عظیم شاعر نہیں بن سکتا۔ ناصر کا قرآن کریم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس نے حضرت علیؓ کی "نہج البلاغہ" بھی پڑھ رکھی تھی۔ سو اس غزل کو ناصر کاظمی کا پسند کرنا اور پھر اسے چند روز پہلے سنانا خاص معنی رکھتا ہے۔ ناصر کی یہ غزل کائنات کا ایک حیرت کدہ لئے ہے جسے دیکھنے والی آنکھ اپنے اپنے طور پر محسوس کرتی ہے۔ ناصر نے اس غزل میں ایک طرح سے خداوند کریم کی حمد کی ہے اور دوسرے یہ کہ سورہ رحمان میں خداوند کریم فرماتا ہے تم میری کس کس نعمت کو ٹھکراؤ گے اس آیت کریمہ کی خوشبو اس غزل میں محسوس ہوتی ہے۔ ناصر جب مختلف ساعتوں اور چیزوں کے حوالے سے یہ کہتا ہے کہ غور سے سن اس غور سے سننے میں وہ یہ بتا رہا ہوتا ہے اس تمام نظام کائنات اور فطرت کے پیچھے ایسی کوئی طاقت ہے جو صبح و شام کے منظر تخلیق کرتی ہے۔ ان کے ہنگاموں اور رات کے پردوں کے پیچھے بھی کوئی پوشیدہ ہے۔ چڑھتے سورج کی ادا اور ڈوبتے دن کی ندا کے پس منظر میں کوئی موجود ہے۔ اس غزل میں ناصر نے کمال مہارت سے نہ صرف خداوند کریم کی حمد کی ہے بلکہ کئی سوال بھی اٹھائے ہیں اور ان سوالوں کے جواب بھی اسی غزل میں دے رہے ہیں یہ ایک مسلسل غزل ہے جو زیادہ تر نظم کے قریب ہے۔

دل تڑپ اٹھتا ہے کیوں آخر شب
دو گھڑی کان لگا غور سے سن

کعبہ سنسان ہے کیوں اے واعظ
ہاتھ کانوں سے اٹھا غور سے سن

موت اور زیست کے اسرار و رموز
آ مری بزم میں آ غور سے سن

چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان
ڈوبتے دن کی ندا غور سے سن

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں

طائر نغمہ سرا غور سے سن

ناصر کے جرس دل کی صدا اتنی پر تاثیر ہے کہ جی چاہتا ہے کہ تمام کے تمام اشعار یہاں رقم کر دیئے جائیں اور یہ حقیقت ہے کہ ناصر کے کلام سے انتخاب کرنا انتہائی مشکل کام ہے' آفتاب احمد نے اس غزل کے بارے میں کہا ہے:

"اس غزل میں ناصر نے کائنات اور فطرت کے مظاہر سے اٹھنے والی نواہائے راز کی محرمی کی ہے"۔ ۲۲

سو ناصر کاظمی نے جو انتظار حسین کو بستر مرگ پہ یہ غزل سنائی تو اس کے سنانے کا مقصد ناصر کا حمد خداوندی کرنا تھا اور یہ بتانا مقصود تھا کہ انسان کی آنکھوں کے سامنے بظاہر جو منظر ہیں' وہ تمام کے تمام بامعنی ہیں' کائنات اور فطرت کی اپنی ایک آواز ہے' اگر انسان اس آواز کو سن نہیں پاتا تو اس کی زندگی بے معنی زندگی ہوتی ہے بامقصد اور خوب صورت زندگی کے لئے ضروری ہے کہ ہم سورہ رحمان کا ادراک کرتے ہوئے ناصر کی اس خوب صورت حمدیہ غزل کے اسرار و رموز کو سمجھیں' ناصر کاظمی نے اپنے اس دور میں ایک اور غزل کے مقطع میں زندگی کو ایک مختلف انداز سے دیکھنے کو یوں بیان کیا ہے:

ناصر یہ وفا نہیں جنوں ہے
اپنا بھی نہ خیر خواہ رہنا

۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۳ء کا دور ناصر کاظمی کی شاعری میں نئی مہکاروں کا زمانہ ہے' اس دور میں یاد' اداسی' تنہائی کی وہ شدت نہیں' جو اس سے پہلے تھی' البتہ چاند اور دھیان کے استعارے اس دور میں بھی اپنا رنگ باندھتے نظر آتے ہیں' اس دور میں بھی ناصر نے جو شاعری کی' اس میں سے اس کے کئی اشعار زباں زد عام ہوئے' خاص طور پر یہ اشعار تو ہر دل کی دھڑکن بن گئے:

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

دائم آباد رہے گی دنیا!
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا
شام سے سوچ رہا ہوں ناصر
چاند کس شہر میں اترا ہو گا

ناصر کاظمی کی شاعری میں "چاند" اور "دھیان" دو ایسے لفظ ہیں، جو بہت کثرت سے آئے ہیں اور ہر مرتبہ یہ لفظ اپنے معنی کے اعتبار سے نئے پیراہن میں دکھائی دیے۔ چاند سے ناصر کا عشق بہت جذباتی تھا، وہ چاند کو دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا تھا، اس نے نہ جانے کتنے سفر چاند کے ساتھ ساتھ کیے ہوں گے۔ چاند ہی ناصر کاظمی کے رت جگوں کا دم ساز تھا اور ہم راز بھی، اس کی چاندنی ناصر کے لہو میں سرایت کر چکی تھی۔ وہ ناصر کے محبوب کا مرتبہ حاصل کر چکا تھا، کبھی یہ اداس تو کبھی تنہا دکھائی دیتا۔ دونوں کیفیات کے الگ الگ معنی ناصر کی شاعری میں نمودار ہوتے ہیں، اسی طرح ناصر نے "دھیان" کے لفظ کو بھی اپنے اظہار کے وسیلے سے بہت عزیز رکھا، ناصر نے دھیان کو بھی اپنی شاعری میں مختلف موسموں کے حوالے سے باندھا۔ آیئے دیکھتے ہیں، اس دور میں ناصر کاظمی کی شاعری کی خوشبو کیسی ہے اور چاند اور دھیان کن معنوں میں اپنے ہونے کا پتہ دیتے ہیں، اس دور میں ناصر در میخانہ گل وا ہوتے دیکھتے ہیں، وہ اس دور میں بھی اپنی یادوں کے سائے سائے آگے بڑھتے ہیں، چاند، دھیان اور یاد کے حوالے سے یہ اشعار دیکھیے:

پھر کسی گل کا اشارہ پا کر
چاند نکلا سر میخانہ گل
آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانہ گل

اس دور میں ناصر کاظمی کی امنگوں کے چراغ روشن ہوتے دکھائی دیتے ہیں

اور ہجر و وصال کے موسم نیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء کے دور کی غزلوں میں ناصر کی غزل میں ایک پُراعتماد آواز سنائی دیتی ہے۔ ناصر کو اپنی شاعری کی مقبولیت اور اس نے جو غزل کو اعتبار بخشا اسے نئی زندگی عطا کی' اس کا احساس برتری اس کی اس پہلی غزل ہی میں نمایاں ہے' وہ کہتا ہے:

ہم نے آباد کیا ملک سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے

ناصر نے حقیقت میں غزل کی حویلی کو دوبارہ آباد کیا' اس حویلی کو آباد و شاد کرتے ہوئے ناصر کو یہ بھی احساس تھا:

اب وہ دریا' نہ وہ بستی' نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے
کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے

پھر بھی ناصر نے نئے تقاضوں سے رشتہ جوڑا' نئی زندگی کو اپنایا' ماضی سے بھی ناتہ قائم رکھا اور مستقبل کے امکانات کو بھی بشارت سمجھا' اس کی شاعری میں اب تازہ موسموں کی مہک یوں محسوس ہوتی ہے:

آئینہ لے کے صبا پھر آئی
بجھتی آنکھوں میں ضیا پھر آئی
تازہ رس لمحوں کی خوشبو لے کر
گل زمینوں کی ہوا پھر آئی

پھر ایک ایسا دور بھی آتا ہے کہ ناصر کاظمی کی شام سحر کا روپ دھار لیتی ہے' لیکن اس سحر کے ساتھ ساتھ اس کی اداسی اسی طرح تخلیقی عمل جاری رکھتی ہے اور ناصر نت نئے تخیلاتی موسموں کے کھوج میں لگا رہتا ہے' یہاں وہ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح سے کرتا ہے:

نت نئی سوچ میں لگے رہنا
ہمیں ہر حال میں غزل کہنا

شہر والوں سے چھپ کے پچھلی رات
چاند میں بیٹھ کر غزل کہنا
کیا خبر کب کوئی کرن پھوٹے
جاگنے والو جاگتے رہنا

ناصر کاظمی کے کلام میں جہاں اس کے ذاتی دکھوں کی کہانیاں ماضی کی زندگی کی یادیں' پرانی اور نئی بستیوں کی رونقیں' ایک بستی کے بچھڑنے کا غم اور دوسری بستی بسانے کی حسرت تعمیر ملتی ہے' وہاں وہ اپنے عہد اور اس میں زندگی بسر کرنے کے تقاضوں سے بھی غافل نہیں رہتے' ان کے کلام میں ان کا عہد بولتا ہوا دکھائی دیتا ہے' اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی گزرتی ہوئی زندگی کا بھی احساس ہوتا ہے:

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے سونا ہوئے رخسار بھی

عمر کے اس حصے میں ناصر کا شعور پختہ ہو چکا ہے' اسے فاختہ کی خاموشی پر بھی دل دکھانے والی حیرت ہوتی ہے' وہ زندگی کے رک جانے کو المیہ سمجھتا ہے' وہ خواب آشنائی کے ساتھ حقیقت آشنا بھی ہے' وہ صرف زندگی کے خواب ہی نہیں بنتا' بلکہ زندگی کو حقیقت کی آنکھ سے بھی دیکھتا ہے' وہ اجڑے ہوئے گھروں پر ماتم کرنے کا قائل نہیں' بلکہ نئی دنیا بسانے کی تحریک دیتا ہے' وہ ایک ایسا شاعر ہے' جس کے لہو میں اپنے دیس کی مٹی کی خوشبو سرایت کر گئی ہے' وہ اس گلشن کو ہرا بھرا اور پنپتے دیکھنا چاہتا ہے' یہ وہ زمانہ ہے' جب پاکستان کی سیاست میں سیاسی طوفان برپا تھے' بے یقینی کا دور دورہ تھا' ملک مارشل لا کے کنارے پر پہنچ چکا تھا' محلاتی سازشوں نے حکومت کو متزلزل کر کے رکھ دیا تھا' جمہوریت اور جمہوری قدریں دم توڑ رہی تھیں۔ ناصر کے سامنے یہ سب کچھ کھلی کتاب کی صورت تھا' وہ یہ تمام صورت حال دیکھ کر نہ صرف کڑھتا ہے' بلکہ اس کا احساس بھی یوں دلاتا ہے:

جو گھر اجڑ گئے ان کا نہ رنج کر پیارے
وہ چارہ کر کہ یہ گلشن اجاڑ سا نہ لگے

ویراں پڑا ہے میکدہ حسن خیال کا
یہ دور ہے بہائے نیر کے زوال کا

ناصر نے اس دور کی شاعری میں برگ ریز کے نام سے بھی کچھ متفرق اشعار کہے، جو فرد فرد ہوتے ہوئے بھی معنویت کے اعتبار سے بھرپور ہیں۔ ناصر کاظمی نے "برگ نے" کے آخر میں صحیح ہی تو کہا ہے:

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفل سخن میں
ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

یہ دعویٰ ایک ایسا ہی شاعر کر سکتا ہے، جس نے غزل کو نئی زندگی سے ہمکنار کیا اور اس دور میں غزل کا پرچم بلند کیا، جب نظم کا پرچم ہر جگہ لہرا رہا تھا۔ ناصر کی غزل نے برصغیر پاک و ہند میں غزل کی روایت کی تجدید کی اور قیام پاکستان کے بعد نئی شاعری کا ایک ایسا پودا لگایا، جو اب ایک مضبوط تن آور درخت ہے، غزل کا یہ ہرا بھرا درخت ماضی کی سرزمین میں جڑیں پیوست کئے ہوئے ہے اور حال اور مستقبل میں اپنی شاخوں کے بازوؤں کو لہراتے ہوئے آنے والے وقت کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔

○

(ب)

□☆::☆□

دیوان ::

"دیوان" کی شاعری ناصر کاظمی کی شاعری کی ارتقائی منزل ہے۔ "برگ نے" میں ناصر نے کھوئے ہوؤں کی جستجو کی، اداسی، تنہائی اور رت جگوں سے اپنی تخلیقی حویلی کو آباد کیا اور مستقبل کی امکانی روشنیوں سے اس کے در و بام کو سجایا اور پھر سے زندگی کے آثار پیدا کئے۔ ناصر ایک ایسا شاعر تھا، جس نے اپنے دیس سے بچھڑنے کے نوحے بھی لکھے اور نئی مٹی سے رشتہ استوار کر کے اسے سونا بنانے کی آرزو بھی کی۔ ناصر کاظمی نے کسی خاص مروجہ نظریے کے تحت شاعری نہیں کی، بلکہ اس نے اپنے دور کے ترقی پسندوں کے نظریے اور جدیدیت کے نظریوں کو جذب کر کے نئے طرز احساس کی بنیاد ڈالی۔ ناصر کاظمی کی نئی شاعری کا مزاج احساس تحیر سے عبارت تھا، اس نے انسانی اقدار کی توڑ پھوڑ کو بھی حیرت سے دیکھا اور نئی بستی بسانے کے خواب کو بھی حیرتی انداز میں پیش کیا۔ ناصر کاظمی کے نزدیک شاعری کسی مخصوص آئیڈیالوجی کا نام نہیں تھا، بلکہ اس کے نزدیک ایک مردہ لمحوں کو زندہ کرنے کا نام شاعری ہے، یہ لمحے چاہے تہذیبی ہوں یا ثقافتی، اداسی، تنہائی، رت جگوں اور یادوں کے لمحوں کو زندہ کرنے کا نام شاعری ہے اور یہی شاعری ناصر کاظمی کی نئی شاعری ہے، جو نہایت سادہ، آسان اور عام فہم ہے اور جس میں جذبے اور تخیل کی لہر کو ایک ساتھ محسوس کیا جا سکتا

ہے۔

حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

"نئی شاعری کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اقبالؒ کے خطابیہ، بلند آواز اور اجتماعی آہنگ سے منحرف ہو کر حرف زیر لبی کے دھیمے، داخلی اور سرگوشیانہ لہجے میں اپنا وجود منوا لیتی ہے، آہنگ اور لہجے کی یہ تبدیلی شاید اس لئے بھی ناگزیر ہو گئی تھی، کیونکہ اقبالؒ کے بعد کئی ترقی پسند اور غیر ترقی پسند شعرا سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، احسان دانش، جوش اور سیماب نے شاعری سے اس کا داخلی اور شخصی لب و لہجہ چھین کر اسے عوامی اور اجتماعی چیز بنا کر رکھ دیا تھا اور اس کی حیثیت محض منظوم خیال کی رہ گئی تھی"۔

آگے چل کر حامدی کاشمیری کہتے ہیں:

"شاعری کو شور آفرینی کے انداز سے پاک و صاف کرنے میں راشد، میراجی کے فوراً بعد جس شاعر نے غیر معمولی شائستگی، ضبط اور سلیقے سے کام لیا اور اسے داخلی، شستہ اور نرم و نازک لہجے سے ہم کنار کیا، وہ ناصر کاظمی ہیں"۔ ۲۳

حامدی کاشمیری کے نزدیک ناصر کاظمی کی شاعری سچے شاعر کی طرح نظریاتی میلانات سے بالاتر ہے، مگر احمد ندیم قاسمی نے اپنے میں مضمون ناصر کاظمی کو باقاعدہ ایک نظریاتی شاعر قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے:

"ناصر جب یہ کہتا ہے کہ اس کی اداسی منفی نہیں ہے، بلکہ اس اداسی سے خود آگاہی کے سوتے پھوٹتے ہیں تو ناصر کا معیار خود آگاہی مجرد نوعیت کا نہیں رہتا، ہمہ گیر اور ہمہ اثر حیثیت اختیار کر جاتا ہے، یہی خود آگاہی شاعر کو ایک خوش حال زندگی، ایک پر سکون معاشرے اور ایک شاداب تہذیب کے خواب دکھاتی ہے، یہی ناصر کاظمی کی آئیڈیالوجی ہے، اس نے یقیناً اسے آئیڈیالوجی کا نام نہیں دیا، مگر زندگی اور انسان اور اس کے مستقبل کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر کے سوا آئیڈیالوجی اور ہوتی کیا ہے"

احمد ندیم قاسمی کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناصر کاظمی کو نظریاتی شاعر مانتے ہیں اور پھر انہوں نے اپنے مضمون میں ان کی جس غزل کا حوالہ دیا ہے' وہ بھی احمد ندیم قاسمی کے موقف کی تائید کرتی ہے' مگر ناصر کاظمی جب خود اس قسم کی آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے تو پھر کوئی بھی انہیں کسی خاص نظریہ کا پابند کرنے میں حق بجانب نہیں ہے۔ ناصر کے نزدیک تو مردہ وقت کو زندہ کرنے کا نام شاعری ہے' یہ وقت کوئی تہذیب بھی ہو سکتی ہے' جذبات' احساسات بھی ہو سکتے ہیں' خواب بھی ہو سکتے ہیں' اداسی' تنہائی اور رت جگوں کے لمحے بھی ہو سکتے ہیں اور کوئی زمانہ بھی ہو سکتا ہے' سو ناصر نے تمام عمر ان مردہ لمحوں کو زندہ کیا' جو نظریہ ساز ادیبوں کے نزدیک اتنے اہم نہیں تھے' جتنے ناصر کاظمی کے نزدیک یہ لمحے انیس جاں تھے۔ اس کے نزدیک درخت' شہر' چاند' پھول' فطرت' رومانٹک چیزیں نہیں ہیں' بلکہ یہ ایک بڑی مہذب تہذیب ہے' جسے صدیوں میں انسان نے خون دے کر پالا ہے' اس کے استعارے اس کی زندہ علامتیں ہیں' یہی استعارے اور زندہ علامتیں "برگ نے" کے بعد دیوان میں اجاگر ہوتی ہیں۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

"انہیں تپتی دوپہروں اور لمبی راتوں کے سفر میں ہم نے مل جل کر اپنے آپ کو دریافت کیا اور نئی نسل کے ظہور کا اعلان کیا۔ پاکستان کی ادبی تاریخ میں یہ پہلا اعلان بغاوت تھا' اصل میں ہم باقی ادیبوں سے الگ ایک اور ہی سطح پر جی رہے تھے' اس سطح کو دیوانگی کی سطح کہہ لیجئے' مگر یہ دیوانگی پچھلے عہد کی دیوانگیوں سے الگ اپنا رنگ رکھتی تھی' ہر عہد اپنے دیوانے الگ لے کر آتا ہے"۔

ہمارے دور میں دیوانگی کے طور ہیں اور

ناصر کی دیوانگی نے اس آشوب کے بطن سے جنم لیا تھا' جس نے بہت بستیوں کو ویران کر دیا تھا اور بہت گھر والوں کو بے گھر و بے در بنا دیا تھا۔ ایک خلقت تھی کہ رنج ہجرت کھینچ رہی تھی اور کتنے خانہ برباد تھے کہ یادوں کے بجھے ہوئے سویرے آنکھوں میں چھپائے پھرتے تھے۔ ناصر کا

زندگی کرنے کا طور اور شعری رویہ دونوں کی معنویت اسی سیاق و سباق میں کھلتی ہے' آخر کوئی تو وجہ تھی کہ ناصر کی دیوانگی اور شاعری اس عہد کو لے اڑی تھی' جو دل زدہ نوجوان دیوانگی کا بار امانت اٹھانے کی ٹھانتا تھا' وہ اپنے خواب لے کر اس شب گزیدہ انجمن میں شامل ہو جاتا تھا اور جو نیا ذہن تخلیقی لگن سے آشنا ہوتا تھا' وہ اس کے ساتھ لگن لیتا تھا' پھر کسی نے منادی کرا دی کہ ایشیا کا سب سے بڑا مصور آیا ہے اور کافی ہاؤس میں بیٹھتا ہے' ہم باری باری اس کا درشن کرنے کافی ہاؤس گئے' وہ تجریدی اسلوب میں تصویر بناتا تھا اور شاکر علی اپنا نام بتاتا تھا' ہم میں سے کتنوں کو اسی تجریدی اسلوب نے لوٹ لیا اور ہماری نئی نسل ادیبوں اور مصوروں کی ملی جلی نسل بن گئی۔۔۔۲۵

انتظار حسین نے ناصر کے تخلیقی فن کا جو پس منظر بیان کیا ہے' اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ان ادیبوں اور مصوروں کے سوچنے کا انداز اپنے دور کے نظریہ سازوں اور نظریہ بازوں سے قطعی مختلف تھا' یہی وجہ تھی کہ یہ انداز دل رکھنے والوں کو تو بھایا' مگر ذہن سے کام لینے والوں نے اس کی مخالفت کی' آگے چل کر انتظار حسین لکھتے ہیں:

> "نئی نسل کے اعلان نے خاصی اتھل پتھل پیدا کی' حلقہ ارباب ذوق نے سزا دینے میں سب سے زیادہ عجلت دکھائی' بات یہ تھی کہ ناصر تو پہلے بھی فراق کے سوا باقی شاعروں کو واجبی واجبی ہی مانتا تھا' مگر اب اس نے فراق کے بارے میں بھی سوال اٹھا رکھا تھا کہ کون فراق' سو باقی کس گنتی میں تھے۔ حلقہ میں بیٹھے ہوئے سینئر شاعروں نے غیظ میں آ کر ناصر کو اور اس کے ساتھ مجھے' نیز مظفر علی سید کو نکال باہر کیا۔ شہرت بخاری نے قیوم نظر سے ہمارے لئے بہت رحم کی اپیلیں کیں' مگر ایک پیش نہ گئی' ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کی سیاست بھی حلقہ میں در آئی تھی کہ حلقہ کے کچھ لوگ اہل مدرسہ میں شامل ہو گئے' سو انہیں دنوں پروفیسر سید وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی حلقے سے نکالے گئے"۔۔۔۲۶

انتظار حسین کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ نئی نسل کے اعلان نے خود ان کے اپنے حلقہ احباب کے علاوہ ہر نقطہ نظر کے حامل ادبی گروہوں کو پریشان کیا' اس دور میں ناصر کے یہاں خود اعتمادی کا پیدا ہونا ایک فطری بات تھی' ناصر کو احساس تھا کہ اس نے غزل کو جذبہ اور تخیل کا جو نیا پیراہن دیا ہے' غزل اس دور میں اس سے محروم تھی۔ ترقی پسند جو غزلیں کہہ رہے تھے' ان میں انسانی قدروں کی شکست و ریخت تو تھی' مگر جذبہ اور تخیل کا فقدان تھا' یہی وجہ تھی کہ فیض کی وہ شاعری لوگوں کے دل دھڑکانے کا سبب بنی' جہاں یہ دونوں اوصاف کار فرما تھے' خاص طور پر یہ غزل :

گلوں میں رنگ بھرے باد نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

احمد ندیم قاسمی کے یہاں بھی جذبہ اور تخیل کی جگہ محض انسانی قدروں کی توڑ پھوڑ سے پیدا ہونے والے رویوں کا اظہار تھا۔ انسانی اقدار کی تفہیم اور قدر و منزلت کے جذبوں کے فروغ کے وہ بلاشبہ بہت بڑے شاعر ہیں' جب کہ منیر نیازی کی ایمجری بقول ناصر کاظمی ایسی ہے کہ اسے در و دیوار' خالی دروازوں اور کھڑکیوں سے بھی ہم کلام ہونے کا ہنر آتا ہے' منیر نیازی کی ایمجری میں بھی ناصر کی طرح حیرتوں کا ایک جہان آباد ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان نے اپنے مضمون میں لکھا ہے :

"ناصر کی شاعری پر لکھے گئے نئے مضامین زیادہ تر ناصر کاظمی کی شاعری میں سے اپنی پسند کا ناصر کاظمی تلاش کرنے کی کوشش ہیں۔ وزیر آغا' جیلانی کامران' سجاد باقر رضوی' احمد ندیم قاسمی اور بہت سے دوسرے اصحاب کی طویل اور مختصر تنقیدی تحریروں میں یہی رجحان کار فرما نظر آتا ہے' جہاں ناصر کے پرانے نقادوں کے مداح اس حقیقت کو فراموش کرتے رہے کہ اچھا شاعر تمام عمر ایک ہی مقام پر نہیں ٹھہرا رہتا' وہاں نئے نقاد اس بات کو ماننے سے گریزاں نظر آتے ہیں کہ ناصر کاظمی کے ذہن کی ساخت ان کے ذہن سے علیحدہ تھی' ان مضامین میں ناصر کاظمی کو کسی طرح اپنے فکری دائرے

میں لے آنے کی بے تابی یوں چھلکتی ہے، جیسے کوئی چھت پر کھڑا کبوتر کو گھیر کر اپنی چھت پر بٹھانے کی کوشش میں مصروف ہو"۔۔۔ ۲۷

ڈاکٹر سہیل احمد خان نے یہاں ناصر کے بارے میں پیدا ہونے والی بحثوں کو صرف ایک فقرے میں یوں سمو دیا ہے کہ مختلف نظریات کے حامل ناقدوں نے ناصر کو اپنے اپنے فکری دائرے میں لانے کی اس طرح سے کوشش کی، جیسے کوئی چھت پر کھڑا کسی کبوتر کو گھیر کر اپنی چھت پر بٹھانے کی کوشش کرے، لیکن ناصر کاظمی شاعری کا ایک ایسا کبوتر تھا، جسے صرف اپنی منفرد چھت ہی عزیز تھی، اس کے تخیل کی پرواز کبوتروں کی سی تھی اور اس کا جذبہ بھی کبوتروں کا سا تھا، جنھوں نے کربلا والوں کی یاد کو اپنے لہو میں ڈوبے ہوئے پروں سے لوگوں کے دلوں میں آباد کر دیا۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان نے کہا ہے کہ اچھا شاعر ایک مقام پر ٹھہرا نہیں ہوتا، سو یہی دلیل ناصر کاظمی پر بھی صادق آتی ہے، اس نے "برگ نے" کی شاعری کے بعد "دیوان، پہلی بارش، نشاط خواب اور منظوم ڈرامہ، سر کی چھایا" کی وساطت سے تحیر کے نئے در وا کئے۔ "دیوان" کی شاعری گو نئی نسل کے جذبوں کی آواز تھی، مگر اس شاعری میں ترقی پسندوں کو اپنی آواز بھی سنائی دی۔ انتظار حسین کہتے ہیں:

"بعض ترقی پسندوں کو ناصر کے گزر جانے کے بعد یہ پتا چلا ہے کہ ناصر تو عوام کے دکھ درد سے بھی آشنا تھا۔ "دیوان" کی جن غزلوں نے ان سادہ دل ترقی پسندوں کو ورطہ حیرت میں غرق کر رکھا ہے، وہ ان یاروں کے لئے حیرت انگیز نہیں ہو سکتیں، جنھوں نے گرم و سرد راتوں میں ناصر کو خاک نشینوں اور گدڑی پوشوں سے گھلتے ملتے دیکھا ہے، یہ گھلنا ملنا کسی نظریے کے واسطے سے نہیں تھا اور نظریے کے واسطے سے گھلنے ملنے کی منزل تو کم ہی کم آتی ہے اور دور ہی دور سے اظہار محبت ہوتا ہے، درمیانی فاصلہ طے نہیں ہوتا، درمیان میں یہ سوال آ جاتا ہے کہ اپنے آپ کو ڈی کلاس کیسے کریں۔ ناصر کا محور ہم نے دیکھا کہ ایک سطح پر وہ طبقہ اشراف کی خوبو رکھتا تھا، زندگی کیسی بھی گزرتی ہو، مگر دماغ ویسے ہی تھا اور ٹھسا وہی تھا، مگر دوسری سطح پر اس نے اپنے آپ کو بلا تکلف یعنی ڈی کلاس کر لیا تھا"۔ ۲۸

ناصر کاظمی کے دوسرے شعری مجموعے "دیوان" کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں' مرا دیوان رہے گا

دیوان کی شاعری ۱۹۵۳ء کے بعد کی شاعری ہے اور اسے ناصر کاظمی نے خود مرتب کیا تھا۔ "دیوان" ناصر کاظمی کے بیٹوں نے نہیں بستر مرگ پر خود ناصر نے مرتب کیا تھا۔ دیوان کی غزلوں میں ناصر کے فن کی ارتقائی منزل صاف دکھائی دیتی ہے' یہ وہ غزلیں ہیں' جو دلوں کو گرماتی بھی ہیں اور فضا میں گنگناتی ہوئی بھی محسوس ہوتی ہیں۔ غنائیت ان غزلوں کا ایک خاص وصف ہے' یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بیشتر کو پاک و ہند کے معروف گلوکاروں نے گایا بھی ہے۔

ناصر کاظمی کے "دیوان" کی پہلی غزل میں ناصر کے یہاں سوچ کی جو تبدیلی دکھائی دیتی ہے' اس کے لئے یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

پہلے تو ناصر کا یہ رویہ تھا کہ بقول میر

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

سو میر اور ناصر کے مزاج میں فرق یہیں سے محسوس کیا جا سکتا ہے' اس کے ساتھ ساتھ ناصر کی دیوانگی میں کچھ فرق محسوس نہیں ہوتا' بلکہ دیوانگی میں کچھ غالب کی سی جھلک محسوس ہوتی ہے' ناصر کہتے ہیں:

دیوانگی شوق کو یہ دھن ہے ان دنوں
گھر بھی ہو اور بے در و دیوار سا بھی ہو

اور غالب نے یوں کہا تھا:

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

سو یہاں ناصر کی دیوانگی اور غالب کی دیوانگی میں مماثلت محسوس ہوتی ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ناصر اپنی منفرد آواز کے حوالے سے یوں بھی کہتے ہیں:

فرصت میں سن شگفتگیِ غنچہ کی صدا
یہ وہ سخن نہیں جو کسی نے کہا بھی ہو

اس غزل کے مقطع میں ناصر کی شاعری کا مخصوص رنگ کھل کر نمایاں ہوتا ہے:

بزمِ سخن بھی ہو سخنِ گرم کے لئے
طاؤس بولتا ہو تو جنگل ہرا بھی ہو

یہ شعر ناصر کے مزاج کی بھرپور عکاسی کرتا ہے' ناصر جس طرح کی محفلیں سجایا کرتے تھے اور جس طرح کی حیرت انگیز باتیں کرتے تھے اور سننے والے ہمہ تن گوش ہوتے تھے' یہاں ناصر نے اس کیفیت کو طاؤس کے بولنے سے تشبیہ دی ہے' ناصر کی گفتگو میں ایک خاص سحر ہوتا اور جو کوئی بھی ان کی گفتگو سنتا وہ پھر اس سحر ہی میں کھو جاتا۔

دیوان کی دوسری غزل ناصر کی ایک اور مقبول غزل ہے' اس غزل میں ناصر کی یادوں کی پرچھائیاں بڑھتی اور مدھم ہوتی دکھائی دیتی ہیں اور اس غزل کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ناصر کی خواب آشنائی حقیقت آشنائی کی طرف سفر کرتی جا رہی ہے:

نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں
تو بھی دل سے اتر نہ جائے کہیں
نہ ملا کر اداس لوگوں سے
حسن تیرا بکھر نہ جائے کہیں

تیسری غزل میں ناصر کاظمی اپنی شاعری کی کیاریوں کو ہرا بھرا دیکھتے ہوئے یوں کہتے ہیں:

سینچی ہیں دل کے خون سے میں نے کیاریاں
کس کی مجال میرا چمن مجھ سے چھین لے

اور چوتھی غزل میں ناصر کاظمی نے "یادیں" کو پھر تخلیقی زندگی عطا کی' ناصر

کاظمی کے یہاں "یادیں" زندہ استعاروں کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں' اس غزل میں ناصر کی شاعری کی خوشبو ساون رت کے ساتھ یوں نمودار ہوتی ہے۔

پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے
پھر کونجیں بولیں گھاس کے ہرے سمندر میں
رت آئی پیلے پھولوں کی تم یاد آئے

ساون' پتے' کونجیں' گھاس' پیلے پھول ناصر کاظمی کی شاعری میں تہذیبی استعارے ہیں۔ ناصر کاظمی نے سرسوں کے پھول کو اپنا ہم عصر کہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ یہ پھول ہماری پوری تہذیب کی علامت ہے' سو ناصر کی شاعری میں یہ تہذیبی مہکاریں بار بار نمودار ہوتی ہیں اور ہمارے دل و دماغ کو مہکاتی ہیں' ایسے اشعار میں جذبے کتنے سچے دکھائی دیتے ہیں' ناصر نے اپنی پانچویں غزل میں اداسی کی کیفیت کو اس قدر پر تاثیر بنا دیا ہے کہ دل کی اداسی آفاقیت کی صورت اختیار کر لی ہے' یہ اداسی جسے ناصر نے تخلیقی علامت قرار دیا تھا' اس غزل کے مطلع ہی میں بے کلی کے ساتھ ساتھ جینے کی تمنا کی طرف اشارا کرتی ہے:

مسلسل بے کلی دل کو رہی ہے
مگر جینے کی صورت تو رہی ہے

ہرے بھرے اور اشجار سے گرتے ہوئے پتوں کو دیکھنا ناصر کی زندگی کا معمول تھا' یہاں بہار کے موسم میں ناصر نے دکھوں کا جو رنگ محسوس کیا ہے' اسے اداسی کے حوالے سے اس طرح پیش کیا ہے:

نہ سمجھو تم اسے شور بہاراں
خزاں پتوں میں چھپ کر رو رہی ہے

اور یہ شعر تو حاصل غزل بھی ہے اور اداسی کا ایک خوبصورت استعارہ بھی ہے:

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

اداسی کے حوالے سے نہ صرف یہ ناصر کا خوبصورت ترین اور یادگار شعر ہے، بلکہ اس طرح کی کیفیت نہ تو کلاسیکی شعرا اور نہ ہی ناصر کے ہم عصر شعرا کے یہاں ملتی ہے:

ناصر کاظمی کے یہاں کپڑے بدل کر نکلنا اور بال بنانا زندگی کرنے کا ایک خوش گوار ڈھنگ ہے، وہ اپنی عام زندگی میں بھی جب کسی کو خوش و خرم دیکھتے تو یہی کہتے کہ "بھئی آج وہ خوب بال بنا کر آیا ہوا تھا" یا وہ کہتے کہ اس نے تو آج خوب نئے کپڑے پہن رکھے تھے، سو ناصر کا یہی انداز ان کی شاعری میں بھی اسی سادگی کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، ناصر کاظمی کا زمانہ آج کے زمانے کے مقابلے میں بہت سادہ تھا اور اس سادہ دور میں کسی سے ملنے کے لئے بار بار آئینہ دیکھنا، بال بنانا اور نئے کپڑے پہننا ایک خاص رومانوی انداز تھا اور اس رومانوی انداز کی عکاسی ناصر نے اس غزل کے مقطع میں یوں کی ہے:

کپڑے بدل کر بال بنا کر کہاں چلے ہو کس کے لئے
رات بہت کالی ہے ناصر گھر میں رہے تو بہتر ہے

آگے چل کر اسی انداز کو ناصر ایک اور کیفیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لئے

شمس الرحمن فاروقی نے ناصر کے جن شعروں کے بارے میں یہ کہا ہے کہ

"یہ ناصر کے بہترین شعر نہیں ہیں"۔ لیکن یہ شعر ایسے ہیں کہ ہمارے زمانے میں کسی سے بھی ایسے بن نہیں سکتے، ان کو پڑھ کر ہنسی نہیں آتی، جب کہ عام طور پر اس طرح کی شاعری پڑھ کر شاعر کی عقل پر رونا اور اپنے اوپر ہنسی آتی ہے"۔ ۲۹ـ

ان میں سے یہ شعر ایک ہے، یہاں شمس الرحمن فاروقی نے متضاد باتیں کی ہیں، ایک تو یہ صاف صاف کہہ دیا ہے کہ یہ اشعار ناصر کاظمی کے بہترین شعر نہیں ہیں، دوسرے یہ کہ اس طرح کے شعر کس سے بھی ایسے بن نہیں سکتے تھے، تیسرے یہ کہ ایسے اشعار پڑھ کر شاعر کی عقل پر رونا اور اپنے اوپر ہنسی آتی ہے۔ شمس الرحمن

فاروقی نے یہ تینوں باتیں عجیب کی ہیں' پہلے تو وہ اشعار دیکھئے' جن کے بارے میں انہوں نے یہ رائے دی ہے:

بلاؤں گا نہ ملوں گا نہ خط لکھوں گا تجھے
تری خوشی کے لئے خود کو یہ سزا دوں گا

ہچکی تھمتی ہی نہیں ناصر
آج کسی نے یاد کیا ہے

شمس الرحمان فاروقی نے ناصر کی جن غزلوں کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے' ان میں سے ایک غزل "نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں" تو پاک و ہند میں بے حد مقبول ہوئی' دوسرے انہوں نے خود ہی اقرار بھی کیا ہے کہ ایسی شاعری ہر کوئی نہیں کر سکتا' یہ بات اپنی جگہ درست ہے' لیکن پھر اس کے ساتھ ہی یہ کہنا کہ اس طرح کی شاعری پڑھ کر شاعر کی عقل پر رونا اور اپنے اوپر ہنسی آتی ہے۔ فاروقی صاحب کی اس عجیب و غریب رائے کی تردید خود یہی غزل اپنی مقبولیت کے جھنڈے گاڑ کر کر رہی ہے' جہاں تک باقی اشعار کا تعلق ہے' وہ بھی نئی نسل کے رومانوی رویوں کا خوب صورت اظہار ہیں۔

"دیوان" کی ساتویں غزل اس اعتبار سے اہم ہے کہ ناصر نے اس غزل میں جہاں بھولی بسری کہانیوں کو زندگی دی ہے' وہاں غالب کی طرح حیرتوں کے کئی در بھی وا کئے ہیں۔ غالب نے استفسار کیا تھا۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اور ناصر اسی طرح ان حیرانیوں کے بارے میں پوچھتے ہیں:

اندھیری شام کے پردوں میں چھپ کر
کسے روتی ہے چشموں کی روانی
کرن پریاں اترتی ہیں کہاں سے
کہاں جاتے ہیں رستے کہکشانی

ناصر کو ان سوالوں کے جواب معلوم ہیں اور وہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی یہی سمجھانا چاہتے ہیں' ان تمام حیرت کدوں کے پیچھے کوئی ہے' جو یہ تمام خوب صورتیاں تخلیق کر رہا ہے' مقطع میں ناصر نے نئی روشنی کو ہنگاموں سے تعبیر کیا ہے اور ان ہنگاموں میں پرانی قدروں کو دبتے دیکھ کر ناصر نے اپنے دکھ کا اظہار یوں کیا ہے :

نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی

ناصر کاظمی کے "دیوان" کی آٹھویں غزل اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ یہی وہ غزل ہے' جس کے سبب ترقی پسندوں نے "دیوان" کی شاعری میں ترقی پسندی دریافت کی اور اس غزل کے حوالے سے مشہور ترقی پسند شاعر احمد ندیم قاسمی کو ناصر کی آئیڈیالوجی دریافت کرنا پڑی' گو اس غزل میں ناصر کاظمی نے استحصالی طبقے کے عطا کردہ دکھوں کا اظہار بڑے موثر طریقے سے کیا ہے' مگر "صبر کر صبر کر" کی ردیف کے ساتھ استحصالی طبقے کے خلاف اس غصہ اور تلخ لہجے کا اظہار نہیں کیا' جو ترقی پسندوں کا شیوہ خاص ہے' بلکہ انہوں نے دھیمے لہجے میں صبر و استقامت کی تلقین کی ہے۔ ناصر کا یہی دھیمہ پن انہیں ترقی پسندوں کے نظریے سے جدا کرتا ہے' اس غزل کے چند اشعار دیکھئے' جسے احمد ندیم قاسمی نے بھی بہت سراہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں کہ "ناصر سے اس قسم کے اشعار اس کی منفرد آئیڈیالوجی ہی کہلواتی ہے :

رہ نورد بیابان غم ' صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے بہم ' صبر کر صبر کر
تیری فریاد گونجے گی دھرتی سے آکاش تک
کوئی دن اور سہہ لے ستم ' صبر کر صبر کر
تیرے قدموں سے جاگیں گے اجڑے دلوں پر ختن
پا شکستہ غزال حرم ' صبر کر صبر کر
شہر اجڑے تو کیا ' ہے کشادہ زمین خدا
اک نیا گھر بنائیں گے ہم صبر کر صبر کر
یہ محلات شاہی تباہی کے ہیں منتظر

گرنے والے ہیں ان کے علم صبر کر صبر کر
دف بجائیں گے برگ و شجر صف بہ صف ہر طرف
خشک مٹی سے پھوٹے گا نم صبر کر صبر کر
لہلہائیں گی پھر کھیتیاں کارواں کارواں
کھل کے برسے گا ابر کرم، صبر کر صبر کر

یہ غزل ناصر کی بہترین غزلوں میں سے ایک ہے۔ مستقبل میں جن تہذیبی قدروں کے احیا کی بازگشت روشن خواب کی صورت میں دکھائی دیتی ہے، اسے انہوں نے جذبہ اور تخیل کے ساتھ نہایت خوب صورت انداز میں بیان کر دیا ہے۔

نویں غزل میں وہ اشعار بھی شامل ہیں، جنہیں شمس الرحمان فاروقی ناپسند کر چکے ہیں اور ان کے حوالے سے گفتگو بھی ہو چکی ہے، شمس الرحمان فاروقی کو جو شعر پسند نہیں آیا، اس میں رقابت کے رویے کو ناصر نے ایک نئے انداز سے سوچا ہے:

میرے چومے ہوئے ہاتھوں سے
اوروں کو خط لکھا ہو گا

دسویں غزل میں ناصر نے اس تہذیب کو یاد کیا ہے، جو اب خواب بن کر رہ گئی ہے۔ ناصر اس غزل میں مردہ لمحوں کو زندگی سے ہمکنار کرتے دکھائی دیتے ہیں:

گل نہیں مے نہیں پیالہ نہیں
کوئی بھی یادگار رفتہ نہیں
ہوش کی تلخیاں مٹیں کیسے
جتنی پیتا ہوں اتنا نشہ نہیں

نئے موسموں میں اب پہلے کے سے موسم کہاں اب تو مے میں بھی وہ تاثیر باقی نہیں رہی کہ جتنی پی جاتی ہے، اتنا نشہ نہیں ہوتا۔ پرانی اقدار کے مٹنے کی ایک تصویر اس غزل میں نظر آتی ہے۔

گیارہویں غزل بھی ناصر کاظمی کی مشہور غزل ہے، اس میں جہاں دل کی باتیں ہیں، وہاں آگہی کی گفتگو بھی ہے، شہروں کی سہمی ہوئی فضا، ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں، خاموشی آواز نما، کوئل کی صدا، چڑیوں کی آواز نامونوس اداس نوا۔ ڈوبتے

ہوئے تاروں کی ندا' بدلتی رت کی ہوا' مہمان سرا' آواز درا' خلق خدا' اتنی بہت سی شعری علامتیں اور استعارے اس غزل میں روشن ہوئے ہیں کہ یہ تمام کی تمام غزل جگمگا اٹھی ہے۔

ناصر جہاں درد آشنا اور خواب آشنا تھے' وہاں عہد آشنا بھی تھے' اس لئے جہاں انہوں نے یہ کہا کہ

یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشی آواز نما کچھ کہتی ہے
سب اپنے گھروں میں لمبی تان کے سوتے ہیں
اور دور کہیں کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے
جب صبح کو چڑیاں باری باری بولتی ہیں
کوئی نامونوس اداس نوا کچھ کہتی ہے

اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے عہد آشنائی کے حوالے سے وقت کی آواز کو یوں اپنی اس غزل میں بیان کیا ہے:

بیدار رہو' بیدار رہو' بیدار رہو
اے ہم سفرو آواز درا کچھ کہتی ہے
ناصر آشوب زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے جب خلق خدا کچھ کہتی ہے

آخری شعر مقطع میں ناصر نے زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو کے محاورے کو نئے انداز سے بیان کیا ہے۔

"دیوان" کی بارہویں غزل میں ناصر نے چھوٹی بحر میں اپنی تنہائی کو تخلیقی رنگ دیا:

او پچھلی رت کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں
تیری گلی میں سارا دن
دکھ کے کنکر چنتا ہوں

ناصر کاظمی ہجر و وصال کے موسموں کو اپنی شاعری میں مختلف انداز میں پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہیں' وہ ماضی کو بھی نہیں بھولتے' حال پر بھی ان کی نظر ہے اور مستقبل کو بھی خواب کی صورت میں دیکھ رہے ہیں' ان تینوں زمانوں سے ناصر کا رشتہ بہت گہرا ہے:

ایک سمے ترا پھول سا نازک ہاتھ تھا میرے شانوں پر
ایک یہ وقت کہ میں تنہا اور دکھ کے کانٹوں کا جنگل
یاد ہے اب تک تجھ سے بچھڑنے کی وہ اندھیری شام مجھے
تو خاموش کھڑا تھا لیکن باتیں کرتا تھا کاجل
میں تو ایک نئی دنیا کی دھن میں بھٹکتا پھرتا ہوں
میری تجھ سے کیسے نبھے گی ایک ہیں تیرے فکر و عمل

اس وقت ہمیں کاجل کے شعر کے حوالے سے اس شعر سے ملتا جلتا سید عابد علی عابد کا یہ شعر یاد آ رہا ہے:

وقت رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

مگر ناصر کے یہاں شعر کی انفرادیت اپنی جگہ قائم ہے۔

اگلی غزل میں ہجر کی کیفیت کو ناصر نے ایک اور انداز سے بیان کیا ہے اور انہوں نے میر کی طرح رونے کو توہین وفا قرار دیا ہے:

دل کا یہ حال ہوا تیرے بعد
جیسے ویران سرا ہوتی ہے
رونا آتا ہے ہمیں بھی لیکن
اس میں توہین وفا ہوتی ہے

رت جگے ناصر کی زندگی تھے اور وہ ایک رت جگے کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

رات کتنی گزر گئی لیکن
اتنی ہمت نہیں کہ گھر جائیں

دیوان کی غزلوں میں بھی رات، چاند، دھیان، گلی، شہر نئے معنی کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں۔ "دیوان" کی غزلوں میں ناصر کے یہاں زندگی نئی معنویت کے ساتھ رنگ دکھاتی ہے، امنگ، امید، آرزو اور جستجو اس دور کی شاعری میں نمایاں ہے، لیکن اس دور میں بھی یاد کے بے نشاں جزیروں سے ناصر کے محبوب کی آواز سنائی دیتی ہے، یہ غزل بھی ناصر کی زندگی کی بہترین غزلوں میں شمار ہوتی ہے اور گائیکوں نے اسے بھی دل سے گایا ہے:

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی
یاد کے بے نشاں جزیروں میں
تیری آواز آ رہی ہے ابھی
تم تو یارو ابھی سے اٹھ بیٹھے
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

ناصر نے ہمیشہ امید سے اور اچھے دنوں سے اپنا ناتہ جوڑے رکھا، مگر افسوس کہ یہ روشن دنوں کے خواب دیکھنے والا اور سب کو حیران کرنے والا شاعر اپنی زندگی کے آخری دنوں میں خود تو اس خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکا، لیکن آنے والی نسل کے لئے سکھ کی فصل بو گیا۔

ناصر کاظمی کو انبالہ کی طرح شہر لاہور سے بھی ہمیشہ انس رہا، انہوں نے اس شہر کے سناٹوں سے دوستی کی۔ درختوں اور چڑیوں سے محبت کی، اس کی سڑکیں اور اس کی گلیاں ان کی زندگی کی یادیں بنیں، جب ناصر نے اس شہر کے روشن ستاروں کو ٹوٹتے دیکھا تو وہ خود بھی ٹوٹ کر رہ گیا:

وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا
اگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی
میٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے

ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی
بازار بند راستے سنسان بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی
گلیوں میں اب تو شام سے پھرتے ہیں پہرہ دار
ہے کوئی کوئی شمع سو وہ بھی بجھی بجھی

ناصر کاظمی کی یہ غزل ایک طرح سے لاہور کی تہذیبی زندگی کے اجڑنے کا نوحہ ہے' یہ وہ دور تھا' جب لاہور کی ٹھنڈی سڑک مال روڈ سے اشجار کو قتل کیا جا رہا تھا۔ ناصر کو درختوں سے بہت محبت تھی' اس نے درختوں کے قتل کو بہت محسوس کیا' یہی حال انتظار حسین کا بھی تھا' انہوں نے بھی درختوں کے کاٹنے پر کئی کالم لکھے۔ ناصر ایک مجلسی آدمی تھے' شام کو لاہور کے کسی نہ کسی ریستوران میں ان کی محفل گرم ہوتی یا پھر کسی سبزہ زار میں بیٹھتے' پھر آہستہ آہستہ کچھ صورتیں دوسرے دیس سدھار گئیں' جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں اور کچھ دوست اپنے اپنے روزگار کے چکروں میں پڑ کر لاہور سے رخصت ہو گئے' ان محفلوں کے برہم ہونے کے اثرات ناصر کی حساس طبیعت پر بھی پڑے' سو یہ غزل اسی احساس کی آواز ہے' اگلی غزل میں یہ احساس مزید شدت اختیار کر جاتا ہے اور ناصر اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

دوست بچھڑے ہیں کئی بار مگر
یہ نیا داغ کھلا ہے اب کے
پتیاں روتی ہیں سر پیٹتی ہیں
قتل گل عام رہا ہے اب کے

راتوں کا جاگنا ناصر کی زندگی کا دستور رہا' وہ اسے دولت بیدار کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصر
تم نے یہ دولت بیدار کہاں سے پائی

دم مہتاب فشاں سے ناصر

آج تو رات جگا دی ہم نے

ناصر کبھی تو رونے کو آئین وفا کے منافی قرار دیتے ہیں اور کبھی آئین وفا سے خود بے وفائی کے مرتکب بھی ہوتے ہیں' اس تضاد کو ان کی غزل کے اس شعر میں دیکھیے:

اس قدر رویا ہوں تیری یاد میں
آئینے آنکھوں کے دھندلے ہو گئے

دیوان کی بائیسویں غزل ناصر کاظمی کی زندگی کی یادگار غزل ہے۔ ناصر نے اس غزل میں اپنے عہد کے آشوب درد کو اہل درد کے المیہ کے ساتھ بیان کیا ہے' یہاں ناصر کاظمی کا غم اس عہد کا غم اور اس عہد کا دکھ ناصر کا دکھ محسوس ہوتا ہے' وہ زمانے کی بے حسی اور بے قدری کو نہایت موثر انداز میں بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اپنی شعری سلطنت ہی کو اپنے لئے سب سے بڑی معراج قرار دیتے ہیں۔

ترا یہ کمال ہے ظاہری تیرا ہر خیال ہے سرسری
کوئی دل کی بات کروں تو کیا ترے دل میں آگ تو ہے نہیں
میں ہوں ایک شاعر بے نوا مجھے کون چاہے گا مرے سوا
میں امیر شام و عجم نہیں میں کبیر کوفہ و رے نہیں
یہی شعر ہیں مری سلطنت اسی فن میں ہے مجھے عافیت
مرے کاسہ شب و روز میں ترے کام کی کوئی شے نہیں

ڈاکٹر سہیل احمد خان لکھتے ہیں:

"ناصر کے ذہن کی ساخت میں حکایاتی اور اساطیری عناصر کو خاص مقام حاصل ہے' ہر شاعر اپنے تجربوں اور اپنے دکھ سکھ کے اظہار کے لئے بعض وضعیں بناتا ہے' انہیں وضعوں سے اس کی شاعری کی مجموعی شکل بنتی ہے۔ ناصر نے حکایاتی اور داستانی وضعوں کو اپنے تجربے سے ہم آہنگ جانا ہے اور اس طرح اپنے تجربے کو اجتماعی تخیل کے تناظر میں لا کر دیکھا ہے"۔۔۔۳۰

ناصر کاظمی کی غزل میں حکایاتی عناصر اور داستانی وضعیں مختلف انداز میں

آشوب ذات اور اجتماعی کرب کو بیان کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ناصر کی مندرجہ بالا غزل میں ان پرچھائیوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

منیر نیازی نے ناصر کاظمی کے اس دوسرے شعری مجموعے کے بارے میں کہا ہے

"برگ نے" میں تازہ جدائی کی کیفیت ہے کہ جس میں مراجعت' دوبارہ وصال کے امکانات اور کھو کر پھر پالینے کی امیدیں ہیں' پر "دیوان" میں "برگ نے" کے ہلکے ہلکے سروں کی موجودگی کے ساتھ ملال کا رنگ زیادہ گہرا اور دعا کا انداز زیادہ واضح اور نمایاں ہو گیا ہے' اس سے اس کے کلام اور فکر کی پختگی ہی کہا جا سکتا ہے' مگر مضمون وہی آغاز عشق والے رہے ہیں۔ سطحی ذہن کے سیاست دانوں کی بدولت اس ملک کا جو حشر ہوا اور اس کے شہروں میں جس قسم کا منتظم ذہن پیدا ہوا' اس غیر حساس اور غیر رفیق ذہن کے سامنے شاعر کا جواب وہ ہونا ہولناک عذاب تھا کہ جس کا اثر ناصر کی سوچ اور اس کے اظہار پر پڑا' سو دشمن معاشرے سے مفاہمت کے خیال' انا کے مجروح ہونے کا کبر' جو کہ ابتدائی شاعری میں نہیں تھا' دیوان میں ہے" برگ نے" والے بنیادی احساس پر اس اضافے کا مضمون "دیوان" میں سو رنگوں سے باندھا گیا ہے"۔۔۔۳۱

منیر نیازی نے بھی دیوان کی شاعری کو ناصر کاظمی کی شاعری کی ارتقائی منزل اور ناصر کے کلام کو فکر کی پختگی قرار دیا ہے۔ ناصر نے اس پر آشوب دور میں جس طرح زندگی بسر کی' اس کے کھٹے میٹھے ذائقے ان کی ان غزلوں میں محسوس کئے جا سکتے ہیں' ابھی ہم نے دیوان ناصر سے ابتدائی بائیس غزلوں کا تذکرہ کیا ہے' آیئے اب دیکھتے ہیں کہ ناصر کی باقی غزلوں میں سے ایسی کون سی غزلیں تھیں' جن سے ناصر کی غزل کی گونج دور دور تک پھیل گئی' ان غزلوں کے کچھ اشعار دیکھئے۔

چلتا پھرتا ہوں میں دوپہروں کو
جانے کیا چیز کھو گئی ہے مری

ناصر سے کہے کون کہ اللہ کے بندے
باقی ہے ابھی رات ذرا آنکھ جھپک لے

بجھی بجھی سی ہے کیوں چاند کی ضیا ناصر
کہاں چلی ہے یہ کاسہ اٹھائے شام فراق

اس غزل کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے:

"شام فراق سے فراق گورکھپوری کی وہ طویل غزل یاد آ سکتی ہے، جس کی ردیف فراق ہے، اس کے علاوہ فراق صاحب کی ایک آدھ لفظی خصوصیت مثلاً کسی شے کا جھلملانا اور بجھا بجھا سا ہونا بھی اس نفوذ کی جانب اشارہ کرتا ہے، جو "برگ نے" کی کئی ایک غزلوں میں زیادہ بین طور پر موجود ہے، مگر شام فراق والی غزل میں جو ناصر کے پختہ اور منفرد دور کا کلام ہے، یہ نفوذ بھی نمو کے مراحل سے گزرتا ہوا نظر آتا ہے"۔۳۲

سو اس غزل کے حوالے سے فراق صاحب کا نام ذہن میں آنا اصل میں اس کی ردیف کا قصور ہے، وگرنہ یہ غزل بھی بقول شمس الرحمٰن فاروقی ناصر کی شاعری کی قوت نمو کی نمائندہ ہے۔

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لئے

مرتا نہیں اب کوئی کسی کے لئے ناصر
تھے اپنے زمانے کے جواں اور طرح کے

سوکھے پتوں کو دیکھ کر ناصر
یاد آتی ہے گل کی باس بہت

اب کوئی کام بھی کریں ناصر

رونا دھونا تو عمر بھر ہے یہ

نہ پوچھ کیسے گزرتی ہے زندگی ناصر
بس ایک جبر ہے یہ اختیار اگر ہے بھی

کوئی اور شے ہے' وہ بے خبر جو شراب سے بھی ہے تیز تر
میرا میکدہ کہیں اور ہے مرا ہم سبو کوئی اور ہے

غم ہے یا خوشی ہے تو
میری زندگی ہے تو

کچھ یادگار شہر ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

ناصر کاظمی کے کلام سے انتخاب کرنا انتہائی مشکل کام ہے' یہ ان غزلوں کے اشعار ہیں' جنھوں نے ناصر کاظمی کی نئے طرزاحساس کی شاعری کی پہچان کرائی۔ ناصر کاظمی نے سابق مشرقی پاکستان کا سفر کیا تو وہاں کی سبز ہواؤں اور نیلے پانیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے سکے' ان کی یہ غزلیں اسی سفر کی یادگار ہیں :

جنت ماہی گیروں کی
ٹھنڈی رات جزیروں کی
دیس سبز جھیلوں کا
یہ سفر ہے میلوں کا

ناصر کی زندگی کی ایک اور بلکہ سب سے یادگار غزل وہ ہے' جو انہوں نے سنہ ۶۳ء میں کہی اور وہ "دیوان" کی سترویں غزل ہے' اس غزل کو اگر ناصر کی زندگی

کی نمائندہ غزل قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ غزل کا مطلع ہے:

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

اس غزل کا ایک ایک شعر دل میں اتر جانے والا ہے۔ ناصر نے اس غزل میں جس قدر بامعنی استعارے اور خوب صورت ترکیبیں استعمال کی ہیں' ان کی مثال نہ تو خود ان کی اپنی شاعری میں اس قدر روشن اور خوبصورت انداز میں ملتی ہے اور نہ ہی ان کے ہم عصر شعرا میں۔ یہ تمام غزل یہاں درج کرنے کے قابل ہے' مگر ہم طوالت کے سبب اس کے مطلع ہی پر اکتفا کر رہے ہیں' ورنہ ناصر کی یہ غزل ایسی ہے کہ اس کے ایک ایک شعر کے لئے جتنی بار بھی مکرر مکرر کہا جائے کم ہے۔

ناصر نے بستر مرگ پر انتظار حسین کو جو غزل سنائی وہ ناصر کاظمی کی زندگی کا المیہ ہے:

وہ ساحلوں پر گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

یہ غزل ناصر نے ۳۰ اپریل ۱۹۷۱ء میں اے۔ وی۔ ایچ میں بیماری کے دوران ہی کہی تھی' اس غزل کے بارے میں آفتاب احمد کا کہنا ہے:

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس غزل میں ناصر نے آخری بار وہ سب کچھ کہہ دیا ہے' جو وہ عمر بھر کہنے کی کوشش کرتا رہا' اس میں زندگی سے مایوسی بھی ہے اور زندگی کی حسرت اور تمنا بھی۔ رات کی تاریکی کا بھی احساس ہے اور اس صبح کا انتظار بھی جو اپنے ساتھ نئے قافلے لانے والی تھی اور جو آ نہیں چکتی' اس غزل میں ناصر کو ساحلوں پر گانے والوں' نئی عمارتیں بنانے والوں' روشنی دکھانے والوں' دوستی نبھانے والوں اور اکیلے اداس گھروں میں دیا جلانے والوں کی یاد آتی ہے"۔ ۳۳

آفتاب احمد نے اس غزل کے بارے میں جو رائے دی ہے' اس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ غزل ناصر کاظمی کی زندگی کا نوحہ ہے۔ اس غزل کے ایک ایک شعر میں ناصر کے خواب ٹوٹے دکھائی دیتے ہیں اور ناصر نے اس غزل کو سنانے کا اہتمام بھی تب

ہی کیا' جب وہ خود زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے' ناصر کاظمی نے یہ غزل سنانے کے بعد انتظار حسین سے انکی بے انتہا داد اور تعریف کے جواب میں کہا تھا:

"بہرحال میں تو بہت شکر گزار ہوں' اتنی دیر تو مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ میں بیمار ہوں اور ایسا لگتا ہے کہ صحت اور خون میں تازگی یکایک پتہ نہیں کہاں سے لوٹ آئی اور ایک بیمار شاعر کی تیمار داری بھائی اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ اس سے اس کا تازہ کلام سنا جائے روز آیا کرو روز سنا کرو"۔۔۔ ۳۴

ناصر نے جس کرب کے عالم میں یہ غزل سنائی اور سنانے کے بعد اس کے لہو میں جو تازگی محسوس ہوئی' ناصر نے اپنی زندگی کی اس آخری ملاقات میں اس سے انتظار حسین کو باخبر کیا۔ ناصر ایک حساس شاعر تھا جو ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا' جس کے خواب ابھی ادھورے تھے' اپنے پچھلے خوابوں کی تعبیر اس غزل میں بتا گیا۔ ناصر کاظمی کے بہت سے متفرق اشعار بھی "دیوان" کے آخر میں دیئے گئے ہیں' ان میں سے دو شعر ایسے ہیں' جو ناصر نے بستر مرگ پر فروری ۱۹۷۲ء میں کہے' ان اشعار کے پڑھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ناصر کو بہت پہلے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اب وہ ہجر کی رات کا ستارا ہے' جس نے بہت جلد ٹوٹ جانا ہے' اسے اپنی زندگی میں اپنی موت کی خبر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شوق اور سننے کا اشتیاق تھا' اس نے ایک بار شیخ صلاح الدین کے ساتھ مل کر اپنی زندگی میں مرنے کی شرارت بھی کی تھی اور صفدر میر اور اصغر سلیم کو کچھ لمحوں کے لئے اس خبر سے افسردہ بھی کر دیا تھا' مگر ۲' مارچ ۱۹۷۲ء کو ناصر واقعی سب کو افسردہ کر گیا' اس کا جینا بھی حیران کن تھا اور مرنا بھی باعث حیرت' وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے بارے میں جو کچھ کہہ گیا' وہ کچھ یوں تھا:

کہیں کہیں روشنی ہے — جو آتے جاتے پوچھتی ہے
کہاں ہے وہ اجنبی مسافر — کہاں گیا وہ اداس شاعر

(ج)

□☆∷☆□

پہلی بارش ::

ایک جائزہ

ناصر کاظمی کی شاعری ایک ایسا حیرت کدہ ہے، جس میں کائنات کا ایک ایک رنگ اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے، اس کے تخیل کی پرواز کسی ایک جہان تک محدود نہیں، بلکہ وہ تحیر کے کئی جہان منکشف کرتی دکھائی دیتی ہے، برگ نے ' دیوان ' پہلی بارش اور سر کی چھایا کی شاعری جذبے اور تخیل کے سنگم سے تخلیق پانے والی وہ خوشبو ہے، جو دلوں کے آنگن مہکانے کا ہنر رکھتی ہے۔ ناصر خود بھی حیران ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی حیران کرتا ہے، چاہے اس کی نثر ہو یا نظم۔ لکھی ہوئی کتھا ہو یا زبانی گفتگو، وہ حیرتوں کے در اس طرح سے وا کرتا ہے کہ اس سے اور اس کی تخلیقات سے ہم کلام ہونے والا اس کے تخلیقی حیرت کدے میں داخل ہو کر اس وقت تک کھویا کھویا سا رہتا ہے، جب تک ناصر کاظمی خود اسے پھر سے نہیں چونکا دیتا، سو ناصر کاظمی نے شاعری کے گنبد میں اپنی شاعری کی منفرد گونج تخلیق کر کے سب کو چونکا دیا، چونکا دینے کا یہ ہنر ناصر کاظمی کو قدرت سے ودیعت تھا، اس کے شعور نے جب آنکھ کھولی تو اپنے سامنے حسن کے کئی جہانوں کو منکشف ہوتے ہوئے دیکھا۔ چاند، آسمان، ستارے، پہاڑ، آبشاریں، ندیاں، چشمے، درختوں کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے اور درخت، دریا، سمندر،

صحرا' میدان' سرسبز وادیاں' ان وادیوں میں چمکتے سرخ' سبز' نیلے پرندے' دوڑتے گھوڑوں کے سموں سے نکلتی ہوئی چنگاریاں' چوکڑیاں بھرتے ہوئے ہرن' پانی کی تلاش میں ہجرت کرتی ہوئی مرغابیاں' صبح سویرے حمد کرتی ہوئی چڑیاں' شام کو لوٹتے ہوئے پنچھیوں کی ڈاریں' ڈوبتا اور چڑھتا سورج' وصال کا چاند اور ہجر کے ستارے' بدلتے موسموں کی خوشبوئیں' خزاں زدہ پتوں کی درد ناک آوازیں' پھولوں کی مہکاریں اور کانٹوں کی چبھن' حسین سانولے چہروں کے ایک رخ پر زلفوں کا سایہ' ہونٹوں کے عکس سے چمکتی ٹھوڑی' ہجر وصال کے کھٹے اور میٹھے ذائقے' غرض فطرت کے حسن کی لازوال اور بے مثال تصویریں اور صفحہ قرطاس پر حیرتیں بکھیرتی تحریریں ناصر کاظمی کے شعور کی پہلی پرواز کا عکس جمیل تھیں' یہی عکس جمیل ہمیشہ ناصر کاظمی کے ساتھ ساتھ رہا' وہ ایک ایسا شاعر ہے' جو خواب آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت آشنا بھی ہے' وہ جدید اس لئے ہے کہ بقول ٹی۔ ایس ایلیٹ آج کا تعین گزرے ہوئے کل کے حوالے سے کرتا ہے' اس کے دھیان کی سیڑھیاں ماضی سے شروع ہوتی ہیں اور حال سے ہوتی ہوئیں مستقبل کو چھوتی ہیں۔ ناصر کاظمی کے نزدیک شاعری مردہ لمحوں کو زندہ کر دیتی ہے' وہ وقت جو مر گیا' جسے کوئی زندہ نہیں کر سکتا۔ شاعر زندہ کر سکتا ہے۔۔۔۳۵

ناصر کاظمی نے انتظار حسین سے مکالمے کے دوران کہا تھا:

> "جس طرح عطر کی شیشی آپ کھولتے ہیں تو خوشبو آپ کو آتی ہے تو پھول اور باغ تو نظر نہیں آتے تو شاعری میں میری یہ تمام واقعات براہ راست تو آپ کو نظر نہیں آئیں گے' البتہ یہ ہے کہ وہ جو یادیں ہیں' جو زمانہ تھا' ہماری غلامی کا اور جس میں ہم جینے کے لئے کوشش کر رہے تھے۔۔۔ ان کی تگ و دو کو میری شاعری کے آہنگ میں' رنگوں' میں لفظوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں"۔۔۔۳۶

یہ اقتباس ہم نے مکرر اس لئے دیا ہے کہ تاکہ ناصر کاظمی کی ان غزلوں کی صحیح معنوں میں تفہیم ہو سکے' جو پہلی بارش میں شامل ہیں۔ ناصر نے پہلی بات یہ کی کہ شاعری مردہ لمحوں کو زندہ کر دیتی ہے اور دوسری یہ کہ عطر کی شیشی کھولنے سے پھول

اور باغ تو نظر نہیں آتے' بس خوشبو ہی محسوس ہوتی ہے اور تیسرے یہ کہ گزرے زمانے کی یادوں کو میری شاعری کے آہنگ میں' رنگوں میں' نقطوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں' جہاں تک ناصر نے یہ کہا کہ شاعر مردہ لمحوں کو زندہ کرتا ہے' اس سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے اور ناصر نے یہی تو کمال دکھایا ہے کہ اپنی یادوں کے بتوں میں اپنی شاعری کی روح پھونک کر انہیں زندہ جاوید کر دیا اور پھر اس کی شاعری واقعی اس خوشبو کی صورت ہے' جس کے پس منظر میں نہ جانے کتنے باغ اور پھول ہیں۔ دیکھنے والا یا دیکھنے والے کسی ایک باغ یا پھول کی نشاندہی نہیں کر سکتے' مگر ہمارے ناقدین نے یہ بھی کیا ہے اور وہ شاعری ہو یا افسانے اپنے اپنے مطلب کے پھول اور باغ تلاشنے کی جستجو کرتے ہیں' سو پہلی بارش کے بارے میں بھی یہ رویہ سامنے آ چکا ہے کہ ناصر کاظمی نے یہ غزلیں یا ان میں سے کچھ غزلیں فلاں محبوب شخصیت کے حوالے سے تخلیق کیں' اس بارے میں ہم پہلے باب میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے ایسے امکانات کو رد کر چکے ہیں' ان سے ناصر کی غزلوں کی مونچھیں اگنے کا گمان ہوتا ہے' اس کی غزلوں کے پس منظر میں غزال آنکھیں تو ہو سکتی ہیں' مگر "ع غ نما کجلے والی آنکھیں" نہیں ہو سکتیں' وگرنہ وہ پہلی بارش ہی کی غزلوں میں اپنے محبوب کی تعریف یوں کبھی نہ کرتا'

چاندی کا ایک پھول گلے میں
ہاتھ میں بادل کا ٹکڑا تھا
بھیگے کپڑے کی لہروں میں
کندن سونا دمک رہا تھا

اک رخسار پہ زلف گری تھی
اک رخسار پہ چاند کھلا تھا
ٹھوڑی کے جگمگ شیشے میں
ہونٹوں کا سایہ پڑتا تھا
ماتھے پر بوندوں کے موتی

آنکھوں میں کاجل ہنستا تھا

یہاں ناصر کاظمی کا محبوب اگر مرد ہوتا تو وہ کبھی بھی اس طرح کی تعریف نہ کرتا' ناصر کاظمی ایک حسن پرست شاعر تھا' وہ مردہ لمحوں کو زندہ کرنے اور زندہ لمحوں کو لازوال کرنے کا ہنر جانتا تھا' اس کے تخیل کے حیرت کدے میں مانوس موسموں کے علاوہ بے شمار ان دیکھے موسموں کا جہان آباد ہے۔ شیخ صلاح الدین لکھتے ہیں

"ناصر ایک کھرا شاعر ہی نہیں' بلکہ اپنے پورے کلام میں ایک عظیم شاعر کی طرح طلوع ہوتا ہے' اس کا ہر مجموعہ کلام نہ صرف الگ جہان ہے' بلکہ پہلے سے زیادہ تہ دار ہے"۔۔۔۳۷

شیخ صلاح الدین نہ صرف ناصر کاظمی کے بہترین دوست ہیں' بلکہ ناصر کاظمی کی شاعری کی تفہیم کے سلسلے میں بھی ان کا اپنا ایک نقطہ نظر ہے' اسی نقطہ نظر کا اظہار انہوں نے ناصر کو ایک عظیم شاعر قرار دے کر کیا اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ ناصر کاظمی کا ہر مجموعہ ایک نیا جہان حیرت لئے طلوع ہوتا ہے' سو پہلی بارش کی بارہ تیرہ غزلوں کے حوالے سے احمد عقیل روبی کا بقول ڈاکٹر خواجہ زکریا یہ ذکر کرنا کہ ناصر کاظمی کی بارہ تیرہ غزلیں ایسی ہیں' جن کا پس منظر سوائے ناصر کاظمی اور اسلم انصاری کے تیسرا کوئی آدمی نہیں جانتا' اس کی تردید شیخ صلاح الدین' انتظار حسین اور شہرت بخاری واضح طور پر کر چکے ہیں' البتہ ڈاکٹر خواجہ زکریا کا یہ کہنا درست ہے کہ ناصر کاظمی ایک طویل مثنوی لکھنا چاہتے تھے اور یہ غزلیں اسی کا تسلسل ہیں۔۔۔۳۸

آیئے ان غزلوں کا تجزیہ مجموعی طور پر پہلی غزل سے گیارہویں غزل تک اور بارہویں غزل سے چوبیسویں غزل تک دو حصوں میں کرتے ہیں' لیکن مجموعی طور پر یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ناصر کاظمی نے گو تمام غزلوں میں ایک ہی قافیہ استعمال کیا ہے اور غزلوں کے اشعار میں قافیوں کے کئی لفظ دہرائے بھی گئے ہیں' مگر مطلعوں میں یہ صورت مختلف ہے' آیئے چوبیس مطلعوں کو دیکھتے ہیں :

مطلعے ::

۱

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

۲

تو جب میرے گھر آیا تھا
میں ایک سپنا دیکھ رہا تھا

۳

میں جب تیرے گھر پہنچا تھا
تو کہیں باہر گیا ہوا تھا

۴

شام کا شیشہ کانپ رہا تھا
پیڑوں پر سونا بکھرا تھا

۵

دن کا پھول ابھی جاگا تھا
دھوپ کا ہاتھ بڑھا آتا تھا

۶

پتھر کا وہ شہر بھی کیا تھا
شہر کے نیچے شہر بسا تھا

۷

پچھلے پہر کا سناٹا تھا
تارا تارا جاگ رہا تھا

۸

گرد نے خیمہ تان لیا تھا
دھوپ کا شیشہ دھندلا سا تھا

۹

مجھ کو اور کہیں جانا تھا
بس یونہی رستہ بھول گیا تھا

۱۰

تو جب دوبارہ آیا تھا
میں ترا رستہ دیکھ رہا تھا

۱۱

تجھ بن گھر کتنا سونا تھا
دیواروں سے ڈر لگتا تھا

۱۲

دھوپ تھی اور بادل چھایا تھا
دیر کے بعد تجھے دیکھا تھا

۱۳

دم ہونٹوں پر آ کے رکا تھا
یہ کیسا شعلہ بھڑکا تھا

۱۴

چاند ابھی تھک کر سویا تھا
تاروں کا جنگل جلتا تھا

۱۵

نئے دیس کا رنگ نیا تھا
دھرتی سے آکاش ملا تھا

۱۶

چھوٹی رات سفر لمبا تھا
میں اک بستی میں اترا تھا

۱۷

تھوڑی دیر کو جی بہلا تھا
پھر تیری یاد نے گھیر لیا تھا

۱۸

میں ترے شہر سے پھر گزرا تھا
پچھلے سفر کا دھیان آیا تھا

۱۹

میں اس شہر میں کیوں آیا تھا
میرا کون یہاں رہتا تھا

۲۰

پل پل کانٹا سا چبھتا تھا
یہ ملنا بھی کیا ملنا تھا

۲۱

روتے روتے کون ہنسا تھا
بارش میں سورج نکلا تھا

۲۲

پون ہری جنگل بھی ہرا تھا
وہ جنگل کتنا گہرا تھا

۲۳

تنہائی کا دکھ گہرا تھا
میں دریا دریا روتا تھا

۲۴

تیرا قصور نہیں میرا تھا
میں تجھ کو اپنا سمجھا تھا

ان چوبیس مطلعوں میں ناصر کاظمی نے صرف ایک لفظ رہا کو چار مرتبہ استعمال کیا، جب کہ باقی مطلعوں میں تمام نئے الفاظ کے قافیے ہیں، جہاں تک باقی غزلوں کے قافیوں کا تعلق ہے، ان غزلوں میں ناصر نے ایک لفظ کے قافیے کو کئی مرتبہ

استعمال کیا ہے، لیکن مجموعی طور پر کہانی کے تسلسل میں دہرائے گئے، یہ قافیے محسوس نہیں ہوتے، بلکہ اپنے تسلسل کے اعتبار سے فطری لگتے ہیں، ان چوبیس غزلوں کے تسلسل کو ایک ہی نشست میں پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ناصر کاظمی نے دو خواب بیان کئے ہیں، پہلا خواب پہلی غزل سے گیارہویں غزل پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا بارہویں غزل سے شروع ہو کر چوبیسویں غزل پر اختتام کو پہنچتا ہے۔ دونوں خوابوں کی بنیادی روح یادیں ہیں، لیکن ان یادوں میں خواب آشنا چہرہ ایک ہی ہے اور یہی خواب آشنا چہرہ ناصر کاظمی کو تمام عمر بیدار کئے رہا اور یہی خواب آشنا' ناصر کے رت جگوں کا باعث تھا۔ ناصر کاظمی نے ہجر و وصال کی کیفیات کو اس خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ مجاز اور حقیقت دونوں ایک ہی سمندر کی دو لہریں محسوس ہوتے ہیں۔ ناصر کی ان غزلوں کو اگر فرداً فرداً بھی پڑھیں، تب بھی یہ اپنی اکائی میں مکمل معنی دیتی ہیں اور اگر ہر غزل کے جدا جدا شعر کو پڑھیں، تب بھی وہ اپنی جگہ پر بامعنی اور مکمل شعر کی صورت میں سامنے آتا ہے، لیکن ان غزلوں کے اشعار ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح سے بھی مربوط ہیں کہ ہر غزل ایک مکمل نظم بھی دکھائی دیتی ہے اور اگر اسے مزید وسعت دی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو غزلیں ہیں، پہلی غزل سے گیارہویں غزل کے مقطع تک ایک غزل اور بارہویں غزل سے چوبیسویں غزل کے مقطع تک دوسری غزل ہے، اس طرح سے پہلی بارش کی غزلوں کا یہ تسلسل، دو مکمل غزلوں اور دو خوابوں کی صورت میں ہے اور یہی وصف ناصر کاظمی کی جدید شاعری کی پہچان ہے۔

آیئے اب ان دو خوابوں اور دو غزلوں کا مجموعی طور پر جائزہ لیتے ہیں، پہلی غزل ایک حمدیہ غزل ہے، اس کا مطلع اس قدر خوب صورت اور بامعنی ہے کہ اتنی سادہ اور عام فہم زبان میں خداوند کریم کی حمد بیان کرنا ایک نئی بات اور ایک بالکل نیا انداز ہے۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

یہ حمدیہ شعر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بھی پورے معنی دیتا ہے اور اس کے

ساتھ ساتھ ناصر کاظمی کے شعور کو منور کرنے والی پہلی روشنی کی طرف بھی اشارا کرتا ہے اور یہ روشنی ہی ناصر کاظمی کی پہلی منزل ہے' جسے ایمان کہتے ہیں۔ باصر سلطان کاظمی نے پہلی بارش کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"اس شعر کے بارے میں پاپا خود کہا کرتے تھے کہ اس کا شمار چند بہترین حمدیہ اشعار میں ہو گا"۔۳۹

سو یہ شعر اپنی جگہ پر ایک خوب صورت اور مکمل حمد ہے اور یہی ناصر کاظمی کی تشنگی کے لئے پہلی بارش ہے' اس حمد میں ناصر کاظمی نے عظمت انسان کو وجود آدمیت اور وجود کائنات کے حوالے سے واضح کیا ہے اور خداوند کریم کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہوئے جہاں اپنی خاکساری کا ذکر کیا ہے' وہاں تھوڑا سا شکوہ بھی عاجزی و انکساری کے ساتھ یوں کیا؟

تو نے کیوں مرا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا

یہ شعر خود احتسابی کی واضح دلیل ہونے کے ساتھ ساتھ خداوند کریم پر مکمل ایمان کا عکاس ہے اور وہ رب ذوالجلال جو بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتا ہے' اس سے صراط مستقیم کی جستجو کی گئی ہے' آگے چل کر ناصر کہتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں جو کچھ پایا اور جو کچھ کھویا' وہ سب تیرا ہی تھا اور تیرے بغیر میں نے گو ساری عمر گزار دی' اس لئے کہ لوگ کہیں گے تو میرا تھا اور اس آخری شعر میں ناصر کاظمی نے تصوف کے وصال لمحہ کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ تخلیق کیا ہے

پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا

خدا کا جلوہ دیکھنے کی آرزو پیغمبروں کو تھی' مگر سوائے نبی آخر الزماںؐ کے کوئی اس کی تجلی کی تاب نہ لا سکا' سو ناصر کاظمی نے بڑے عارفانہ انداز میں اس کے خالق کائنات کو پہچانا اور اس پیاسی دھرتی پر پہلی بارش بھیجنے والے کی حمد کی۔ یہ پوری حمدیہ غزل' غزل کی صنف میں جہاں بالکل نیا اور انوکھا اضافہ ہے' وہاں حمد کی صنف میں بھی اپنی نوعیت کا پہلا خوب صورت تجربہ ہے۔

دوسری غزل کی ابتدا سے پہلا خواب اس طرح سے شروع ہوتا ہے۔

تو جب میرے گھر آیا تھا
میں اک سپنا دیکھ رہا تھا
تیرے بالوں کی خوشبو سے
سارا آنگن مہک رہا تھا
چاند کی دھیمی دھیمی ضو میں
سانولا مکھڑا لو دیتا تھا
تیری نیند بھی اڑی اڑی تھی
میں بھی کچھ کچھ جاگ رہا تھا

یہ کہانی اس خواب آشنا چہرے کی ہے' جس کا ذکر ہم پہلے باب میں کر چکے ہیں۔ ناصر نے ان تمام غزلوں میں اپنے محبوب کا جو سراپا بیان کیا ہے' وہ اسی سانولی رنگت کا ہے' جو جوانی سے مرتے دم تک ناصر کے دل کی حویلی میں سایہ فگن رہی۔ ناصر کی غزلوں میں اور گفتگو میں عموماً بال بنانے کا ذکر ملتا ہے۔ ناصر بالوں کے حوالے سے عاشقوں کی نفسیات بیان کرتے ہیں کہ جب وہ اپنے محبوب کے سامنے جاتے ہیں تو سب سے زیادہ اپنے بالوں ہی کو سنوارتے ہیں' یہاں بھی ناصر نے محبوب کے بالوں کی خوشبو سے آنگن مہکنے کی طرف اشارہ کیا ہے اور ساتھ ساتھ اس سانولے سلونے مکھڑے کا روپ بھی دکھایا ہے' جو چاند کی دھیمی دھیمی ضو میں چاند روپ بن جاتا ہے اور اس غزل میں ناصر نے دو پیاسی روحوں کے بادل کو برستے بھی دکھایا ہے اور دو یادوں کے چڑھتے دریا کو ایک سمندر میں گرتے بھی بیان کیا ہے اور ابھی کہانی کی ابتدا ہی ہے کہ رات کا آنچل بھیگ چکا ہے' مگر راتوں کو یہ جاگنے والا سب سے پہلے جاگ اٹھتا ہے۔

ناصر کو صبح سویرے اٹھنے کی عادت تھی' بچپن میں اگر اس کے والدین پہلے اٹھ جاتے تو وہ ضد کر کے انہیں پھر سے سلا دیتا اور پھر پہلے خود اٹھتا' اس ایک واقعہ کا ذکر ہم پہلے باب میں کر چکے ہیں' یہاں رات گئے تک جاگنا ناصر کے رت جگوں کی جانب اشارا ہے اور اس کے ساتھ ہی صبح سویرے اٹھنا ناصر کے صبح سویرے اٹھ کر

چڑیوں کی چہچہاہٹ سن کر اداس ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔

تیسری غزل میں ناصر کا خواب ایک نیا رخ اختیار کرتا ہے:

میں جب تیرے گھر پہنچا تھا
تو کہیں باہر گیا ہوا تھا

اب یہاں ایک ہلکا سا شبہ اس واقعہ کی طرف ہوتا ہے، جب ناصر کاظمی ملتان گئے تھے اور اپنے ایک دوست کے گھر اپنے دوسرے دوست احمد عقیل روبی کو اسے بلانے کا بھیجا تھا، مگر وہ گھر پر نہیں تھا، حالانکہ بقول عقیل روبی کے وہ گھر پر تھا، لیکن جب عقیل روبی یہ خبر لے کر ناصر کے پاس پہنچتے ہیں تو وہ وہاں سے ایک چٹ لکھ کر رخصت ہو چکے ہوتے ہیں۔ چٹ پہ لکھا ہوتا ہے کہ مجھے یقین ہے، وہ نہیں آئے گا' اگر اس واقعہ پر یقین بھی کرلیں تو یہاں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عقیل نے تو ناصر کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ ناصر تو پہلے ہی جا چکے تھے، اس لئے وہ لوگ جو ان غزلوں کے پس منظر میں ملتان کا سانولا چہرہ دیکھتے ہیں، وہ صرف اس شعر ہی کی بنا پر۔ حالانکہ یہ شعر ناصر کا کوئی اخباری بیان نہیں ہے کہ جس پر یقین کرلیا جائے، بلکہ یہ تو شاعری ہے، جس کے بارے میں ناصر کاظمی نے کہا تھا کہ

"جس طرح عطر کی شیشی کھولنے سے باغ اور پھول نظر نہیں آتے تو اسی طرح شاعری میں تمام واقعات براہ راست نظر نہیں آتے"۔۲۰۴

سو اس شعر کو کسی ایک واقعہ سے مربوط کرنا درست نہیں، اس تیسری غزل میں ناصر کاظمی نے اپنی یادوں کے حوالے سے گرم موسم کی جو کیفیت بیان کی ہے، اس کے لئے یہ ایک شعر ہی کافی تھا:

تیرے گھر کے دروازے پر
سورج ننگے پاؤں کھڑا تھا

یہ شعر اپنے مضمون کے اعتبار سے اتنا خوب صورت اور جاندار اور جدید ہے کہ اس کا کوئی ثانی دکھائی نہیں دیتا۔ ناصر کاظمی نے اچھے شعر کے بارے میں اپنے آخری انٹرویو میں کہا تھا:

"اچھا لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنا لکھے، ایک شاعر کے شعر کو سن

کے کچھ دیر آپ کو کسی اور کا شعر یاد نہ آئے' بس یہی اچھا لکھنا ہے' اگر میرا شعر سن کے تمہیں غالب کا شعر یاد آئے تو جیسے ہاتھی کے پاؤں کے نیچے چیونٹی کا حال ہوتا ہے' وہی حال ہو گا میرا۔ بس اسے برا کیا ہے"۔ ۲۱۰

ناصر کاظمی نے اپنے مکالمہ میں اچھے شعر کی جو تعریف کی ہے' یہ شعر اس تعریف پر ہر اعتبار سے پورا اترتا ہے' گرمی کی شدت کو محبوب کے دروازے پر سورج کو ننگے پاؤں کھڑا کر کے شاعرانہ تخیل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے' اس سے اگلا شعر بھی دیکھیے:

دیواروں سے آنچ آتی تھی
مشکوں میں پانی ملتا تھا

ناصر کاظمی کے یادوں کے دریچوں میں جھانکنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تحت الشعور میں وہی شہر تھا' جہاں کی گلیوں میں وہ ننگے پاؤں گھومتا پھرتا تھا اور یہ شہر انبالہ تھا' جہاں سخت گرمی پڑتی تھی' گو یہ سرسبز علاقہ تھا' مگر بارانی تھا۔ انبالہ شہر میں کچے پکے دونوں طرح کے گھر تھے اور شہر کے ساتھ ایک چھوٹی سے نہر بھی بہتی تھی۔ لوگ پانی کی کمی کی وجہ سے سرکاری نلوں سے مشکوں میں پانی بھر کے محفوظ کر لیتے تھے' یہی وہ شہر تھا' جہاں ناصر کاظمی کی یادوں کی حویلی تھی' اسی حویلی میں اس کے تخیل کے کبوتر تھے' درخت موسم تھے' چڑیاں تھیں اور خواب آشنا چہرہ تھا' اب ہجرت کے بعد ناصر کو جب وہ بستی یاد آتی ہے تو پھر وہ اپنے خواب کو بھولے ہوئے دیس کا سپنا ظاہر کرتا ہے:

اک بھولے ہوئے دیس کا سپنا
آنکھوں میں گھلتا جاتا تھا

اور پھر جب یادوں کے دروازے پوری طرح وا ہوتے ہیں تو ناصر پیش منظر کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

تیری آہٹ سنتے ہی میں
کچی نیند سے چونک اٹھا تھا
کتنی پیار بھری نرمی سے

تو نے دروازہ کھولا تھا
میں اور تو جب گھر سے چلے تھے
موسم کتنا بدل گیا تھا
لال کھجوروں کی چھتری پر
سبز کبوتر بول رہا تھا
دور کے پیڑ کا جلتا سایہ
ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا

ناصر نے جہاں اپنی یادوں کے شہر کے سبز کبوتروں کا ذکر کیا ہے' وہاں دور کے پیڑ کے جلتے سائے سے ہجر کے امکانی تصور کو بھی واضح کر دیا ہے۔ چوتھی غزل میں ناصر کاظمی نے اس کہانی کے اگلے منظر کو بیان کرتے ہوئے اپنی اور محبوب کی پیاس کا ذکر کرتے ہوئے خود کو اس سے زیادہ پیاسا کہا ہے' یوں یہاں ناصر نے محبت میں اپنی شدت کو ظاہر کر کے طالب و مطلوب کے محبت بھرے جذبوں کی عکاسی کی ہے:

تیرے ہونٹ بھی خشک ہوئے تھے
میں تو خیر بہت پیاسا تھا

اور پھر اسی غزل میں ناصر ایک خواب میں کئی اور خواب دیکھتے ہیں:

تیرے شانے پر سر رکھ کر
میں سپنوں میں ڈوب گیا تھا

اور پھر ان وصال لمحوں کو وہ خوشبو کا جھونکا قرار دیتے ہیں' جو رات کے سفر کے ساتھ ساتھ رخصت ہو جاتا ہے:

یوں گزری وہ رات سفر کی
جیسے خوشبو کا جھونکا تھا

پانچویں غزل میں ناصر کاظمی نے طلوع آفتاب کا نقشہ کس تیکھے انداز میں کھینچا ہے' باقی اشعار بھی دیکھیے:

دن کا پھول ابھی جاگا تھا
دھوپ کا ہاتھ بڑھا آتا تھا

سرخ چناروں کے جنگل میں
پتھر کا اک شہر بسا تھا
پیلے پتھریلے ہاتھوں میں
نیلی جھیل کا آئینہ تھا
ٹھنڈی دھوپ کی چھتری تانے
پیڑ کے پیچھے پیڑ کھڑا تھا

یہ اشعار موسم کے بدلنے کے غماز ہیں اور ایک ایسے مقام کی نشاندہی کر رہے ہیں، جو سرد ہے، جہاں پہاڑ ہیں، پتھر ہیں اور پیڑوں کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے پیڑ یہ حسین منظر نگاری ناصر یادوں کے حوالے سے کر رہے ہیں اور ان کی یادوں میں ڈکشائی جیسی خوب صورت وادیاں بھی ہیں، جہاں ناصر کا لڑکپن گزرا۔ ناصر نے اسی طرح کی منظر کشی اپنی ایک کتھا "سر کی چھایا" میں بھی کی ہے، اس غزل میں ناصر نے ایک شعر میں پہلی مرتبہ محبوب کی انگلی کو ہلال سے تشبیہ دے کر ایک نئی بات پیدا کی ہے، شعر دیکھیے:

تیری ہلال سی انگلی پکڑے
میں کوسوں پیدل چلتا تھا

اور پھر اپنی محبت کو دوسروں پر ظاہر نہ کرنا بھی ہمارے عشاق کی روایت کا ایک حصہ رہا ہے۔ ناصر کہتے ہیں:

آنکھوں میں تیری شکل چھپائے
میں سب سے چھپتا پھرتا تھا

آخر میں ناصر کاظمی جو ایک خواب دیکھ رہے ہیں، اس خواب میں ایک اور خواب کے دیکھنے کا ذکر یوں کرتے ہیں:

یوں گزری وہ رات بھی جیسے
سپنے میں سپنا دیکھا تھا

اگلی غزل بھی اس غزل کا تسلسل ہے، پتھر کے اس شہر کے نیچے ناصر نے ماضی کے شہر کے آثار کی نشاندہی کی ہے اور معاشرے کے منفی رویوں کو جو ہمیشہ محبت

کے راستے میں رکاوٹ بنے ہیں ناصر نے پتھر سے مماثل قرار دے کر ان کی بے حسی کو اجاگر کیا ہے۔ اور اسی پتھر کی بستی اور وادی میں ناصر اپنے محبوب کو لئے پھرتا تھا۔ آخری شعر میں تو ناصر نے ایسی پتھریلی وادی کی مکمل منظر کشی کر دی ہے:

گونگی وادی گونج اٹھتی تھی
جب کوئی پتھر گرتا تھا

ناصر کاظمی کی یہ شاعری پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی فطرت اور انسانی قدروں کا ماہر نباض تھا۔ اس نے جذبے اور احساسات کے دریاؤں سے حیرتوں اور محبتوں کا ایک نیا دریا تخلیق کیا ہے۔ شیخ صلاح الدین کا کہنا ہے:

"ناصر شاعری کی حکمت کا مکمل اظہار جانتا تھا اور شاعر کو حکیم گردانتا تھا' وہ حکیم جو طلسم باندھنا جانتا ہو' جو انسانی معاملات اور انسانی معاملات پر اثر انداز فطرت کی حدود سے واقف ہوتا ہے' مگر بیسویں صدی میں شاعر کو حکیم کوئی نہیں جانتا۔ اردو کی دنیا میں کسی شاعر کو حکیم نہیں سمجھا گیا' صرف اقبال" کو بعض تصوف پسند لوگ حکیم مشرق ضرور سمجھتے رہے' مگر تصوف کی زبان میں حکیم کے وہ معنی ہرگز نہیں' جو قرآن میں حکیم کے معنی ہیں' جس پر ناصر کو مکمل ایمان تھا۔ ناصر کو نہ صرف اپنی حدود کا شعور تھا' بلکہ ان کا احترام بھی تھا' اس لئے اس نے ۱۹۶۳ء اور "پہلی بارش" کے بعد شاعری کو الوداع کہہ دیا اور صرف حکیم کی زندگی بسر کرنے پر راضی رہا' مگر ان ساری باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حدود میں مسدود رہا' بلکہ یہ ہے کہ وہ ہر شے کی حدود کے اندر اس کو بھرپور جیتا' بلکہ یوں کہیں تو حقیقت کے عین مطابق ہو' اس نے اپنی حدود کو پوری طرح معمور کیا۔ اپنی حدود کی آخری لکیر تک اس نے شاعری کے جہاں کو آباد کیا' شاعری کی ان حدود تک سفر کیا' جہاں وہ تنہا تھی"۔ ۴۲

یہ اقتباس ناصر کی شاعری کی تفہیم کے لئے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ شیخ صاحب کا کہنا ہے کہ ناصر کاظمی شاعری کی حکمت کا مکمل اظہار جانتا تھا اور یہ کہ اس نے شاعری کے ان حدود تک سفر کیا' جہاں وہ تنہا تھی۔ پہلی بارش کی یہ غزلیں ناصر کی

حکمت و دانائی کی دلیل ہونے کے ساتھ ساتھ اس تنہا سفر کی عکاسی کرتی ہیں، جس سفر کے دوران ناصر نے فطرت کو بہت قریب سے دیکھا اور پھر صرف دیکھا ہی نہیں فطرت کے ان نظاروں کو نئے معنی دے کر شاعری کا ایک نیا جہان آباد کیا۔

ناصر کاظمی کے اسی آباد جہان کی ساتویں غزل میں ناصر نے اپنے رت جگوں کو جو انہیں بہت عزیز تھے اور ان راتوں کو جنہیں وہ باعث تخلیق کہا کرتے تھے، بڑے شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے، پچھلے پہر کے سناٹے میں جب تارا تارا جاگ رہا تھا۔ ناصر نے اپنے محبوب کا سراپا اس طرح سے کھینچا

بالوں میں تھی رات کی رانی
ماتھے پر دن کا راجا تھا
ایک رخسار پہ زلف گری تھی
تھوڑی کے جگمگ شیشے میں
ہونٹوں کا سایہ پڑتا تھا
چندر کرن سے انگلی انگلی
ناخن ناخن ہیرا سا تھا
ایک پاؤں میں پھول سی جوتی
ایک پاؤں سارا ننگا تھا

یہ خوب صورت سراپا کسی غیر معمولی محبوب ہی کا ہو سکتا ہے اور ناصر کاظمی کا محبوب واقعی غیر معمولی اور اسی طرح کا تھا، جیسا کہ انہوں نے بیان کیا ہے، اس سراپے کے حوالے سے افتخار کاظمی نے بھی "ناصر کے اس محبوب کی پہچان کی تائید کی ہے، جسے ناصر نے اپنے اشعار کے آئینے میں دکھایا ہے"۔ ۴۳

آٹھویں غزل کا موسم پھر تبدیل ہو رہا ہے، یہاں دھوپ کا شیشہ دھندلا پڑ گیا ہے اور گرد نے خیمہ تان لیا، اس بدلتے ہوئے موسم کا اثر شاعر پر بھی پڑتا ہے اور وہ ماضی کے ایک اور منظر کی نشاندہی کرتا ہے اور اس منظر کے آخر میں نیل گگن کا ایک پرندہ پیلی دھرتی پر اترتا ہے۔ نیل گگن سے پیلی دھرتی پر پرندے کا اترنا زمین پر زندگی کی بشارت ہے۔ نویں غزل میں ناصر کاظمی نے اگلی منزل پر پہنچ کر اپنے رستہ بھول

جانے کے حوالے سے محبوب کے دیس پہنچ کر وہاں کی خوشبوؤں اور مہکاروں کو جس طرح سے محسوس کیا' اس غزل میں بیان کیا ہے اور ان خوشبوؤں' مہکاروں اور بارش کی رم جھم میں بھیگے بدن کے ساتھ محبوب کا آنا ناصر کے لئے ایک قیامت کا منظر تھا۔

ماتھے پر بوندوں کے موتی
آنکھوں میں کاجل ہنستا تھا
چاندی کا اک پھول گلے میں
ہاتھ میں بادل کا ٹکڑا تھا
بھیگے کپڑوں کی لہروں میں
کندن سونا دمک رہا تھا

اس سراپا کے بعد ناصر نے اپنے محبوب کو طوفانی بارش میں گھر تک چھوڑ کر آنے کی طرف اشارہ بھی کیا ہے' جب بارش تھم جاتی ہے تو ناصر کہتے ہیں:

بھیگی بھیگی خاموشی میں
میں ترے گھر تک ساتھ گیا تھا
ایک طویل سفر کا جھونکا
مجھ کو دور لیے جاتا تھا

دسویں غزل میں ناصر کاظمی کے تخیل کی وادی میں محبوب سے مکرر ملاقات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ انتظار کی کیفیت کو ناصر نے محبوب کے وصال کے یقین کے ساتھ بیان کیا ہے:

تو جب دوبارہ آیا تھا
میں ترا رستہ دیکھ رہا تھا
پھر وہی گھر' وہی شام کا تارا
پھر وہی رات' وہی سپنا تھا

اس غزل میں ناصر نے اپنے محبوب کی نفسیات کی بھی عکاسی کی ہے' وہ کسی انجانے خوف سے چونک پڑتا تھا اور اس کے وہمی ہونے کی جانب بھی ناصر نے اشارا کیا

ہے' اب یہاں ہم یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ انبالہ کے لوگ بہت سادہ مزاج' محبت کرنے والے اور اس کے ساتھ ساتھ وہمی اور جھگڑالو بھی ہوتے ہیں۔

ناصر کاظمی کی ایمجری ایک مصور کی تصویری کہانی ہے' جس کا ہر منظر پہلے منظر سے جدا ہے۔ ناصر نے اپنے عشق کی وارداتوں اور ہجر وصال کے موسموں کو شاعری کی اس تصویری کہانی میں بیان کیا ہے۔ گیارہویں غزل میں ناصر کاظمی کے وصال کا موسم مکمل طور پر ہجر کی خزاں رت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور گل موسم وصال خار ہجراں کی صورت اختیار کر لیتا ہے' اس غزل میں ناصر کاظمی کی اداسی' اس کا دکھ اور غم نئے شعری استعاروں کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے' وہ ہجر کے ستارے کے دکھ کو اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ سننے والے کو ہر ستارا ہجر کی رات کا ستارا محسوس ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری کا کمال یہی ہے کہ ایک مرتبہ اگر کوئی اس کی انگلی پکڑ لے تو پھر چھڑانے کو جی نہیں چاہتا' یہ غزل ناصر کاظمی کے پہلے خواب کا کلائمکس بھی ہے اور ہجر کے موسم کا حرف آخر بھی' ناصر کہتے ہیں:

تجھ بن گھر کتنا سونا تھا
دیواروں سے ڈر لگتا تھا
بھولی نہیں وہ شام جدائی
میں اس روز بہت رویا تھا
تجھ کو جانے کی جلدی تھی
اور میں تجھ کو روک رہا تھا
میری آنکھیں بھی روتی تھیں
شام کا تارا بھی روتا تھا
گلیاں شام سے بجھی بجھی تھیں
چاند بھی جلدی ڈوب گیا تھا
سناٹے میں جیسے کوئی
دور سے آوازیں دیتا تھا
یادوں کی سیڑھی سے ناصر

رات کو اک سایہ اترا تھا

ناصر کاظمی کے پہلے خواب کی یہ آخری غزل ہے، جس میں ناصر نے مقطع میں پہلی بارش کے پہلے منظر کے در، ہجر کی پرچھائیوں اور سناٹوں کے ہمراہ بند کر لئے ہیں، اس غزل میں موسم وصال پر ہجر کی دھوپ کا سایہ مکمل طور پر چھا جاتا ہے اور ناصر بیتے ہوئے دنوں کی یادوں میں کھو جاتا ہے:

ہمارے گھر کی دیواروں پر ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

لیکن اس اداسی کی تاریک راہوں میں ناصر وصال کی کرنیں پھر سے نمودار ہوتے دیکھتا ہے اور بارہویں غزل سے اس کے دوسرے خواب کا سفر یوں شروع ہوتا ہے:

دھوپ تھی اور بادل چھایا تھا
دیر کے بعد تجھے دیکھا تھا
میں اس جانب تو اس جانب
بیچ میں پتھر کا دریا تھا
ایک پیڑ کے ہاتھ تھے خالی
اک ٹہنی پر دیا جلا تھا
دیکھ کے دو چلتے سایوں کو
میں تو اچانک سہم گیا تھا
ایک کے دونوں پاؤں تھے غائب
ایک کا پورا ہاتھ کٹا تھا
ایک کے الٹے پاؤں تھے لیکن
وہ تیزی سے بھاگ رہا تھا
ان سے الجھ کر بھی کیا لیتا
تین تھے وہ اور میں تنہا تھا

ناصر کاظمی کا پہلا خواب جو اس حمدیہ مطلع سے شروع ہوتا ہے:

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

گیارہویں غزل کے اس مقطع پر اختتام کو پہنچتا ہے:

یادوں کی سیڑھی سے ناصر
رات کا اک سایہ اترا تھا

اس طرح سے پہلے خواب کی یہ پہلی مسلسل غزل اپنے اختتام کو پہنچی تھی' یہ خواب قیام پاکستان سے پہلے کے مناظر کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے' اس خواب میں جو یادوں کی حویلی ہے' اس کے تمام خد و خال ہجرت سے پہلے کی مانوس حویلی سے مشابہ ہیں' جب کہ دوسرے خواب میں ہجرت کے بعد رونما ہونے والے ہجر و وصال کے موسموں کے ذائقے بیان کیے گئے ہیں۔ ناصر کی ہر غزل کے بعد ایک خاموشی کا عمل بھی ایک تخلیقی رویہ ہے' یہ تخلیقی رویہ گیارہویں اور بارہویں غزل کے مابین طول پکڑ لیتا ہے اور اس طوالت سے ماحول پر سناٹا چھا جاتا ہے اور جب ناصر کاظمی بارہویں غزل کے پہلے مطلع میں اس منظر کو بیان کرتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی ایک عرصے کے بعد اس نے اسے دیکھا ہے' جسے وہ ہمیشہ اپنی آنکھوں میں بسائے رکھتا تھا' جو اس کی آنکھوں کا تارا تھا' جو بعد میں ہجر کی رات کا ستارا بن گیا۔ شیخ صلاح الدین لکھتے ہیں:

"پہلی بارش محض دو اشخاص کے ملنے اور بچھڑنے کی کہانی نہیں ہے۔ میں اور تو علامتیں ہیں داخل اور خارج کی۔ نمائندے ہیں فرد اور معاشرے کے۔ انسان کو معاشرے اور تنہائی دونوں کی ضرورت ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے زوج ہیں یا اس کی ذکا دونوں کی صحیح ترکیب ہی سے ممکن ہے۔ شاید ایک انسان دوسرے انسان سے جدا ہو کر' تنہا ہو کر' رفع حاجت کے لیے جاتے ہیں وہاں وہ خود اپنے آپ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ وہاں ان کو عجیب عجیب باتیں سوجھتی ہیں۔ جن تک اس کے شعور کی رسائی نہیں ہوتی۔ مارٹن لوتھر نے اس امر کا اعتراف کیا ہے محبت کی پرورش کے لیے بھی تنہائی اور خاموشی کی ضرورت ہے۔ ۴۴"

ناصر کاظمی نے بھی اپنی محبت کی پرورش تنہائی اور خاموشی کے اشتراک سے کی ہے اور ناصر نے واقعی بقول شیخ صاحب کے ان دو اشخاص کے بچھڑنے کی کہانی ہی نہیں بیان کی، بلکہ اس نے اپنے معاشرتی اور سماجی رویوں کو بدلتے سیاسی موسموں کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے گزرے ہوئے زمانوں کا المیہ ہجر و وصال کی کیفیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ناصر کاظمی کوئی قنوطی شاعر نہیں تھا، وہ ایک حقیقت آشنا شاعر تھا، جس نے جہاں ماضی کی یادوں کو اپنی زندگی کا سرمایہ بنایا ہے، وہاں آنے والے روشن دنوں سے بھی اپنا ناتہ جوڑا ہے۔

سترہویں غزل میں ناصر نے پھر اسے یاد کیا، جسے وہ چند لمحوں کے لئے اس منظر میں کھو کر بھول گیا تھا، وہ پہلی بارش کے اس منظر کو یاد کرتا ہے، جب اس نے پہلے پہل اپنے محبوب کو دیکھا تھا۔ اس غزل کا گو ایک ایک شعر آئینہ ہے، مگر یہ شعر معنویت سے بھرپور ہے:

دل کی صورت کا اک پتا
تیری ہتھیلی پر رکھا تھا

اور پھر محبت بھری اس کیفیت کو بیان کرنے کے بعد ناصر نے موسم وصال کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

دیر کے بعد مرے آنگن میں
سرخ انار کا پھول کھلا تھا
دیر کے مرجھائے پیڑوں کو
خوشبو نے آباد کیا تھا
شام کی گہری اونچائی سے
ہم نے دریا کو دیکھا تھا
یاد آئیں کچھ ایسی باتیں
میں جنھیں کب کا بھول چکا تھا

اس غزل میں ایک مرتبہ پھر ناصر کی یادوں کا جہان آباد ہوتا ہے اور پھر انہیں یادوں کے سہارے وہ اپنا سفر آگے رواں دواں رکھتا ہے۔ اور اپنے محبوب کے

شہر سے گزرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر ان یادوں میں کھو جاتا ہے، جن کی تصویریں اس کے دھیان میں گھومتی رہتی ہیں، یہاں ناصر کاظمی ریلوے اسٹیشن کا بھی ذکر کرتا ہے، جو بچپن ہی سے اس کے شعور میں بسا ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ گاڑی کی سیٹی کی آواز نے بے چین کیا، انجن کی کوک اس کے دل میں ہوک بن کر اٹھتی، اس غزل میں اس نے گاڑی کے ایک سفر کا ذکر کرتے ہوئے کسی انجانے چہرے کو مانوس پایا:

ریل چلی تو ایک مسافر
مرے سامنے آ بیٹھا تھا
سچ مچ تیرے جیسی آنکھیں
ویسا ہی ہنستا چہرہ تھا
چاندی کا وہ پھول گلے میں
ماتھے پر وہی چاند کھلا تھا
جانے کون تھی اس کی منزل
جانے کیوں تنہا تنہا تھا
کیسے کہوں روداد سفر کی
آگے موڑ جدائی کا تھا

ناصر نے اس غزل میں جہاں کسی کو یاد کیا، وہاں ہجر کی حقیقت کو اس اجنبی مسافر کے بچھڑنے کے عمل سے بھی قبول کرتے ہوئے بیان کر دیا، گو یہ مسافر اس کا محبوب نہیں تھا، مگر اس جیسا تھا، جب کسی شے سے کسی محبوب شے کی نسبت ہو جائے تو وہ بھی عزیز تر ہو جاتی ہے، سو ناصر نے اس مانوس اجنبی میں اپنے محبوب کا پر تو دیکھا اور وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کے سامنے ہی رہے، مگر یہ بھی ایک اٹل حقیقت کہ اسے آگے اسٹیشن پر اترنا تھا اور اس طرح ہجر یہاں بھی اس کا مقدر تھا۔

انیسویں غزل کی کیفیت بھی ہجرت کے بعد ایک ایسے شہر کی بازگشت ہے، جو کبھی آباد تھا، جہاں زندگی کی علامتیں تھیں، اپنے پیارے تھے، یہی وہ بستی تھی، جہاں کبھی پھول ہنسا کرتے تھے، یہی وہ شہر تھا، جہاں کا ایک ستارا باعث بیداری تھا، جب ناصر کاظمی اس شہر کو مدتوں بعد دیکھتا ہے تو اسے وہ "سر کی چھایا" کا سورج پور دکھائی دیتا

ہے، جو بے رحم وقت کے ہاتھوں تباہی و بربادی کے کنارے آ لگا ہے، یہاں ناصر کاظمی خود عبدل کے کردار میں نظر آتا ہے، جو سورج پور جانا چاہتا ہے اور گاڑی میں بیٹھا ہے، اس شہر کے بارے میں سوچتا ہے، جہاں سات برس پہلے اس کی خوشیاں سرسبز و شاداب پیڑوں کی شاخوں کی طرح لہلہاتی تھیں، جہاں اس کے محبوب کی خوشبو تھی۔ دوست تھے، پرندے تھے، پھول تھے، پھل تھے، امنگیں تھیں، امیدیں تھیں، مگر جب وہ اس اسٹیشن کو سات برس بعد دیکھتا ہے تو اس کی امید پر پانی پھر جاتا ہے، سورج پور اب ایک ویران جنگل ہے اور اس اسٹیشن پر اب کوئی نہیں اترتا، ہر طرف اداسی ہی اداسی ہے اور ویرانیاں ہی ویرانیاں ہیں اور ان ویرانیوں میں عبدل کے دل کی کئی کہانیاں ہیں، وہ ان کہانیوں کو اپنے دل میں بسائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سورج پور کو تکتا ہے اور پھر جہاں اس نے اترنا ہوتا ہے، وہ سورج پور اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتا ہے۔

بیسویں غزل میں ناصر پھر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آتے ہیں، اور اس غزل میں پل بھر کے ملاپ کو یاد کرتے ہیں، اس ملاپ میں کتنی ایسی ان کہی باتیں تھیں، جو کہنے سے رہ گئیں اور یہاں بھی ناصر نے اپنے محبوب کے وہم کا ذکر یوں کیا ہے:

کسی پرانے وہم نے شاید
تجھ کو پھر بے چین کیا تھا

یہ وہم ناصر کے محبوب کو پہلے خواب میں بھی چونکاتا اور خوف میں مبتلا کرتا ہے اور اس دوسرے خواب میں بھی وہی وہم دامن گیر ہے، اس ملاقات کو ناصر نے ان دو شعروں میں یوں واضح کیا ہے:

میں بھی مسافر تجھ کو بھی جلدی
گاڑی کا بھی وقت ہوا تھا

اک اجڑے اسٹیشن پر
تو نے مجھ کو چھوڑ دیا تھا

اس غزل میں ناصر نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کے محبوب نے ناصر کو چھوڑا تھا۔ ناصر نے اسے نہیں چھوڑا، بلکہ ہمیشہ اپنی یادوں کی حویلی میں اسے بسائے

رکھا۔ ناصر کی ذاتی زندگی کا بھی یہی المیہ ہے، جسے وہ چاہتا تھا' وہ کسی اور کا ہو گیا اور پھر کسی اور کا ہونے کے بعد کبھی کبھار اس کی چھب نظر آ جاتی تو ناصر کی تمام محبت بھری بیتی گھڑیاں زندہ ہو جاتیں۔ اکیسویں غزل میں ناصر نے روتے روتے ہنسنے کو بارش میں سورج کے نکلنے سے تشبیہ دی ہے' اس غزل میں بھی ماضی کی یادوں کے حوالے سے ناصر نے اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ ہمارا ملاپ مشکل تھا:

تیرے ساتھ ترے ہمراہی
میرے ساتھ مرا رستہ تھا

بائیسویں غزل نئی زندگی کی بشارتوں سے عبارت ہے اور اس غزل سے ناصر کے حقیقت آشنا ہونے کا پتہ چلتا ہے' اس غزل میں اپنی خوشیوں کے خوشوں کو پہچانتے ہیں۔ اور اپنی گم شدہ جنت کو پالیتے ہیں:

خوشوں کے اندر خوشے تھے
پھول کے اندر پھول کھلا تھا
شاخیں تھیں یا محرابیں تھیں
پتا پتا دست دعا تھا
گاتے پھول' بلاتی شاخیں
پھل میٹھے اور جل بھی میٹھا تھا
جنت تو دیکھی نہیں لیکن
جنت کا نقشہ دیکھا تھا

اپنی جنت کو پالینے یعنی اپنی ذات کے ادراک کے ساتھ ساتھ ناصر اپنی تنہائی کو بامعنی بناتے نظر آتے ہیں۔ تنہائی کا زندہ استعارہ ہی ان کی زندگی کا ساتھ ٹھہرتا ہے اور وہ خود احتسابی کے عمل سے گزرتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں:

ایک ہی لہر نہ سنبھلی ورنہ
میں طوفانوں سے کھیلا تھا

یہاں بھی ناصر نے سچی محبت کی خوشبو کو اجاگر کیا ہے۔ ناصر گو محبوب سے لاتعلق ہو جاتے ہیں' مگر زیادہ دیر تک یہ لاتعلقی بھی ان کی برداشت سے باہر ہوتی ہے'

اسی طرح جس طرح حسرت موہانی نے کہا تھا:

بھلاتا لاکھ ہوں ان کو برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت میں وہ کیونکر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اور اسی مضمون کو ناصر نے کس خوب صورت انداز میں اس شعر میں بیان کر دیا ہے:

اے دوست ہم نے ترکِ تعلق کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

وہ محبوب سے بچھڑنے کو بھی قبول کرتے ہیں اور پھر بچھڑنے اور لاتعلق سے ہو جانے کے باوجود اسے یاد بھی کرتے ہیں، یوں ناصر کاظمی کا دوسرا خواب اور دوسری غزل اس مقطع پر ختم ہو جاتی ہے:

کس کس بات کو روؤں ناصر
اپنا لینا ہی اتنا تھا

سو اس غزل کے مقطع میں ناصر ہجر و وصال کی اس تمام کہانی کو اپنا لینا یعنی اپنا مقدر اور قسمت ہی قرار دیتے ہیں، گو یہ دونوں خواب یا دونوں مسلسل غزلیں یادوں کے مانوس موسموں کی خوشبوؤں سے معمور ہیں، مگر دوسری طویل غزل جو بارہویں غزل سے شروع ہو کر چوبیسویں غزل پر ختم ہوتی ہے، اس کی آخری غزلیں نئی زندگی، نئے موسموں، نئی مہکاروں سے نہ صرف عبارت ہیں، بلکہ ناصر کی زبان میں کھوئی ہوئی جنت کو پالینے کے مترادف ہیں۔ ناصر اور ان کے ہم عصر شعرا کے مابین یہ بھی ایک حد امتیاز ہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری ماضی کی یادوں کا نوحہ بھی ہے اور حال اور مستقبل کا طربیہ بھی اور ناصر کاظمی کی شاعری میں ہجر و وصال کے موسموں کو سمجھنے کے لئے یہ ایک شعر ہی کافی ہے:

روتے روتے کون ہنسا تھا
بارش میں سورج نکلا تھا

ناصر جہاں آنسو بہاتا ہے' وہاں وہ ہنسنا بھی جانتا ہے' پہلی بارش کی چوبیس غزلیں اپنے مجموعی تاثر میں یادوں کی ایک ایسی حویلی ہے' جس کے در و دیوار جہاں پرانی یادوں کے لوبانوں کی خوشبو سے مہکے ہوئے ہیں' وہاں حال اور مستقبل کی نئی مہکاروں سے اپنی منفرد پہچان اس طرح سے کراتے ہیں کہ دور سے بھی محسوس کرنے والا یہ کہہ اٹھتا ہے کہ یہ ناصر کاظمی کی شاعری کی خوشبو ہے۔

یہی وصف ناصر کاظمی کی شاعری کی سب سے بڑی پہچان ہے اور یہی اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

(و)

□☆::☆□

نشاط خواب ::

غزل گو ناصر کاظمی کی شاعری کا ایک مختلف مزاج ::

ناصر کاظمی ایک ایسا شاعر ہے' جو فطرت کا دم ساز بھی ہے اور فطری رویوں کا ہم راز بھی' جس کی شاعری کی حویلی کا ماحول اداس بھی ہے اور اس کے کئی گوشوں میں اچھے دنوں کی آس بھی' وہ خواب بنتا ہے اور خواب کہتا ہے اور خواب لکھتا ہے' اس کے یہ تمام خواب تخلیقی ہیں' اس لئے سننے والوں اور پڑھنے والوں کے لئے حیرت کا سبب ہیں۔ حیرت ہی ناصر کاظمی کی شاعری کا ایک زندہ استعارہ ہے' اس نے بطور شاعر اپنی غزل کے مزاج سے حیرانیاں تخلیق کیں اور پھر جب نثر کے لئے قلم اٹھایا تو یہ حیرانیاں نثر لطیف کی صورت اختیار کر گئیں اور پھر جب ناصر کاظمی نے ان حیرانیوں کو نظم کی صورت میں بیان کرنا چاہا تو ان کی نظموں میں غزلوں کی خوشبو بھی محسوس ہونے لگی۔ ناصر کاظمی نے بہت کم نظمیں کہی ہیں' مگر ان نظموں میں زندگی کے وہی رویے سامنے کھل کر آتے ہیں' جنہیں ناصر نے غزل کا پیراہن عطا کیا' گو نظم غزل سے ایک مختلف صنف سخن ہے' مگر ناصر کاظمی کے یہاں غزل میں نظم کی مںکاروں اور نظم میں غزل کی خوشبو کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری کا جدید انداز ہی یہی ہے'

انہوں نے کسی بھی صنف میں اظہار کی بنیاد محض شاعری ہی کو قرار دیا ہے۔ وہ انتظار حسین سے اپنی زندگی کے آخری انٹرویو میں کہتے ہیں:

"اصل میں غزل کی روش پر تو میں نہیں چل نکلا' مجھے غزل' قطعہ' رباعی' آزاد نظم وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں رہا' مجھے تو شاعری سے سروکار ہے' تمہیں پتہ ہے کہ شاعری صرف مصرع لکھنے کا نام نہیں' شاعری تو ایک نقطہ نظر ہے' زندگی کو دیکھنے کا' چیزوں کو دیکھنے کا' ان کو ایک خاص موزوں طریقے سے بیان کرنے کا نام شاعری ہے"۔۔۔۴۵

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ صنف سخن کی کوئی حیثیت نہیں' اصل چیز تو شاعری ہے' مگر ناصر کاظمی نے اس تعریف کے باوجود جس صنف سخن کو عزیز جانا وہ غزل ہی تھی اور ان کی غزل کا پرتو ان کی نظم اور گیتوں پر بھی پڑا' لیکن ناصر کاظمی کی نظموں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ اس صنف کی جانب توجہ دیتے تو اس صنف سخن میں بھی جدت کے نئے باب رقم کرنے میں کامیاب ہوتے' اسی طرح ناصر کاظمی نے قصیدے اور مثنوی کو نہیں اپنایا' مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر وہ ان اصناف سخن کو اپناتے تو ان کے شاعرانہ جوہر مزید کھل کر سامنے آتے' ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی کو تمام اصناف سخن کے اظہار میں قدرت حاصل تھی' مگر یہ اور بات کہ ان کی محبوب صنف سخن غزل ہی ٹھہری۔ ناصر کاظمی انتظار حسین سے مکالمہ کے دوران کہتے ہیں:

"غزل کا احوال تمہیں پتہ ہے' دلی کا سا ہے' یہ بار بار اجڑتی ہے اور بار بار بنتی ہے' کئی بار غزل اجڑی' لیکن کئی بار یہ زندہ ہوئی اور اس کا یہی امتیاز ہے کہ غزل میں شاعری اچھی ہوئی ہے۔ شاید نظم کا ان آسانی سے چراغ نہیں جلا۔ خود فیض نظم لکھتے ہیں' لیکن غور سے دیکھئے ان کی ساری کی ساری شاعری غزل ہے۔ تغزل ہی تغزل تو ہے' جس کی وجہ سے فیض شاعر ہے"۔۔۔۴۶

ناصر کاظمی نے یہاں' جہاں فیض کی شاعری کی بنیادی روح کو غزل قرار دیا ہے' وہاں یہ حقیقت خود ناصر کے ساتھ بھی ہے' وہ جب کہتے ہیں کہ غزل کی وجہ سے

فیض کی نظم کا چراغ نہیں جل سکا تو یہی کیفیت خود ناصر کے ساتھ بھی ہے۔ ناصر کی نظمیں اور خاص طور پر "نشاط خواب" ایک ایسی نظم ہے' جس میں غزل کی روح موجود ہے۔ نشاط خواب اپنی ہیئت کے اعتبار سے نظم ہے' مگر روح تک ایک ہی قافیہ استعمال ہوا ہے' چونکہ اس میں تمام اشعار ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ایک زنجیر کی صورت میں اور ایک خاص مضمون بیان کر رہے ہیں تو ہم اسے نظم ہی کہیں گے' اب آیئے دیکھتے ہیں کہ مختلف دانشوروں نے نظم کی تعریف کیسے کی ہے۔

"اختر الایمان

نظم کی بنیادی صفت اس کا تعمیری پہلو ہے' ہر نظم اپنی جگہ پر ایک عمارت ہوتی ہے' جس طرح کسی عمارت میں ایک اینٹ اپنی جگہ پر کوئی حیثیت نہیں رکھتی' اس طرح نظم کا ایک مصرع یا ایک شعر اپنی جگہ پر علیحدہ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

منیب الرحمن

نظم میں ابتدائیہ اٹھان' کلا ئمکس اور پھر مجموعی تاثر کا خیال رکھنا چاہیے' ہمارے یہاں امیجز غزل میں بھی ہوتی ہیں' لیکن نظم میں اس کے استعمال میں سلیقے کی ضرورت ہے' کیونکہ جلد از جلد امیجز بدلنے سے نظم کے تاثر پر اثر پڑتا ہے۔

آل احمد سرور

پیکر کی تخلیق ہی شاعرانہ عمل ہے' کسی روح کو جو جب تک پیکر میں نہ ڈھالا جائے' گا شاعرانہ عمل مکمل ہی نہ ہو گا اور نہ شاعر اس وقت تک خالق کہا جا سکتا ہے' اردو میں حالی سے پہلے بھی نظمیں لکھی گئیں' لیکن عرصے تک ہماری نظم پر غزل کا سایہ رہا ہے' اس کے اثرات اب بھی باقی ہیں۔

خورشید الاسلام

زندگی کے مختلف تجربات' مشاہدات اور جذبات و احساسات کو پیش کرنے کے عام طور پر تین طریقے ہیں' پہلا رد عمل کی پیشکش' اسے غزل کہتے ہیں' محسوسات کو ایمان داری' تازگی' اختصار اور ایجاز کے ساتھ پیش کرنا' ذاتی

رد عمل، ذاتی بصیرت اور ذاتی تجربے کے انکشاف میں کم سے کم تفصیلات کی ضرورت ہے۔ دوسرا طریقہ وہ ہے، جو ڈرامہ میں ہوتا ہے، اس میں زندگی کی کشمکش ہوتی ہے۔ اقدار کا تصادم، خیر و شر، حسن و قبح کا معرکہ ہوتا ہے، اس کی پیشکش میں ذاتی رد عمل کافی نہیں۔ سمبل یا کرداروں کے ذریعے بے لوثی، معروضیت اور بے تعلقی کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ ناول کا ہے۔ ناول نگار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماحول تفصیلات و جزئیات بیان کر کے مصوری سے بھی کام لے اور عمل کو بھی جگہ دے، نظم میں یہ تینوں باتیں ممکن ہیں۔ ذاتی رد عمل کا انکشاف، محض عمل کے ذریعے اور بے لوثی کے ساتھ یا عمل اور بیان دونوں کے ساتھ تجربے پیش کرنا نظم میں ممکن ہے۔

مجنوں گورکھپوری

نظم دراصل وہی صحیح معنوں میں نظم کہلانے کی مستحق ہو گی، جس میں بالیدگی ہو۔ ابتدا اوسط اور انتہا ہو اور ہر جز اس طرح کل میں ختم ہو جائے کہ کہیں سے جھول نہ معلوم ہو، نظم میں ہر مصرعہ دوسرے سے مربوط ہوتا ہے۔ اور اس طرح کہ ان کی نشست یا ترتیب بھی بدلی نہ جا سکے، تب نظم کی تعمیر مکمل ہو گی، نظم کے پہلے مصرعے سے ہمیں یہ احساس ہونا چاہئے کہ جیسے ایک لپٹی ہوئی چیز کو کھولا جا رہا ہے۔ بغیر بالیدگی اور ارتقا کے نظم۔ نظم نہیں پہلے شعر کے بعد دوسرا شعر پڑھا جائے تو پہلے شعر کی یاد تو رہ جائے، لیکن دوسرا شعر ذہن کو آگے بڑھائے۔ ۲۷

مختلف نقطہ نظر کے حامل ان ناقدین کی آرا سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نظم ایک ایسی صنف سخن ہے، جس میں شاعر کھل کر اپنی بات یا تخیل مربوط طریقے سے بیان کر سکتا ہے اور یہ کہ نظم کے اشعار کی لڑی تسبیح کی دانوں کی طرح ہوتی ہے، جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ان آرا کو پڑھنے کے بعد یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ نظم پر غزل کے اثرات ایک عرصے تک غالب رہے ہیں، اس لئے پابند نظم کی بنت میں کہیں کہیں غزل کی رت بھی محسوس ہوتی ہے، البتہ آزاد

نظموں اور نثری نظموں کا مزاج اس سے قطعی مختلف ہے' ان اصناف پر کسی اور صنف سخن کا گمان تک نہیں ہوتا۔ ناصر کاظمی جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ غزل گو شاعر تھے' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی نظم اور عام گفتگو میں بھی ایک سحر تھا کہ سننے والا ان کی باتوں کی بارش میں بھیگے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ تو گفتگو میں بھی طلسماتی شاعری کرتے تھے' جبکہ ان کی نظموں' قومی نغموں اور گیتوں اور ان کے ترجموں میں بھی ان کی شاعری کے حیرت کدے منکشف ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

نشاط خواب کی شاعری کا پہلا حصہ ان کی چھ نظموں پر مشتمل ہے' جب کہ حصہ دوم میں نعتیں' سلام' رباعیات' قومی نغمے اور ترجمے شامل ہیں۔ ناصر کاظمی کی شاعری کا یہ مجموعہ اس اعتبار سے متنوع ہے کہ اس میں کئی ایک اصناف سخن یکجا کر دی گئی ہیں۔ آیئے اب ہم ایک ایک کر کے ہر حصے کا فنی تجزیہ کرتے ہیں۔

حصہ اول:::

نشاط خواب:::

یہ نظم' قصیدہ اور غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے' مطلع سے لے کر آخری شعر تک ایک ہی قافیہ ہے' اس نظم سے پہلے ایک ورق پر اسی نظم کا ایک شعر دیا گیا ہے' جو ناصر کاظمی کے نظریہ فن سے عبارت ہے۔

ناصر یہ شعر کیوں نہ ہوں موتی سے آبدار
اس فن میں کی ہے میں نے بہت دیر جاں کنی

ناصر کاظمی کی جاں کنی کا اظہار ان کی تخلیقات ہیں جنہوں نے سید ناصر رضا کو ناصر کاظمی بنایا ہے۔ ناصر کاظمی ایک ایسے شاعر تھے' جنہوں نے اپنی شاعری کی حویلی میں پرانے اور نئے دونوں شہر آباد کر رکھے تھے' ان کی شاعری کے باغات میں انبالہ کے آموں' امرودوں اور جامنوں کے ذائقے بھی ملیں گے اور لاہور کی اپلچی جیسے نئے اور تازہ پھلوں کی خوشبو بھی۔ ناصر ایک ایسا نیا اور جدید شاعر ہے' جس نے روایت کے

مٹی گارے اور حال کے سفید سیمنٹ سے اپنی نئی شاعری کا پختہ مکان تعمیر کیا ہے۔ ناصر معتقد میر بھی ہے اور نئی روشنی کے حامل مشرق اور مغربی دانشوروں کی سوچوں کا اسیر بھی، مگر اس کی تخلیقات میں مشرقی اور مغربی اقدار فن کی حسرت تعمیر نہیں ہے، بلکہ اس کی تخلیق کی حویلی اس کی اپنی ہے اور سب سے جدا ہے۔ ناصر کاظمی ایک ایسا شاعر ہے، جو اپنا ناتہ مٹی سے استوار کرتا ہے، اس کے پاؤں کے نیچے جو زمین ہے، وہ اس کا احسان مند ہے کہ اس نے اس کا بار اٹھایا ہوا ہے، پھر یہی زمین اس کے جسم اور روح کے رشتے کو بھی برقرار رکھے ہوئے ہے، سو اسی لئے اس کے نزدیک ماں دھرتی کی عزت اور وقار حقیقی ماں کی طرح ہے، وہ اپنی جنم بھومی کو اس لئے نہیں بھولتا کہ اس نے اسی دھرتی پر لکھنا سیکھا تھا اور وہیں پر سب سے پہلے قادر مطلق کا نام لکھا تھا، وہیں پر پہلے پہل اس کے کانوں میں پرندوں کی آوازوں نے رس گھولا تھا اور وہیں پر پہلے پہل اس نے فطرت کو آنکھ کھول کر دیکھا تھا۔ اس کے نزدیک وہ دھرتی اور وہ شہر دیدنی تھا اور اس وقت دیدنی تھا، جب وہ وہاں رہا کرتا تھا، وہاں گلیوں میں ننگے پاؤں پھرا کرتا تھا، رات بھر چاند کے ہمراہ چلا کرتا تھا، مگر وہاں سے ہجرت کے بعد وہ شہر ناصر کے نزدیک سورج پور کی طرح ویران اور جنگل ہے، ایک ایسا سنسان جنگل کہ اب اس کے اسٹیشن سے نہ تو کوئی مسافر گاڑی میں سوار ہوتا ہے اور نہ ہی اترتا ہے۔ ناصر کاظمی کے یہاں یہی ہجرت کا سب سے بڑا وصف ہے کہ اس کے یہاں سوچوں کی مراجعت تو ہے، مگر عملی نہیں۔ سوچوں کی مراجعت کا سبب اس کی یادیں ہیں، جہاں وہ اپنے آپ کو گم کرکے تخلیق کے نئے حیران کن جہان آباد کرتا ہے، یہی صورت اس نظم "نشاط خواب" کی بھی ہے۔ ناصر کاظمی ایک خواب کی سرشاری میں وہ کچھ تخلیق کر دیتا ہے، جو ایک شاہکار بن جاتا ہے، مگر وہ جس عمل سے گزر کر یہ سب کچھ تخلیق کرتا ہے، اس کی حقیقت سوائے نشاط خواب کے کچھ اور نہیں ہوتی۔ ناصر نے جب سے انبالہ شہر سے ہجرت کی، وہ سر کی چھایا کے عبدل کی طرح چاہتے ہوئے بھی دوبارہ سورج پور نہیں گیا، مگر اس شہر اور اس کے مکینوں، وہاں کے پرندوں، لہلہاتے کھیتوں، بدلتے موسموں اور وہاں کی خوشبوؤں اور مہکاروں کو یاد ضرور رکھا۔ "نشاط خواب" میں ناصر کاظمی نے شاعری میں مصوری کی ہے۔ اپنے اس شہرت کے بارے میں ناصر نے انتظار

حسین سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔

"انتظار حسین! دراصل میں بظاہر جسمانی طور پر تو اب نہیں چلتا پھرتا کہ کچھ عرصے سے بیمار ہوں، مگر میرا ذہن، میری آنکھیں، میری یادیں اس طرح چلتی پھرتی ہیں، تمہارے ساتھ لاہور کی گلیوں میں، درختوں میں اور اب تم نے جو ماضی کی بات چھیڑی ہے تو وہ ایک بہت طویل بات ہے، اتنا ہے کہ جب پاکستان وجود میں آیا تو ایک بستی ہے، انبالہ

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی" ۴۸ ؎

یہ اقتباس پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے، اس سے آگے چل کر ناصر نثر میں اپنے شہر کا وہ نقشہ کھینچتے ہیں، جو انہوں نے اشعار کی صورت میں "نشاط خواب" میں کھینچا ہے۔ ناصر کا یہ شہر مختلف حوالوں سے ان کی شاعری میں نمودار ہوتا ہے ناصر کاظمی کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے گو ان کے پیش نظر ان کا اپنا شہر انبالہ ہے، مگر وسیع تر معنوں میں وہ ایک ایسے شہر کا خواب دیکھتے ہیں، جو ان کا آئیڈیل ہے اور ایسے شہر کے بارے میں ان کی تخیل کی پرواز میں جو ایک مثالی شہر سامنے آتا ہے، اس کے بارے میں ناصر یوں کہتے ہیں:

ہر کوچہ اک طلسم تھا ہر شکل موہنی
قصہ ہے اس کے شہر کا یارو شنیدنی
تھا اک عجیب شہر درختوں کی اوٹ میں
اب تک ہے یاد اس کی جگا جوت روشنی
بیچ بیچ کا اک مکاں پرستاں کہیں جسے
رہتی تھی اس میں ایک پری زاد پدمنی
اونچی کھلی فصیلیں، فصیلوں پہ برجیاں
دیواریں سنگ سرخ کی، دروازے چندنی

ناصر کاظمی نے اپنے شہر کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس میں وہ ان کے خواب کا ایک حصہ ہے، جو وہ اکثر اپنے اس محبوب شہر کے بارے میں دیکھا کرتے تھے، یہ انبالہ

ایک سادہ سا اور چھوٹا سا شہر ہے' جہاں آموں کے باغات بہت ہیں' یہاں کی زمین بارانی ہے' اس لئے ناصر نے اپنی اس نظم میں جہاں فواروں کا ذکر کیا ہے' وہ شاعری کی حد تک تو درست ہے' مگر حقیقت اس کے برعکس ہے' انبالہ میں پانی کی بہت کمی تھی' اس نظم میں ناصر نے جس پری زاد پدمنی کا ذکر کیا ہے' وہی اس کا اصل عشق تھا' جس کا ذکر ہم پہلے باب میں تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ ناصر کو بچپن اور لڑکپن میں جن جن چیزوں کا شوق تھا اور جو ان کے مشاغل تھے' وہ سب کے سب اس نظم میں موجود ہیں۔ ناصر نے کبوتروں کا ذکر اس طرح سے کیا ہے:

جھرمٹ کبوتروں کے اترتے تھے رنگ رنگ
نیلے' اجال' جو گئے' گلدار' کاسنی
پٹ بیجنا سی انکھڑیاں گل چاندنی سے تاج
چونچوں میں خس کی تیلیاں پنجوں میں پنجنی
سارنگیاں سی بجتی تھیں جب کھولتے تھے پر
یکبار گونج اٹھتی تھی سنسان کنگنی
استادہ اصطبل میں سبک سیر گھوڑیاں
ٹاپوں میں جن کی گرد ہو گردون گردنی

ان اشعار میں ناصر نے اپنے پسندیدہ مشغلوں کا ذکر بڑے خوب صورت شاعرانہ انداز میں کیا ہے' کبوتروں کے جھرمٹوں کا اترنا اور طرح طرح کے کبوتروں کا ہونا ناصر کی زندگی کا یہی حسین خواب تھا۔ ان کا اور کبوتروں کا ہمیشہ سے ساتھ رہا اور پھر ناصر نے اپنی ڈائریوں میں جہاں اپنی گھڑ سواری کا ذکر کیا ہے' ان اشعار سے بھی ان کے اس شوق کی تصدیق ہوتی ہے' آگے چل کر ناصر کھانے پینے کی اشیا کا ذکر بڑی دلچسپی کے ساتھ کرتے ہیں۔

کشمش' چھوارے' کاغذی بادام' چار مغز
رکھتے تھے رنگ رنگ کے میوے چشیدنی
مرغابیاں تلی ہوئیں' تیتر بھنے ہوئے
خستہ کباب سیخ کے اور نان روغنی

یہاں کھانوں میں ناصر نے جو مرغابیاں اور تیتروں کا ذکر کیا ہے' اس سے بھی ان کے شکار کے شوق کی عکاسی ہوتی ہے' انبالہ کے لوگ زندہ دل تھے اور موسیقی میں گہری دلچسپی لیتے تھے' وہاں کی گانے والیاں بھی اپنے فن میں یکتا تھیں' انبالہ کے کھاتے پیتے لوگ رات کو ان کنچنیوں کا گانا سننے ضرور جاتے تھے' کئی رئیسوں نے تو اپنی تمام دولت کنچنیوں کے کوٹھوں پر لٹا دی تھی۔ انبالہ میں سیدوں کو میر صاحب کہہ کر پکارتے تھے' سو کئی ایک میر صاحبان رات کو کنچنیوں کے کوٹھوں پر موسیقی سے دل بہلا رہے ہوتے تھے' ناصر نے اس ماحول کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

سازوں کی گت پلٹ گئی ' طبلے ٹھنک گئے
پی کر شراب ناچ رہی تھی وہ کنچنی!
انگارہ سا بدن جو دمکتا تھا بار بار
گل منہ پہ ڈھانپ لیتے تھے کرنوں کی اوڑھنی
ہر وانگ باجنے لگے باجے نشاط کے
مردنگ ' ڈھول ' تان پرا ' سنکھ سنکھنی

یہاں ناصر نے موسیقی سے اپنی دلچسپی کے سبب وہ ساز بھی دکھا دیئے ہیں' جن سے شادیانے پھوٹ رہے تھے' آگے چل کر ناصر کاظمی انبالہ کی تہذیب و تمدن کا نقشہ کھینچتے ہوئے شادی بیاہ کا ایک منظر بڑے خوبصورت انداز میں یوں پیش کرتے ہیں:

اڑ اڑ کے راج ہنسوں نے جنگل جگا دیا
گھوڑوں کے رتھ میں بیٹھ گئے جب بنا بنی
منہ دیکھتے ہی رہ گئے سب ایک ایک کا!
منہ پھیر کر گزر گئی وہ راج ہنسنی
منظر مجھے ہوس نے دکھائے بہت مگر
ٹھہرا نہ دل میں حسن کا رنگ شکستنی
تارا سحر کا نکلا تو ٹھنڈی ہوا چلی
نیند آ گئی مجھے کہ وہاں چھاؤں تھی گھنی

اس خوب صورت منظر کو بسا کے جب صبح کا تارا اپنا روپ دکھاتا ہے تو ناصر

نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ ناصر کی زندگی کا ہمیشہ یہی شعار رہا' وہ تمام رات جاگتے ہوئے گزارتے اور جونہی صبح ہوتی ٹھنڈی ہوا سے ان کی آنکھ لگ جاتی۔ مطلع ثانی میں ناصر کاظمی نے انبالہ شہر کا نقشہ دکھانے کے بعد اپنے آباؤ اجداد کو یاد کیا ہے۔ ناصر کا تعلق سادات کاظمی سے تھا' جو حضرت امام موسیٰ کاظمؒ کی اولاد ہیں۔ اولاد علیؓ ہونے کے ناتے سے وہ اپنے اجداد کی بہادری پر ہمیشہ فخر کرتے تھے' سو مطلع ثانی میں ناصر نے اپنے اجداد کی تعریف یوں کی ہے:

وہ شیر سو رہے ہیں وہاں کاظمین کے
ہیبت سے جن کی گرد ہوئے کوہ آہنی
شاہان فقر وہ مرے اجداد باکمال
کرتی ہے جن کی خاک بھی محتاج کو غنی
سر خم کیا نہ افسر و لشکر کے سامنے
کس مرتبہ بلند تھی ان کی فروتنی
کرتی تھی ان کے سایہ محمود میں قیام
قسمت مآبی ' خوش نسبی ' پاک دامنی
شب بھر مراقبے میں نہ لگتی تھی ان کی آنکھ
دن کو تلاش رزق میں کرتے تھے جان کنی
تھی گفتگو میں نرم خرامی نسیم کی
ہر چند وہ دلیر تھے تلوار کے دھنی
جاتے ہیں اب بھی اس کی زیارت کو قافلے
اس در کے زائروں کو نہیں خوف رہزنی
اس آستاں کی خاک اگر ضوفشاں نہ ہو
برجوں سے آسمان کے اڑ جائے روشنی

کاظمین شریف میں حضرت امام موسیٰ کاظمؒ کا روضہ اقدس ہے' جہاں روزانہ ہزاروں زائرین شرف باریابی حاصل کرتے ہیں۔ کاظمی سادات کا تعلق بھی انہیں امام سے ہے اور وہ انہیں کی اولاد ہیں' سو ناصر نے اپنے جد کی تعریف کرتے ہوئے اہل

بیت کا مقام اور مرتبہ واضح کیا ہے۔

آگے قطعہ بند اشعار میں ناصر نے کھل کر اپنی محبوب بستی انبالہ کا ذکر کیا ہے اور انہوں نے اہل لاہور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں انبالہ کا رہنے والا ہوں' یہ اسی طرح سے ہے' جیسے میر نے لکھنؤ پہنچ کر اپنا تعارف اشعار میں کرایا تھا۔ ناصر بھی اپنا تعارف ان خوب صورت اشعار میں کراتے ہوئے کہتے ہیں' اے ساکنان خطہ لاہور میں اسی شہر سے لعل معدنی لے کر آیا ہوں' گو میں داغ بے وطنی سے جلتا ہوں' مگر مجھے یقین ہے کہ میرے اشعار کا سوز میرا نام روشن کرے گا' آگے چل کر کہتے ہیں :

خوش رہنے کے ہزار بہانے ہیں دہر میں
میرے ضمیر میں ہے مگر غم کی چاشنی
یارب زمانہ ممتحن اہل صبر ہے
دے اس دنی کو اور بھی توفیق دشمنی
ناصر یہ شعر کیوں نہ ہوں موتی سے آبدار
اس فن میں کی ہے میں نے بہت دیر جاں کنی
ہر لفظ ایک شخص ہے ہر مصرع آدمی
دیکھو مری غزل میں مرے دل کی روشنی

اس آخری قطعہ بند اشعار میں ناصر نے اپنا نظریہ فن بیان کر دیا ہے اور غم کی چاشنی کو اپنے شاعرانہ مزاج کا جزو قرار دے کر اپنے اشعار میں دکھوں کی آنچ اور اداسی کی چھاؤں کا سبب بیان کر دیا ہے اور اپنی محبوب صنف سخن غزل کو اپنے دل کی روشنی کہہ کر غزل کی صنف کو نئی قوت سے ہم کنار کیا ہے' یہ نظم جو غزل کی مہکاروں سے آراستہ ہے' اس کا ایک ایک شعر مثل آفتاب ہے' جس کی روشنی سے آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں' مگر ناصر کاظمی کے ستارا حرف دلوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

ناصر کاظمی کی دوسری نظم "شہر غریب" ایک طرح کا شہر آشوب ہے۔ ناصر کاظمی نے اس شہر کی بازگشت میں خود کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے' مگر یہ ایک ایسا

دھندلا شہر ہے' جہاں کچھ سجھائی نہیں دیتا اور ایسے میں شاعر ایک وہم اور وسوسے کی دنیا میں پھنس کر رہ جاتا ہے' کبھی اسے گمان ہوتا ہے کہ کوئی سایہ اس کے ساتھ چل رہا ہے' کبھی اسے گھورتی ہوئی دو آنکھیں بلا معلوم ہوتی ہیں' ایک طرف اجڑے مکان کا منظر دوسری جانب شہر خموشاں کہیں کسی اندھیرے مکان میں دیا ٹمٹا رہا ہے' دل چاہتا ہے کہ شاعر اس مکان پر دستک دے' مگر وہم کی دیمک اس کا لہو چاٹ رہی ہے۔ اس نظم میں ناصر کاظمی نے بے یقینی' وہم اور وسوسوں کی کیفیت بیان کرنے کے لئے سانپ کی علامت کو بار بار استعمال کیا ہے:

بوٹا بوٹا ہے سانپ کی تصویر
پتا پتا ہے سانپ کا ٹیکا
آسماں جیسے سانپ کی کنڈل
تارا تارا ہے سانپ کا منکا
آ رہی ہے لکیر سانپوں کی
ہر گلی پر ہے سانپ کا پہرا

یہاں سانپ کی علامت خوف و ہراس کو ظاہر کرتی ہے' ہر جگہ سانپ ہی سانپ ہیں' یہاں تک جو لوگ عزیز جاں تھے' وہ بھی آستین کے سانپ ہیں:

ہاں مری آستیں کا سانپ ہے یہ
کیوں نہ ہو مجھ کو جان سا پیارا

اس سارے خوف و ہراس اور تنہائی کی فضا میں ناصر کاظمی نظم کے آخر میں اپنے محبوب سے سوال کرتے ہیں۔

تیری بستی میں اتنی رات گئے
کون ہوتا بھلا یہ میرے سوا
ارے یہ میں ہوں تیرا شہر غریب
تو گلی میں تو آ کے دیکھ ذرا

یہاں بھی ناصر نے اپنی غمگیں طبیعت کی اداسی اور ہجر کی کیفیت کو اپنے روایتی انداز میں بیان کیا ہے اور آخر میں اسے بے یقین اور بے حسن معاشرے میں

ایک حساس دل رکھنے والے کی دلی کیفیات کو یوں بیان کرتے ہیں:

یہاں پھلتا نہیں کوئی آنسو
یہاں جلتا نہیں کسی کا دیا
تیرا کیا کام تھا یہاں ناصر
تو بھلا اس نگر میں کیوں آیا

یہ نظم بھی ناصر کی پہلی نظم کی طرح غزل کے قریب ہے۔ ناصر نے ابتدا سے مقطع تک ایک قافیہ کا اہتمام کیا ہے اور غزل کے آہنگ میں لکھی گئی اس نظم میں اپنے اس ماحول کی عکاسی کی ہے، جو اس کے ارد گرد سانپ کی طرح کنڈلی مارے ہوئے ہے۔ یہ نظم ناصر کاظمی نے ۱۹۵۲ء میں کہی، یہ وہ دور تھا، جب ہجرت مارے ابھی تک پریشان حال تھے اور انہوں نے نئی زمین سے اپنا رشتہ مضبوط نہیں کیا تھا، دوسرے معنوں میں ان کے قدم ابھی پوری طرح زمین پر جمے نہیں تھے، سو اپنے ماحول میں بے یقینی اور وہم اور وسوسوں کی فضا کو ناصر نے اس نظم میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

جولائی ۱۹۵۲ء میں لکھی گئی یہ نظم "نیا سفر" ایک تابناک روشن مستقبل کا امکان لئے ہوئے ہے۔ یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہے اور اس میں وہی خصوصیات موجود ہیں، جو ربط کے لئے مثنوی کے اشعار میں ہوتی ہیں، مثنوی کے اشعار کہانی بیان کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑے ہوتے ہیں، یہی خصوصیت اس مثنوی نما نظم کی بھی ہے کہ اس کے تمام اشعار زنجیر کی ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں، اس کا ابتدائی شعر ہی نئی زندگی کی بشارت بن کر طلوع ہوتا ہے۔

اندھیروں کی نگری سے پھوٹی کرن
مہکنے لگا خاک دان کہن
اٹھا محمل وقت کا ساربان
نئی منزلوں کو چلے کاروان

اس نظم میں نئی بشارتیں تحریر کرنے کے لئے ناصر کاظمی نے اسی ایمجری سے

کام لیا ہے، جس کی تصویر کشی سے فطرت کا ایک ایک رنگ واضح ہو جاتا ہے۔ ناصر کاظمی نے اس نظم میں پہلی مرتبہ اس خواب کی تعبیر پیش کی ہے، جو یہاں کے سب باسیوں کے خواب تھے، وہ اس خطہ سرسبز پر اللہ تعالیٰ کے نام کی گونج کے ساتھ ساتھ اسم محمدؐ کا اجالا دیکھنے کے متمنی تھے۔

کھلا جنت صبح کا در کھلا
بہ آواز اللہ اکبر کھلا
مہکنے لگیں دھان کی کھیتیاں
کہ ابر بہاری برس کر کھلا

اس طرح سے ناصر کاظمی اپنے غموں کی حویلی سے نکل کر خوشیوں کا نیا سورج اور نیا دن نکلتے دیکھتے ہیں اور ہجر کی رات کے ستارے کو اپنی آنکھوں کے سامنے چمکتا دیکھتے ہیں، اس نظم سے ناصر کاظمی کا شعری مزاج سمجھنے میں مدد ملتی ہے، وہ ایک ایسا شاعر تھا، جو شام غم فراق کو صبح بشارت کی خبر کے طور پر سننے اور دیکھنے کا متمنی تھا، اس کے یہاں زندگی ایک نعمت خداوندی ہے اور وہ زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرنے کا متمنی ہے، اس لئے وہ اس نظم کا اختتام اس شعر پر کرتا ہے۔

نئے دن کا سورج دمکنے لگا
زمیں کا ستارہ چمکنے لگا

بارش کی دعا ناصر کاظمی کی ایک ایسی نظم ہے، جس کے بارے میں مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہے، ان تمام روایتوں کی روح ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ گو یہ نظم ۲ فروری ۱۹۶۷ء کو شائع ہوئی، مگر یہ لکھی گئی تھی، جون ۱۹۶۶ء میں، جب لاہور میں بے پناہ گرمی پڑ رہی تھی، اس واقعہ کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں کہ ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی کنٹرولر محمد اعظم خان راوی ہیں کہ اس شدید گرمی میں کچھ لوگ استاد امانت علی خاں سے کہنے لگے کہ خان صاحب اگر آپ ملہار گا دیں تو شاید بارش ہو جائے۔ استاد امانت علی خاں اور ناصر کاظمی میں بہت پیار تھا، وہ کہنے لگے، ایک شرط ہے کہ اگر ناصر کاظمی ابھی ملہار کے گیت لکھیں تو میں ابھی گا دوں گا، چنانچہ ناصر کاظمی نے یہ بارش کی دعا لکھی۔

اے داتا بادل برسا دے
فصلوں کے پرچم لہرا دے
دیس کی دولت دیس کے پیارے
سوکھ رہے ہیں کھیت ہمارے
ان کھیتوں کی پیاس بجھا دے
اے داتا بادل برسا دے

ناصر کاظمی نے گو اسے عنوان دے کر نظم بنا دیا ہے، مگر ہیئت کے اعتبار سے یہ ایک خوب صورت گیت ہے، محمد اعظم خان ہی کا کہنا ہے کہ جب استاد امانت علی خاں نے یہ گیت گایا تو شام کو موسلا دھار بارش ہو گئی اور سب نے استاد امانت علی خاں اور ناصر کاظمی کو مبارک باد پیش کی۔۴۹

حصہ اول کے آخر میں دو نظمیں گجر پھولوں کے اور ساتواں رنگ دی گئی ہیں، یہ چھوٹی چھوٹی نظمیں الگ الگ کیفیت کی ہیں۔ پہلی نظم میں ناصر نے ایک کرن جو چشم و چراغ دل شب بھی ہے اور خون رنگ دل بھی، یہ کرن خوشی کی علامت ہے، جو گجر پھولوں کے گیت بن رہی ہے، دوسری مختصر نظم "ساتواں رنگ" میں ناصر نے بڑے اختصار کے اور خوب صورت انداز میں دیکھے رنگوں میں ان دیکھے رنگ، جسے اس نے ساتواں رنگ کہا ہے، کے دیکھنے کی آرزو کی ہے۔

حصہ دوم:

نشاط خواب کے دوسرے حصے میں ناصر کاظمی کی چھ نعتیں، ایک سلام، پانچ رباعیاں اور تیرہ قومی نغمے اور قومی نظمیں شامل ہیں۔ ناصر کاظمی نے گو کم نعتیہ کلام لکھا، مگر ان چھ نعتوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ نعت گوئی کی صنف میں مزید کچھ کہتے تو وہ ایک منفرد نعت گو کے حوالے سے بھی اپنا لوہا منواتے۔ ناصر کاظمی اپنا جد امجد سرکار دو عالمؐ کو قرار دیتے ہیں، ان کی ڈائری کے ایک ورق پر اس کے شواہد ملتے ہیں، جو پہلے باب میں درج کی جا چکی ہے۔ ان کا اللہ اور اس کے رسولؐ پنجتن

پاک اور تمام اماموں پر مکمل ایمان تھا۔ شیخ صلاح الدین لکھتے ہیں:

"وہ رسولؐ اللہ کو اپنا جدامجد کم ہی کہا کرتا تھا' وہ اکثر ان کو "میرے نانا" کہا کرتا تھا' لیکن وہ اس بات کا ہمیشہ اہتمام کرتا تھا کہ وہ اپنی سیادت کی بات خود نہ چھیڑے' کوئی دوسرا ہی چھیڑتا تھا' اس کا بھرپور انداز میں نعت گوئی اور سلام کی صنف کی طرف نہ آنا بھی ایک طرح کی خود احتسابی تھی' وہ اس خشوع و خضوع کے ساتھ یہ متبرک کلام نہیں کہہ سکے' کیونکہ اس کے تقاضے نہایت ارفع تھے' سو اس نے جو چند نعتیں' حمدیہ اشعار' سلام اور رباعیات کہیں ہیں' وہ اس کی سرکار دو عالمؐ اور ان کے اہل بیت سے سچی عقیدت و مودت کی دلیل ہیں"۔

پہلی نعت رسول مقبولؐ میں ناصر کاظمی نے غالب کے مصرعوں کو بطور تضمین استعمال کیا ہے' یہ مصرعے کچھ اس طرح سے ہیں:۔

ع۔ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے
ع۔ کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے
ع۔ کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے
ع۔ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

ناصر نے غالب کے کلام کے حوالے سے جو تضمین پیش کی ہے' ان کی عقیدت کی خوشبو اس آخری بند سے واضح ہوتی ہے:

تھکی ہے فکر رسا اور مدح باقی ہے
قلم ہے آبلہ پا اور مدح باقی ہے
تمام عمر لکھا اور مدح باقی ہے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

اگلی نعت میں اپنی کم مائیگی کا اظہار آخری شعر میں یوں عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں:

میں کچھ بھی نہیں مجھے کیا ہے غم جب تیرا کرم ہے شاہ کرم
شاداب ہے میرے تن کا بن اے پاک نبیؐ رحمت والے

ناصر کاظمی سرکار دو عالم کی ذات کو نور سمجھتے تھے اور یہی ان کا ایمان تھا:

تمہارے نور سے معمور ہیں وجود و عدم
اسی چراغ کو ہم روشنی سمجھتے ہیں
سمجھ سکیں گے وہ کیا رتبہ نبیؐ کریم
جو آدمی کو فقط آدمی سمجھتے ہیں

نعت نمبر پانچ میں رسالت مآبؐ کے آخری نبی ہونے کے مضمون کو اس طرح سے باندھتے ہیں:

سب جہانوں کی رحمت کہا آپؐ کو
کتنا خوش ہے خدا یا نبی آپؐ سے
ختم ہے آپؐ پر شان پیغمبری
یہ روایت مکمل ہوئی آپؐ سے

حضورؐ سرور کائنات کی ولادت پر ناصر نے جو نعت کہی اس کے شعر دیکھیے:

کس کے قدم سے چمکی ہے بطحا کی سرزمیں
ظلمت کدوں میں شور نوید سحر ہے آج
ناصر در حضورؐ سے جو چاہو مانگ لو
وا خاص و عام کے لیے باب اثر ہے آج

ناصر کاظمی نے ختمی مرتبتؐ سے بے پناہ عقیدت کو اپنی مختصر نعتوں میں بیان کرنے کے علاوہ کربلا کے شہیدوں کو ہدیہ سلام بھی پیش کیا ہے' ان کے اس ایک سلام اور رباعیوں میں امام مظلوم اور ان کے بہتر جانثاروں کی مودت کا باب کھلتا ہے۔ سلام میں وہ کہتے ہیں:۔

لہو لہو ہے زباں قلم بیاں کے لئے
یہ گل چنے ہیں شہیدوں کی داستاں کے لئے
دیا بجھا کے یہ کہتے تھے ساتھیوں سے حسینؓ
جو چاہے ڈھونڈ لو رستا کوئی اماں کے لئے
کہاں کہاں نہ لٹا کاروان آل نبیؐ

فلک نے ہم سے یہ بدلے کہاں کہاں کے لئے

یہ دشت کرب و بلا ہے جناب خضر یہاں

ہے شرط تشنہ لبی عمر جاوداں کے لئے

ناصر کاظمی نے ایک نعت کے سوا تمام نعتیں اور یہ سلام غزل ہی کی ہیئت میں تخلیق کیا ہے‘ گو ان نعتوں اور اس سلام سے ناصر کاظمی کی سرکار دو عالمؐ اور فخر موجودات اور کربلا والوں سے بے پناہ‘ عقیدت کی مہک محسوس ہوتی ہے‘ مگر یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ناصر کاظمی نے ان نعتوں اور سلام میں اپنی غزلوں یا پھر اس ایک حمدیہ غزل کی طرح سے بھی کوئی جدت پیدا نہیں کی‘ البتہ ان کی ایک رباعی میں ان کی نئی شاعری کی خوشبو محسوس ہوتی ہے‘ رباعی کچھ اس طرح سے ہے:

کیا نقل کروں شام غریباں کی بہار

باقی تھے ابھی دھوپ کے کم کم آثار

بیٹھا تھا سر خیمہ کبوتر کوئی

مہتاب سے پر‘ لال لہو سی منقار

ناصر نے یہاں کبوتروں کے لال پروں اور لال منقار سے کرب و بلا میں مظلوموں پر جو بیتی اسے نہایت موثر انداز میں بیان کر دیا ہے‘ یہی ناصر کاظمی کی شاعری ہے‘ لگتا ہے‘ یہ نعتیں اور سلام ناصر کاظمی نے محض ریڈیو اور ٹی وی کے مشاعروں میں پڑھنے کے لئے لکھے تھے‘ سلام کے آخر میں ۱۸ مارچ ۱۹۷۰ء پاکستان ٹیلی وژن درج ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی والے اپنے نعتیہ مشاعروں یا محفل مسالمہ میں شعرا کو مدعو کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ آیا جن شعرا کو وہ مدعو کر رہے ہیں‘ انہوں نے پہلے اس صنف میں کچھ کہا بھی ہے یا نہیں‘ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ غزل گو اور نظم گو شعرا کو ان مبارک محفلوں میں مدعو کر کے ان سے سلام اور نعت کہلائی جاتی ہے‘ اس طرح کا گمان ناصر کاظمی کے نعتیہ کلام اور سلام پر بھی ہوتا ہے‘ وگرنہ وہ اس صنف میں اتنا مختصر کبھی نہ کہتے۔

نشاط خواب میں نعتیہ کلام‘ سلام اور رباعیات کے بعد قومی نغمے اور قومی نظمیں شامل ہیں‘ جو ناصر کاظمی کے جذبہ حب الوطنی اور اس پاک دھرتی سے بے پناہ

عشق کی دلیل ہیں۔ ناصر کاظمی ایک سچے پاکستانی اور ایک محب وطن شاعر کے روپ میں یہاں اپنی پہچان کراتے ہیں' ہجرت کے بعد ناصر کاظمی نے اس مقدس دھرتی سے اپنا جو جذباتی رشتہ قائم کیا' ناصر کاظمی کی یہ قومی شاعری اسی کا عکس جمیل ہے۔ ڈاکٹر مظفر عباس نے قومی شاعری کی تعریف یوں کی ہے:

"ایسی شاعری جو قوم کے کسی بھی پہلو سے متعلق ہو' قومی شاعری کے زمرے میں آتی ہے' کسی قوم کے علمی ادبی ثقافتی اور ذہنی و قلبی رجحانات کو احاطہ قلم میں لانے کے لئے نثر کے مقابلے مین شاعری زیادہ ممد و معاون ثابت ہوتی ہے------ قوم کو درس دینے اور اس میں حریت کے جذبات پروان چڑھانے کے لئے شعر کا وسیلہ بہت زیادہ موزوں و مناسب ہے' دنیا کی تمام قوموں کے شعرا نے اس وسیلے سے کام لیا ہے اور دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری میں قومی شاعری کی ایک مربوط و مستحکم روایت موجود ہے"۔۔۔۵۰

ڈاکٹر مظفر عباس نے جو قومی شاعری کی تعریف کی ہے' اس تعریف کی روشنی میں اگر ہم تاریخ پاکستان کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمارے یہاں قومی شاعری کی تاریخ تحریک پاکستان سے شروع ہوتی ہے' ہمارے شعرا نے انگریز اور ہندو سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لئے تحریک پاکستان کے مجاہدین کے شانہ بشانہ قلمی جہاد میں حصہ لیا اور اس دور میں جو قومی نغمے تخلیق کئے' وہ تاریخ پاکستان اور تحریک پاکستان کا ایک اہم باب ہیں' قیام پاکستان کے بعد وطن کی آزادی کے نغمے گائے گئے اور پاکستانی شعرا نے اپنے ملک کی مٹی کی خوشبو اور یہاں کی مہکاروں کے حوالے سے قومی نغمے لکھے اور قومی نظمیں کہیں۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ نے پوری قوم میں بیداری کی ایک لہر پیدا کر دی اور اس دوران پاکستانی قوم نے دشمن کے مقابلے میں جس اتحاد یگانگت کا ثبوت دیا اور جس جذبہ حب الوطنی کا مظاہرہ کیا' وہ بھی تاریخ پاکستان کا ایک سنہری باب ہے۔ پاکستانی افواج اور عوام نے اپنے سے کئی گنا بڑی طاقت والے دشمن کی للکار کا جواب جس بہادری اور جرات اور بلند حوصلگی سے دیا اور جس طرح سے اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر

پوری قوم کھڑی ہو گئی، اس کی مثال تاریخ حریت میں کم ہی ملتی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے پاکستانی قوم کو ایک نیا جوش اور ولولہ دیا۔ جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہمارے اہل قلم نے جن میں شعرا پیش پیش تھے، قلمی جہاد کے کئی حیرت انگیز نئے باب رقم کیے۔ ڈاکٹر مظفر عباس کا کہنا ہے:

"اس سترہ روزہ جنگ نے پاکستان کے عوام میں ایک نیا جوش، ایک نیا ولولہ اور ایک نئی امنگ پیدا کی۔ دس کروڑ عوام ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند پاک فوج کے شانہ بشانہ ملک کے لئے کھڑے ہو گئے۔ شعرا نے بھی اپنا کردار بخوبی ادا کیا، اس دور میں تخلیق ہونے والی شاعری اگرچہ جذباتی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو قومی شاعری اس سترہ روزہ جنگ کے نتیجے میں تخلیق ہوئی، وہ شاعری کے تمام معیاروں پر پوری اترتی ہے، ان میں سے اکثر قومی ترانے جنگ کے دنوں میں ریڈیو سے نشر ہوئے اور زباں زد عام ہو گئے، آج بھی ان ترانوں کو بہت احترام سے سنا جاتا ہے"۔۔۔ ۵۱

ڈاکٹر مظفر عباس نے سترہ روزہ جنگ کے حوالے سے تخلیق پانے والے قومی ترانوں اور ان کے خالقوں کی جو تعریف کی ہے، ان میں ناصر کاظمی کے قومی ترانے بھی شامل ہیں۔ ناصر کاظمی کو اس زمانے میں ریڈیو کی نوکری اختیار کئے ایک سال ہی گزرا تھا، چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اپنی غیر مطبوعہ ڈائری میں لکھتے ہیں

"ابھی صبح کاذب تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی، ہم حیران ہوئے کہ آج اتنی جلدی کون آ گیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو محلے کے دودھ والوں نے بتایا کہ پاکستان پر ہندوستان کا حملہ ہو گیا ہے، انہوں نے کہا کہ ابھی جلو سے ان کے دو آدمی یہ خبر لائے ہیں، میں فوراً تیار ہو کر ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ خبر درست تھی۔ دن کے ساڑھے نو بجے تھے کہ ایک دم آسمان پر بہت زور سے دھماکہ ہوا، ہم سمجھے کہ دشمن نے گولہ باری کی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جیلانی صاحب انجینئر اور بٹ صاحب ڈائریکٹر مسکرائے اور کہنے لگے کہ ہمارے ۱۰۴ جہازوں نے ساؤنڈ بیریئر عبور کیا ہے۔ مرزا ادیب

وزیر آغا کی گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ریڈیو اسٹیشن میں اس وقت صرف تین ترانے موجود تھے' ایک فلمی ترانہ "ساتھیو مجاہدو۔۔" دوسرا عالی کا ترانہ "میرے نغمے تمہارے لئے ہیں"۔ جو رن کچھ کی جنگ کے موقع پر لکھا گیا تھا اور ایک اور تھا۔ میں نے فوراً ایک ترانہ لکھا۔

"ہمارے پاک وطن کی شان"۔۔۔ ۵۲

ناصر کاظمی نے پاک بھارت جنگ کے حوالے سے اپنے جس ترانے کا ذکر کیا ہے' وہ نشاط کے قومی ترانوں کے انتخاب میں شامل نہیں ہے' مگر یہ ریڈیو سے گایا ضرور گیا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں تقریباً تمام شعرا نے قلمی جہاد میں حصہ لیا اور اس دور میں جن شعرا کے قومی نغمے اور نظمیں مقبول عام ہوئیں' ان میں بقول ڈاکٹر مظفر عباس یہ شامل تھے۔

یہ ہواؤں کے مسافر یہ سمندروں کے راہی (صوفی تبسم)
کس حرف پہ تو نے گوشہ لب اے جان جہاں غماز کیا (فیض احمد فیض)
تکبیر سے فضا کو جگاتے ہوئے بڑھو
نعرہ "علی" کا لگاتے ہوئے بڑھو (احسان دانش)
کروٹے جنگلوں کو اور پہاڑوں سے گزر جاؤ (حفیظ جالندھری)
ہم ہیں کیا لوگ بتا دیں گے ستمگاروں کو (ظہیر کاشمیری)
قسم ان سورماؤں' ان جیالوں اور دلیروں کی (جوش ملیح آبادی)
صبح کے نور میں لپٹا ہوا توپوں کا دھواں (قتیل شفائی)
افریشیا کے واسطے تھے ننگ انڈیا (انجم رومانی)
اے وطن کے سجیلے جوانو
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں (جمیل الدین عالی)
ہنستے پھولو ہنستے رہنا
تم ہو پاک وطن کا گہنا (ناصر کاظمی)
ملت نچھاور تقدیر یاور
تدبیر دمساز میرے ہوا باز (لطیف انور)

امن کی نیند سویا ہوا میرا شہر (صفدر میر)
اپنی جان نذر کروں اپنی وفا پیش کروں (مسرور انور)
پاکستان کے سارے شہرو زندہ رہو پائندہ رہو (منیر نیازی)
رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو (تنویر نقوی)
چاند اس رات بھی نکلا تھا مگر اس کا وجود (احمد ندیم قاسمی)
میں نے اس کے لیے بغاوت کی (شورش کاشمیری)
دائم آباد تیری حسین انجمن ۔ اے وطن اے وطن (احمد فراز)
تب و تاب خون شہید ہے مرے آسماں کو نئی رضا (سجاد باقر رضوی)
زندہ ہے لاہور پائندہ ہے لاہور (قیوم نظر)
خطہ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام (رئیس امروہوی)
میں نے گندم کے پودے سے دانہ (جیلانی کامران)
ہم کو اپنا قومی پرچم اپنی جاں سے پیارا ہے (شبنم رومانی)
اپنی قوت اپنی جاں لا الہ الا اللہ (محشر بدایونی)
مرے شہید کا ماتم نہ یوں کرو کہ شہید (رشیدہ سلیم سیمیں)
شہادت کے کنول کھلتے ہیں۔ ۵۳ (تبسم کاشمیری)

بقول ڈاکٹر مظفر عباس یہ تو وہ قومی نغمے اور نظمیں ہیں' جو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران فوری رد عمل کے طور پر شعرا نے تحریر کیں' لیکن ابھی ایسی بہت سی نظمیں اور قومی ترانے باقی ہیں' جو ان دنوں لکھے گئے اور وہ بے حد مشہور بھی ہوئے۔ ان جنگی قومی ترانوں میں اردو کے علاوہ پنجابی' پشتو' سندھی' بلوچی دیگر پاکستانی زبانوں میں ترانے بھی شامل تھے۔ ناصر کاظمی نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران کئی ایک قومی نغمے اور نظمیں لکھیں' جو نشاط خواب میں شامل ہیں' ان قومی نغموں میں جو مشہور ہوئے' ان کے ٹکڑے یہ ہیں۔

گلشن پاک ہمارا
تن من دھن سے پیارا

زندہ رہے گا زندہ رہے گا سیالکوٹ تو زندہ رہے گا

زندہ دلوں کا گہوارہ ہے سرگودھا میرا شہر

صدائے کشمیر آ رہی ہے' ہماری منزل قریب تر ہے

تو ہے میری زندگی اے مرے پیارے وطن

تو ہے عزیز ملت تو ہے نشان حیدر

ہنستے پھولوں ہنستے رہنا

ان کے علاوہ ناصر کاظمی کی وہ قومی نظمیں جو اس زمانے میں بہت پسند کی گئیں' اس انتخاب میں شامل ہیں' یہ حقیقت ہے کہ ناصر کاظمی نے جو قومی شاعری تخلیق کی ہے' وہ اس پایہ کی نہیں ہے' جس معیار کی ان کی غزلیں ہیں' مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ناصر کاظمی نے جو قومی ترانے لکھے' وہ اس زمانے میں زباں زد عام تھے' خاص طور پر سیالکوٹ اور سرگودھا کے حوالے سے جو ترانے لکھے' ان میں ان علاقوں کی تہذیب و ثقافت کی بھی پوری طرح عکاسی کی گئی' اسی طرح نشان حیدر عزیز ملت والا ترانہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔

ناصر کاظمی نے نہ صرف ۱۹۶۵ء بلکہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھی نظمیں اور ترانے لکھے' انہوں نے ایک نظم خود ٹی۔ وی سے پڑھی' یہ نظم جنگ کے عنوان سے پڑھی گئی۔ اس کے علاوہ ناصر کاظمی نے حضرت قائد اعظمؒ کے بارے میں بھی نظمیں لکھیں' جو انہوں نے ٹی۔ وی سے سنائیں بھی۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے حوالے سے ناصر کاظمی کی قومی شاعری جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہے' مگر یہ تمام قومی شاعری ناصر کاظمی کے شاعرانہ مزاج سے مختلف ہے۔ اس بارے میں شیخ صلاح الدین لکھتے ہیں:

"پاکستان پر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے دوران بھارت کے حملوں کے جواب میں اس نے ریڈیو کے لئے ترانے اور ایک دعا ضرور لکھی، مگر ان کا مصنف غزلوں، نشاط خواب، سر کی چھایا اور پہلی بارش کے شاعر سے قطعاً الگ ہے، اگرچہ پھر بھی منفرد ہے۔ ناصر کی شاعری کے جہاں کی سرحد پہ یہ نیا شاعر صرف ایک ننھے سے سبزہ زار میں، ایک مینار کی صورت، محدود و مسدود ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ کلام اس کی انسانی حب الوطنی کا موزوں الحان ہے، جو شاعری نہ بن سکا، کیونکہ اس میں نہ صرف لفظوں کا رکھ رکھاؤ اور ان کے استعمال کا سلیقہ وہی ہے، جو اس کی غزلوں کا وصف ہے، اس میں غنائیت ہے اور اس غنائیت میں شرف کی کیفیت رچی ہے اور اس میں گہرائی اور وسعت بھی ہے، مگر ان میں بلندی کی وہ لطیف ہوا نہیں ہے، جو اس کی شاعری کا خاص وصف ہے، جو اس کی غزلوں میں جسمانی طور پر محسوس کی جاسکتی ہے"۔۵۴

شیخ صلاح الدین نے گو ناصر کاظمی کے ان قومی ترانوں اور نظموں کو ان کی غزلوں کی طرح سے سراہا نہیں ہے، مگر وہ اس کلام کی بھی غنائیت کے حوالے سے تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ قومی ترانوں یا نغموں یا گیتوں میں موسیقی کا بہت عمل دخل ہوتا ہے اور موسیقی تب ہی اچھی بنتی ہے، جب شاعری میں بھی غنائیت ہو۔ ناصر کاظمی موسیقی کے اسرار رموز سے بخوبی واقف تھے، اس لئے انہوں نے گائیگی کے لئے جو ترانے لکھے، وہ موسیقی کے اعتبار سے بے مثال تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بے حد مقبول ہوئے، البتہ ناصر کاظمی نے جو قومی نظمیں کہی ہیں، وہ واقعی اس مزاج کی نہیں ہیں، جن کی طرف شیخ صاحب نے اشارہ کیا ہے، مگر ناصر کاظمی نے ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء کی جنگ میں جو ترانے لکھے، ان سے ایک اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار منفرد سوچ کے حامل شاعر ناصر کاظمی سے ہماری ملاقات ہوتی ہے، جو جذبوں کو لفظوں کا پیراہن دینا جانتا ہے۔

حصہ سوم:

تراجم:

نشاط خواب کا آخری حصہ تراجم پر مشتمل ہے۔ ناصر کاظمی نے جن بدیسی شعرا کے کلام کے تراجم کئے ہیں' ان میں تزے' یے' چائن و تنائی' وی لی' والٹ وٹمین اور رابرٹ فراسٹ کی نظمیں شامل ہیں' جب کہ ناصر نے خواجہ فرید کی کافی کا ترجمہ بھی "ان حد مرلی شور مچایا" کے عنوان سے کیا ہے۔ ناصر کاظمی نے بدیسی شعرا کے کلام کا جو ترجمہ کیا ہے' اس سے پہلی بات تو یہ واضح ہوتی ہے کہ ناصر کاظمی باقاعدگی کے ساتھ مغربی ادب کا مطالعہ کرتے تھے۔ شیخ صلاح الدین لکھتے ہیں:

"اسطرح اس نے اول اول سر آرتھر ریڈ نکسٹن کی "وسیع ہوتی ہوئی کائنات" سر جیمز جین کی "ہمارے گرد کائنات" ہربرٹ ریڈ کی "فن اور معاشرہ" سوزن لینگر کی فلسفے کا نیا آہنگ اور "احساس اور ہیئت" پڑھ ڈالیں' اس کے بعد اس نے کوئی سو سے زیادہ انگریزی کتابیں مجھ سے لے کر پڑھیں اور ان پر سیر حاصل باتیں کیں' اس طرح میرا مطالعہ میرے جسم و جاں میں رچ بس گیا' بعض کتابیں اس نے بحق ناصر ضبط کر لیں۔ ان میں ریڈ نکسٹن اور جیمز جین کی مذکورہ کتابیں ایڈتھ ستویل شاعر کی نوٹ بک پیسٹرناک کی نظموں کے تراجم پر مبنی کتاب جے ایم چون کی کتاب۔ انگریزی فرانسیسی' جرمن' ہسپانوی شعرا کے انگریزی تراجم سے اس کو دلچسپی ہونی ہی چاہیے تھی' اس نے ان کو نہ صرف شوق اور غور سے پڑھا' بلکہ ان پر اختر محمود اور مجھ سے بہت خوب صورت گفتگوئیں کیں۔ زاہد ڈار نے مجھے بتایا کہ اس کے ساتھ بھی وہ اکثر ٹی ہاؤس سے واپس گھر جاتے ہوئے رامبو' رلکے اور لورکا پر بہت اچھی باتیں کرتا تھا"۔ ۵۶

شیخ صلاح الدین کی اس روایت سے ناصر کاظمی کے انگریزی ادب کے مطالعہ کے شوق کی تصدیق ہوتی ہے، خود شیخ صاحب نے راقم سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آج بھی ناصر کے گھر میں میری کئی انگریزی کتابیں موجود ہیں، مگر اب میں ان کے بیٹوں سے واپس نہیں لوں گا، کیونکہ وہ بحق ناصر ضبط ہو چکی ہیں۔۔۵۷

شیخ صلاح الدین نے ناصر کاظمی کے انگریزی ادب کے مطالعہ کا جو ذکر کیا ہے، اس سے پہلے ایسے لوگوں کے کہے کی تردید ہوتی ہے، جو کہتے تھے کہ ناصر کا تمام بدیسی علم سماعی تھا۔ شیخ صلاح الدین نے اپنی کتاب ناصر کاظمی ایک دھیان کے آخر میں انگریزی کتب کی جو فہرست دی ہے، اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ناصر نے یہ تمام کتابیں خود ان کی وساطت سے پڑھی تھیں۔

ناصر کاظمی نے جو کتابیں۔۵۸ شیخ صلاح الدین کے توسط سے پڑھیں ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں ہیں جو ان کے زیر مطالعہ رہیں۔ یہ آج بھی ناصر کاظمی مرحوم کی ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں ہمیں ناصر کاظمی کے وسیع المطالعہ ہونے کی شہادت ملتی ہے اور دیکھا جائے تو یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ناصر کاظمی اپنے ہم عصر شعرا میں سب سے زیادہ وسیع المطالعہ شاعر تھا۔

ناصر کاظمی کے وسیع المطالعہ ہونے کی مزید تصدیق شیخ صلاح الدین یوں کرتے ہیں۔

"ناصر کاظمی کے مطالعے کی ایک جھلک دکھانے کے لئے اسی مضمون کے ضمیمے میں ایک فہرست درج کر رہا ہوں کہ ناصر نے میری وساطت سے کون کون سی کتاب پڑھی مگر اس سے یہ سمجھنا جائز نہ ہوگا کہ اردو کتابوں کے علاوہ اس نے یہی کتابیں پڑھی تھیں میرے علم میں ہے کہ وہ دوسرے دوستوں سے کتابیں لے کر پڑھتا تھا۔"۔۵۹

آگے چل کر شیخ صلاح الدین مزید لکھتے ہیں

"اس قوت کو چھپائے رکھنے کا ناصر اس حد تک اہتمام کرتا تھا کہ بعض قریبی دوست بھی اس کو بے علم گردانتے رہے اور اب بھی سمجھتے ہیں۔"۔
۶۰

ناصر کاظمی نے "نشاط خواب" کے حصہ سوم میں جو مختلف مغربی شعرا کے کلام کے ترجمے کئے ہیں وہ ان کی غزلوں کے معیار کے تو نہیں ہیں مگر اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ انہیں نظرانداز کر دیا جائے۔ ناصر کاظمی نے انگریزی نظموں سے اردو میں منظوم ترجمہ کرتے وقت شاعر کی اصل روح کو برقرار رکھا ہے صرف اس روح کو نئی زبان کا پیراہن عطا کیا ہے کسی تخلیقی ترجمے کی یہی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے کہ وہ ترجمہ ہوتے ہوئے بھی بذات خود تخلیق معلوم ہو۔ سو ناصر کاظمی کے یہ تراجم تمام کے تمام تخلیقی ہیں مگر اعلیٰ پایہ کے نہیں۔ البتہ ناصر نے خواجہ غلام فرید کی پنجابی کافی کا جو منظوم ترجمہ کیا ہے وہ اعلیٰ پایہ کا ہے اور یہ بذات خود ایک اردو کافی محسوس ہوتی ہے۔ ناصر نے ترے یے' چائن و سنائی' وی تی' والٹ وٹمین اور رابرٹ فراست کی شاعری کے جو تراجم کئے ہیں ان میں کہیں کہیں ناصر کی اپنی مخصوص لفظیات بھی در آتی ہیں اور ناصر کی انہیں لفظیات سے ہم پہچان سکتے ہیں کہ یہ ناصر کاظمی ہی کی تخلیق ہیں۔

جہاں تک ناصر کاظمی کی مغربی شعرا سے دلچسپی کا تعلق ہے اس کا سراغ اس کے مضامین اس کی ڈائریوں اور احباب سے اس کی گفتگو میں کئی جگہ ملتا ہے۔ تاہم ضروری نہیں کہ یہ دلچسپی تراجم کی شکل بھی اختیار کرے۔ ناصر کاظمی نے جو چند تراجم کئے ہیں وہ اس کی وسیع تر دلچسپی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ ان میں سے چند تراجم قدیم چینی' نظموں کے ہیں۔ قدیم چینی شاعری میں ایمجری سے بہت کام لیا جاتا تھا ہو سکتا ہے کہ ناصر کو اپنی شاعرانہ تصویر سازی کے سیاق و سباق میں یہ نظمیں پرکشش محسوس ہوئیں ہوں۔

چند امریکی نظموں کے جو تراجم اس نے کئے ہیں وہ "ایف۔ ایس۔ لن کے مرتب کردہ مضامین کے مجموعے دی امریکن سوسائٹی میں شامل تھے۔ ناصر نے ۱۹۶۵ء میں امریکن سنٹر لاہور کے ایما پر اس کا ترجمہ کیا تھا۔ خواجہ فرید کی کافی کا ترجمہ جشن فرید منعقدہ ملتان میں پڑھنے کے لئے کیا اس طرح ناصر کاظمی ان شعرا میں سے نہیں ہے جو ترجمے کو مسلسل اپناتے ہیں لیکن یہ چند تراجم ایک اچھے شاعر کی ترجمہ کرنے کی غمازی ضرور کرتے ہیں اور اس چیز کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ناصر نے شاعر کے مزاج کو سمجھ کر

اردو میں ایک خاص لفظیات بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً چینی نظموں کے جو تراجم اس نے کئے ہیں ان میں گیت کا سا انداز اپنانے کی کوشش کی گئی ہے اور مخصوص لفظوں کے استعمال سے ترجمہ میں ایک انفرادیت پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے مثلاً جب "تزے پے" کی نظم کا پہلا مصرع ع۔ "اس کا در چٹے پانی پر کھلتا ہے" سامنے آتا ہے تو سب سے پہلے چٹے کا لفظ متوجہ کرتا ہے سفید یا شفاف پانی کی بجائے چٹے کا لفظ ایک خاص سیاق و سباق کی طرف لے کر جاتا ہے اسی طرح کاٹھ کا پل اور ننھی منی سندری کے لفظ اس نظم میں متوجہ کرتے ہیں۔ اسی طرح نظم جاڑے کی رات میں نین پون' پی قوجن میں سندری کے دھیان' دکھیارے بن اور ڈھیر بندھاوں جیسے ہندی الفاظ یہ ثابت کرتے ہیں کہ ناصر کاظمی نے نظموں کے غنائی مزاج کو سمجھ کر ان کا اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح والٹ وٹ مین' کا انداز چونکہ نثری ہے اس لئے اس کا ترجمہ بھی نثری ہی کیا گیا ہے جو شاعر کے اسلوب کی بہت عمدگی سے نمائندگی کرتا ہے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"میں ان پرندوں کے جسم کے بعض حصوں کو شوخ زردی سے روشن اور باقی حصوں کو گھمبیر سائے میں ڈوبا ہوا دیکھتا۔

یہ پرندے فضا میں آہستہ آہستہ چکر کاٹتے رہتے اور پھر رفتہ رفتہ جنوب کی طرف پرواز کرنے لگتے۔

میں موسم گرما کے نیلگوں آسمان کا عکس پانی میں دیکھتا۔

میری آنکھیں کرنوں کے جگمگاتے راستے کو دیکھ کر چکا چوند ہو جاتیں سورج سے چمکتے پانی میں روشنی کی خوبصورت مرکز گریز لکیروں کو اپنے سر کے اردگرد رقصاں دیکھتا۔

جنوب اور جنوب مغرب کی پہاڑیوں پر ہلکی سی دھند چھائی ہوئی ہوتی میں بھی سفید بادلوں کو دیکھتا' جن میں بنفشی رنگ کی جھلک نظر آتی۔

میں بھی خلیج کے نچلے حصے سے جہازوں کو آتے ہوئے دیکھتا' یہ جہاز رفتہ رفتہ میری طرف بڑھتے چلے آتے اور میں ان مسافروں کو

دیکھتا جو مجھ سے قریب ہوتے۔

میں دو مستولوں والی اور ایک مستول والی کشتیوں کے سفید بادباں اور لنگر انداز جہازوں کو دیکھتا۔

ان کے ملاح مستولوں' رسیوں اور چپوؤں پر کام میں جتے ہوئے نظر آتے یا جہاز کو اتھلے پانی سے نکالنے کے لئے چپوؤں کو چلاتے ہوئے صاف نظر آتے۔ گول گول مستول' حرکت کرتے ہوئے جہاز اور ان پر سانپ کی مانند بل کھاتے ہوئے جھنڈوں کو دیکھتا۔

ناصر کاظمی کے تراجم تعداد میں اتنے کم ہیں کہ وہ ان کی ادبی اہمیت میں کسی اضافے یا کمی کا باعث نہیں بنتے مگر ناصر کی شاعری سے دلچسپی لینے والوں کے لئے یہ اس اعتبار سے اہم ضرور ہیں کہ ایک تخلیقی شاعر جب ترجمے کی کلوش کرتا ہے تو اس کا انداز پیشہ ور مترجموں سے کس قدر الگ ہوتا ہے۔

"نشاط خواب" کی شاعری گو ناصر کاظمی کے ایک اور طرح کے طرز احساس کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں نظمیں ہیں' ترانے ہیں اور تراجم ہیں۔ ناصر کاظمی نے اس زمانے میں نظمیں کہیں اور جب نظم ایک خاص ڈگر پر چل رہی تھی اور اس پر میرا جی' ن ۔ م ۔ راشد اور مجید امجد کے اثرات نمایاں تھے مگر ناصر کاظمی نے نظم نگاری میں بھی اپنا نیا راستہ نکالا اگر وہ غزل کی طرح نظم نگاری پر بھی توجہ دیتے تو یقینی طور پر نئی نظم کی حویلی تعمیر کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے۔ سردست ہم کہہ سکتے ہیں کہ "نشاط خواب" میں ناصر کاظمی نے نشاط خواب ہی کی صورت میں ایک شاہکار نظم تخلیق کی ہے اور ان کے قومی ترانے صنف ترانہ گوئی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(ر)

□☆::☆□

سر کی چھایا::

منظوم ڈرامہ

سر کی چھایا ناصر کاظمی کا منظوم ڈراما ہے اس ڈرامہ کا فنی جائزہ لینے سے پیشتر ہمیں کچھ ڈرامے کے بارے میں جاننا ہوگا۔ ہندوستان ابتدا ہی سے ڈرامے یا ناٹک کا گہوارہ رہا ہے مغرب میں ڈرامے کی روایت یونان سے چلی۔ ڈراما بذات خود یونانی لفظ ہے جس کے معنی اس زبان میں کچھ کر کے دکھانا ہیں۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں:۔

"مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں یونان کو ڈرامے کی تخلیق اور پرورش میں آغوش مادر اور گہوارہ محبت کی حیثیت حاصل ہے اور اس لئے ان دونوں ملکوں میں اس صنف ادب کے ساتھ جو تصورات وابستہ ہوئے اور جن روایتوں نے جنم لیا انہی کو آنے والی صدیوں میں بھی اس فن کے لازمی عناصر سمجھا گیا۔ یونانیوں نے ڈرامے کو جو کچھ سمجھا اس کا اظہار خود اس لفظ کی ساخت سے ہوتا ہے لفظ ڈراما کی اصل یونانی ہے اور اس زبان میں اس کے معنی ہیں کر کے دکھانا۔ گویا یونانیوں کے نزدیک ڈرامے کا سب سے بڑا امتیاز اور اس کا بنیادی عنصر اس کی یہی خصوصیت ہے کہ جو کچھ لکھا

جائے اسے کر کے دکھایا جائے۔ یہ ڈرامے کی بڑی سیدھی سادی لیکن بڑی واضح اور روشن تعریف ہے اور اس میں کسی شاعرانہ، تخیلی اور فلسفیانہ تاویل یا موشگافی کی گنجائش نہیں۔ ہندوستان میں ڈرامے کو جو کچھ سمجھا گیا ہے اس سلسلہ میں ایک بڑی دلچسپ روایت مشہور ہے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دیوتاؤں کے دل میں اپنی ہموار، سپاٹ، بے تغیر اور بے لطف زندگی سے اکتاہٹ پیدا ہوئی کہ وہ سب مل کر راجہ اندر کے پاس گئے اور اپنی بے کیف اور بے مزہ زندگی کے لئے کسی دلچسپ مشغلے کے طالب ہوئے۔ راجہ اندر نے کہا کہ چلو برہما کے پاس چلیں، ممکن ہے کہ کوئی صورت نکلے چنانچہ سب برہما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی عرضداشت پیش کی۔ برہما نے تھوڑے سے سوچ بچار کے بعد ایک ترکیب نکالی۔ انہوں نے رگ وید سے رقص، سام وید سے سرود، یجروید سے حرکات و سکنات، اور اتھروید سے اظہار جذبات کا طریقہ اخذ کر کے ایک پانچواں وید ترتیب دیا اور "نت وید" اس وید کا نام ہوا۔ یہ عجیب و غریب نسخہ دیوتاؤں کے ہاتھ آیا تو وہ خوش خوش واپس آئے۔ اس نسخہ کیمیا اثر کو عملی طور پر آزمایا اور یہی نسخہ آگے چل کر دنیا والوں کے لئے ان ناٹکوں میں رقص و سرود کے علاوہ اظہار جذبات اور حرکات و سکنات کو جو جگہ دی گئی ہے وہی ہر زمانے میں ڈرامے کی امتیازی خصوصیت رہی ہے۔ یہی خصوصیت ہے جس کا اظہار لفظ ڈراما کی اصل اور ساخت سے ہوتا ہے۔ اور یہی امتیاز ہے جس نے ڈرامے اور ان اصناف ادب کے درمیان فن اور تیکنیکی فرق پیدا کئے ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کے واقعات کو کہانی کی صورت دینے کی خدمت سرانجام دی ہے۔" [۱۱]

ڈرامہ کی اس تعریف پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسی تحریر جس سے کچھ کر کے دکھانا مقصود ہو ڈرامہ کہلاتی ہے۔ ہندوستان میں ڈرامہ کی روایت بہت پرانی ہے ایک طرح سے ڈرامہ ہندوؤں کے دھرم کا حصہ ہے جس میں مختلف دیوتاؤں کے سوانگ بھرے جاتے ہیں۔ ان کے جلوس نکلتے ہیں، مورتیاں بنائی جاتی ہیں۔ لیکن اصل

ڈرامہ وہ ہے جو بقول سید وقار عظیم انسانی زندگی کے واقعات کو کہانی کی صورت میں ڈھالے۔ ابتدا میں جو ڈرامے لکھے گئے وہ سٹیج کے لئے ہوا کرتے تھے یوں تو امانت لکھنوی کے منظوم ڈرامے اندر سبھا کو اردو کا پہلا ڈرامہ کہا جاتا ہے مگر اس سے پہلے بھی اردو ڈراموں کی روایت ملتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اندر سبھا" سے پہلے خود نواب واجد علی شاہ نے لکھنؤ میں ڈرامے لکھے اور رادھا اور کنھیا کے ناٹک کے علاوہ واجد علی شاہ نے اپنے تین منظوم قصوں کو ناٹک کی شکل دی۔ ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ پہلا ناٹک یا ڈرامہ کس نے لکھا۔ ہمیں اس حوالے سے یہی عرض کرنا ہے کہ ناٹک یا ڈرامے کی روایت اردو ادب میں بہت قدیم ہے اور اس قدیم روایت ہی کا ایک حصہ منظوم ڈرامہ ہے' بلکہ تاریخ ادب اردو پر نظر دوڑائی جائے تو بعض محققین کے نزدیک "اندر سبھا" ہی اردو کا پہلا ڈرامہ ہے جو منظوم ہے۔ناصر کاظمی نے سر کی چھایا کے نام سے جو ڈرامہ لکھا ہے اسے ایک کتھا کا نام دیا گیا ہے۔ کتھا کہانی کو کہتے ہیں سو یہ ایک چھوٹی سی کہانی ہے جسے ناصر کاظمی نے منظم کیا ہے۔ بقول باصر سلطان کاظمی:

> "منظوم ڈرامے پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی زبان غیر فطری اور مصنوعی اور امکانات محدود ہوتے ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ہر زندہ اور بڑے نثری ڈرامے کے کردار جو زبان بولتے ہیں وہ عام زندگی میں بولی جانے والی زبان سے اتنی ہی مختلف ہوتی ہے جتنی کہ نظم۔ نظم کی طرح یہ بھی بار بار لکھی گئی ہوتی ہے۔ ادیب اپنے اردگرد بولی جانے والی زبان میں سے بہت کچھ مسترد کر دیتا ہے اور جو کچھ چنتا ہے اسے بھی ایک خاص ترتیب دیتا ہے اس سلسلے میں کئی نئے الفاظ تخلیق کرتا ہے گویا ادب کی زبان بہت زیادہ نتھری اور منجھی ہوئی ہوتی ہے۔" سان او کیسے کہتا ہے کہ اگر گلی یا ڈرائنگ روم میں بولا جانے والا کوئی مکالمہ ہو بہو کسی ڈرامے میں شامل کر دیا جائے تو نتیجہ نہایت مضحکہ خیز اور بھونڈا ہوگا۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس ادبی کلام اور روزمرہ بول چال میں تفریق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ صرف ادبی کلام ہی کلام کہلانے کا مستحق

ہے۔" ۶۲

آگے چل کر باصر سلطان کاظمی لکھتے ہیں:۔

دنیائے ادب کا مطالعہ لارنس کی اس بات کی تائید کرتا ہے مثلاً اگر ہم شیکسپیئر کے کسی ہم عصر کو پڑھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس کی زبان شیکسپیئر سے کتنی مختلف ہے اس کے ہم عصر حقیقت نگاری کے شوق میں اپنی ہم عصر زبان لکھتے رہے۔ اسی لئے زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریریں غیر مقبول اور غیر معروف ہوتی گئیں۔ زبان جو سدا ارتقائی منازل میں رہتی ہے وقت کی کسوٹی پر وہی تحریر پوری اترتی ہے جو تخلیقی ہو۔ ۶۳

باصر سلطان کاظمی کے ان دونوں اقتباس سے ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اصل میں ڈرامہ کا تخلیقی ہونا ضروری ہے اور اس کی زبان میں اور روزمرہ کی زبان میں تخلیقی اعتبار سے فرق ہونا ضروری ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔ سان او کیسے اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے ادبی کلام اور روز مرہ بول چال میں تفریق کرتے ہوئے جو تعریف کی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام دانشور عام بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں فرق کو لازمی سمجھتے ہیں اور جہاں تک کسی ڈرامے کے منظوم ہونے کا تعلق ہے، ان دونوں اقتباسات سے اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ نثر کی نسبت نظم زیادہ توجہ سے لکھی جاتی ہے اور اس کے ایک ایک حرف پر بار بار غور کیا جاتا ہے اور جو چیز بار بار غور کرنے کے بعد شعور کے ترازو پر پورا اترتے ہوئے جذبات و احساسات کی ترجمان بنتی ہے وہی حقیقی معنوں میں تخلیق ہوتی ہے۔ اس تعریف کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر سر کی چھایا کا پہلا تاثر قائم کیا جائے تو اسے ہر اعتبار سے ایک تخلیق کا نام ہی دینا ہو گا۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر کہتے ہیں:۔

"دراصل پرانے زمانے میں ڈرامے منظوم ہوتے تھے بقول تاجور سامری سنسکرت ادب میں ڈرامہ شاعری ہی کا ایک جز قرار دیا گیا ہے نظم جو محض پڑھی جا سکے شرو کاویہ یعنی سننے کی شاعری اور مکالماتی نظم جسے "غنایا جا سکے، درشیہ کاویہ یعنی دیکھنے کی شاعری، چنانچہ سنسکرت ڈرامہ نگار کے لئے

شاعر ہونا ضروری تھا بلکہ شاعری پہلے اور ڈراما نگار بعد میں سمجھا جاتا ہے۔
اردو قدیم ڈرامے بیشتر منظوم ہیں۔ یہی حال دوسری زبانوں کا بھی ہے مگر
انگریزی میں زمانہ جدید میں بھی ڈرامے کو منظوم لکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔
ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے لیکچر "پوئٹری اینڈ ڈراما" میں جو ۲۱ نومبر ۱۹۵۰ء
کو ہارورڈ یونیورسٹی میں دیا گیا' اس بات پر زور دیا ہے کہ ڈراما کو منظوم لکھا
جائے اور نظم و نثر دونوں کو ڈراما میں استعمال کرنے کی بجائے صرف نظم کو
ہی استعمال کیا جائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ادبی نثر عام گفتگو سے مختلف
ہوتی ہے لہٰذا یہ کہنا کہ ڈرامہ کے کردار نثر میں گفتگو کر کے حقیقت یا
فطرت کے قریب ہو جاتے ہیں' غلط ہے یہاں ایلیٹ نے اس حقیقت کو
نظر انداز کر دیا ہے کہ ڈرامائی نثر اگرچہ عام لوگوں کی گفتگو نہیں ہوتی مگر وہ
شاعری کی نسبت عام گفتگو سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔"۔ ۶۴

ڈاکٹر ملک حسن اختر نے منظوم اور نثری ڈرامے کی حوالے سے اس اقتباس میں واضح کر دیا ہے کہ منظوم ڈرامے کی روایت اردو ادب میں بہت قدیم ہے اور ایسے ڈرامہ نگاروں کے لئے پہلے شاعر ہونا بہت ضروری ہے۔ دوسرے انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ڈرامہ بہرحال اگر نثر میں بھی لکھا جائے تو بھی اس کی زبان عام بول چال کی زبان سے مختلف ہوتی ہے مگر وہ شاعری کی نسبت عام گفتگو سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ ناصر کاظمی نے سر کی چھایا میں ان دونوں باتوں کا خیال رکھا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ناصر کاظمی ایسے ڈرامہ نگار ہیں جو بنیادی طور پر شاعر ہیں دوسرے انہوں نے منظوم ڈرامہ لکھتے وقت جہاں نظم کی ہیئت کا خاص طور پر خیال رکھا ہے وہاں ڈرامائی عناصر کو شامل کرتے ہوئے ایسے کردار تخلیق کئے ہیں جن کی گفتگو ڈرامہ کے ماحول کے مطابق عام بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہے۔ یہاں ہمیں یہ بھی جائزہ لینا ہوگا کہ آیا یہ ڈرامہ ریڈیو کے لئے لکھا گیا تھا یا سٹیج کے لئے۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر کا کہنا ہے:

" ریڈیو ڈرامہ عام طور پر یک بابی ہوتا ہے کیونکہ ریڈیو پر طویل
ڈرامے سنانا مناسب نہیں ہوتا۔ صرف آواز کے سہارے سامعین کی

توجہ کو جذب رکھنا خاصا مشکل کام ہے البتہ ایسے ڈرامے جن میں ایک مربوط پلاٹ نہیں ہوتا اور وہ بہت سے یک بابی ڈراموں کا مجموعہ ہوتے ہیں، اقساط میں دکھائے جاتے ہیں۔ ایسے ڈراموں کی ہر قسط یک بابی ڈرامہ ہوتی ہے۔"۶۵

یہ تعریف ہم نے اس لئے دی ہے کہ ناصر کاظمی چونکہ ریڈیو سے وابستہ تھے اس لئے شاید انہوں نے ریڈیو کے ڈرامائی عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ڈراما لکھا ہے۔ مگر یہ یک بابی نہیں ہے، جہاں تک اس کے ریڈیو براڈ کاسٹ ہونے کا تعلق ہے اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو محض آوازوں کے ذریعے ڈرامہ پیش کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ باصر سلطان کاظمی نے سر کی چھایا کے دیباچے میں لکھا ہے:

"سر کی چھایا" محض ایک پڑھی جانے والی منظوم کہانی نہیں بلکہ باقاعدہ سٹیج پر پیش کیا جانے والا ڈرامہ ہے۔ یہ حقیقی سٹیج اور اس کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔"۶۶

باصر سلطان کاظمی نے سر کی چھایا کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے ہمارے نقطہ نظر کے مطابق یہ ایک ایسا منظوم ڈراما ہے جو نہ صرف سٹیج ہو سکتا ہے، بلکہ ریڈیو براڈ کاسٹ اور ٹی۔ وی سے ٹیلی کاسٹ بھی ہو سکتا ہے۔ ناصر کاظمی نے یہ کہانی ایک ایسی بستی کی بیان کی ہے جو ماضی کی یادوں کا گہوارہ ہے۔ یہ وہ بستی ہے جس کی تعریف ماضی کے حوالے سے یوں کی جا سکتی ہے:۔

ایک بستی تھی جہاں پھول ہنسا کرتے تھے
اک ستارا تھا کہ جو باعث بیداری تھا

پہلا منظر:

سو اسی طرح کی ایک بستی تھی سورج پور جہاں پھول ہنسا کرتے تھے کھیت تھے، کھلیان تھے، پرندے تھے، شہسوار تھے۔ محبتیں تھیں، پھول تھے، پھولوں کی مہکاریں تھیں۔ باتوں کی بارشیں تھیں، روایتی جھگڑے تھے، سماجی کشمکش اور معاشرتی تضادات

تھے۔ دوست تھے اور دشمن تھے' خوش فہمیاں تھیں اور غلط فہمیاں بھی تھیں۔ اسی پیار بھرے ماحول میں آسمان محبت پر اک ستارا بھی چمکتا تھا جو اس کہانی کے ہیرو عبدل کے لئے باعث بیداری تھا۔ اس ستارے کا نام نندی تھا۔ عبدل اور نندی کی یہ ایک ایسی کہانی ہے جسے سننے اور پڑھنے سے ماضی کی یادوں کے دریچے وا ہوتے ہیں۔

اس کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے:

پہلے منظر میں شام کا وقت ہے ریل گاڑی ایک پہاڑی علاقے میں فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی ہے درمیانے درجے کے چھوٹے سے ڈبے میں چند مسافر بیٹھے ہیں تین آدمی ایک طرف بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ زمانہ ہجرت کے بعد کا زمانہ ہے اور آسمان سے سورج آہستہ آہستہ ڈھلتا جا رہا ہے۔

یہاں ناصر کاظمی نے جو منظر کشی کی ہے وہ ان کی شاعری کے تخیل سے بہت قریب ہے۔ ڈھلتا سورج اور پہاڑی علاقے سے ریل کا فراٹے بھرنا ان کے شاعرانہ تخیل کی دلیل ہے۔ اس تمام منظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ناصر کاظمی کے ذہن میں شملہ سے انبالہ کا ریل کا سفر ہے۔ انبالہ سے شملہ کا سفر پہاڑی علاقہ کا سفر ہے اور بہت دلفریب۔ گاڑی میں جو کردار بیٹھے ہیں ان میں احمد کی عمر ۳۷ برس' فیاض کی ۴۱ اور مولوی صاحب ۷۵ برس کے ہیں ایک منجن بیچنے والا ہے تصویر حسین اس کی عمر ۴۰ سال ہے۔ عبدل کی عمر ۳۰ برس ہے۔ گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔ احمد اور فیاض عبدل کے گاؤں کے رہنے والے ہیں ۔ وہ عبدل کو غائبانہ طور پر جانتے ہیں مگر اب پہچانتے نہیں۔ ڈرامہ کی ابتدا احمد فیاض کے ساتھ مولوی صاحب کی تکرار سے ہوتی ہے جو ریل کے سفر کے دوران ہماری نفسیات ہے۔ یعنی کسی نہ کسی مسافر سے ضرور الجھا جاتا ہے ۔احمد اور فیاض جو ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ فیاض مولوی صاحب کو سیٹ بدلنے کے لئے کہتا ہے جس پر مولوی صاحب کہتے ہیں:۔

مولوی صاحب : تم میرا غم نہ کرو۔

میں جہاں بھی ہوں وہیں اچھا ہوں۔

ناصر کاظمی نے پہلے ہی منظر میں مسافروں کی نفسیات بیان کر دی ہے کہ گاڑی

میں مسافر اجنبی ہوتے ہیں مگر گفتگو اس سلیقے سے شروع کرتے ہیں کہ بات سے بات بنتی چلی جاتی ہے اور بعض اوقات پرانی دوستیاں منکشف ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی صورت اس قسم کی ہے۔

فیاض اور احمد سورج پور کی باتیں کرتے ہیں احمد بتاتا ہے کہ اس نے تو سورج پور اترنا ہے مگر آگے نویں شہر جانا ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری میں چاند ہمیشہ ایک زندہ استعارہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے یہاں بھی ناصر نے فیاض سے چاند کی تعریف یوں کرائی ہے۔

فیاض : سورج پور ابھی تھوڑی ہی دور ہو گا

احمد : نہیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے ہمیں رات پڑ جائے گی۔

فیاض : آج تو ساتویں رات ہے خاصا چاندنا ہوگا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر پہنچیں گے۔

اب یہاں ناصر کاظمی نے چاند کی چاندنی کی بجائے چاندنا کہلوایا ہے جو انبالہ شہر کی زبان میں عام استعمال ہوتا ہے۔ انبالے والے ہمیشہ چاند کی چاندنی نہیں کہیں گے بلکہ چاند کا چاندنا ہی بولیں گے۔ سو اس ڈرامے میں ناصر کاظمی کی جائے پیدائش انبالہ کی زبان کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جو آگے چل کر مختلف کرداروں سے مزید نمایاں ہوں گے۔

احمد اور فیاض کی گاڑی میں گفتگو جاری ہے۔ احمد فیاض کو کہتا ہے کہ لگتا ہے کہ میں نے پہلے کبھی آپ کو دیکھا ہے فیاض کہتا ہے دیکھا ہوگا نویں شہر میں۔ میں بھی آپ کی صورت پہچان رہا ہوں کہاں ملے یہ دھیان نہیں۔ احمد بتاتا ہے کہ نویں شہر میں کچھ مہینے ہوئے میں نے بنگلہ لیا ہے وہاں میرے بھائی کا لڑکا بھی رہتا ہے جو ڈاکٹر ہے۔ ابھی گفتگو جاری رہتی ہے کہ ایک ننھا سا اسٹیشن آ جاتا ہے' گاڑی رک جاتی ہے ریلوے اسٹیشن کا ماحول پان بیڑی سگریٹ والے کی آوازیں۔ سوڈا واٹر کی آوازیں ایک آواز آتی ہے کہ یہ سید پور ہے۔ فیاض سگریٹ والے کو بلاتا ہے اور گولڈ فلیک کی ڈبی اور چار پان طلب کرتا ہے اس کے ساتھ ہی احمد سے پوچھتا ہے چائے پیئں گے وہ کہتا ہے گھر چل کر پیئں گے۔ اتنے میں آواز سنائی دیتی ہے۔

"میاں گاڑی چلنے لگی ہے
اب اندر چلے آؤ! !
آوازیں : بیرا گڈی چلنے لاگی دوڑ کے آجا
تیرا ٹکس کہاں ہے؟
چھجو چاچا میرا بکسا کھڑکی ماں تے پھینک دے جلدی۔
اچھا اللہ بیلی بیرا:
ہو! چھٹی استانی پایئے۔

اب یہ آوازیں ظاہر کرتی ہیں کہ ناصر کاظمی کے ذہن میں ماضی کی یادیں ابھی تک تازہ ہیں اور گاڑی جس علاقے میں چل رہی ہے وہ مشرقی پنجاب خاص طور پر انبالہ کے گرد و نواح کا علاقہ ہے'

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ ناصر کے ذہن میں تمام منظر شملہ سے انبالہ تک کے ریل کے سفر کا ہے۔ پہلے باب میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ انبالہ میں جو بولی' بولی جاتی تھی وہ اردو اور پنجابی کا مکسچر تھی۔ دونوں زبانوں کے ملانے سے انبالہ کی اپنی بولی وجود میں آتی ہے اور یہ بولی اس قدر اپنے اندر وسعت رکھتی ہے کہ اس کے اپنے محاورے ہیں اور اپنی روزمرہ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس زبان میں جو لوک گیت ہیں انہیں کسی بھی زبان کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ انبالہ میں پڑھے لکھے گھروں میں صاف اردو بھی بولی جاتی تھی اور اپنی یہ بولی بھی۔ انبالے والے جب کسی اوپرے بندے سے ملتے ہیں تو اردو ہی بولتے ہیں مگر جہاں بے تکلفی ہو وہاں اپنی بولی ہی میں بات کرتے ہیں اور ان پڑھ اور نچلے طبقے کی بولی وہی ہے جو اس گاڑی میں اس آواز کی صورت کانوں میں پڑتی ہے۔ یہاں خاتون اپنے بھائی کو بیر کہہ کر پکارتی ہے پنجابی میں بیر کو ویر کہتے ہیں مگر مشرقی پنجاب میں جالندھر' لدھیانہ اور انبالہ میں بھائی کو بیر یا بیرا کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔ یہاں بہن اپنے بھائی کو پکار رہی ہے کہ گاڑی چلنے والی ہے تم دوڑ کے آجاؤ اور تمہارا ٹکٹ کہاں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے جو لوگ رخصت کرنے کے لئے آئے ہیں ان میں چھجو چاچا بھی ہے جسے وہ کہتی ہے کہ میرا

بکس کھڑکی میں سے مجھے پکڑا دو۔ انبالہ کی زبان اور اردو اور پنجابی کے لفظوں میں جو عام بول چال کی زبان میں فرق پایا جاتا ہے وہ اس طرح سے ہے۔

اردو	انبالوی زبان
میں	ماں
کس میں	کاس ماں
ہمارے	مارے
تمہارے	تھارے
گاڑی	گڈی
سڑکوں	سڑکاں
باتیں	باتاں
گال	گلاں
ہونٹ	ہوٹاں
آنکھیں	اکھاں
ماتھا	متھا

انبالہ کی زبان اور اردو میں جو فرق ہے وہ مندرجہ بالا چند الفاظ سے ظاہر ہو گیا ہے انبالہ کی زبان میں ایسے بہت سے الفاظ ملتے ہیں جو نہ تو پنجابی میں بولے جاتے ہیں اور نہ ہی اردو میں۔ یہی صورت محاوروں اور لوگ گیتوں کی بھی ہے۔ سو ناصر کاظمی کے اس ڈرامے میں آپ کو انبالہ کی زبان کی مہکاریں بھی ملیں گی خاص طور پر آگے چل کر ہندو اور حسن خالص انبالہ کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہاں سے ناصر کاظمی کے شاعرانہ رویوں کے اثرات ان کی ڈرامہ نگاری پر بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ناصر کاظمی کی شاعری میں یادوں کے بہت سے در وا ہوتے ہیں اور وہ ہمیں ہر مرتبہ ایک نئے منظر کی سیر کراتے ہیں۔ اس ڈرامے میں بھی ناصر کاظمی نے سید پور کے اشیشن کے ماحول کی عکاسی میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے اور چند مقامی بولیوں سے اس بستی کی یاد

تازہ کر دی ہے جسے ہم بھول چکے ہیں اور جو ہجرت کے بعد آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔

گاڑی مسلسل چل رہی ہے پچھلے اسٹیشن سے ایک منجن فروش تصویر حسین گاڑی کے ڈبے میں داخل ہوتا ہے تو فیاض کہتا ہے:۔

فیاض : یہ تصویر حسین یہاں بھی آ دھمکا ہے
اس کی بات پر دھیان نہ دینا
دھوکے باز کہیں کا..........

اس کے بعد تصویر حسین اپنا منجن بیچنے کے لئے شعر پڑھتا ہے۔

جس کے منہ سے آوے باس
اس کا دارو میرے پاس

وہ کہتا ہے گاڑی میں منجن کی قیمت آٹھ آنے ہے باہر ملو گے تو ایک روپیہ لوں گا۔ یہاں تصویر حسین مولوی صاحب کو منجن خریدنے کے لئے کہتا ہے اور پھر دونوں لڑ پڑتے ہیں۔ یہاں ناصر کاظمی نے تصویر حسین کی زبان سے منجن بنانے کی ترکیب بھی بتا دی ہے:

تصویر حسین: جھپک بابا پیسہ لے جا
جھپک بابا پیسہ لے جا
وزن برابر سب کے تول
وارد ہووے یوں انمول
زیرہ موچھیں ستوا سونٹھ
کیتار جلا لے لے کر گھونٹھ
جوں جوں لگاوے پاوے سکھ
تجھ دانتوں کا جاوے دکھ
آٹھ آنے میں ..... ہے کوئی لینے والا

ایک آواز : یہ لو اٹھنی۔ ایک شیشی دینا بھائی۔
دوسری آواز : ایک شیشی ادھر کو بھی لانا

تصویر حسین : منجن میرا سب سے نرالا
اس کو لے گا دانتوں والا
آٹھ آنے میں دنیا لٹ گئی
آٹھ آنے میں۔

آپ ۔۔۔ جناب ۔۔۔۔ آپ ۔۔۔۔ اور آپ

تصویر حسین منجن بیچتا ہوا اگلے ڈبے میں چلا جاتا ہے۔ فیاض احمد کو سگریٹ پیش کرتا ہے احمد کہتا ہے شکریہ میں ابھی پی چکا ہوں۔ فیاض احمد کو نویں شہر میں اپنے کاروبار سے آگاہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ بتاتا ہے کہ سورج پور میں اس کا گھر ہے اونچی مسجد سے کچھ آگے عظمت منزل والوں کا منجھلا لڑکا۔ یہ تو میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ یہ اب کتنا بدل گیا ہے ابھی وہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ احمد فیاض سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ کچھ مہینے ہوئے میں نے بستی سے دو میل دور پر پانچ ایکڑ لئے تھے وہ عبدل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہی کنج گھر پھر چلایا ہے ہم نے وہی شیشہ گر مل گیا ہے بس اب کام چلنے لگا ہے۔ فیاض سمجھ جاتا ہے کہ یہ اکبر کا حصہ دار ہے۔ دونوں کاروباری گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کل کاریگر ملنے بہت مشکل ہیں اس کے ساتھ احمد فیاض سے پوچھتا ہے کہ تم عبدل کو جانتے ہو۔ فیاض بتاتا ہے کہ مدت ہو گئی میں تو بارہ برس بعد یہاں آیا ہوں سنگاپور میں رہتا تھا۔ اباجی نے خط لکھا تھا ان کے بلاوے پر آیا ہوں اور یہاں بڑا کاروبار کرنے کا ارادہ ہے۔ عبدل' احمد کو پہچان جاتا ہے کہ یہ میرے دوست اکبر کا ساتھی ہے کبھی کبھی یہ اکبر سے ملنے آتا تھا اس کے ساتھ ہی عبدل سوچتا ہے کہ اکبر اور حسن جو دونوں میرے ساتھی تھے سوچتے ہوں گے کہ جب جنگل میں آگ لگی تھی تو میں اور نندی دونوں جل گئے ہوں گے۔ نندی عبدل کی محبوبہ تھی جو عبدل سے ملنے آئی تھی گاؤں کے لوگوں اور اس کے بھائی نمبردار لبھا کو پتہ چل گیا انہوں نے جنگل کو آگ لگا دی۔ کہتے ہیں نندی وہیں پر جل کر مر گئی۔ فیاض کہتا ہے:

فیاض : سورج پور اب پھر نہ بسے گا۔
آج سے سات برس پہلے جب اس جنگل کو آگ لگی تھی۔
وہ دن اپنے گاؤں کی بربادی کا دن تھا۔

احمد : جہاں کمیوں کے مکاں تھے وہاں ڈاک خانہ بنا ہے۔

فیاض : ہاں جی اپنے دیکھتے دیکھتے دنیا کتنی بدل گئی ہے؟

جہاں وہ اینٹوں کا بھٹہ تھا

جلے ہوئے جنگل کے ٹھنٹھ پڑے تھے۔

وہاں یہ شہر بسا ہے۔

احمد : جہاں وہ پرانا کنواں تھا وہاں بجلی گھر بن گیا ہے۔

ان مکانوں سے ناصر کاظمی نے بدلتی ہوئی قدروں کی طرف اشارہ کیا ہے زمانہ کس تیزی سے بدلتا ہے اس کی عکاسی ان مکالموں سے ہوتی ہے۔ پہلے منظر کے آخری حصے میں عبدل ماضی کی یادوں کو کریدتا ہے اسے نندی یاد آجاتی ہے اور وہ سوچتا ہے:

وہ دن یاد ہیں

اسی کنویں پر سانجھ سویرے کھیلنے آتے

وہ میلہ ــــــــــ ناچ کتھا

پھر چیت کا میلہ آیا ــــــــــ من بھایا ہو آیا

اس کے ساتھ ہی وہ فیاض کے اس مکالمے کو دھراتا ہے

سورج پور اب پھر نہ بسے گا

سورج پور ــــــــــ وہ آگ کی نگری

وہ اندھیاری رات ــــــــــ وہ جنگل

کہاں ہو نندی؟ یاد ہیں نندی وہ دن

جب ہم چھوٹے چھوٹے تھے

میں اور حسن کھیل رہے تھے

یہاں پہلا منظر ختم ہو جاتا ہے اور ان مکالموں سے عبدل اور نندی کے عشق کی داستان منکشف ہو جاتی ہے۔

دوسرا منظر:

سورج پور کے زمیندار حشمت کا لڑکا عبدل اور اس کا منہ بولا بھائی حسن اپنے مکان کے صحن میں کھیل رہے ہیں۔ عبدل کا عرف پپو ہے عمر چھ سال ہے حسن کو گٹی کہتے ہیں گلہری کو کٹو کہتے ہیں اور اس کے علاوہ بندر ہیں۔

انبالہ میں جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے لوگوں کے ناموں کو بگاڑ کر پکارنے کا رواج عام تھا بعض اوقات مجبوری کے تحت بھی نام رکھ دیئے جاتے تھے مثلاً ناصر نام کے انبالہ میں کئی نوجوان تھے انہیں اس طرح سے پکارا جاتا تھا ناصر حبشی ۔ ناصر جھلا۔ ناصر شوکت والا۔ ناصر بدھو والا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ناصر کاظمی نے بھی یہاں عبدل کا عرف پپو اور حسن کا گٹی رکھا ہے۔ انبالہ میں گلہری کو کٹو کہہ کر پکارتے ہیں ۔ جہاں تک بندروں کا تعلق ہے انبالہ میں بندر بہت ہوا کرتے تھے جو ہر وقت منڈیروں اور کوٹھوں پر چھلانگیں لگاتے نظر آتے تھے۔ اس منظر میں بچوں کے کھیل اور ان کی پہیلیاں بیان کی گئی ہیں یہاں عبدل اور حسن کے ساتھ نندی اور اس کا بھائی لبھا بھی کھیلتا ہے کہیں کٹو کی باتیں کرتے ہیں کہیں بندروں کی۔ پپو نندی کو کچھ دینا چاہتا ہے تو لبھا اس کا برا مناتا ہے اور زبردستی اپنی بہن کو وہاں سے لے جاتا ہے!

یہاں جس عمر میں پپو' عبدل اور نندی کی آپس میں دلچسپی دکھائی گئی ہے یہ چھ برس کی عمر کا واقعہ ہے ناصر کاظمی کا ذاتی تجربہ بھی چاہت کا اسی عمر کا تھا جب وہ نوشہرہ میں دوسری تیسری میں پڑھتا تھا تو ایک لڑکی ان کے گھر قرآن پڑھنے آتی تھی۔ ناصر نے اپنی ڈائری میں اس کی خوبصورتی کی تعریف کی تھی اور پھر ڈکشائی میں بھی ناصر کا لڑکپن تھا جب اس نے تیرہ برس کی عمر میں حمیرا کو چاہا تھا اور آٹھویں کلاس پاس کرنے کے بعد جب وہ ڈکشائی سے انبالہ آیا تو اسے حمیرا سے جدائی کا صدمہ سہنا پڑا۔ سو یہاں بھی عبدل اور نندی ملتے ہیں بچپن سے لے کر لڑکپن تک مگر بعد میں جدائی ہو جاتی ہے اور دوسرے منظر میں بچے آپس میں کھیل تماشہ کرتے ہیں ایک دوسرے کو کٹو کے کرتب دکھاتے ہیں اور بندر شور مچاتے ہیں اس پر سین ختم ہو جاتا ہے۔

تیسرا منظر:

سورج پور اور پرانے جنگل کے درمیان ایک بہت بڑا میدان ہے اس میدان میں چیت کا میلہ لگا ہے ٹھٹھ کے ٹھٹھ آس پاس کی بستیوں سے میلہ دیکھنے آئے ہیں طرح طرح کی دوکانیں سجی ہیں قسم قسم کے گھوڑے اور مویشی میلے میں نمائش کے لئے لائے گئے ہیں۔ ناچ رنگ سے ساری بستی گونج رہی ہے۔

انبالہ میں اس طرح کا میلہ سائیں توکل اور پنکھوں کا ہوتا تھا جس میں اس طرح لوگ آس پاس کے گاؤں سے جوق در جوق آتے تھے۔ ناصر نے اس منظر میں بھی ہجرت سے پہلے کا زمانہ دکھایا ہے اور یہ وقت صبح کا ہے' ابتدا میں عورتوں اور مردوں کی ایک ٹولی ناچ کتھا میں ڈوبی ہوئی ہے عبدل' حسن اور نندی جو بچپن کے ساتھی ہیں اس ناچ میں موجود ہیں! پہلے کچھ لوگ مرد اور عورتیں چیت کے میلہ کا گیت گاتے ہیں۔ اس گیت میں انبالہ کی بولی نمایاں ہے:۔

عورت : ہٹ دور پرے کل موہے

تو میرا جوبن چھوئے

تری اکھیوں ماں ڈالوں سوئے

کل موئے

کورس : پھر چیت کا میلہ آیا

من بھایا

ہو آیا

بندو : ہم تو ترے عسک ماں مر گئے تنے کھیل کٹاری دیکھتے!

کورس : اس بانکے رے ترچھے گھونگھٹ ماں توں سارے جگ سے نیاری دیکھے

ایک آواز : متھے پر جھمر لشکاں مارے۔ مانگ ماں چمکیں تماں

دوسری آواز : سارا گاؤں دھائیاں دیوے سیر ماں پڑ گئیں دھوماں

کورس : اس بانکے رے ترچھے گھونگھٹ ماں توں سارے جگ سے نیاری دیکھے۔

دھنا دھن دھن

دھنا دھن دھن

اس تمام کورس سے ایک تو انبالہ کی مقامی بولی سے آگاہی ہوتی ہے تو دوسرے ناصر کاظمی کی موسیقی سے دلچسپی اور لوک گائیکی کے بارے میں معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی نے اپنی جنم بھومی سے جو رشتہ استوار کر رکھا تھا اس کی پرچھائیں اس منظر میں محسوس ہوتی ہیں۔ یہاں میلہ میں حسن اور نندی کا جو مکالمہ ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نندی سے حسن بھی پیار کرتا ہے مگر نندی عبدل کو چاہتی ہے:۔

حسن : کبھی ہم سے بھی پیار کرو
اب یوں نہ انکار کرو
کرو اقرار
پھر چیت کا میلہ آیا
من بھایا
ہو آیا

نندی : چلے جاؤ حسن
کئی بار تم سے کہا ہے کہ مجھ سے نہ بولو

عبدل : کیا ہے نندی! کیا ہے؟
حسن بھیا ادھر چلو

ڈھول کی آواز : دھانا دھن دھن
دھنک دھن دھا
دھنک دھن دھا

یہاں ناصر کاظمی نے ڈھول کے تال بھی بیان کر دیئے ہیں اور اسی طرح آگے بھی ڈھول کے مختلف پلٹے سامنے آتے ہیں جن سے ناصر کی موسیقی میں گہری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے، آگے چل کر گھوڑے اور بیل کے مکالموں سے وہ گھوڑے اور بیل کی خوبیاں الگ الگ سے بیان کرتے ہیں۔ گھوڑے اور بیل کی آپس کی گفتگو اور لڑائی بھی انبالہ کی مقامی زبان میں ہے۔ اس لڑائی کے دوران ہی عبدل نندی سے پوچھتا ہے کہ تم ناچ کتھا دیکھو گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ شور میں کہتا ہے میں چلتا ہوں تم میرے پیچھے

پیچھے آؤ۔ اب یہاں نندی اور عبدل کے مابین جو مکالمے ہیں ان سے ہماری روایتی تہذیبی شرم و حیا' ڈر خوف کی نفسیات اجاگر ہوتی ہے۔

چوتھا منظر:

اس منظر میں عبدل گاؤں کی لڑکیوں کو بڑ کے ایک گھنے درخت کے پیچھے چھپ کر دیکھ رہا ہے اس کے خالی گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سورج پور ہے' نندی' یا سمینہ' زرینہ عبدل اور اکبر اس منظر میں آتے ہیں۔

نندی یا سمینہ کو کہتی ہے کہ کنوئیں میں نہ جھانکو یہاں سانپ رہتے ہیں یا سمینہ کہتی ہے کہ تیرا تو سر پھرا ہے۔ نندی کہتی ہے کہ یا سمینہ یہ سب سے پرانا کنواں ہے یہاں اب کے ساون میں بھیا نے دو سانپ مارے تھے کم بخت پھنیر تھے۔ یا سمینہ کہتی ہے سانپ اس کنویں پر' اتنے میں گھوڑے پر کوئی آتا دکھائی دیتا ہے یا سمینہ کہتی ہے حسن ہے میں تو نہ جانوں۔ نندی کہتی ہے اس میں اتنی ہمت نہیں کہ کچھ کہے۔ اتنے میں زرینہ کے گانے کی آواز آتی ہے یا سمینہ کہتی ہے اب میں سمجھی تو بھی جلی ہوئی ہے تینوں سہیلیاں ہنستی ہیں اور آخر میں یا سمینہ یہ گیت گاتی ہے۔

یا سمینہ : ماں ری ماں میں چودہ برس

سب مل کر: سولہ برس کا تھا چھورا رانگڑ کا

سولہ برس کا تھا چھورا رانگڑ کا

مجھے بلاوا تھا چھورا رانگڑ کا

وقفہ ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی عبدل گھوڑے پر سوار ہو کر سامنے آتا ہے زرینہ اور یا سمینہ ڈر کر ایک طرف ہو جاتی ہیں اور نندی اکیلی رہ جاتی ہے یہاں عبدل اور نندی کے مابین جو مکالمے ہوتے ہیں وہ ہماری تہذیبی اقدار کے حامل ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان میں شاعرانہ تخیل کی پرواز سے خود بخود ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

عبدل : آؤ میں تم کو گھر چھوڑ آؤں

دیکھو! سورج کتنا نیچے اتر گیا ہے

نندی : (ذرا گھبرا کر)
نہیں جی چلے جاؤ

عبدل : ٹھہرو نندی

نندی : امی کہتی تھیں غیر آدمی سے نہیں بات کرتے!

عبدل : وہ دن یاد ہیں
اس کنویں پر سانجھ سویرے کھیلنے آتے
وہ املی کا درخت ابھی تک اسی طرح خاموش کھڑا ہے
آؤ گٹار سے توڑیں
میں املی پر چڑھ جاتا ہے
تم پلا! پھیلاؤ
وہ دیکھو وہ ریت پر بڑھیاں دوڑ رہی ہیں
آؤ ان کے پیچھے بھاگیں
اس نے پھر کشتی کے لنگر کھول دیئے ہیں
کشتی چلنے لگی ہے
پانی کی آواز سنی ہے تم نے؟

(عبدل سامنے ایک کیکر کے درخت پر گوسل کو کنکر مار کر اڑا دیتا ہے)

نندی : شام کی خامشی میں درختوں پر کنکر نہیں مارتے
شام کو پیڑ آرام کرتے ہیں عبدل
یہ رونے کی آواز کس کی ہے؟

عبدل : چرواہی بھیڑوں کو ہانک رہی ہے

نندی : (گھبرا کر) نہیں یہ تو الو کی آواز ہے
جھاڑیوں میں کہیں چھپا چھپا ہے۔

اس منظر میں عبدل اور نندی آپس میں باتیں کرتے ہوئے حیرانیوں کے جال

بنتے ہیں اور کھولتے ہیں۔ کہیں اوڑھوں کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو کہیں خانہ بدوشوں کے بارے میں' ان کی بھیڑوں کے بارے میں' محنت مزدوری کے بارے میں تمام واقعات زیر بحث آتے ہیں' فاختہ اور ندی کا پانی۔ فاختہ بہتے پانی کے شیشے میں اپنے ہی روپک کو تکتی ہے' اتنے میں عبدل نندی سے کہتا ہے۔

عبدل : سوچ رہا ہوں ہم یوں کب تک

ہم یوں کب تک ---------- تم ہی سوچو ---------- ہم یوں کب تک

نندی : چلو اب چلیں

یہاں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عبدل اور نندی دونوں ایک دوسرے سے سچی محبت کرتے ہیں اور عبدل نندی کو اپنانا چاہتا ہے اسی لئے تو کہتا ہے کہ ہم یوں چھپ چھپ کر کب تک ملتے رہیں گے۔ اس گفتگو کے دوران میں اکبر گھوڑے پر آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عبدل نندی کو بتاتا ہے کہ اکبر اپنا دوست ہے۔ عبدل اکبر کو کہتا ہے حسن ملے تو کہنا کہ شام کو ڈیرے پر آ جائے۔ اکبر آندھی کے آنے کی پیش گوئی کرتا ہے اور کہتا ہے میں حسن کو پیغام پہنچا دوں گا۔ عبدل سوچتا ہے کہ نہ جانے کیوں اب حسن نے بھی ملنا چھوڑ دیا ہے۔ اتنے میں گرد اڑتی دکھائی دیتی ہے نندی کہتی ہے وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔ نندی کہتی ہے چلو درختوں کی اوٹ میں چھپ جائیں عبدل کہتا ہے کہ ڈرو نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں اس تالاب کے نزدیک نہ جانا۔ نندی چل پڑتی ہے اور عبدل اسے روکتا ہے۔

پانچواں منظر :

اس منظر میں نندی کہیں کھو جاتی ہے عبدل اسے ڈھونڈتا ہے لیکن نندی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ عبدل تھک ہار کر اک گھنے درخت کے تنے کے سہارے حیران کھڑا ہو جاتا ہے اور نندی کے خیال میں کھو جاتا ہے وہ نندی کے ساتھ اپنی یادوں کو دھراتا ہے۔ اتنے میں لوگوں کا شور سنائی دیتا ہے اور وہ جنگل کو آگ لگا دیتے ہیں۔

عبدل کہتا ہے۔
عبدل : کم بختوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے
کیسے بھاگوں؟ آگ ــــــــــ آگ ــــــــــ آگ
چاروں جانب آگ کا دریا
کہاں ہو نندی؟
بولو نندی کہاں چھپی ہو
باہر جاؤں
لیکن نندی
نندی مر جائے گی عبدل
ایک آواز : الٹے پاؤں پلٹ جا عبدل!
نندی اب نہ ملے گی
اس کی قسمت میں جلنا ہے
الٹے پاؤں پلٹ جا
عبدل : لیکن نندی۔ اسے اکیلا چھوڑ کے جاؤں
نہیں نہیں۔ میں جل جاؤں گا
جل جاؤں گا
جل جاؤں گا
آواز : آگ کسی کی میت نہیں ہے
اپنی جان بچا لے عبدل
نندی اب نہ ملے گی
اندھی آگ کا رستہ چھوڑ کے راتوں رات نکل جا پیارے
وہ رستہ ہے۔
اب آواز نہ دینا عبدل
نندی اب آواز نہ دے گی
وہ رستہ ہے

اب آواز نہ دینا عبدل
نندی اب آواز نہ دے گی
وہ رستہ ہے
اس رستے سے دریا کے اس پار اتر جا
آگ کے منہ پر آنکھیں نہیں ہیں
آگ ہے اندھی
آگ ہے بہری
اپنی جان بچالے عبدل
وہ رستہ ہے

یہ سین یہاں ختم ہو جاتا ہے اس سین میں جب نندی جنگل کی آگ کا شکار ہو جاتی ہے تو عبدل بھی اس آگ میں کود کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے مگر اس کے اندر اور باہر ایک کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور وہ خودکشی کرنے کے مقابلے میں جان بچانے کو ترجیح دیتا ہے یہاں اس کا رومانوی کردار ہمارے یہاں کے رومانوی روایتی کرداروں سے مختلف ہے بقول ناصر سلطان کاظمی:

عبدل دنیا کے ادب کے بیشتر رومانوں مرکزی کرداروں سے مختلف نظر آتا ہے مثلاً وہ نندی کو کھو دینے پر نہ تو فرہاد کی طرح سر پھوڑتا ہے نہ مجنوں کی طرح دیوانہ ہو جاتا ہے نہ رومیو کی طرح زہر پیتا ہے نہ ورتھر کی طرح کنپٹی میں گولی اتارتا ہے جب جنگل میں آگ لگتی ہے اور نندی بچھڑ جاتی ہے تو عبدل اسے ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوشش کرتا ہے لیکن جلدی ہی اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔"

یہاں عبدل کے عشق پر اس کی عقل حاوی ہو جاتی ہے اور وہ، وہ راستہ اختیار کرتا ہے جو عقل و شعور کا راستہ ہے۔ بقول ناصر کاظمی:

ناصر یہ وفا نہیں ہے جنوں ہے
اپنا بھی نہ خیر خواہ رہنا

اس کے بعد جب آواز کی وہ بات مان لیتا ہے تو وہ اس مقام سے دور نکل جاتا ہے جہاں اس کی محبت پروان چڑھی۔ اس پر حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اب اس کے پیڑ کی جڑیں سوکھ چکی ہیں اس کے پھل کو اندر سے کیڑوں نے چاٹ لیا ہے اور اب اس میں کبھی رس نہیں پڑے گا تو وہ گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے اور کڑوے نیم کی ٹہنی چن لیتا ہے۔ سات برس گزر جانے کے بعد اگرچہ اسے ضمیر کی خلش کبھی کبھی تنگ کرتی ہے لیکن اسے یقین ہے کہ نہ تو اس نے بے وفائی کا مظاہرہ کیا تھا نہ بزدلی کا آخری منظر میں جب آواز اسی ملامت کا نشانہ بناتی ہے تو وہ اپنا پورا پورا دفاع کرتا ہے۔

چھٹا منظر::

آدھی رات گزر چکی ہے جنگل کی آگ کے شعلے ابھی تک بھڑک رہے ہیں گاؤں بھر میں شور برپا ہے عبدل ویران رستوں میں گرتا پڑتا چھپتا چھپاتا گھر آتا ہے اور طویلے میں سے اپنے باپ کے کمرے میں جھانکتا ہے عبدل کے ماں باپ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ عبدل کے ماں باپ کے مابین جو گفتگو ہوتی ہے اس میں حشمت عمر ۷۰ سال عبدل کا باپ اور نصیبن عمر پچاس عبدل کی ماں ایک دوسرے سے عبدل کے عشق کے بارے میں مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں ان حویلی والوں کے کیڑے پڑیں بنت رنگن نے میرے لونڈے کو پاگل کر دیا۔ نصیبن کہتی ہے پوت کاہے کو جنا تھا سانپ تھا تم کو اس دن کے لئے پالا تھا عبدل۔ جب عبدل اپنے ماں باپ کو اپنی اور نندی کی مخالفت میں گفتگو کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس کے اندر سے آواز ابھرتی ہے اب اس پیڑ سے اڑ جا اس کی جڑیں سوکھ چکی ہیں۔ یہاں

ناصر نے گھر کو اس ہرے بھرے پیڑ سے تشبیہ دی ہے جس کی چھاؤں سب گھر والوں کے لئے آسرا ہوتی ہے لیکن جب یہ پیڑ ہی سوکھ جائے تو پھر اس کا سایہ جائے اماں نہیں ہوتا سو عبدل کے لئے اس کے گھر کا پیڑ سوکھ چکا تھا اس لئے اس نے کہیں جنگل میں بسیرا کرنے کی ٹھانی اور اپنے لئے کڑوے نیم کی ٹہنی چن لی۔ ہمارے یہاں جو روایتی عشق و محبت کی داستانیں ملتی ہیں اس ڈرامے کا پلاٹ ان سے کچھ مختلف ہے یہاں ہیرو کو جینے کی آرزو ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے اس سماج کا بھی سامنا ہے جو یہ سمجھتا ہے اس آگ کا قصور وار بھی وہی ہے۔

ساتواں منظر::

سورج ڈوب رہا ہے گاڑی پوری رفتار سے چل رہی ہے عبدل کھڑکی کی طرف بیٹھا ماضی کو یاد کر رہا ہے گاڑی کبھی سرنگ میں سے کبھی کسی پل پر سے گزرتی ہے تو وہ چونک پڑتا ہے۔ احمد اور فیاض دوسری طرف باتیں کر رہے ہیں۔ ناصر کاظمی نے اس ڈرامے کو آنے والی جدید تکنیک کے مطابق لکھا ہے اگر اسے فلمایا جائے یا ٹی۔ وی سے ٹیلی کاسٹ کرنا مقصود ہو تو اس میں فلیش بیک سے پوری کہانی اجاگر کرنے میں بہت آسانی پیش آتی ہے اب تک جو کہانی بیان کی جا رہی ہے پیش منظر میں گاڑی ہے جو چل رہی ہے اور اس کے ڈبے میں دو کردار ایک دوسرے سے محو گفتگو ہیں اور گفتگو کا موضوع ایک ایسی محبت بھری کہانی ہے جس کا اہم کردار بھی ڈبے میں موجود ہے اور وہ خاموشی سے ان کی گفتگو بھی سن رہا ہے خود کلامی بھی کر رہا ہے اس ساتویں منظر میں ہم ایک مرتبہ پھر ڈبے میں آجاتے ہیں' عبدل باہر کے دیہاتی منظر کو دیکھ کر سوچتا ہے وہی منظر ہیں وہی پہاڑ کی چوٹی۔ وہی چشمے وہی ہریالی' وہی چرواہے لیکن اس دھرتی پر میرا کوئی نہیں ہے۔ میں اس سرزمین پر سات برس بعد کیسے قدم رکھوں

اس دھرتی سے میرا ناتہ ٹوٹ چکا ہے اور اپنے وقت کے تمام ساتھی بچھڑ چکے ہیں۔ احمد اور فیاض گرمی کا ذکر کرتے ہیں اور احمد فیاض کو شیشہ کھولنے کے لئے کہتا ہے اور اس سے پانی لے کر پیتا ہے یہاں باہر کے منظر میں ایک گھڑ سوار دکھائی دیتا ہے تو دونوں گھوڑوں کے بارے میں گفتگو شروع کر دیتے ہیں اور یہاں ناصر کاظمی نے اپنے گھڑ سواری کے شوق کی کہانی کو بڑے موثر انداز میں پیش کرتے ہوئے فیاض کی زبانی گھوڑوں کی قسمیں بھی بیان کر دی ہیں۔

فیاض : ہم نے اپنی ساری عمر میں رنگ رنگ کے گھوڑے
پالے۔
چمپا، نقرا، خاکی، چینا، کالا اور کمیت۔
گھوڑا تو بس قسمت والے کو ملتا ہے
اس کے کانوں سے جنت کی ہوا آتی
ہے

اس کے ساتھ وہ ایک میلہ میں کالے گھوڑے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ گھوڑا ایسا تھا کہ اس پر سواری کرنا ہر ایک کے بس میں نہ تھا گاؤں کے چودھری نے شرط لگائی تھی کہ جو کوئی اس پر سواری کرے گا یہ گھوڑا اسے مل جائے گا ایک پناہ گیر لڑکا جو آفت کا پتلا تھا اکبر اس نے شرط جیت لی۔ پھر اکبر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ قسمت کا بہت دھنی ہی اس نے اب موتا سے شادی کر لی ہے لیکن اس میں ایک ہی کھوٹ ہے کہ وہ نئے زمانے کی لڑکی ہے۔ پھر وہ اس رات کا ذکر کرتے ہیں جب جنگل میں آگ لگی تھی۔ عبدل ان کے باتیں سن رہا ہے۔ احمد کہتا ہے۔

احمد : تو وہ آگ کس نے لگائی تھی؟
عبدل نے -------- نندی کے بھائی نے --------
حسن نے

فیاض : میاں جتنے منہ اتنی ہی باتیں

سنا یہی ہے!
اللہ جانے تہہ میں کیا ہے؟
احمد : یہ سارے زمیندار ایسے ہی ہیں
لوگ کہتے ہیں جنگل انہوں نے جلایا
مگر گاؤں والوں کو نندی کے بھائی پر شک ہے
بھلا آپ اس دن کہاں تھے۔
فیاض : میں اس روز وہیں تھا
اپنے گاؤں میں تھا' بس کھانا کھانے ہی بیٹھا تھا
اتنے میں اک شور سا اٹھا
میں سمجھا کہ ساتھ کے گاؤں نے ہلہ بول دیا ہے
ننگے بدن کے گھوڑے پر الانا چڑھ کے نکلا
اس سے پوچھا اس سے پوچھا
کالی رات اور تیز ہوا تھی
تین کوس سے آگ کی لاٹیں چمک رہی تھیں
ڈیرے والے بھرے طمنچے اور بندوقیں لے کر نکلے
گھوڑے سوار مشالیں لے کر بھاگ رہے تھے
احمد : تعجب ہے عبدل کہاں تھا؟
وہ نندی تو جل گئی تھی
تمہیں تو خبر ہے
فیاض : آگ کے بہتے دریاؤں میں
اس کی چیخیں ہم نے سنی تھیں
ہم نے لاکھ پکارا
آوازیں دیں
لیکن کوئی نہ بولا
احمد : میں نے وہ رات دیکھی ہے جب آسمان سرخ تھا۔

یہاں ناصر کاظمی نے آسمان کی سرخی کی طرف اشارہ کر کے نندی پر ہونے والے ظلم کو بیان کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ناصر کاظمی طبقاتی اور جاگیرداری اور زمینداری نظام کے سخت خلاف تھا اس نے احمد سے یہ کہلوایا کہ سارے زمیندار ایسے ہی ہیں لوگ کہتے ہیں جنگل انہوں نے جلایا۔ پھر اس منظوم ڈرامے میں ناصر نے بڑی کمال مہارت سے مکالمے بلوائے ہیں اور اس فطری انداز میں کہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ مکالمے بولے جا رہے ہیں بلکہ اسی طرح لگتا ہے جیسے کردار بے تکلف انداز میں ایک دوسرے سے محو کلام ہیں۔ یہاں احمد اور فیاض کی گفتگو سے محسوس ہوتا ہے کہ گاؤں والے ابھی یہ طے ہی نہیں کر پائے کہ اصل میں آگ کس نے لگائی تھی۔ عبدل پر اس لئے شک ہے کہ حسن بھی نندی کو چاہتا تھا۔ حسن پر اس لئے شک ہے کہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ عبدل سے محبت کرتی ہے مگر عبدل اور حسن کی بچپن کی دوستی اور عبدل اور نندی کی سچی محبت سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آگ نندی کے بھائی لبھانے لگائی تھی جو بچپن ہی سے نندی اور عبدل کے مابین دیوار بن جاتا تھا۔ لیکن اس منظر تک ناصر کاظمی نے ڈرامہ کی اس گتھی کو سلجھنے نہیں دی اور باقاعدہ ایک سسپنس رکھا ہے جو اس ڈرامہ کی کامیابی کی دلیل ہے۔

آٹھواں منظر:

مرچوں کے کھیت میں حسن، بندو اور احمد رہٹ کے منڈھ پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں شام ہو رہی ہے رہٹ چل رہا۔

یہاں ناصر کاظمی نے مشرقی پنجاب کے دیہاتی ماحول کا نقشہ کھینچا ہے ناصر کاظمی نے مشرقی اور مغربی پنجاب کے کئی دیہاتوں کی سیر کر رکھی تھی۔ وہ دیہاتی زندگی سے بخوبی واقف تھے اور اکثر بقول ان کے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر انبالہ سے را بگڑھ اور قریبی دیہاتوں میں بھی جاتے تھے۔ اس منظر میں حسن' بندو' احمد' اکبر' کچھ دیہاتی اور لبھا دکھائی دیتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے رہٹ کی آواز کو ایک لوک گیت میں بڑی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ حسن رہٹ کی مُدھ پر بیٹا طنبورہ بجا رہا ہے۔ بندو اور احمد حقہ پی رہے ہیں۔ الاؤ کی آگ بھڑک رہی ہے۔ یہاں حسن اور بندو کی گفتگو خالص انبالہ کی زبان میں ہے اور اس زبان میں ناصر کاظمی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ شاعری کی جوت جگائی ہے۔ سورج کے ڈوبنے کے منظر کو وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

بندو : دھپ گئی پردیس ماں کلی رہ گئی چھاؤں
مرگھٹ دیکھے گاؤں لے تو رب کا ناؤں

حسن : سدھ بدھ ہے مجھے دھوپ کی نا میں جانوں چھاؤں
نا مرا ٹھور ٹھکانہ کوئی نا مرا کوئی گاؤں

اس کے بعد بندو کہتا ہے چلو اب گاؤں چلیں مگر حسن اسے کہتا ہے دو گھڑی بیٹھو اور سنگیت سنو۔ احمد کہتا ہی تم نے یادیں تازہ کر دیں سناتے رہو بھائی اتنے میں اکبر گھوڑے پر سوار آتا ہے' وہ آکر کہتا ہے حسن میں تمہیں صبح سے ڈھونڈ رہا ہوں اور ادھر عبدل جانے کس روگ میں پھنسا ہے بندو پھر پوچھتا ہے۔

بندو : اکبر بھیا! عبدل کی کچھ کھیر کھبر ہے۔

اکبر : بڑے مزے میں ہے شہزادہ
ابھی ملا تھا
ارے وہ کیا ہے
وہ دیکھو آکاش پر وہ کیا ہے

پھر تمام دوست آپس میں گفتگو کرتے ہیں اور یہ شادی کی آتش بازی تھی جو آسمان پر تارے بکھیر رہی تھی۔ یہاں ناصر کاظمی نے کانچ یا شیشہ کو کنچ کہا ہے اور یہ نام انبالہ ہی کی زبان میں ہے۔ انبالوی زبان میں کانچ کو کنچ کہتے ہیں اور یہاں کنچ گھر

سے مراد کانچ کا کارخانہ ہے۔ ابھی ان دوستوں میں گفتگو جاری تھی کہ کنچ گھر کے سائرن کی آواز سنائی دیتی ہے سناٹا اور پھیل جاتا ہے۔ کنچ گھر کے مزدور اور کاری گر دور سے ایک رستے پر تیزی سے جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں اکبر پھر وارد ہوتا ہے اور کہتا ہے۔

اکبر : سناؤ کیا حال ہے میرے دوستو

بندو : اتنے دنوں ماں سکل دکھائی
اچھے تو ہو میرے بھائی

اکبر : خدا کے فضل و کرم سے اچھی گزر رہی ہے
سناؤ احمد تمہارا کیا حال ہے
کہو کیسی کٹ رہی ہے؟

احمد اکبر کو بتاتا ہے کہ حسن نے آج ایسا گانا سنایا کہ تڑپا کر رکھ دیا اس کے گلے میں قیامت کی مرکی ہے۔ گھنگھرو کا کھٹکا ہے ظالم نے کوئل کی آواز پائی ہے۔ آگے چل کر ناصر کاظمی اپنے پسندیدہ مشغلے کبوتروں کا ذکر کرتے ہیں۔

اکبر : نہ جانے یہ جنگلی کبوتر کہاں سے اترے ہیں اجڑے بن میں؟
کبوتروں کی یہ ٹکڑیاں ہیں یا ٹڈی دل ہے
بڑا اندھیرا ہے بھائی احمد
کہاں چلے ہو؟

احمد : ذرا دو کبوتر گرا لاؤں
میں پل جھپکنے میں آ جاؤں گا

اکبر : یہ شام کے وقت ان پرندوں کو کیوں ستاتے ہو
جانے دو غیر وقت ہے۔

بندو : بڑا ہی بھولا پنچھی ہے یہ 'سید اس کی ذات
بھرے سے مت مارو اس کو مانو میری بات
حسن تم کوئی گیت سناؤ
بابو جی کا جی بہلاؤ

یہاں ناصر کاظمی نے کبوتروں سے اپنی محبت کو بڑے سلیقے کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ پرندوں سے ناصر کو جو پیار تھا اس کی ایک جھلک بھی یہاں ملتی ہے کہ غیر وقت پرندوں کو ستانا نہیں چاہئے۔ یہاں اکبر اور بندو کا مکالمہ شہری اور گاؤں کے ایک گنوار کے مابین فرق ظاہر کرتا ہے۔

بندو : کمبل کو نہیں جانتے گاؤں کے سیدھے لوگ
ہم تو نرے گنوار ہیں تم ہو سہری لوگ

اکبر : بھلا کبھی تم نے شہر دیکھا ہے؟
جانتے ہو کہ شہر کیا ہے؟
کبھی جو سپنے میں دیکھ پاؤ تو گاؤں کی ناریوں کو بھولو!

احمد : میاں باؤلے ہو کے روتے پھرو گے
ارے شہر کی ناریوں سے خدا ہی بچائے
ذرا آگ کے پاس آجاؤ خنکی اترنے لگی ہے۔

احمد کے اس مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب موسم تبدیل ہو گیا پہلے گرمی کا موسم تھا اور اب سردی آگئی ہے۔ آگے اکبر، احمد اور بندو کے مابین گفتگو ہوتی ہے۔ بندو اپنی مقامی زبان میں گفتگو کرتا ہے اور شہریوں کی مکاری اور استحصالی رویوں کی مذمت کرتا ہے۔ ناصر کاظمی نے گاؤں اور شہری ماحول میں پائے جانے والے تضاد کو یہاں بڑی مہارت سے بیان کر دیا ہے۔ چکی کی آواز آرہی ہے احمد چکی چلتے دیکھ کر کہتا ہے گاؤں میں ویسے ہی دھائی مچی ہے کہ آٹا نہیں کل ہے لوگ مر جائیں گے۔ احمد کہتا ہے کہ چلو پھر شہر چلیں لیکن شہر میں بھی بغیر سفارش کے کوئی نوکری نہیں ملتی۔ احمد کہتا ہے کہ یہ سب نفع خوروں کی سازش ہے۔ غلے کا توڑا نہیں ہے۔ اپنے کھیتوں کو دیکھو ذرا اپنی ہری بھری فصلوں کو دیکھو ہری ہیں بھری ہیں۔ یہاں ناصر کاظمی نے سماجی صورت حال کو بھی واضح کر دیا ہے کہ ہم ایسے معاشرے میں زندہ ہیں جہاں ہجرت کرنے والوں کو پناہ گیر کہہ کر پکارا جاتا ہے جہاں پیٹ بھرنے کے لئے بغیر سفارش کے کچھ نہیں ملتا۔ جہاں سب کچھ ہے مگر شور یہی مچایا جاتا ہے کہ کچھ نہیں۔ یہ سب ہمارے حکمرانوں کے چکر ہیں۔ ابھی یہ آپس میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں کہ اندھیرے

میں سفید پگڑیاں اور گھوڑیوں کی آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ نندی کا بھائی اور اس کے ساتھی ہیں۔

نواں منظر:

حسن اور احمد سورج پور سے دو میل کے فاصلے پر جنگل کے شمالی حصے کے ساتھ گھوڑوں پر بیٹھے عبدل اور نندی کی تلاش میں پھر رہے ہیں اندھیری رات ہے ہر طرف سناٹا ہے۔ احمد اور حسن کے کے گھوڑے دوڑ دوڑ کر پسینہ پسینہ ہو گئے ہیں۔ آگے جنگل اور آگ گھوڑا اٹک جاتا ہے احمد کہتا ہے آگے نہ جاؤ۔ حسن دیکھتا ہے کہ ایک نار اپنے تن پر راکھ ملے ننگی بیٹھی ہے حسن اس سے کہتا ہے۔

حسن : اگنی برن کی اوٹ ماں اپنا بدن چھپا
او ناری او مورکھ ناری اپنا ناؤں بتا

ناری : (بڑی ڈراؤنی اور گہری آواز میں)
ناری نہیں چڑیل ہوں اپنی جان سنبھال
کھائے لوں گی تیرا کالجہ جیوڑا لوں گی نکال

حسن : تو مجھے نہیں پچھانتی میں ہوں منش دلیر
ایسا بھلا ماروں گا بس کر دوں گا یہیں ڈھیر

ناری : تو مجھے نہیں پچھانتا باپ مرا مہاراج
میں ہوں مہار جیونتی گپت مرا سرتاج

یہاں احمد دونوں کو سمجھاتا ہے کہ نرمی سے بات کرو، ابھی دونوں کے مابین گفتگو جاری ہوتی ہی ہے کہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور لوگوں کے شور سے جنگل گونج اٹھتا ہے۔ آگ کے شعلے آسمان تک بلند ہو رہے ہیں۔ عورت جنگل کی طرف بھاگ جاتی ہے اور حسن اس کے پیچھے بھاگتا ہے۔

دسواں منظر:

دسویں منظر میں لبھا اپنے ساتھیوں کے ساتھ حسن پر حملہ آور ہوتا ہے۔ کنج گھر کا انجینئر جس کی عمر پچاس برس ہے سمجھاتا ہے کہ اس کو مت مارو اور معاملہ عدالت پر چھوڑ دو قانون ہاتھ میں مت لو مگر لبھا جو اپنی بہن کے خون کا بدلہ لینے کے لئے پاگل ہو گیا ہے کہتا ہے۔

لبھا : یو میرا مجرم ہے یارو

ان نوں میرے پاس لیاؤ

لبھا حسن کو خون بھری آنکھوں سے دیکھتا ہے

تو اگر اشراف ہے تو آ اتر میدان ماں

سید ہے تو رجپوت میں

تو پہلے اپنا وار کر پھر روک میرے وار کو

میں یوں نہ چھوڑوں گا تجھے

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی اس کہانی کو سسپنس سے نکال کر اب کلائمکس پر لے جا رہے ہیں لبھا کو یہ شک ہے کہ اس کی بہن نندی کا خون حسن نے ہی کیا ہی حالانکہ حسن اسے بھائی کہہ کر یقین دلا رہا ہے کہ اس کا اس میں قصور نہیں ہے اور یہ کہ تمہاری بہن کے سنگ عبدل بھی جل کر راکھ ہو گیا مگر جب لبھا حسن کی کسی بات پر یقین نہیں کرتا اور اسے میدان میں اترنے کے لئے کہتا ہے تو پھر حسن کا سیدی جلال جاگ اٹھتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اگر تیرے پاس ہتھیار ہیں تو میرے ساتھ پنج تن پاک ہیں اور اسے للکار کر کہتا ہے اور رانگڑ کے چھورے میرے ساتھ میرا مولا ہے آ میدان میں میں تیرا زور دیکھوں۔ یہاں ناصر کاظمی نے جہاں راجپوت کی بہادری دکھائی ہے وہاں سید کی بہادری اور صبر و استقامت کو بھی واضح کیا ہے کہ سید کبھی پہل نہیں کرتا مگر جب پانی سر سے گزر جائے تو پھر معاف بھی نہیں کرتا۔

گیارہواں بارہواں اور تیرہواں منظر :

ناصر کاظمی نے بڑے فنکارانہ انداز میں حسن کی چیزوں کی خاموشی سے واضح کر دیا کہ وہ اب نہیں رہا۔ الماری میں حسن کی چیزیں پڑی ہیں حسن کے بعد اسے کسی نے نہیں چھیڑا۔ اکبر اور احمد مینا کو دیکھتے ہیں اور کچھ دیر خاموش رہتے ہیں۔ احمد اور اکبر حسن کو یاد کرتے ہیں وہ تمام حسین منظر ان کی آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں جو اب یاد ماضی ہیں۔ احمد، اکبر اور شیشہ گر حسن اور عبدل کا جو حصہ کنچ گھر میں ہے اسے تقسیم کرنے کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں اب ان کا یہاں کوئی والی وارث نہیں ہے شیشہ گر کہتا ہے کہ حق دار تو اب آپ ہی ہیں۔ یہاں دنیا داری کی گفتگو بھی ملاحظہ کیجئے۔

اکبر: بجا ہے بھائی۔ تمہاری محنت ہمارا پیسہ

احمد: تو پھر تین حصے ہوئے

کچھ تو اللہ کے رستے میں دے دو

جو باقی بچے اسے تینوں میں تقسیم کر لو

اکبر: میرا تو دل کانپتا ہے جب بھی خیال آتا ہے دوستوں کا

یہ حصے وصے کی بات چھوڑو

جو کام کرنا ہے کرتے جاؤ

احمد: میں قانون کی رو سے کہتا ہوں۔

اس کے ساتھ ہی احمد کنچ گھر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے شیشہ گر انہیں کنچ گھر دکھاتا ہے اور یہاں کے بارے میں مکمل معلومات دیتا ہے۔ آخر میں شیشہ گر کہتا ہے

آپ آتے رہیں تو چند دنوں میں سارا کھیل سکھا دوں گا

اس شیشہ گر کی صنعت کے سب راز رموز بتا دوں گا

بارھویں منظر میں ایک عورت مونا، اکبر اور احمد دو پہیوں کی گاڑی میں پھول گلی سے کنچ گھر کی طرف جا رہے ہیں گاڑی کو دو سفید گھوڑے کھینچ رہے ہیں۔ گرمیوں کی دوپہر ہے ایک عورت بھیرویں گا رہی ہے اس کی آواز دور سے آ رہی

ہے۔

کنچن روپ دکھائے
سرگم سا۔ سارے گاما سا
جل میں آگ لگائے

آگے چل کر مونا کہتی ہے گاڑی والے گاڑی روکو احمد بھیا نیچے اترو۔ احمد پوچھتا ہے یہ کس کا جنازہ ہے اکبر۔ اکبر بتاتا ہے کہ ہمارے مفتی گزر گئے ہیں یہ آخری شمع رہ گئی ہے۔

تیرھویں منظر میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حسن اور لبھا آپس میں لڑتے لڑتے مر گئے۔ احمد اور فیاض گاڑی کے ڈبے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ پس منظر سے اب ناصر کاظمی پیش منظر میں آ جاتے ہیں۔ فیاض کہتا ہے۔

فیاض : ساتھ برس میں اس دھرتی کی ایسی کایا پلٹی
پہلے جنگل راکھ ہوا' پھر کال پڑا
سیلاب تو بس ایسا آیا کہ توبہ میری
سورج پور میں کیا رکھا ہے؟

احمد : پرانی حویلی بھی اجڑی پڑی ہے
وہ ڈیرہ تو حشمت کے دم سے ہی تھا بس
تمہیں یاد ہے جب سیلاب آیا تھا
اس رات عبدل کے ماں باپ' لبھے کا کنبہ
خدا جانے کتنی ہی مخلوق اس راون میں بہہ گئی

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اب سورج پور میں کچھ نہیں رہا بڑے بوڑھوں کو بہت سمجھایا کہ سیلاب آ رہا ہے وہ گھر چھوڑ دیں مگر انہوں نے کسی کی نہ مانی اور اپنی دھرتی کو نہ چھوڑا۔ احمد فیاض کو حسن کے ساتھ عبدل کو تلاش کرنے والا قصہ سناتا ہے اور پھر ڈین کا ذکر کرتا ہے جو پہلے حسن کو ڈراتی ہے اور پھر حسن کی گفتگو سے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ کلاکار ہے تو اس سے برہا کا گیت سنتی ہے۔ آخر میں فیاض احمد سے سوال کرتا ہے اور یہ تمام ماجرا عبدل سن رہا ہے۔

ان آوازوں کے ساتھ ساتھ فیاض احمد کو کہتا ہے کہ اب تو یہی تمنا ہے کہ نویں شہر میں جلدی جلدی گھر بن جائے۔ احمد کہتا ہے کہ آٹھ بجنے لگیں تو بتانا تمہیں کچے گھر کا نظارا دکھاؤں گا گاڑی وہیں سے گزرتی ہے۔ فیاض کہتا ہے آٹھ بجنے میں چند منٹ ہیں۔ ایک آواز عبدل کے کانوں میں آتی ہے سورج پور اترو گے عبدل؟ وہاں نہ جانا وہاں اب ترا کوئی نہیں ہے۔ آخر میں ناصر کاظمی نے عبدل سے خود کلامی میں یہ کہلوایا۔

آواز: تو نے نندی کو مارا ہے
تو نے اس کا خون پیا ہے
تو نے حسن کو مارا ہے
تو اپنے ماں باپ کا قاتل ہے
تو ہی لیسے کا قاتل ہے
اتنے تن داروں کا خون تیری گردن پر!
تو خونی ہے تو قاتل ہے

اس آواز کا جواب اپنے ضمیر کی آواز سے دیتا ہے اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس کے بارے میں کہا جا رہا ہے وہ غلط ہے اسی طرح جس طرح حسن تھا اس لئے عبدل کہتا ہے۔

عبدل: تو جھوٹا ہے
نندی اپنی موت مری ہے
حسن میرا جگری دوست تھا

آواز: تو بزدل ہے
تو نے سورج پور کو اجاڑا

عبدل: تو جھوٹا ہے

آواز: تو بزدل ہے
تو خونی ہے
تو قاتل ہے

تو بزدل ہے

عبدل : لہجہ بدل کر

دھوپ کی گرمی سے پیلا پڑ گیا تھوہڑ کا کانس

چاند کی کبریت سے جلنے لگے جنگل کے بانس

ا۔ ارے کیا ہوا دیکھنا

یہ گاڑی کھڑی ہو گئی؟

فیاض : (عبدل کی طرف دیکھ کر) کون سا اسٹیشن ہے بھائی؟

آپ یہاں اتریں گے صاحب!

احمد : نہیں! یہ تو جنگل ہے

گاڑی یہاں کیوں رکی

کوئی آواز بھی تو نہیں

کوئی بتی نہیں

یہ تو جنگل ہے سنسان جنگل

یہاں یہ کتھا ختم ہو جاتی ہے۔ عبدل جہاں سات برس بعد لوٹنا چاہتا تھا وہاں لوٹنا بیکار تھا۔ اس نے ساتھ برس پہلے جب ہجرت کی تھی اس وقت سورج پور واقعی سورج پور تھا مگر ہجرت کے بعد یہاں کچھ نہیں بچا۔ سوائے جنگل کے جہاں اب کوئی مسافر اترنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

ناصر کاظمی نے اپنے اس ڈرامے میں بقول باصر سلطان کاظمی :

"گاڑی کے سفر کو مجسم اور متحرک شکل دے دی ہے۔ مسافر اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے بے تاب ہیں اور یادوں میں کھو جاتے ہیں لیکن جونہی ماضی غالب آنے لگتا ہے گاڑی رک جاتی ہے اور وہ بھی تاریک سنسان جنگل میں۔ گاڑی ایک لحاظ سے مقدر کی علامت بھی ہے جو ماضی میں زیادہ دور نکل جائے تو غیر فعال ہو کر رہ جاتی ہے۔" ۶۷

مجموعی تاثر :

اس تمام تجزیئے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ناصر کاظمی کا یہ منظوم ڈرامہ بھرپور تاثر کا حامل ہے۔ یہ ڈرامہ اپنی بنت کے اعتبار سے ریڈیو کے لئے زیادہ موزوں ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی نے لکھا بھی اسے ریڈیو کے لئے۔ ریڈیو پر اسے کرداروں کے ذریعے آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے اور ماحول تخلیق کرنے کے لئے صوتی تاثرات سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ۔ کردار۔ مکالمے۔ منظر نگاری اور واقعات نگاری میں ناصر کاظمی نے بڑے سلیقے کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ڈرامے کی اصل روح شاعرانہ تخیل ہے۔ ناصر کاظمی نے گو سیدھے سادے اور آسان اسلوب میں یہ ڈرامہ تحریر کیا ہے مگر اس میں تجسس اور سپنس آخر تک برقرار رہتا ہے۔ ناصر کاظمی نے کہانی کے تسلسل کو ابتدا سے لے کر آخر تک برقرار رکھا ہے اور اس میں آج اور کل کے حوالے سے بدلتی ہوئی قدروں اور زندگی کے رویوں کی بڑے فنکارانہ انداز میں عکاسی کی ہے۔ یہ ڈرامہ ہمارے سماج میں طبقاتی کشمکش، معاشرتی ناہمواری، رفتگاں کی یاد، ہجرت کے تجربے، فراق، اداسی، فطرت سے لگاؤ، شہروں اور دیہاتوں کی زندگی میں فرق، جانوروں اور پرندوں سے محبت، سیرو سیاحت، گھڑ سواری، موسیقی سے دلچسپی، مقامی تہذیب و تمدن اور مقامی زبان و بیان کا آئینہ ہے۔ یہ ڈرامہ زندگی کی حقیقتوں سے عبارت ہے۔ قنوطیت، یاسیت اور بے عملی کی نفی کرتا ہے۔ اس میں محبت کی خوشبو بھی ہے بہادری کی عظمت بھی۔ یہ خاندانی وقار، عزت اور غیرت کی تصویر بھی ہے اور جرات اور جوانمردی کی تعبیر بھی اس میں عبدل کے کردار میں حقیقت پسند انسان سے ملاقات ہوتی ہے جس کا دکھ جس کا درد اور جس کا کرب آج کے معاشرے کے ہر فرد کا دکھ درد اور کرب ہے اس کے یہاں زندگی سے فرار کی بجائے زندگی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے ڈرامہ کے تمام فنی لوازمات کے ساتھ ساتھ اس میں انبالہ کی مقامی زبان کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور انبالہ کے لوک ادب سے بھی ہمیں مختلف لوک گیتوں کے ذریعے متعارف کرایا ہے۔ یہ ڈرامہ ایک ایسے ہرے بھرے درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں ماضی کی دھرتی میں پیوست ہیں اور شاخیں مستقبل کی روشن فضاؤں میں قوت نمو پا رہی ہیں۔

اس میں قاری کی دلچسپی اس کی کہانی کی بنت سے ابتدا سے لے کر آخر تک قائم رہتی ہے اور بعض اوقات قاری مختلف مناظر میں کھو کر خود کو وہیں محسوس کرتا ہے جہاں کی ڈرامہ نگار نے عکاسی کی ہوتی ہے۔ سر کی چھایا ایک ایسی کہانی ہے جو اپنے ڈرامائی عناصر کے ساتھ ریڈیو' ٹی۔ وی اور آرٹ فلم کے لئے نہایت موزوں ہے جبکہ سٹیج کے لئے یہ ڈرامہ قدرے مشکل ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ اس ڈرامے سے سب سے زیادہ لطف وہ لوگ اٹھا سکتے ہیں جو مشرقی پنجاب کی تہذیب و تمدن اور زبان سے آشنا ہیں۔ جبکہ عام قارئین اور ناظرین کے لئے بھی یہ خاصی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔

(و)

□☆::☆□

"کلاسیکی شعرا کا انتخاب" ::

جیسا کہ ہم گزشتہ ابواب میں لکھ آئے ہیں کہ ناصر کاظمی ایک وسیع المطالعہ شخصیت تھے۔ انہوں نے جہاں انگریزی شعر و ادب پر گراں قدر کتب پڑھ رکھی تھیں وہاں اردو کے کلاسیکی شعرا کی شخصیت، حالات زندگی اور کلام سے پوری طرح باخبر تھے۔ ان کے مکالموں، گفتگوؤں اور ڈائریوں کے اقتباسات سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کلاسیکی شعرا کی تمام جہتوں اور پہلوؤں پر دسترس رکھتے تھے اور ان کے بارے میں بلا تکان گفتگو کر سکتے تھے۔ ناصر کاظمی نے اپنی زندگی ہی میں بیشتر کلاسیکی شعرا کے کلیات کے انتخاب مرتب کر دیئے تھے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے اور کچھ زیر اشاعت ہیں۔ اس بارے میں باصر سلطان کاظمی لکھتے ہیں:۔

"اردو کے کلاسیکی شعرا کا کلام ناصر کاظمی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ مطالعے کے دوران اپنے پسندیدہ یا کسی اور اعتبار سے قابل توجہ اشعار پر نشانات لگانا اور بعض اوقات حواشی لکھنا بھی ان کی عادت تھی۔ ان کی وفات کے بعد ہمیں ان کے کاغذات اور کتابوں کے ذخیرے میں سے متعدد اساتذہ کے کلام کے انتخاب ملے۔ میر اور نظیر کے انتخاب تو انہوں نے الگ الگ کاپیوں میں

اپنے ہاتھ سے خوشخط نقل کر رکھے تھے۔ جبکہ "کلیات ولی" ، "دیوان درد" ، "کلیات انشا" ، "کلیات مصحفی" (دیوان اول و دوئم) "دیوان گویا" مظہر عشق (دیوان قلق) اور داغ کی کتابوں میں اپنے منتخب کردہ اشعار پر نشان (✓) لگائے ہوئے تھے اور ناشرین و مرتبین کے لئے ہدایات بھی کہیں کہیں حواشی میں لکھی ہوئی تھیں۔"۶۸

ان سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی کی دلچسپی محض ان شعرا کے انتخاب تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ اس انتخاب کے بعد انہیں افادہ عام کے لئے شائع بھی کرانا چاہتے تھے افسوس کہ زندگی نے انہیں مہلت نہ دی ورنہ عین ممکن تھا کہ آج اردو کے تقریباً تمام اہم شعرا کا انتخاب ہمارے ہاتھ میں ہوتا۔ باصر سلطان کاظمی کے مطابق ناصر کاظمی اپنی زندگی میں میر تقی میر اور نظیر کے انتخاب خود اپنے ہاتھ سے کاپیوں پر لکھ کر محفوظ کر چکے تھے۔ جبکہ ولی' درد' انشا' مصحفی' گویا' قلق اور داغ وغیرہ کے کلیات اور دواوین میں منتخب اشعار پر نشان ہی لگائے تھے اور انہیں الگ کاپی پر منتقل کرنا باقی تھا کہ بیماری نے آلیا اور پھر اجل کا بلاوا آگیا اور یوں یہ کام ادھورا رہ گیا۔ اسی طرح انیس کے مختلف مراثی کے تقریباً ساڑھے چار سو بند ' سلام کے متعدد اشعار اور رباعیات' دیوان غالب' دیوان ظفر' دیوان حالی' خم کدۂ آزاد' زبور عرفان (انتخاب شاد عظیم آبادی) میں بھی ان گنت اشعار پر پسندیدگی کے نشانات لگے ہوئے ہیں۔ تاہم ان نشانات کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ باقاعدہ اشاعت کی غرض سے انتخاب کئے گئے ہیں۔

ناصر کاظمی کے جو انتخاب اب تک شائع ہوئے ہیں ان میں انتخاب میر (مارچ ۱۹۸۹ء) ' انتخاب نظیر (نومبر ۱۹۹۰ء) ' انتخاب ولی (جولائی ۱۹۹۱ء) اور انتخاب انشا (دسمبر ۱۹۹۱ء) شامل ہیں۔ ذیل میں ہم ان انتخابوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔

ا۔ انتخاب میر:

ناصر کاظمی نے یہ انتخاب کلیات میر کے اس ایڈیشن سے کیا ہے' ان کے دیگر

انتخابوں میں سب سے ضخیم انتخاب ہے جو میر کے کلیات میں شامل چھ دواوین اور دیگر مجموعوں میں سے کیا گیا ہے۔ اس انتخاب میں حروف تہجی کے اعتبار سے ہر دیوان سے الگ الگ انتخاب کیا گیا ہے۔ ذیل میں ردیف دار ان غزلوں اور اشعار کی تفصیل پیش کی جاتی ہے جو اس انتخاب میں موجود ہیں۔

حروف تہجی	دیوان اول	دیوان دوم	دیوان سوم	دیوان چہارم	دیوان پنجم	دیوان ششم
	غزلیں، اشعار	غزلیں، اشعار	غزلیں، اشعار	غزلیں، اشعار	غزلیں، اشعار	غزلیں، اشعار
ردیف الف:	۱۲۲، ۱۳	۷۰، ۲۰	۱۳، ۱۸	۳، ۹	۹، ۱۳	۱۱، ۷
ردیف ب:	–، ۳	۲، ۶	۳، –	۱، –	۵، ۳	–، ۱
ردیف ت:	۳، –	۳، ۲	۳، ۳	–، –	–، ۳	–، ۲
ردیف ج:	۱، –	–، –	–، –	–، –	۱، ۱	–، –
ردیف چ:	۱، –	۱، ۱	–، ۱	–، ۱	–، –	۲، –
ردیف ح:	–، ۱	–، ۱	–، –	–، –	–، –	–، –
ردیف د:	۴، –	۳، –	۳، –	–، –	–، ۱	–، –
ردیف ر:	۹، ۸	۴، ۵	۲، ۲	–، ۲	۴، ۳	۲، –
ردیف ز:	–، ۲	–، ۱	–،	–، ۱	۲، ۱	–، –
ردیف س:	۱، –	–، ۱	۱، ۲	۱، –	۱، –	–، –
ردیف ش:	۱، ۱	–، ۲	۲، ۱	–، ۱	–، ۱	–، –
ردیف ط:	–، –	–، ۱	–، –	–، ۱	۱، ۱	–، –
ردیف ع:	–، –	–، –	–، ۱	–، –	–، ۱	–، –
ردیف غ:	–، –	۱، –	۱، –	۱، –	۱، –	–، –
ردیف ف:	۱، –	۱، –	۱، –	۱، –	۱، –	–، –
ردیف ک:	۶، ۲	–، ۳	–، –	۱، ۱	۲، –	۱، –
ردیف گ:	۱، –	۳، ۱	–، –	–، ۱	–، ۱	–، –
ردیف ل:	۵، –	۱، –	۱، –	–، –	۱، –	۱، –

ردیف م: ۸، ۱ ۵، ۲ ۱، ۲، ۱، ۲ ۱،

ردیف ن: ۳۸، ۱۴ ۲۳، ۹ ۶، ۷ ۵، ۱۳ ۳، ۳ ۵، ۳

ردیف و: ۶، ۱۰ ۱۰، ۸ ۱، ۸ ۲، ۲ ۳، ۶ ۷، ۱

ردیف ہ: ۵، ۲ ۵، ۲ ۱، ۲ –، – ۲، ۳ ۴، ۳

ردیف ے: ۱۰۰، ۲۵ ۵۰، ۱۸ ۸، ۱۱ ۹، ۱۳ ۲۹، ۲۲ ۲۳، ۸

غزلیات کے علاوہ دیگر اصناف سخن کا انتخاب یوں ہے:

فردیات : ۷

رباعیات : ۱۸

رباعیات مستزاد : ۳

ترکیب بند : ۱۴

مسدس : ۳

مخمس : ۲

قصائد : ۲

مثنویات : ۲۰

قطعہ : ۱

مسدس بطرز واسوخت : ۱

غزلیات از شکار نامہ : ۱۲

ناصر کاظمی کو اگرچہ "میر شناسی" کا دعویٰ کبھی نہیں رہا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان سے زیادہ نہ تو کسی نے میر کو پڑھا ہے اور نہ ان سے بڑھ کر کوئی میر کو سمجھ سکا ہے۔ انھوں نے "میر' ہمارے عہد میں " کے عنوان سے میر پر ایک طویل مضمون قلم

بند کیا اور میر ہی کے موضوع پر انتظار حسین سے ایک طویل مکالمہ بھی کیا۔ ناصر کاظمی کا یہ مضمون اور مکالمہ بھی انتخاب میر کے ابتدائی صفحات کی زینت ہے۔ ان پر ہم "ناصر کاظمی کی نثر" کے باب میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ سردست ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ زیر نظر انتخاب کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس میں ناصر کاظمی نے کن باتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب ناصر کاظمی کے ایک مکالمے میں موجود ہے وہ کہتے ہیں:

"میر کے جو برے بھلے انتخاب ہو رہے ہیں ان میں میر سے انصاف نہیں ہوا ان کے بہتر نشتروں کا میں بھی ہلاک ہوں لیکن ان نشتروں پر ہی بات ختم نہیں ہو جاتی۔ مجھے تو اس کی غیر معروف غزلوں میں بعض اشعار یا مصرعے پدم سانپ کی طرح پیچ و تاب کھاتے اور پھنکارتے نظر آتے ہیں۔ یہ سانپ انگشت کے برابر ہوتا ہے۔ مٹی کے رنگ کا۔ عام نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ میں نے یہ زہر بھی سہارا ہے۔"۶۹

اس اقتباس سے چند اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ اب تک میر کی شاعری کے جتنے بھی انتخاب ہوئے ہیں ان میں میر سے انصاف نہیں ہوا اور میر کی مکمل شخصیت اور فن ہمارے سامنے نہیں آتا۔

۲۔ میر کے بہتر نشتروں کا جواب نہیں لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ میر کے بے شمار غیر معروف اشعار بھی ایسے ہیں جو پدم سانپ کی طرح پانی مانگنے کی مہلت نہیں دیتے۔

چنانچہ زیر نظر "انتخاب میر" کو مرتب کرتے ہوئے ناصر کاظمی کے سامنے یہ دو امور رہے کہ ایک تو انتخاب ایسا ہونا چاہئے جس میں میر کی شاعری کی تمام جہتیں آ جائیں۔ دوسرے یہ کہ میر کو محض ان کے معروف اشعار کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کے بجائے ان اشعار کے آئینے میں بھی دیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے جو آج تک لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ میر کے صرف بہتر نشتر ہی نہیں بلکہ بے شمار اور بھی ایسے نشتر ہیں جو ان بہتر نشتروں سے بھی آگے کی چیز ہیں۔ ان جملہ امور کو

پیش نظر رکھتے ہوئے ناصر کاظمی نے کلیات میر کے انتخاب کا بیڑا اٹھایا اور انتخاب کردہ تمام غزلیات اپنے ہاتھ سے ایک کاپی پر نقل کیں۔ باصر سلطان کاظمی نے ''انتخاب میر'' کے تعارف میں لکھا ہے کہ جس کلیات سے ناصر کاظمی نے یہ انتخاب کیا ہے اس میں سرخ، نیلی، کالی پنسلوں اور قلموں سے مختلف نشانات لگے ہوئے ہیں اور حواشی لکھے ہوئے ہیں۔ ان حواشی میں دو حرفی تبصرے اور مختلف شاعروں مثلاً غالب، ولی، درد، مصحفی وغیرہ کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر کا شعر پڑھ کر جس شاعر کی گونج ذہن میں ابھری ہے اس کا نام لکھ دیا گیا ہے۔

زیر نظر انتخاب میں میر کے چھ دیوانوں کا انتخاب ناصر کاظمی نے خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر محفوظ کر رکھا تھا جبکہ کتاب کے آخر میں دیگر اصناف سخن کے انتخاب کے سلسلے میں مرتب نے ان نشانات اور حواشی سے رہنمائی حاصل کی ہے جو کلیات میر پر ناصر کاظمی نے لگائے تھے۔

۲۔ انتخاب نظیر:

ناصر کاظمی نے جن دو شعرا کے انتخاب ایک الگ رجسٹر میں درج کر رکھے تھے ان میں ایک نظیر اکبر آبادی بھی تھے۔ نظیر، ناصر کاظمی کے پسندیدہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ مکالمہ ''خوشبو کی ہجرت'' میں نظیر اکبر آبادی کا ذکر آیا ہے اس طرح ناصر کاظمی کے ریڈیو فیچرز میں انھوں نے جن کلاسیکی شعرا کو موضوع بنایا ہے ان میں نظیر کا نام بھی شامل ہے۔ زیر نظر انتخاب کے آغاز میں ریڈیو فیچر اور ''خوشبو کی ہجرت'' کا متعلقہ حصہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ الف میں غزلیات کا انتخاب کیا گیا ہے اور حصہ ب میں منتخب منظومات شامل کی گئی ہیں۔

غزلیات کی ہجی وار ترتیب یوں بنتی ہے۔

ردیف الف :	۲۸ غزلیات،	۸ اشعار
ردیف ب :	۱ غزل	
ردیف ت :	۱ غزل	

ردیف چ:	۱ غزل	
ردیف ح:	۱ غزل	
ردیف د:	۱ غزل،	۱ شعر
ردیف ر:	۳ غزلیں	۱ شعر
ردیف ز:	۱ غزل	
ردیف س:		۱ شعر
ردیف ش:		۱ شعر
ردیف ف:	۱ غزل	
ردیف گ:		۱ شعر
ردیف ل:	۱ غزل	
ردیف م:	۱ غزل	
ردیف ن:	۵ غزلیں،	۲ اشعار
ردیف ہ:	۳ غزلیں،	۱ شعر
ردیف ے:	۱۵ غزلیات،	۴ اشعار

جہاں تک منظومات کا تعلق ہے تو نظیر اکبر آبادی کی کل اناسی (۷۹) نظمیں اسی انتخاب میں شامل کی گئی ہیں، انتخاب کے آخر میں ایک فرہنگ بھی ترتیب دی گئی ہے جس میں سو کے لگ بھگ ایسے الفاظ کے معنی دیئے گئے ہیں جو نظیر کی منتخب نظموں میں استعمال ہوئے ہیں۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ نظیر نے کبوتروں کی اقسام اور رنگ کے لحاظ سے پچاس کے قریب نام گنوائے ہیں جو مختلف نظموں میں کبوتروں کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ ناصر کاظمی چونکہ خود کبوتروں سے دلچسپی رکھتے تھے اس لئے اسی نسبت سے فرہنگ میں یہ تمام نام بھی درج کئے گئے ہیں۔

نظموں کے انتخاب میں نظیر کی عوامی اور زبان زد عام نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی موضوعات پر لکھی ہوئی نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ مثلاً "یہ دنیا"، "دنیا دار المکافات ہے"، "دنیا"، "مذمت اہل دنیا"، "مذمت بخل"، "تن کا جھونپڑا"

"توکل، ترک و تجرید" "ترک و تجرید"، "تلقین توحید"، "قناعت"، "وجد و حال"، "اسرار قدرت"، "خواب غفلت"، "کل من علیہا فان" ایسی نظمیں ہیں جو اخلاقیات اور تصوف کے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

۳۔ انتخاب ولی::

ناصر کاظمی نے ولی کے کلام کا یہ انتخاب سید نور الحسن ہاشمی کے مرتب کردہ "کلیات ولی" مطبوعہ ۱۹۵۴ء سے کیا۔ اس بارے میں باصر سلطان کاظمی لکھتے ہیں:

"مذکورہ کلیات کے نسخے میں ناصر کاظمی نے اول تا آخر منتخب اشعار پر نشان ہائے انتخاب (✓) لگا رکھے ہیں۔ یہ اشعار انہوں نے گزشتہ انتخابوں کی طرح ایک دفتر میں لکھنا تھے لیکن صرف چوبیس غزلیں ہی لکھ پائے تھے کہ بیماری نے انہیں یہ کام ملتوی کرنے پر مجبور کر دیا اور یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔" ۷۰

انتخاب کے آغاز میں کلیات ولی کے مقدمے کی ان سطور کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے جنہیں ناصر کاظمی نے انڈر لائن کر رکھا تھا۔ یہ سطور زیادہ تر ولی دکنی کے شخصی حالات اور زندگی کے اہم واقعات پر مبنی ہیں۔ اسی طرح ناصر کاظمی نے کلام ولی کی متعدد تراکیب اور الفاظ کو بھی انڈر لائن کیا تھا جنہیں مرتب نے تعارف میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے متعدد اشعار یا مصرعوں کی فہرست بھی درج کر دی گئی ہے جن کے حواشی میں میر غالب یا مومن کے نام یا ان کے مصرعے یا اشعار لکھے ہوئے ہیں یا اپنی رائے کے اظہار کے لئے کوئی جملہ درج کیا گیا ہے۔ ولی دکنی کے بارے میں ناصر کاظمی کے ریڈیو فیچر کا ایک اقتباس بھی شامل کتاب ہے۔ اسی طرح ناصر کاظمی کی ڈائری کے وہ اوراق بھی پیش کر دیئے گئے ہیں جن میں انہوں نے ولی کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

"۲۱ جنوری ۱۹۵۳ء علی الصباح' ولی دکنی کی زبان کے بعض الفاظ آج متروک ہو چکے ہیں مگر یاروں نے تو ساری زبان ہی متروک کر دی

ہے۔ بعض متروک الفاظ آج بھی رائج ہونے چاہئیں۔ ڈرامہ کے لئے بول چال یا مکالمات میں بعض الفاظ آج بھی بھلے معلوم ہوں گے۔ مثلاً مکالمہ میں "نہیں" کی جگہ "نئیں۔" اسی طرح "تک کا بدل دوسرا لفظ نہیں۔"[۱۷]

زیرِ نظر انتخاب حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس کے انتخاب کی صورت کچھ یوں بنتی ہے:

ردیف الف:	۴۱ غزلیات '	۸ اشعار
ردیف ب:	۳ غزلیات '	۱ شعر
ردیف ت:	۳ غزلیات '	۱ شعر
ردیف ث:		۲ اشعار
ردیف ج:	۲ غزلیات	
ردیف ح:		۱ شعر
ردیف خ:	۱ غزل	
ردیف د:	۴ غزلیات '	۳ شعر
ردیف ذ:	۱ غزل	
ردیف ر:	۱۰ غزلیات '	۳ اشعار
ردیف ز:	۲ غزلیات	
ردیف س:	۳ غزلیات '	۱ شعر
ردیف ش:	۲ غزلیات	
ردیف ص:	۲ غزلیات '	۱ شعر
ردیف ض:	۲ غزلیات '	۱ شعر
ردیف ظ:		۱ شعر
ردیف ع:	۲ غزلیات	
ردیف غ:	۲ غزلیات	
ردیف ف:		۲ اشعار

ردیف ق :	۱ غزل	
ردیف ک :		۲ اشعار
ردیف ل :	۳ غزلیات '	۷ اشعار
ردیف م :	۴ غزلیات '	۲ اشعار
ردیف ن :	۳۱ غزلیات '	۱۹ اشعار
ردیف و :	۵ غزلیات '	۳ اشعار
ردیف ہ :	۵ غزلیات '	۳ اشعار
ردیف ے :	۸۷ غزلیات '	۱۹ اشعار

غزلیات کے علاوہ اس انتخاب میں دیگر اصناف سخن کی ترتیب کچھ یوں بنتی ہے۔

حمد : ۱ ' نعت : ۱ ' منقبت : ۱ ' فردیات : ۱۳ ' رباعیات : ۱۳ ' قصائد : ۲ ' قطعات : ۴۔

انتخاب کے آخر میں تقریباً ۵۶ الفاظ پر مشتمل ایک فرہنگ بھی دی گئی ہے جس میں ولی کی منتخب شاعری میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معانی درج کئے گئے ہیں۔

۴۔ انتخاب انشا::

یہ انتخاب بھی ناصر کاظمی کے ان نشان ہائے انتخاب کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے جو انہوں نے کلیات انشاء اللہ خاں ' مطبوعہ منشی نول کشور پر لگائے تھے۔ اس انتخاب میں کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو انہوں نے الگ کاغذوں پر درج کر رکھے تھے۔ مثلاً اس انتخاب میں ناصر کاظمی کی تحریر کا ایک عکس دیا گیا ہے جس میں انہوں نے ایک نوٹ کے ساتھ انشا کے تین اشعار درج کیے ہیں :۔

"نظیر اکبر آبادی کے بعد لکھنؤی شعرا میں سید انشا اور ان کے ہم

عصروں کے یہاں بھی اس زمین کے موسموں کے خارجی رنگ موجود ہیں۔ لیکن تنگنائے غزل کی ہیئت انہیں اپنے محدود دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔

گرمی کی جو شکوہ تھی سب گرد ہو گئی
دو چار بوندوں ہی میں ہوا سرد ہو گئی

بادل آئے، بجلی چمکی، مینہ کے ڈریڑے پڑتے ہیں
پھولوں کے منہ پر باد صبا کے آج تھپیڑے پڑتے ہیں

ہے بندھا مینہ کے تار کا جھولا
کیوں نہ لے جھونٹے یار کا جھولا۔"ے۲۷

زیر نظر انتخاب بھی حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ غزلوں کی ترتیب وار صورت کچھ یوں بنتی ہے:

ردیف الف :	۳۳ غزلیات	۱۶ اشعار
ردیف ب :	۲ غزلیات	
ردیف پ :	۲ غزلیات	
ردیف ت :	۶ غزلیات '	۱ شعر
ردیف ٹ :	۴ غزلیات '	۱ شعر
ردیف ث :	۱ غزل	
ردیف چ :		۱ شعر
ردیف ج :	۲ غزلیات	
ردیف ح :	۳ غزلیات	
ردیف خ :	۱ غزل	
ردیف د :	۱ غزل '	۱ شعر
ردیف ذ :	۳ غزلیات '	

ردیف ر :	۱۲ غزلیات ،	۲ اشعار
ردیف ڑ :	۱ غزل ،	۲ اشعار
ردیف ز :		۱ شعر
ردیف س :	۳ غزلیات ،	۱ شعر
ردیف ش :	۱ غزل ،	۲ اشعار
ردیف ص :	۱ غزل	
ردیف ض :	۱ غزل	
ردیف ط :	۱ غزل ،	۱ شعر
ردیف ع :	۱ غزل	
ردیف غ :	۱ غزل	
ردیف ف :		۱ شعر
ردیف ق :	۱ غزل ،	۱ شعر
ردیف ک :		۲ اشعار
ردیف ل :	۲ غزلیات	۵ اشعار
ردیف م :	۶ غزلیات	۳ اشعار
ردیف ن :	۱۸ غزلیات ،	۱۴ اشعار
ردیف و :	۹ غزلیات ،	۱ شعر
ردیف ہ :	۴ غزلیات ،	۳ اشعار
ردیف ے :	۲۹ غزلیات ،	۱۳ اشعار

دیوان ریختی سے مختصر انتخاب کی ہجی وار ترتیب یوں ہے۔

ردیف الف :	۱۱ شعر
ردیف ع :	۱ شعر
ردیف ہ :	۱ شعر

ردیف ے: ۲ غزلیات' ۱۳ اشعار

غزل کے علاوہ زیر نظر انتخاب میں ایک حمد' ایک منقبت' دو قصائد' ایک مثنوی اور ایک رباعی بھی شامل ہے۔

○::○

حواشی

۱ -: احمد ندیم قاسمی (مضمون)' "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ' ص :۹۰' ۹۱

۲ -: فراق گورکھپوری "" "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ' ص :۲۷

۳ -: انتظار حسین "" "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ' ص :۲۷

۴ -: انتظار حسین "" "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ' ص :۲۷

۵ -: احمد ندیم قاسمی "" "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ص :۸۸' ۸۹

۶ -: سلیم احمد "" "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ' ص :۹۳

۷ -: مظفر علی سید ' "" "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ص : ۱۰۳

۸ -: منیر نیازی ' "" "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ص : ۱۳۱

۹ -: آفتاب احمد ' "" "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ص : ۱۲۰

۱۰ :- شمس الرحمٰن فاروقی ‘‘ ’’ہجر کی رات کا ستارا‘‘ (مرتبہ) احمد مشتاق ‘ ص ۱۵۰ :

۱۱ :- شمس الرحمٰن فاروقی ‘ ‘‘ ’’ہجر کی رات کا ستارا‘‘ (مرتبہ) احمد مشتاق ‘ ص ۱۵۲ :

۱۲ :- ناصر کاظمی ‘ ’’خشک چشمے کے کنارے‘‘ انٹرویو انتظار حسین ‘ ص : ۳۷۹

۱۳ :- سہیل احمد ‘ (مضمون)’’ہجر کی رات کا ستارا‘‘ (مرتبہ) احمد مشتاق ‘ ص ۱۸۶ :

۱۴ :- سہیل احمد ‘ ’’ہجر کی رات کا ستارا‘‘ (مرتبہ) احمد مشتاق ‘ ص : ۱۸۷ - ۱۸۸

۱۵ :- حامدی کاشمیری ‘ ’’ناصر کاظمی کی شاعری‘‘ اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد ۱۹۸۲ء ص : ۱۱۷ ‘ ۱۱۸

۱۶ :- ناصر کاظمی ‘ ’’خشک چشمے کے کنارے‘‘ انٹرویو انتظار حسین ‘ ص : ۳۶۱ ‘ ۳۶۲

۱۷ :- مظفر علی سید ‘ ‘‘ ’’ہجر کی رات کا ستارا‘‘ (مرتبہ)احمد مشتاق ص : ۱۰۶

۱۸ :- ناصر کاظمی ‘ ’’خشک چشمے کے کنارے‘‘ انٹرویو انتظار حسین ‘ ص : ۳۷۰

۱۹ :- ناصر کاظمی ‘ ’’برگ نے‘‘ اعتبار نغمہ ‘ مکتبہ خیال لاہور جنوری ۱۹۸۷ء ‘ ص : ۱۳ ‘ ۱۴

۲۰ :- عبدالحمید ‘ (مضمون)’’ہجر کی رات کا ستارا‘‘ (مرتبہ) احمد مشتاق ص : ۱۹

۲۱ :- ناصر کاظمی ‘ ’’خشک چشمے کے کنارے‘‘ انٹرویو انتظار حسین ‘ ص : ۳۷۰

۲۲ :- آفتاب احمد ‘ (مضمون) ’’ہجر کی رات کا ستارا‘‘ (مرتبہ) احمد مشتاق ص : ۱۳۶

۲۳ :- حامدی کاشمیری ‘ ’’ناصر کاظمی کی شاعری‘‘ ص : ۱۴ - ۱۵

۲۴ :- احمد ندیم قاسمی ‘ (مضمون)’’ہجر کی رات کا ستارا‘‘ (مرتبہ) احمد مشتاق

، ص : ۸۹ - ۹۰

۲۵ :- انتظار حسین ، " "ہجر کی رات کا ستارا" ، (مرتبہ) احمد مشتاق ، ص : ۳۴

۲٦ :- انتظار حسین ، " "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ص : ۳۴، ۳۵

۲۷ :- سہیل احمد خان ، ڈاکٹر ، " "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ، ص : ۱٦۹

۲۸ :- انتظار حسین ، " "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ص : ۴۳، ۴۴

۲۹ :- شمس الرحمٰن فاروقی ، " "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ص : ۱۵۲

۳۰ :- سہیل احمد ، ڈاکٹر ، " "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ، ص : ۱۸۴

۳۱ :- منیر نیازی ، " "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ، ص : ۱۳۲ - ۱۳۳

۳۲ :- شمس الرحمان فاروقی ، " "ہجر کی رات کا ستارا" (مرتبہ) احمد مشتاق ، ص : ۱۰۴ - ۱۰۵

۳۳ :- آفتاب احمد ، " "ہجر کی رات کا ستارا" ، (مرتبہ) احمد مشتاق ، ص : ۱۱۷

۳۴ :- ناصر کاظمی ، "خشک چشمے کے کنارے" انٹرویو انتظار حسین ، ص : ۳۸۱

۳۵ :- ناصر کاظمی ، مکالمہ انتظار حسین ، "خشک چشمے کے کنارے" ، ص : ۳٦۱

۳٦ :- ناصر کاظمی ، "خشک چشمے کے کنارے" انٹرویو انتظار حسین ، ص : ۳٦۰

۳۷ :- شیخ صلاح الدین ، ''ناصر کاظمی ایک دھیان'' ، ص : ۳۱ - ۳۲
۳۸ :- ڈاکٹر خواجہ زکریا ، مضمون ''حلقہ ارباب ذوق'' ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۱ء
۳۹ :- ناصر کاظمی ، ''پہلی بارش'' دیباچہ باصر سلطان کاظمی ، ص : ۱۲
۴۰ :- '' ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' انتظار حسین مکالمہ ، ص : ۳۵۸
۴۱ :- ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' انتظار حسین مکالمہ ، ص : ۳۷۹
۴۲ :- شیخ صلاح الدین ، ''ناصر کاظمی ایک دھیان'' ، ص : ۱۴۳
۴۳ :- افتخار کاظمی ، گفتگو مکالمہ ، ۲۹- جون ۱۹۹۴ء
۴۴ :- شیخ صلاح الدین ، ''ناصر کاظمی ایک دھیان'' ، ص : ۴۴
۴۵ :- ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' انٹرویو انتظار حسین ، ص : ۳۶۱
۴۶ :- ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' انٹرویو انتظار حسین ص : ۳۶۲
۴۷ :- ایک مباحثہ ، رسالہ ''سوغات'' جدید نظم نمبر ۷ - ۸ ، ص : ۱۸۷ تا ۱۹۲
۴۸ :- ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' انٹرویو انتظار حسین ص : ۳۵۴
۴۹ :- محمد اعظم خان ، گفتگو مقالہ نگار ، اس کا حوالہ پہلے باب میں دیا جا چکا ہے
۵۰ :- مظفر عباس ڈاکٹر ، ''اردو میں شاعری'' مطبوعہ مکتبہ عالیہ ۱۹۸۷ - ۱۹۸۷ء ، ص : ۱۹ - ۲۰
۵۱ :- مظفر عباس ، ڈاکٹر ، ''اردو میں قومی شاعری'' ص : ۲۷۱
۵۲ :- ناصر کاظمی ، ''چند پریشاں کاغذ'' غیر مطبوعہ ڈائری مملوکہ باصر سلطان کاظمی - حسن سلطان کاظمی
۵۳ :- مظفر عباس ، ڈاکٹر ، ''اردو میں قومی شاعری'' ص : ۲۷۲ تا ۲۸۷
۵۴ :- صلاح الدین ، شیخ ، ''ناصر کاظمی ایک دھیان'' ، ص : ۲۸ - ۲۹
۵۵ :- شیخ صلاح الدین ، ''ناصر کاظمی ایک دھیان'' ، ص : ۱۷ - ۱۸

۵۶ :۔ شیخ صلاح الدین "گفتگو مقالہ نگار" ۲۶۔ جون ۱۹۹۴ء

۵۸ :۔ شیخ صلاح الدین "ناصر کاظمی ایک دھیان" ص : ۱۲۳ تا ۱۳۰

۵۹ :۔ شیخ صلاح الدین "ناصر کاظمی ایک دھیان" ' ص : ۲۴

۶۰ :۔ شیخ صلاح الدین "ناصر کاظمی ایک دھیان" ' ص : ۹۶

۶۱ :۔ پروفیسر وقار عظیم' "اردو ڈراما فن اور منزلیں" ترتیب معین الرحمن' ڈاکٹر سید' پبلیشر یونیورسل بک ۱۹۹۲ء۔ ۱۹۹۳ء' ص : ۲۱۔ ۲۲

۶۲ :۔ ناصر کاظمی ' "سر کی چھایا" دیباچہ باصر سلطان کاظمی' ناشر مکتبہ خیال لاہور نومبر ۱۹۸۷ء' ص : ۴

۶۴ :۔ ناصر کاظمی' "سر کی چھایا" دیباچہ باصر سلطان کاظمی ناشر مکتبہ خیال لاہور نومبر ۱۹۸۷ء ص:۴

۶۵ :۔ حسن اختر' ملک' ڈاکٹر' "اردو ڈرامے کی مختصر تاریخ" ناشر مقبول اکیڈیمی لاہور ۱۹۹۰ء ص : ۱۴۔ ۱۵

۶۶ :۔ حسن اختر ملک' ڈاکٹر' "اردو ڈرامے کی مختصر تاریخ" ' ص : ۳۱

۶۷ :۔ "ناصر کاظمی ' "سر کی چھایا" ' دیباچہ باصر سلطان کاظمی ص : ۲۸

۶۸ :۔ باصر کاظمی' "تعارف انتخاب میر" ' مکتبہ خیال لاہور ۱۹۸۹ء ص : ۵

۶۹ :۔ ناصر کاظمی' "دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف" ' مکالمہ' "ماہ نو" کراچی' ستمبر ۱۹۵۴ء

۷۰ :۔ باصر سلطان کاظمی' تعارف "انتخاب ولی" آغا پبلشرز لاہور ۱۹۹ء ص : ۴

۷۱ :۔ باصر سلطان کاظمی ' تعارف "انتخاب ولی" ' آغا پبلشرز' لاہور ۱۹۹۱ء ص : ۱۹

۷۲ :۔ ناصر کاظمی' "عکس تحریر ' انتخاب انشا" فضل حق اینڈ سنز' لاہور' ۱۹۹۱ء

○::○

باب چہارم

ناصر کاظمی کی نثر

□☆::☆□

□☆⁂☆□

ناصر کاظمی کی نثر

ناصر کاظمی کی شاعری جس تخلیقی منطقے میں ابھرتی' پھیلتی اور اردگرد کے منطقوں کو اپنے گرفت میں لے کر اپنے عہد کی دیگر آوازوں کی لے مدھم کرتی ہے اس کا ایک وسیع منظر نامہ گزشتہ ابواب میں پیش کیا جا چکا ہے۔ زیر نظر باب ناصر کاظمی کی نثر کے لئے مخصوص ہے۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ناصر کاظمی جتنے بڑے شاعر تھے اتنے بڑے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثری تحریریں اور گفتگوئیں جہاں اپنے دامن میں بھرپور تنقیدی احساس لئے ہوئے ہیں وہاں ادب کے باب میں فکر و خیال کی نئی راہیں اختراع کرتی نظر آتی ہیں۔ ناصر کاظمی کے نثری مضامین کا واحد مجموعہ ''خشک چشمے

کے کنارے" کے نام سے ان کے انتقال کے چودہ برس بعد اپریل ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ان کے صاحبزادگان باصر سلطان کاظمی اور حسن سلطان کاظمی کا مرتب کردہ ہے۔ مجموعے کے آغاز میں مرتبین کا ایک نوٹ شامل ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں:

"اردو کے بہت سے ادیب، نقاد، پروفیسر اور اہل ذوق یہ کہتے ہیں کہ ناصر کاظمی جب نثر لکھتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ وہ محض شاعر ہی نہیں ایک بھرپور نثر نگار بھی ہے۔ اس رائے کی تصدیق یا تردید کتاب پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتی ہے ------ "خشک چشمے کے کنارے" ناصر کاظمی کے مختلف مضامین پر مشتمل ہے جس کا نام انہوں نے خود رکھا تھا اس میں کچھ مضامین مختلف ادبی رسائل میں چھپ چکے ہیں اور کچھ ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کاغذات میں محفوظ ہیں۔ بعض مضامین ان کے مختلف ریڈیو فیچرز سے اخذ کئے گئے ہیں ------"[۱]

ناصر کاظمی کے اس مجموعہ مضامین میں متفرقات کے آٹھ نثری اقتباسات (جو ان کی ڈائری سے ماخوذ ہیں) سمیت کل انتالیس مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر مضامین کی ضخامت دو اڑھائی صفحات سے زیادہ نہیں۔ میر کے حوالے سے لکھا گیا مضمون "میر ہمارے عہد میں" اس مجموعے کا طویل ترین مضمون ہے جو اولاً "سویرا" کے شمارہ ۱۹، ۲۰، ۲۱ میں شائع ہوا، ثانیاً" زیر نظر مجموعے میں شامل کیا گیا اور ثالثاً" ناصر کاظمی کے "انتخاب میر" (مطبوعہ مارچ ۱۹۸۹ء) میں رکھا گیا ہے۔ ناصر کاظمی کے ان مضامین کی فہرست کچھ یوں ہے۔

حصہ اول:

۱۔ خشک چشمے کے کنارے — (حلقہ ارباب ذوق کے تیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۶ نومبر ۱۹۶۹ء بروز جمعرات پڑھا گیا خطبہ صدارت تاریخ تحریر ۵ نومبر ۱۹۶۹ء

۲۔ میں کیوں لکھتا ہوں — مطبوعہ "سویرا" ۱۵ - ۱۶

۳۔ میرا ہم عصر — مطبوعہ ادب لطیف نومبر ۱۹۶۳ء

۴۔ روایت اور انسانی ارتقا — مطبوعہ ہمایوں دسمبر ۱۹۶۲ء
۵۔ ادب میں جمود — مطبوعہ ہمایوں جنوری ۱۹۵۳ء
۶۔ چوتھی سمت کی تلاش — غیر مطبوعہ
۷۔ مجھ کو شاعر نہ کہو — ״
۸۔ شاعرانہ صداقت — ״
۹۔ ادیب اور معاشرتی پابندیاں — ״
۱۰۔ نئے لوگ — ״
۱۱۔ معنی کا طلسم — ״
۱۲۔ آج کا ادب — ״
۱۳۔ ہرن کا شکار — مطبوعہ ہمایوں نومبر ۱۹۵۶ء
۱۴۔ میر کے زمانے کی عورت — مطبوعہ ادب لطیف جون ۱۹۶۳ء
۱۵۔ غالب کا طرفدار نہیں — مطبوعہ ادب لطیف اکتوبر ۱۹۶۲ء
۱۶۔ عبدالرحمن چغتائی — مطبوعہ اوراق نو
۱۷۔ احمد مشتاق — غیر مطبوعہ
۱۸۔ شہری فرہاد — مطبوعہ دیباچہ "تیشہ لفظ"
از سجاد باقر رضوی ۲۹ جنوری ۱۹۶۸ء
۱۹۔ ایک کہانی دو استعارے — مطبوعہ فلیپ "دن اور داستان" انتظار حسین
۲۰۔ کچھ شاہ عارفی کے بارے میں — مطبوعہ "نصرت" جنوری ۱۹۶۱ء
۲۱۔ شخص اور عکس — مطبوعہ "ادب لطیف" فروری ۱۹۶۳ء
۲۲۔ کھٹے آم کی تلاش — مطبوعہ "نصرت" جنوری ۱۹۶۳ء
۲۳۔ میر ہمارے عہد میں — مطبوعہ "سویرا" شمارہ ۱۹، ۲۰، ۲۱

حصہ دوم:

۲۴۔ نظیر اکبر آبادی — ریڈیو فیچر (ایوان سخن) ۲۷ مئی ۱۹۶۷ء

۲۵۔ غالب — ریڈیو فیچر (حسن کلام) ۱۸ نومبر ۱۹۶۹ء

۲۶۔ آب حیات میں ڈرامائی عنصر — ڈرامہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۵ء

۲۷۔ داغ — ریڈیو فیچر (ایوان سخن) ۱۴، اکتوبر ۱۹۶۹ء

۲۸۔ حسرت موہانی — " " "

۲۹۔ اقبال — ریڈیو فیچر (حسن کلام) ۱۸ نومبر ۱۹۶۹ء

۳۰۔ مسجد قرطبہ — " (بزم خیال) ت ۔ ن

۳۱۔ راشد، میراجی، فیض — " (ایوان سخن) ۲۲ اپریل ۱۹۶۹ء

۳۲۔ نئی غزل — " حرف و صوت ۲ فروری ۱۹۷۱ء

۳۳۔ اردو شاعری میں ردیف کی اہمیت (موج خیال) ۴ مئی ۱۹۶۷ء

۳۴۔ اردو غزل میں ہجر و وصال — " (گل نغمہ) ۱۹ جنوری ۱۹۷۱ء

۳۵۔ شاعر اور خدا کی تلاش — (شہر غزل) ۴ جون ۱۹۶۸ء

۳۶۔ شاعر اور تنہائی — " (ایوان سخن) ۲۴ جون ۱۹۶۹ء

حصہ سوم :::

۳۷۔ متفرقات (آٹھ نثری اقتباسات میں سے
صرف دو پر ۱۱ مارچ ۱۹۶۴ء
اور ۳۱ اگست ۱۹۷۱ء کی تاریخیں درج ہیں)

کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں حصہ چہارم کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں مندرجہ ذیل دو مضامین شامل ہیں۔

۱۔ حفیظ ہوشیارپوری — غیر مطبوعہ

۲۔ میرابائی کی بھن — "

"خشک چشمے کے کنارے" کا تیسرا ایڈیشن جولائی ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ جس میں حصہ پنجم کا اضافہ کر کے ناصر کاظمی کے اداریے، مکالمے اور آخری انٹرویو بھی شامل کیا گیا۔ ان مضامین کی تفصیل یوں ہے

اداریے::

۱۔ ہماری قومی زبان — مطبوعہ "اوراق نو"

۲۔ نئے اور پرانے کا امتزاج — مطبوعہ "ہمایوں" نومبر ۱۹۵۶ء

مکالمے::

۱۔ خوشبو کی ہجرت — شرکاء (ناصر کاظمی، انتظار حسین، حنیف رامے، شیخ صلاح الدین" مطبوعہ "سویرا" شمارہ ۱۷، ۱۸

۲۔ رفتار کا بدن — شرکاء (ناصر کاظمی، انتظار حسین، حنیف رامے، شیخ صلاح الدین) مطبوعہ "سویرا"، شمارہ ۱۹، ۲۰، ۲۱

۳۔ غالب اور ہم — شرکاء (ناصر کاظمی، انتظار حسین) مطبوعہ "ماہ نو" کراچی، مئی ۱۹۵۴ء

۴۔ دھواں سا کچھ اس نگر کی طرف — شرکاء (ناصر کاظمی، انتظار حسین" مطبوعہ "ماہ نو" کراچی، ستمبر ۱۹۵۴ء

۵۔ افسانہ نگار کی تلاش — شرکاء (ناصر کاظمی، انتظار حسین) مطبوعہ "ماہ نو" کراچی، مارچ ۱۹۵۵ء

۶۔ نیا اسم — شرکاء (ناصر کاظمی، انتظار حسین) مطبوعہ "نیا دور" کراچی، شمارہ ۷، ۸

انٹرویو::

۱۔ ناصر کاظمی کا آخری انٹرویو::

انتظار حسین، برائے پاکستان ٹیلی ویژن

ناصر کاظمی کے اولین شعری مجموعے "برگ نے" کا دیباچہ "اختیار نغمہ" بھی ان کے نثری مضامین کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے جس پر یکم جنوری ۱۹۵۴ء کی تاریخ درج ہے۔ اس کے علاوہ ان کے وہ نثرپارے جو ڈائریوں کی صورت میں ان کے صاحبزادگان کی ملکیت ہیں ان کی "ذاتی ڈائری" کی ذیل میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

ناصر کاظمی کے نثری مضامین کی درج بالا فہرست پر مستزاد وہ گفتگوئیں ہیں جو مختلف اصحاب کے ساتھ انہوں نے چائے کی میز پر بیٹھ کر کیں۔ اس کے علاوہ دیگر مباحث ہیں جن میں وہ حصہ لیتے تھے۔ ناصر کاظمی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ گفتگو کے بادشاہ تھے۔ ان کی گفتگو میں ہر نوع کے علوم، ادبی دائرے اور عصری شعور سمٹ آتے تھے کہ سننے والا حیرت کے سمندر میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ کچھ ان کی اپنی اختراعیں تھیں۔ جنہیں وہ اس خوبصورتی اور صفائی سے بیان کرتے تھے کہ ان پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا تھا۔ بہر حال ناصر کاظمی کے ان مکالموں کی بے حد اہمیت ہے جو انہوں نے اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ بیٹھ کر کئے اور ان میں ادب کی عصری صورت حال اور دیگر موضوعات پر بحثیں کیں۔ ان بحثوں میں وہ سب پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں:

بقول احمد عقیل روبی:

"ناصر کاظمی کی زندگی میں یہی نفسیات تادم مرگ کام کرتی رہی کہ وہ ہر حیثیت میں لوگوں میں منفرد رہیں۔ چاہے شاعری ہو، گفتگو، نوکری یا غربت۔" ۲؎

یہی منفرد نظر آنے والی کیفیت ان کی نثری تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔ ناصر کاظمی کے نثری مضامین پر گفتگو سے قبل فن نثر کے بارے میں چند اہم اور بنیادی

باتیں پیش کرنا ضروری ہیں جن کے تناظر میں ہم ان کی نثر کا جائزہ لیں گے۔

نثر کیا ہے؟::

نثر کے بارے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ یہ تبلیغ افکار اور ترسیل علم کا کام دیتی ہے اور اس کے ذریعے وہ سیاسی، سماجی، فکری، علمی اور تہذیبی مقاصد آسانی سے پورے کئے جاسکتے ہیں جن کا بروئے کار لانا کسی خاص زمانے میں ضروری ہو جاتا ہے۔ لکھنے والا اپنے نقطہ نظر کی اہمیت و افادیت ثابت کرنے کے لئے مدلل، رواں، عام فہم اور اثر انگیز انداز میں لفظوں کو ترتیب دیتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ لفظ کو کب اور کیسے استعمال کیا جائے۔ مختلف الفاظ اور محاوروں کی کیا روایت اور تاریخ ہے۔ ان کے اندر نئے معنی اور خیال و احساس کے بدلتے دھاروں کو کیسے داخل کیا جا سکتا ہے۔ نثر نگار کے لئے سب سے اہم بات لفظوں کو جانچنے اور انہیں برتنے کا سلیقہ ہے۔ اگر نثر نگار لفظوں کو استعمال کرنے کا ہنر نہیں جانتا اور لفظوں کے مزاج و معانی سے آشنا نہیں ہے تو وہ ترسیل خیال کے مقصد کو پورا نہیں کر سکتا۔ آپ کے پاس خیال بذات خود کیسا ہی کیوں نہ ہو اگر ادائیگی کے سانچے مضبوط نہیں ہیں، الفاظ پر گرفت مستحکم نہیں، ڈھیلے ڈھالے جملے ریت کی طرح مٹھی سے پھسلتے جا رہے ہیں، محاوروں کے استعمال پر قدرت نہیں رکھتے تو خیال لفظوں کا روپ دھارتے ہی بد شکل اور بد ہیئت ہو جائے گا اور یوں آپ کی بات بے اثر رہ جائے گی۔ نثر کی ان خامیوں کو سب سے پہلے غالب اور پھر سر سید احمد خان نے محسوس کیا۔ غالب اور سر سید کی نثر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ غالب نے اردو نثر کو شخصی تجربات کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے مدعا نویسی پر نہ صرف اصرار کیا بلکہ مدعا نویسی میں ادبی حسن بھی پیدا کیا۔ ان کی نثر اگرچہ ایک بڑا تجربہ تھا لیکن یہ خالص ذاتی اور شخصی تجربہ تھا۔ اس کے برعکس سر سید احمد خان نے اردو نثر کو اپنی زندگی کا ہی نہیں بلکہ اس وسیع معاشرے کا ترجمان بنایا جس کے وہ ایک مقتدر فرد تھے۔ ۳

سر سید احمد خان نے اردو نثر کو جو وسعت عطا کی وہی جدید نثر کے ارتقا کا سنگ

بنیاد بن گئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں متنوع اصناف ادب کے ذریعے اپنے قدم مضبوطی سے جمانے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیوں کا عمل جاری رہا۔ طرز بیان اور اسلوب میں تغیرات پیدا ہوئے۔ جملوں کی ساخت بدلی' نئے لہجے زبان کے خمیر میں شامل ہوئے۔ نئی ترکیبیں بنیں اور یہ سب چیزیں زبان کی تہذیب کا حصہ بن کر سامنے آئیں اور یوں بیسویں صدی کے ربع آخر میں نثر کی جو صورت ہمارے سامنے تھی اسے سرسید احمد خان اور غالب کی نثر کی ارتقائی شکل قرار دیا جا سکتا ہے۔ جدید دور میں اردو نثر کے نقادوں نے نثر کے جو پیمانے وضع کئے ہیں ان میں لفظوں کی فضول خرچی اور ان کے بے جا استعمال کو نثر نگار کا سب سے بڑا جرم قرار دیا ہے۔ کم سے کم اور موزوں ترین الفاظ میں بات ادا کی جائے اور یہ صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب لکھنے والا زبان کے مزاج سے آگاہ' اس کی روایت' لفظوں کے صحیح معنی اور محاوروں کے درست استعمال سے واقف ہو۔ اس کے جملے میں جو لفظ یا محاورہ آئے وہ سچے موتی کی طرح روشنی دے۔ نثر نگار لفظوں کے نظم و ضبط اور ان کی ترتیب کا خیال رکھے اور موتیوں کی طرح انہیں ایک مسلک میں منسلک کرتا چلا جائے۔ الفاظ سخت پتھروں کی طرح ادھر ادھر لڑھکتے نہ رہیں بلکہ نرم روی اور سبک رفتاری سے خیال کی خوشبو بکھیرتے ہوئے مشام جاں کو معطر کرتے چلے جائیں۔ لیکن یہاں ہمیں ایک لمحے کو رک کر یہ دیکھنا ہے کہ اگر مفکرین کی اس بات کو درست مان لیا جائے کہ شاعری کی بنیاد تخیل اور جذبے پر ہے جبکہ نثر کی تعقل اور تفکر پر۔ تو کیا تفکر و تعقل اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ نثر میں تخیلاتی فضا اور خیال بندی پیدا کر کے اسے رواں دواں' سبک اور شگفتہ بنایا جا سکے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی رائے ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

> "تعقل پسندی کے فروغ سے جس کی نمائندگی ہر زبان کی نثر کرتی ہے عام معاشرتی طرز احساس میں ایک قسم کی بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے ------ ایسے موقع پر بعض ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو طرز احساس کو مربوط کرنے کی کوشش زبان کے حوالے سے کرتے ہیں۔ یعنی وہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جس میں عقل اور جذبہ یا عقل اور محسوسات آپس میں

مربوط ہو جائیں اس بات کی مثال شاعری میں مرزا غالب ہیں اور نثر میں محمد
حسین آزاد۔ گو یہ دونوں حضرات اس افتراق کو ختم نہ کر سکے لیکن اس
طرح زبان کے استعمال کا ایک نیا اسلوب ضرور دے گئے۔" ۲۰

یہ بات طے ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں نثر کا ارتقا تعقل کے حوالے سے ہوا ہے لیکن آزاد کی مثال سامنے رکھیں اور نثر کی شگفتگی کے لئے تعقل کے حوالے سے سلاست اور تخیل کے حوالے سے تصویر کاری کو لے لیا جائے تو ان دونوں کے آمیزے سے نرم رو اور سبک رفتار نثر پیدا کی جا سکتی ہے۔ نثر نگار کی کامیابی اس بات میں ہے کہ وہ لفظوں کو زندہ اکائیاں جانے اور انہیں انسانی زندگی کے مماثل قرار دے کر اپنے بیان کو قاری کا بھرپور تجربہ بنا دے۔ انسانی معاشرت میں لفظوں کا کردار بے پناہ اہمیت رکھتا ہے جسے پڑھنے والے کا تجربہ بننا چاہئے لفظوں کا تجربہ زندگی کی طرح اہم ہے۔ جو نثر نگار لفظوں کو زندگی کا تجربہ بنانے میں کامیاب نہیں' اس کی نثر میں زندگی کی روانی مفقود ہو جائے گی اور نثر جمود کا شکار ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نثر میں جذبہ اور تخیل دراصل تعقل و تفکر کی شدت کو Normalise کر کے اسے زندگی کی حرارتوں سے آشنا کرتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی تحریر میں جذبے' تخیل یا زندگی کی حرارت کو ناپنے کا معیار کیا ہے؟

جدید اردو نثر پر یہ قدغن کہ وہ انگریزی پڑھ کر لکھی جا رہی ہے' نئی نہیں۔ اس کے لئے ہمیں سر سید سے لے کر آج تک کے نثری ادب کو کھنگالنا پڑے گا کہ کن کن نثر نگاروں نے کب اور کہاں انگریزی گھاٹ کا پانی پی کر اپنی نثر کو سیراب کیا ہے۔ اگر روایت سے مراد قدیم اردو نثر کی روایت ہے تو اسے پامال کرنے والوں میں پہلا نام سر سید احمد خان کا ہے جنہوں نے تصنع' تکلف اور ثقالت کو رد کر کے سادہ طرز بیان اختیار کیا اور طرز ادا کے بجائے مضمون کے لطف کو اولیت دی اور مضمون کی سچائی پر زور دیا۔ قدیم اسلوب کی برائیوں پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے برملا لکھا ہے کہ:

"علم و ادب و انشا کی خوبی صرف لفظوں کو جمع کرنے اور ہم وزن اور
قریب التلفظ کلموں کی تک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور

مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط کتابت اور چھوٹے چھوٹے روز مرہ کے رقعوں میں یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خط یا رقعہ ایسا نہ ہوگا جس میں جھوٹ اور وہ بات جو درحقیقت دل میں نہیں ہے مندرج نہ ہو ------ پس ایسی طرز تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے اور ہم کو جھوٹی بناوٹی تحریر کا عادی بنا دیا ہے۔"۵

ادب کا ہر نیا دور اپنے مخصوص تقاضوں کے تحت اپنے رجحانات اور رویے متعین کرتا ہے۔ آج سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے کا زمانہ اپنے مخصوص سیاسی تناظر میں جس نوع کے اسالیب کا متقاضی تھا وہ ظاہر ہے قدیم نثری اسالیب سے بالکل مختلف تھے۔ اسی طرح جدید دور اپنے حالات اور مخصوص تناظر میں اسالیب نثر کے نئے زاویوں کا تقاضا کرتا ہے۔ خاص طور پر ہماری جدید نثر کا علامتی انداز اس بات کا ثبوت ہے کہ سرسید کی سادگی اور صداقت بیانی ہمارے جدید ادبی رویوں کے لئے کچھ زیادہ قابل قبول نہیں رہی۔ جس دور میں ادب کے خیالات و نظریات کی براہ راست ترسیل ناممکن بنا دی جائے وہاں کئی دوسرے پیرایہ ہائے بیان اختیار کرنا پڑتے ہیں اور اسی صورت حال سے ایسے اسالیب جنم لیتے ہیں۔ بادی النظر میں تمثیل کے زور پر لفظوں کا کھیل دکھائی دیتے ہیں لیکن زیریں سطح پر فکر و فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہماری جدید نثر انہی دو سطحوں پر استوار ہے۔ اس کی بالائی سطح کی رنگ آمیزی دراصل زیریں سطح کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کرتی ہے جو اس نثر کا اصل رنگ ہے۔

ناصر کاظمی کی نثر:

ناصر کاظمی کی نثری تصانیف کا ذکر زیر نظر باب کے آغاز میں ہوا ہے۔ یہ نثری تصانیف اپنے دامن میں رنگا رنگ پھول لئے ہوئے ہیں۔ متنوع موضوعات پر ان کے لگ بھگ چالیس پچاس مضامین ہمارے سامنے عقل و فکر کی مختلف جہتیں کھولتے اور دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے جتنی نثر لکھی ہے اس میں اس کا شاعرانہ

تخیل پوری قوت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ بقول سجاد باقر رضوی:

"ناصر کاظمی نرا شاعر تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ پوری زندگی کو شاعری میں تحلیل کر دے۔ حقیقت شناسوں کے نزدیک یہ ایک " شوق فضول" ہے لیکن ناصر کے لئے زندگی سراب اور شاعری حقیقت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاعر ہونے کے معنی زندگی میں شعوری و قدری رویہ رکھنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ زندگی سے ہم آہنگی کا رویہ نہیں ہے۔ زندگی سے ہم آہنگی تو زندگی کے ساتھ سمجھوتے ہی سے نصیب ہوتی ہے اور زندگی سے سمجھوتہ کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ آپ ہر قیمت پر صورت حال کو برقرار رکھیں۔ مگر تخلیقی و شعری رویہ صورت حال کو ہمہ وقت چیلنج کرنے کا رویہ ہے۔ شاعر ہر لمحہ لفظوں میں پوشیدہ جہان معنی کو مسخر کرتا رہتا ہے اور یوں موجودہ صورت حال میں ہمہ وقت اضافہ کرتا رہتا ہے۔"۶

درج بالا اقتباس میں ناصر کاظمی کے جن شعری رویوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس کی نثر کو سمجھنے کے لئے انہیں پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ناصر کاظمی کے ہاں لفظ کی بے حد اہمیت ہے۔ وہ لفظوں کا صورت گر ہے۔ ان سے نئی نئی شکلیں تراشتا اور جہاں معنی آباد کرتا ہے۔ بقول غالب:

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ناصر کاظمی کے ہاں "لفظ" کی اہمیت ذیل کی عبارت سے واضح ہوتی ہے:

" ادیب کے پاس وسائل نہ سہی مگر ایک وسیلہ تو ہے۔ یہ وسیلہ لفظ ہے۔ یہ ایک سو ایک واں داؤں ہے۔ سو داؤں اہل وسائل کے پاس ہیں۔ ایک سو ایکواں داؤں ادیب کے پاس ہے اور یہ تو وہ داؤں ہے جس نے فرشتوں کو سجدہ کرا دیا تھا۔ لفظ کوئی بھی ہو مگر یہ کہ اسے تخلیقی لفظ ہونا چاہئے' عربی' فارسی' اردو' بنگلہ' پنجابی' سندھی' سرائیکی' بلوچی' پوٹھوہاری"

ع۔ کوئی دلکشا نوا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

------ تخلیقی لفظ کی برکتیں دیکھنی ہوں تو زندگی کے پورے عمل میں دیکھو باقی تخلیق کرنے والے کا وظیفہ تو یہ ہے۔

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو سے

ناصر کاظمی کے لئے "لفظ" گنجینۂ معنی کے طلسم کی حیثیت رکھتا ہے۔ لفظ خواہ اس کے اشعار میں آئے یا نثر میں۔ یکساں طور پر ایک جہان معنی آباد کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی نثر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہتا ہے۔ لفظوں کا طومار باندھ کر تحریر کو بلاوجہ طوالت دینا اس کی طبیعت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اکثر مضامین بے حد مختصر ہیں۔ اس کی مختصر بحروں کی غزلوں کی طرح۔ لیکن معنی و مطالب اور مفاہیم کے اعتبار سے بڑی بڑی نثری تحریروں پر حاوی ہیں۔ اس کے خوبصورت نثرپارے تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس ہوتے ہیں اور ایک نئی اور مسحور کن خوشبو کا احساس دلاتے ہیں۔ اس کی نثر پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک تخلیق کار کو اپنی بات کس طرح کہنی چاہئے کہ شگفتگی بھی باقی رہے اور بات بھی پوری ہو جائے۔ لفظوں کا اس قدر صحیح اور برمحل استعمال اس کے ہاں نظر آتا ہے کہ ہر لفظ زندہ اور جیتا جاگتا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نثر کا ہر ہر لفظ ہمیں تھپکتا بھی ہے اور جھنجھوڑتا بھی ہے اور انہیں لفظوں کے ذریعے خیال و احساس کی ایک پوری تصویر پڑھنے والے کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ ایک اچھی نثر کا کمال یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا جو کچھ محسوس کرے اور جو کچھ تخیل کے زور سے دیکھے اسے اسی شدت اور جامعیت کے ساتھ لفظوں کی گرفت میں لے آئے۔ تاکہ جب پڑھنے والا اسے پڑھے تو اس کے اندر بھی وہی شدت احساس' جذبہ اور تصویر خیال پیدا ہو جائے جو لکھنے والا پیش کرنا چاہتا ہے۔ ناصر کاظمی کے ہاں یہ بات بطور خاص توجہ طلب ہے کہ متخیلہ کو کام میں لا کر اپنی تحریر میں جذبے اور احساس کی شدت اس طور نمایاں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کے حصار میں آ کر کہی جانے والی بات کو اپنے دل کے قریب محسوس کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا مضمون "میں کیوں لکھتا ہوں" ایسی ہی صورت

حال کا عکاس ہے۔ یہ مضمون ناصر کاظمی کے تخلیقی سفر کی روداد ہے جو ان کے بچپن سے شروع ہو کر ان کی زندگی کے مختلف تخلیقی مراحل سے ہوتی ہوئی انہیں ایک ایسے مقام پر لے آتی ہے جہاں وہ دوبارہ اپنے بچپن کو خود پر بیتتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ مضمون کا آغاز ان سوالات سے ہوتا ہے جو ابتدائی عمر میں ہر بچے کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ حیرت اور استعجاب کے عالم میں اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ وہ ان کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا ہے لیکن اس کا ننھا سا ذہن ان کی نوعیت اور ماہیت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ پھر وہ اپنے طور پر ان کی توجیہات تلاش کرتا ہے اور بظاہر مطمئن ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ اطمینان عارضی ہوتا ہے کیونکہ پھر کوئی نئی بات اسے سوالوں کے دائرے میں لا کھڑا کرتی ہے اور وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے:۔

"جب پہلی بار میں نے یہ پڑھا کہ زمین گول ہے تو میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ خیال آیا کہ میری گیند بھی تو گول ہے۔ زمین بھی گیند ہے۔ جسے خدا نے اپنے کھیلنے کے لئے بنایا ہے۔ پھر یہ سوچ کر کہ خدا کس کے ساتھ کھیلتا ہوگا! اگر وہ انسان کی طرح جسم رکھتا ہے تو وہ کتنا بڑا ہوگا! پھر اس کھیل کا میدان کتنا وسیع و عریض ہوگا! خود ہی گول کیپر' خود ہی ٹیم' خود ہی کھلاڑی اور خود ہی ریفری۔ عجیب کھلاڑی ہے خدا۔۔۔۔۔۔ ایک ساتھی نے کہا وہ فرشتوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ ایک نے کہا کہ سورج' چاند اور تارے جنات کی گیندیں ہیں۔ اس آسمانی مخلوق اور خالق کی دریافت کا شوق دل میں عجیب عجیب سوال پیدا کرتا۔ یہ آسمان کی روشن گیندیں' دن کو روشنی' رات کو بھی روشنی' غرض ہر وقت اندھیرے اجالے دنیا کے بارے میں نئی نئی باتیں۔ سو جھتیں۔ جو گول چیز دیکھتا۔ اس میں دنیا نظر آتی۔ کرۂ ارض جیسے ہر وقت میرے ساتھ گیند کی طرح رہتا۔ ریت کے ذرے سے لے کر کرۂ ارض تک' تمام گول چیزیں گیند کی طرح دشت تصور میں لڑھکتی نظر آتیں۔ میں بھی ایک کھلاڑی تھا۔ لیکن ایسا کھلاڑی جو ہمیشہ فاؤل کھیلتا۔ میری منزل میرا گول میرے ساتھیوں سے جدا ہوتا۔ میدانی کھیلوں کے قید و

بند مجھے کبھی اچھے نہ لگے۔ اپنا کھیل' اپنا میدان اور اپنی ہار جیت سب سے الگ تھے جب بھی موقع ملتا۔ میں عین کھیل کے وقت فٹ بال کی ہوا نکال دیتا اور دل ہی دل میں یہ سوچ کر حیران ہوتا کہ ایک دن دنیا کا یہی انجام ہوگا۔ پھر آہستہ آہستہ طبیعت میں ایک سکون سا پیدا ہونے لگا اور ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی کہ دنیا اپنے محور سے ہٹ گئی تو کیا ہوگا؟ نارنگی' سیب' تربوز' خربوزہ' ناشپاتی یا کوئی گول مول پھل کھاتے وقت میرے ذہن میں زمین' خدا اور تمام خالق و مخلوق کے عجیب سے رشتے بنتے اور بگڑتے۔ ہر چیز کو دیکھ کر یہی فکر ہوتی کہ یہ کیا ہے؟ کیوں ہے! آخر اسے خالق نے کیوں بنایا اور میرا اس سے کیا رشتہ ہے۔"۸

یہ سطور پڑھ کر ذہن فوراً غالب کے ان اشعار کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل' کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے' ہوا کیا ہے

غالب کے ہاں ان سوالات کا پس منظر مختلف سہی لیکن ناصر کاظمی اور غالب کے سوالات کی نوعیت ایک جیسی ہے۔ غالب کے ذہن میں یہ سوالات اس دور میں پیدا ہوئے جب وہ شعور کی پختگی کے مراحل طے کر چکے تھے۔ زندگی کے پیہم تجربات سے گزرنے کے بعد انہوں نے کائنات کے رموز اور خالق کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اپنی چشم تصور وا کی اور خود کو حیرتوں کے گرداب میں گھرا ہوا پایا۔ میر کے ہاں یہ صورت ایک دوسرے انداز میں اور زیادہ شدت کے ساتھ دکھائی دیتی ہے:

اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہے آنکھیں
حیرت پڑی ہے آن کر صاحب نظروں کو

میر نے اپنی اس حیرت کو صاحب نظر ہونے سے مشروط کر دیا ہے اور ظاہر ہے "صاحب نظر" ہونا ایک عمر کی ریاضت چاہتا ہے۔ میر کے ساتھ ناصر کاظمی کا ایک براہ راست قلبی اور فکری و نظری رشتہ استوار تھا۔ ناصر کاظمی کی حیرت کا آغاز مدور چیزوں

کو دیکھنے سے ہوتا ہے اور میر صاحب بھی چاند کو دیکھ کر جنوں کی سرحد پار کر جاتے تھے۔ اسی ضمن میں ایک واقعہ ناصر کاظمی اور میر کی ذہنی تطبیق کا آئینہ دار ہے۔ جسے یہاں درج کرنا دلچسپ مضمرات رکھتا ہے۔ احمد عقیل روبی کے بقول، کہ جنہیں ناصر کاظمی کی صحبتوں میں اٹھنے بیٹھنے کا دعویٰ ہے۔

> ناصر کاظمی ایک بار بہاولپور کسی مشاعرے پر آئے۔ مشاعرے کے اختتام پر رات انہیں سندھ ایکسپریس پر سوار کرایا گیا۔ انہوں نے اپنے شاگرد گارڈ کو تاکید کی کہ راستے میں ناصر کاظمی کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ دو دن کے بعد ریلوے گارڈ پریشان ان کے پاس آیا اور کہنے لگ، یہ کیسا مسافر آپ نے میرے سپرد کر دیا تھا؟ پوچھنے پر گارڈ نے بتایا کہ لودھراں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ناصر کاظمی گاڑی سے اتر کر پیدل چل رہے ہیں۔ میں نے گاڑی رکوائی پیچھے بھاگ کر ان کے پاس گیا۔ انہیں گاڑی میں سوار ہونے کو کہا تو کہنے لگے۔ آپ گاڑی لے جائیں میں پیدل آؤں گا۔ میں نے لاکھ منتیں کیں لیکن وہ نہ مانے۔ آدھ گھنٹہ اس تکرار میں گزر گیا۔ آخر مسافروں کی بحث و تکرار کے بعد میں نے گاڑی چلا دی۔ بعد میں ناصر کاظمی سے ملاقات پر راوی نے جب ان سے گاڑی چھوڑنے اور پیدل چلنے کا سبب دریافت کیا تو ناصر کاظمی نے کہا۔ کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ مجھے کھڑکی میں سے چاند اکیلا اور اداس نظر آیا مجھ سے اس کا اکیلا پن برداشت نہیں ہوا۔ گاڑی رکی تو میں اتر گیا۔ اور پھر چاند کے ساتھ چلتا ہوا ملتان آ گیا۔ یاد رہے کہ لودھراں سے ملتان کا تقریباً چالیس میل کا فاصلہ پا پیادہ چاند کے ساتھ طے کیا۔[۹]

اگر یہ واقعہ درست ہے تو چاند کو دیکھ کر میر پر جو وحشت اور جنوں طاری ہوتا تھا، اس کے اثرات ناصر کاظمی پر بخوبی محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ ناصر کاظمی کی گیند، جس سے وہ بچپن میں کھیلتے رہے ہیں، محض بچوں کی کھیلنے والی گیند نہ تھی بلکہ اس گیند میں وہ پورے کرۂ ارض کا نقشہ دیکھتے تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ زمین بھی ان کی گیند کی طرح گول ہے تو اس مماثلت پر انہیں خوشی ہوئی۔ اس خوشی کے پس پردہ وہ بچپن کے سوالات تھے جن میں سے ایک سوال کا انہیں جواب مل گیا تھا۔ ناصر کاظمی کی یہی

گیند کبھی زمین بن جاتی ہے، کبھی چاند اور ستاروں کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ پھر دوسری گول مول چیزوں مثلاً پھلوں کو دیکھ کر ان کے دل میں ان اسرار کو جاننے کی طلب پیدا ہوتی ہے، جو کائنات کی تمام گول اور مدور اشیا سے وابستہ ہیں۔ خالق اور مخلوق کے تعلق کو جاننے کی جستجو پیدا ہوتی ہے اور دل میں یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ اور ان کا اس سارے سلسلے سے کیا رشتہ ہے؟ ناصر کاظمی نے کائنات اور خدا سے اپنے رشتے اور تعلق کی وضاحت بھی خود ہی کر دی ہے۔ ظاہر ہے گیند اور زمین کا آپس میں جو تعلق بنتا ہے، وہی تعلق گیند کے کھلاڑی اور زمین کے کھلاڑی کا آپس میں ہے۔ گیند کا کھلاڑی اپنے لئے ایک محدود میدان کو منتخب کرتا ہے جبکہ زمین کے کھلاڑی کے لئے اپنا کھیل جمانے کے لئے میدان کی حد بندی نہیں ہے۔ اس کا میدان بے کراں، افق تا بہ افق اور ہزار وسعتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اس ساری وضاحت کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ پر موجود ہے کہ گیند کے کھلاڑی کا کھیل تو وقت کی قید کا پابند ہے۔ وہ جب چاہے اپنے فٹ بال کی ہوا نکال کر کھیل بند کرنے کا اعلان کر سکتا تھا۔ تو کیا زمین کا کھلاڑی بھی کسی روز زمین کے فٹ بال کی ہوا نکال کر یہ سارا کھیل ختم کر دے گا؟ ناصر کاظمی کے لئے یہ مرحلہ حیرت کا مرحلہ ہے جب وہ یہ سوچتے ہیں کہ ایک دن دنیا کا انجام بھی ان کے فٹ بال کی طرح ہوگا۔

اس سارے عمل میں بنیادی چیز خدا اور کائنات کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش ہے اور یہ خواہش ناصر کاظمی کے دل میں اس وقت بیدار ہوتی ہے جب ابھی ان کے گیند سے کھیلنے کا زمانہ ہے۔ ایک بڑا فنکار اور تخلیق کار اپنی پیدائش کے اول روز سے ہی بڑا فنکار ہوتا ہے۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ کائنات کے اسرار و رموز کو جاننے کے لئے جس غور و فکر اور تعقل و تفکر، کی ضرورت ہوتی ہے وہ ابتدا ہی سے انسان کے ذہن میں رکھ دی جاتی ہے۔ ذہانت اس کا نام ہے جسے کام میں لا کر انسان اپنے گرد و پیش میں بکھری ہوئی چیزوں کے حوالے سے ایک نقطہ مرکزی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک تخلیق کار کا سارا تخلیقی عمل اس فکری سلسلے سے وابستہ ہے آگ، ہوا، پانی اور مٹی اس کائنات کے بنیادی عناصر ہیں۔ اول الذکر تین عناصر کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ ٹھوس نہیں ہیں اور ان کی شکل اور ہیئت میں تبدیلی آتی رہتی

ہے۔ ان عناصر ثلاثہ سے روح جیسے لطیف تصور کی سائنسی تشریح کی جا سکتی ہے۔ لیکن مٹی ایک ٹھوس شے ہے۔ زمین کا پورا تصور اسی ٹھوس شے سے وابستہ ہے جو جسم کی علامت ہے۔ انسان کی سوچ اور فکر ٹھوس چیزوں کی بنیاد پر روح کی تلاش کے سفر کا آغاز کرتی ہے۔ ناصر کاظمی کی زندگی کا سفر بھی ٹھوس چیزوں کی ماہیت کو جاننے سے شروع ہوتا ہے اور اس کی حوالے سے ان کے ذہن میں خدا کے وجود کو جاننے اور اس سے اپنے تعلق کی نوعیت معلوم کرنے کی خواہش جنم لیتی ہے۔ چنانچہ ان کی تمام شعری و نثری تخلیقات اسی بنیادی راز کے انکشاف کا سلسلہ ہیں اور ان کی "تنہائی" کا جواز فراہم کرتی ہیں۔

"اپنا ہر کھیل نرالا تھا۔ کھلونے توڑنے پھوڑنے میں بڑی لذت ملتی۔ گھر میں اپنے سوا کوئی بچہ نہ تھا۔ کھلونے بے شمار اور کھیلنے والا ایک۔ خدا آسمان پر تنہا اور میں زمین پر تنہا۔ لیکن اس تنہائی میں ایک خاص قسم کی معصومیت، حیرت اور شان تھی۔ طبیعت ایجاد اور تخلیق کی طرف مائل ہو گئی۔ کھلونوں کی نگری میں تنہا کھیلنے والا ------ بھانت بھانت کی مخلوقات کے خاموش ننھے ننھے ہمزاد میری خدمت میں دست بستہ رہتے اور کوئی میری زد سے نہ بچتا میں ان کی گونگی زبان سمجھتا۔ گھوڑے کی گردن توڑ کر کتے کے دھڑ کے ساتھ اور اونٹ کی گردن توڑ کر گھوڑے کے دھڑ کے ساتھ لگا دیتا۔ اونٹ بے چارہ گردن کے بغیر۔ یہ صحرائی جہاز معصومیت کے نخلستان میں بغیر گردن کے کھڑا رہتا۔ اس بے ترتیبی میں ایک حسن ہوتا ------ کھلونے توڑنے پر میں نے بھی کئی بار مار کھائی۔ ابا جی کی جیبی گھڑی جب بھی ہات لگتی اسے الٹی سیدھی چابی دے کر وقت کی گردش کو وہیں روک دیتا۔ وقت کا اس سرعت سے گزرنا شاق گزرتا۔ جی چاہتا میں بھی ساتھ چلوں۔ ہر لمحہ گزرتا اور کان میں کہتا "میں جا رہا ہوں" گھڑی بند کر کے میں خوش ہوتا کہ اب کہاں جائے گا یہ لمحہ! ------ ایک دفعہ نانا جان نے پوچھا تم کھلونے کیوں توڑتے ہو۔ میری آنکھوں میں جیسے بجلیاں سی چمکنے لگیں۔ ہمارے گھر کے صحن میں نیم کا ایک بہت بڑا درخت تھا جسے

کٹوا دیا گیا تھا۔ میں نے کہا اس درخت کو کیوں کاٹا؟ کیا مکان کی کڑیوں کے لئے اور لکڑی نہ تھی۔ نانا مجھے گود میں لے کر ناچنے لگے۔ ۷۵ برس کی بوڑھی ہڈیوں سے ایک راگ پھوٹنے لگا۔ ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں ع

پیری نے ملک تن کو اجاڑا دگر نہ یاں۔" ۱۰؎

گیند کے کھیل سے ان انواع و اقسام کے کھلونوں سے کھیلنے اور انہیں توڑنے پھوڑنے کا عمل شروع ہوتا ہے جو ہیں تو کانچ اور ربڑ کے کھلونے لیکن اپنے اصطلاحی معنوں میں وہی چیزوں کی ماہیت کو جاننے کا عمل ہے۔ ناصر کاظمی اپنے سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لئے خود کو زندگی کے ایسے تجربات سے گزارتے ہیں جن کا تعلق ایجاد اور تخلیق سے ہے۔ گھوڑے کی گردن کتے کے دھڑ پر اور اونٹ کی گردن گھوڑے کے دھڑ پر لگا کر وہ اپنی ان تخلیقی صلاحیتوں کو آسودہ کرتے ہیں جو بے تاب دل کی دھڑکنوں کی طرح اپنی نمو کا وسیلہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ ابھی لفظ سے شناسائی کا مرحلہ دور ہے۔ چنانچہ تخلیق کا یہ عبوری دور اشکال میں تبدیلیاں پیدا کر کے متضاد چیزوں کو ایک دوسرے سے ملانے اور ترتیب کو بے ترتیبی میں بدلنے سے عبارت ہے۔ اس بے ترتیبی میں وہ حسن تلاش کرتے ہیں اور پھر وقت کی گردش کو روکنے کی خواہش دراصل وقت اور زمانے پر دسترس حاصل کرنے کی خواہش ہے جو اپنے والد کی جیبی گھڑی کو الٹی سیدھی چابی دے کر پوری ہوتی ہے۔ درج بالا عبارت میں یہ جملہ قابل غور ہے کہ "کھلونے بے شمار اور کھیلنے والا ایک ------ خدا آسمان پر تنہا اور میں زمین پر تنہا۔" ناصر کاظمی کا یہ جملہ ایسا نہیں کہ اسے سرسری دیکھ کر چھوڑ دیا جائے۔ خدا کی ذات تخلیق کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اس کائنات کا وجود اس کے دست ہنر شناس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ کتنی اور دنیائیں اور کائناتیں ہیں جو انسان کی نظر سے اوجھل ہیں۔ خود انسان اس کے حرف "کن" کا نتیجہ ہے۔ انسان کی پیدائش کو اس نے اپنی تمام تخلیقات سے افضل قرار دیا ہے اور یہ افضلیت اس بنیاد پر ہے کہ انسان اپنی محدود دنیا میں خدا کی طرح تخلیقی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوا ہے۔ اپنے تخلیقی ہنر کو وہ زمین پر رہ کر استعمال کرتا ہے جبکہ خدا آسمان کی لا محدود وسعتوں میں بیٹھ کر تخلیق کا شغل جاری رکھے ہوئے ہے۔ ثروت حسین کا ایک شعر ہے:

قندیل مہ و مہر کا افلاک پہ ہونا
کچھ اس سے زیادہ ہے مرا خاک پہ ہونا

ناصر کاظمی کے درج بالا جملے سے عظمت انسان کا تصور بھی ابھرتا ہے۔ لیکن اصل بات یہی ہے کہ جو اس جملے کے بین السطور سے واضح ہوتی ہے۔ کہ میں خدا کی طرح تنہا ہوں۔ یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ ۔

یوں اکیلا ہے زمانے بھر میں
آدمی جیسے خدا ہے یارو

ناصر کاظمی کی تنہائی آغاز زندگی ہی سے ان کے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ لیکن اپنی تنہائی کو خدا کی تنہائی کہنا خالق اور مخلوق کے اسی رشتے کی وضاحت ہے جو آغاز میں ایک سوال حیرت بن کر ان کے سینے میں کلبلاتا ہے اور دوسری طرف تخلیق کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے پر اصرار بھی ہے جو تنہائی ہی میں نمو پاتی ہے۔ سجاد باقر رضوی نے بالکل درست لکھا ہے۔

"ناصر نے فراق کی راتوں کے ساتھ زندگی بھر کا ایسا پیمان کیا کہ وصل کے دن اس کی زندگی میں کبھی نہیں آئے۔ اس بے وضع دنیا میں وہ نہایت وضع دار آدمی تھا۔ دن کے ہنگاموں میں وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ مگر آدھی رات کے قریب جب یہ ہنگامے کچھ کم ہونے لگتے تو وہ جاگنے لگتا تھا ------ جب دوست اسے جاگتا چھوڑ کر سونے چلے جاتے تو ناصر رات کے گہرے سناٹوں، اتھاہ اداسیوں اور تنہائیوں سے ہمکلام ہوتا ------ وہ کہا کرتا تھا کہ زندگی کے سارے تخلیقی کام رات کو ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شب بیداری اس کے تخلیقی اور شعری رویوں کا ایک اہم عنصر تھی۔"[۱۱]

اس "تنہائی" کی مزید وضاحت ناصر کاظمی کے زیر نظر مضمون میں ملتی ہے وہ لکھتے ہیں :

"کھیلوں کا زمانہ آیا اور گیا اور گھوڑے کی سواری کا شوق سما گیا۔ ہوش کے زمانے کی باتیں نہیں لکھوں گا۔ پھر ایسا زمانہ آیا کہ سارے ساتھی بچھڑ

گئے' کوئی مر گیا' کسی نے نوکری کر لی' کوئی فوج میں بھرتی ہو گیا' کوئی پاگل ہو گیا اور کسی نے خود کشی کر لی۔ البتہ ایک دو ساتھی ایسے تھے جو زندگی کے دوسرے شعبوں میں آگے نکل گئے۔ میں پھر تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا۔ لیکن اب میری تنہائی بچپن کی یادوں کے خزانوں سے بھرپور تھی۔ لیکن پھر بھی جی اداس رہتا دنیا اندھیر نظر آتی۔ اس اندھیرے کے احساس نے بجلی ایجاد کی خیالوں نے اپنے ہم جنس اور ہمزاد تلاش کر لئے۔ کتابیں بہت کم پڑھیں ایسی کتاب پڑھنی شروع کی جسے آج تک ختم نہیں کیا۔ بچپن کی کہانیاں' پہیلیاں' لوریاں فطرت کے مظاہر میں نظر آنے لگیں۔ سوچ نے نئے رستے تلاش کئے۔" ۱۲؎

ناصر کاظمی کی زندگی کا یہ مرحلہ جس تنہائی کا اسیر ہے وہ بچپن کی یادوں سے معمور ہے۔ بچپن کی گیند اور دوسرے کھلونے ایک وسیع تناظر میں ان پر زندگی کا مفہوم آشکار کرتے ہیں۔ جی کا اداس رہنا' دنیا کا اندھیر نظر آنا اور پھر احساس کا بجلی ایجاد کرنا دراصل اپنی ذات کے دروں میں کھلنے والی آنکھ کا استعارہ ہے۔ انہیں بچپن کی کہانیاں' پہیلیاں اور لوریاں فطرت کے مظاہر میں نظر آنے لگتی ہیں اور سوچ نئے راستے تلاش کرنے کے لئے ایک لمبے سفر پر نکل کھڑی ہوتی ہے۔ "ایسی کتاب پڑھنی شروع کی جسے آج تک ختم نہیں کیا۔" یہ جملہ دراصل اسی باطنی سفر کا اعلان کر رہا ہے۔ جس سے وہ زندگی کے اس اہم ترین مرحلے پر دوچار ہوتے ہیں۔ اس باطنی سفر کا ایک اہم واقعہ "جی کا اداس" رہنا ہے۔ ناصر کاظمی کے ہاں اداسی کا وہ مفہوم نہیں جو ہم اور آپ سمجھتے ہیں بلکہ ان کی اداسی برنگ دگر جلوہ دکھاتی ہے۔ ناصر کاظمی کی اس "اداسی" کی وضاحت ان کے ایک دوسرے مضمون میں یوں ہوتی ہے:

"ہم لکھنے والے مسافر ہیں' نامعلوم منزلوں کے۔ مگر ہر مسافر کی الگ الگ منزل ہے۔ ہم سب تھوڑی دیر ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں اور پگڈنڈی پر بچھڑ جاتے ہیں اور اکیلے رہ جاتے ہیں اور اداسی ہماری ھمسفر رہ جاتی ہے۔ یہ اداسی کوئی ذاتی اداسی نہیں ہے بلکہ تخلیقی لوگوں کی مشترکہ تقدیر ہے یہ اداسی مایوسی نہیں بلکہ خود آگاہی کی منزل کی طرف پہلا قدم

ہے۔ ایک بے وحدت اور اوچھا آدمی ہجوم سے گھبرا کر گالیوں پر اتر آتا ہے مگر ایک شریف النفس اور مہذب انسان اداس ہو کر گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے کہ اس گناہگار معاشرے کو کیا جواب دے جس کا دل کسی بات پر نہیں دکھتا اور جس کی آنکھ کسی المیے پر نہیں بھیگتی۔" ۱۳ے

ناصر کاظمی اداسی کو خود آگاہی کی منزل کی طرف پہلا قدم قرار دیتے ہیں۔ یہ خود آگاہی اپنی ذات کا ادراک اور شناسائی ہے جسے حاصل کئے بغیر تخلیق کے تقاضے پورے نہیں کئے جا سکتے۔ ناصر کے ہاں اداسی کے دوران آنکھیں اندر کی جانب کھلتی ہیں۔ انسان داخل کی طرف رجوع کرتا اور شعور ذات کے اکتسابی عمل سے گزرتا ہے اور اسی عمل کے دوران اسے کائنات اور مظاہر فطرت کے سربستہ رازوں سے آگاہی ملتی ہے لیکن یہ عمل چند لمحوں کا عمل نہیں بلکہ یہ ایک مسلسل ریاضت کا عمل ہے جس کے لئے عمر بھر کی تنہائی اور طویل اداسی درکار ہے اور یہ وہ کتاب ہے جسے ایک بار پڑھنا شروع کریں تو یہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ناصر کاظمی نے اس اداسی کو تخلیقی لوگوں کی مشترکہ تقدیر کہا ہے تو اس میں ذرا بھر مبالغہ نہیں۔ ایک تخلیق کار اپنے تخلیقی رویوں کے سبب اسی اداسی کے حصار میں جیتا ہے جہاں اسے اپنی ذات کے کرب، دکھوں اور غموں کا اندازہ ہوتا ہے۔ معاشرتی المیوں پر اداس ہو کر جب وہ اپنی ذات کے دروں میں جھانکتا ہے تو اسے ان معاشرتی المیوں کا جواب ملتا ہے۔ پھر یہ دونوں المیے مل کر اس کی تخلیق کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ ناصر کاظمی کی اداسی ان کے اولین سوالوں کا جواب ہے جو خدا اور کائنات کے بارے میں ان کے ذہن میں ابھرے۔ انہی سوالوں نے انہیں اپنی ذات کے دشت کی بادیہ پیمائی پر مجبور کیا اور اسی بادیہ پیمائی میں انہیں لفظ سے آشنائی حاصل ہوئی۔ بچپن کی کومل یادیں تنہائی کی گھمبیرتا میں ان کہانیوں، پہیلیوں اور لوریوں کی آوازیں سننے لگیں جنہیں اپنے اظہار کے لئے لفظوں کی زبان عطا ہو گئی تھی۔

"جو نغمے جو لوگ گیت اور لوریاں بچپن میں سنی تھیں اب اپنے گلے میں پھوٹنے لگیں۔ جذبات لفظوں کی مالا میں گندھنے لگے۔ ان لفظوں کی ترتیب کے پیچھے اذان کی آواز کا شکوہ اور لوریوں کا رس بھی ہوتا۔ خیالات

موزوں الفاظ میں ادا ہونے لگے۔ قدرت نے گلے میں سوز کی ایک پتی رکھ دی تھی۔ میری آواز میں بڑا دکھ تھا اور میں دن رات اسی آواز کے آہنگ میں سرشار رہتا۔ تنہائی کو یادوں کے کھلونے مل گئے۔ شعور ان کھلونوں کو بھی توڑنے لگا۔ اپنی یادوں اور تجربوں میں اپنی آواز کی روح پھونکتا ہوں اور اپنے افکار کے ہمزاد میں نے اس آواز کے ذریعے قابو کئے ہیں۔ ماضی میرے لئے ہمیشہ زندہ ہے لیکن میں اس میں کھو نہیں جاتا۔ بلکہ تجربے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس سے نئے نئے پیکر تراشتا ہوں۔"[۱۴]

یہ ایک شاعر کے تجربات ہیں جس کی سماعت میں محفوظ گیت اور لوریاں اور نہاں خانہ دل میں دبی ہوئی یادیں تخلیقی تجربے کا روپ دھار کر اس کے لفظوں میں سمٹ آئیں۔ اس کے جذبے اور خیال معنی بن کر لفظوں کے باطن میں ٹھہر گئے اور یوں تخلیق کے شجر کو ثمر بخشنے لگے۔ ناصر کاظمی کا یہ مضمون جہاں ایک نئے طرز احساس کی بنیاد بنتا ہے وہاں انسانی زندگی کے تخلیقی پہلوؤں کو پوری شرح و بسط کے ساتھ نمایاں کرتا ہے۔ ہم نے آغاز میں اس مضمون کو ان کے تخلیقی سفر کی روداد لکھا ہے۔ یہ روداد انہوں نے اس خوبصورت اور رواں اسلوب میں قلم بند کی ہے کہ اس پر شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ ایک ایسا فنکار جس نے شاعری کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کئے ہوں اور ایک پورے عہد کی نسل کو متاثر کیا ہو' جب نثر لکھتا ہے تو الفاظ کے انتخاب' ترکیبوں کے استعمال اور محاورہ بندی کے لئے اپنے شعری تجربے سے بھرپور اکتساب کرتا ہے۔ ناصر کاظمی دھیمے سروں میں بات کہنے کے عادی ہیں۔ نثر کو رنگین اور تخیل کے زور پر شگفتہ بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی نثر میں استعاروں کے ذریعے خیال کی ترسیل کا سلسلہ بہت نمایاں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ تمثیل کاری کے ذریعے پورا منظر نگاہوں کے سامنے روشن کر دیتے ہیں۔ اسی مضمون کا درج ذیل پیراگراف ملاحظہ ہو۔ دیکھئے کس خوبصورت برجستہ انداز میں انہوں نے ایک ذاتی واردات کو قاری کے احساس کا حصہ بنا دیا ہے۔

"پہلے پہل رنگوں پر دل دھڑکنے لگا۔ مصوری شروع کی۔ لیکن محنت سے جی کتراتا تھا اس لئے رنگ بے آواز رہے اور گونگے رنگ میری . . . .

تنہائیوں میں شریک نہ ہو سکے۔ رنگ پھینک دیئے۔ کینوس پھاڑ دیئے اور سارنگی خریدی۔ استاد عبدالعزیز جیسے مایہ ناز سازندے سے ضلع جگت کا سبق لیا لیکن تلون یہ چاہتا تھا کہ سر کا دیوتا ایک دم قابو میں آ جائے۔ ایک دن بیزار ہو کر میں نے سارنگی فرش پر دے ماری۔ اس وقت سارنگی سے جو آواز نکلی وہ بہت دردناک تھی۔ سنگیت کی دیوی روٹھ گئی اور اڑ گئی۔ ایک عرصے تک ذہن کی یہ حالت رہی جیسے کوئی سازندہ ایک کمرے میں اپنے ساز بند کر کے کمرے کو قفل لگا کر کسی دور دیش میں چلا جائے۔ اس کمرے کا تصور کیجئے۔ پلنگ، قالین، کرسیوں اور پردوں پر گرد جم چکی ہے۔ کوئی کھڑکی کھلی ہے کوئی بند ہے۔ ہوا چلے، آندھی چلے، مینہ برسے، کمرہ ایک بے حس لاش کی طرح پڑا ہے۔ ساز کی تاروں ------ پر گرد جم چکی ہے۔ اس کی کھونٹیوں میں زنگ لگ گیا ہے۔ تربوں میں کڑیوں نے بسیرا کر لیا ہے، ایک چڑیا روشندان کے شکستہ شیشے میں اڑ کر آتی ہے، کمرہ شور سے بھر جاتا ہے۔ چڑیا چھت کی کڑیوں میں بچوں کو چوگا کھلاتی ہے اور اڑ جاتی ہے۔ پھر آتی ہے اور آخر تھک کر الماری کے ایک کھلے ہوئے تختے پر بیٹھ جاتی ہے۔ چہچہاتی ہے۔ پھر چپ ہو جاتی ہے۔ آنکھیں بند کر لیتی ہے پھر کھول دیتی ہے۔ کمرے کی ایک ایک چیز کو گھور کر دیکھتی ہے۔ کھونٹی پر لٹکے ہوئے کوٹ پر اس کی آنکھیں جم جاتی ہیں۔ سوچتی ہے کہ آج میرے مالک کو کیا ہو گیا؟ پھر فرش پر اتر آتی ہے اور پنجوں کے بل دھیرے دھیرے چلتی ہے۔ ایک ٹڈی اور ایک چیونٹی تنہائی کا طلسم توڑتی ہے۔ چڑیا ٹڈی کو پکڑ لیتی ہے اور منقار میں دبا کر چھت کی طرف اڑ جاتی ہے۔ پھر میز پر رکھی ہوئی ایک پیالی میں اتر آتی ہے جس میں پانی کے چند قطرے سے رہ گئے ہیں۔ چڑیا غریب کو کیا معلوم کہ پانی کے چاروں طرف چینی کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں وہ تو اسے بحر اوقیانوس سمجھتی ہے۔ کرسی پہ ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس کے ایک صفحے پر بلی کی تصویر ہے۔ چڑیا سہم جاتی ہے۔ پھر اس کی نظریں ساز کی طرف جاتی ہیں۔ ایک دم ساز کی تنی ہوئی تاریں چلا اٹھتی ہیں۔

تڑپیں ساتھ ساتھ آس دیتی ہیں۔ ایک اجنبی سی راگنی خاموشی میں دائرے
سے بناتی ہے ایک کرن کمرے میں داخل ہوتی ہے اور ساز کے تاروں پر
ناچنے لگتی ہے

سدھ لے گھر کی بھی شعلہ آواز
دود کچھ آشیاں سے اٹھتا ہے

رنگ اور آوازیں اپنے ہمزاد تلاش کر لیتی ہیں۔ کئی بھٹکی ہوئی
آرزوؤں کے اسم سامنے آتے ہیں۔ ذہن ان اسموں کو جسم دینا چاہتا ہے۔
ایک نیا اظہار جنم لیتا ہے۔ شک یقین میں بدل جاتا ہے۔ نغمہ گھر لوٹ آتا
ہے۔" ۱۵؎

ناصر کاظمی نے مصوری سے موسیقی اور موسیقی سے شاعری تک کا سفر کن
جان جوکھوں سے طے کیا ہے اور اس سفر میں قاری کے لئے حیرت کے کیسے کیسے سامان
رکھے ہیں۔ حیران ہونا اور حیران کرنا ناصر کاظمی کا وتیرہ ہے۔ وہ پڑھنے والے کو حیران
کرنے کے لئے عجیب داؤں چلتے ہیں۔ میجک شو دکھانے والے شعبدہ باز کی طرح۔ اون
کا گولا دکھا کر رومال کے نیچے سے کبوتر نکال لاتے ہیں۔ نثر میں اس اسلوب کی مثال
آزاد کے ہاں دیکھی جا سکتی ہے لیکن آزاد اور ناصر کاظمی کی لفظیات میں زمین آسمان کا
فرق ہے۔ ناصر کاظمی شاعری کی طرح نثر میں بھی امیجز بناتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی
تمثالیں۔ کمرے کی ویران حالی اور شکستگی کا نقشہ انہوں نے انہی امیجز کے ذریعے اسی
خوبصورتی سے کھینچا ہے کہ پوری تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ ہم نے اوپر ذکر
کیا تھا کہ ناصر کاظمی استعاراتی زبان استعمال کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ سو یہ شکستہ
حال مقفل کمرہ ناصر کاظمی کا دروں ہے جہاں ایک وقت میں سارے راگ خاموش ہو
چکے ہیں۔ چڑیا کی صورت میں ان کا طائر خیال اس سناٹے میں تحرک کی کیفیت پیدا کرتا
ہے کہیں سے روشنی کی ایک کرن در آتی ہے۔ ساز کی خاموش تاروں میں لرزش پیدا
ہوتی ہے اور ایک اجنبی سی راگنی خاموشی میں دائرے بنانے لگتی ہے۔ اور رنگ اور
آوازیں مل کر اپنے ہمزاد تلاش کر لیتی ہیں۔ رنگوں اور آوازوں کے یہ ہمزاد ناصر کاظمی
کی شاعری ہے جو دل کے شکستہ حال کمرے اور گرد جمی دیواروں سے بلند ہوتی ہے اور

ایک نیا اظہار جنم لے کر اس نغمے کو واپس لے آتا ہے جو روٹھ چکا تھا۔

مضمون کے آخر میں ناصر کاظمی نے "میں کیوں لکھتا ہوں" کا جواب فراہم کر دیا ہے۔ ناصر کاظمی کے نزدیک یہ سوال اتنا اہم ہے کہ اس کا جواب چند لفظوں میں نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لئے انہوں نے بچپن سے لے کر تخلیق کی پہلی کونپل پھوٹنے تک کی تمام کتھا کہانی بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

"زندگی بسر کرنے کے لئے نان و نمک ضروری ہے۔ جسے حاصل کرنے کے لئے ہزار ذریعے ہو سکتے ہیں۔ لیکن فنکار بننے کے لئے حواس کی تسخیر ضروری ہے۔ زندگی بسر کرنے کے لئے نان و نمک' کپڑا لتہ اور سر چھپانے کو ٹھکانا کافی ہے۔ شاعری' مصوری' موسیقی اور سنگ تراشی کی کیا ضرورت ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ تمام فنون کلچر کے عناصر ہیں۔ کوئی تہذیب ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جدید دنیا کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے فطرت کو ایک حد تک تسخیر کر لیا ہے لیکن فطرت اور انسان کی لڑائی ازل سے جاری ہے۔ اس لڑائی کے پیچھے احساس جمال ہے۔ تمام فنون مل کر احساس جمال پیدا کرتے ہیں اور اس احساس کے حظ نے انسان کو اعتبار دیا ہے' خلق کا مرتبہ دیا ہے۔ میں نے شاعری کو اس لئے اپنایا ہے کہ میں نے زندگی بسر کرنے کے لئے کچھ اصول وضع کئے ہیں۔ ان اصولوں کو جسم دینے کے لئے میں نے یہی راستہ بہتر سمجھا ہے۔ اظہار کے لئے زبان کی ضرورت ہے اور یہ اظہار رنگ اور آواز کے ساتھ ساتھ زبان کا محتاج ہے۔ اس فن کی عمارت کھڑی کرنے کے لئے مجھے فطرت کی تخریبی قوتوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ اس تعمیر کے لیے توڑ پھوڑ بھی ضروری ہے۔ خیال کی تخلیق بغاوت چاہتی ہے ہر شے سے بغاوت اور یہ بغاوت ایک بہت بڑی تعمیر کی امین ہے۔" ص ۱۶۰

گویا تخلیق کا اصل مسئلہ فطرت کی تسخیر ہے۔ فطرت اور انسان کی آویزش اسی لئے ہے کہ انسان اپنے احساس جمال کو نمود دے سکے۔ احساس جمال کی نمود توڑ پھوڑ چاہتی ہے گھوڑے کا سر اس کے جسم سے جدا کر کے کتے کے دھڑ پر لگا دیتی ہے اور

اونٹ کا سر گھوڑے کے دھڑ پر لگا کر اپنی تخلیقی اپج کی داد چاہتی ہے۔ یہ ایک نئے خیال کی تخلیق ہے جو فطرت سے بغاوت کر کے وجود پذیر ہوئی ہے۔ چیزوں کو ان کے اصلی تناظر سے ہٹا کر ایک دوسرے تناظر میں دیکھنا ایک باغیانہ رویہ ہے جسے ناصر کاظمی اپنے فن کی اساس قرار دیتے ہیں۔ وہ رنگوں اور آوازوں کی دنیا میں اس لئے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے کہ انہیں اپنے اظہار کے لئے زبان کی ضرورت تھی۔ اسی لئے انہوں نے لفظوں کی دنیا سے آشنائی پیدا کی۔ احساس جمال پیدا کرنا کوئی بات نہیں۔ اصل ہنرمندی یہ ہے کہ اس احساس جمال کو لفظوں کی صورت میں اجاگر کیا جائے۔ ناصر کاظمی اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ فطرت کے مظاہر اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی تاریخ زبان کے راستے سمجھی جا سکتی ہے۔ وہ معاشرے میں زبان کے عملی پہلو سے بھی بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ الفاظ دیگر مخلوق اور انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں' باعمل طور پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ الفاظ بھی انسان کی طرح باغیانہ سرشت رکھتے ہیں۔ خیال کی تخلیق جس نوع کی بغاوت کا تقاضا کرتی ہے' لفظ اس سے پوری طرح بہرہ ور ہوتے ہیں اور انسان کی بغاوت میں پوری طرح اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ رنگ پھیکے پڑ سکتے ہیں۔ آوازیں فطرت کے مقابل پر گھٹنے ٹیک سکتی ہیں لیکن لفظوں کا شکوہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ وہ ایک تمکنت اور وقار کے ساتھ اپنی جگہ پر سربلند رہتے ہیں۔

ناصر کاظمی کے نزدیک بغاوت ایک بہت بڑی تعمیر کی امین ہے۔ فطرت کی تخریبی قوتوں سے مقابلہ کرنے کے لئے یہ بغاوت نہایت ضروری ہے۔ اس کائنات کا خالق خود توڑ پھوڑ کے عمل سے تخلیق کی نئی شکلیں دریافت کرتا ہے تو انسان جو خالق اور مخلوق کے رشتے کی درمیانی کڑی ہے' توڑ پھوڑ کے اس عمل سے خود کو کیسے باز رکھ سکتا ہے۔ خیال کی تخلیق کے لئے شکست و ریخت لازمی ہے۔ اس کے لئے کشتی میں سوراخ کرنا پڑتا ہے۔ مگر کشتی ڈبونے کے لئے نہیں بلکہ ادب کی کشتی کو بیگار کے طور پر استعمال کرنے کا سلسلہ ختم کرنے کے لئے۔ بقول ناصر کاظمی:

"اگر یہ تخریب ہے تو تعمیر بھی تو شاید ہم ہی کر رہے ہیں۔ اس گرتی دیوار کو جس کے نیچے خزانے دفن ہیں' سہارا ہم نے ہی تو دے رکھا ہے۔ گرتی ہوئی دیوار میں دبا ہوا خزانہ محفوظ ہو جائے اور کشتی کو کوتوالوں کی بیگار

سے نجات مل جائے یہ ہے پہلی بات۔ باقی رہا کشتی کو دوبارہ چلانے کا سوال تو جو شخص کشتی میں سوراخ کر رہا ہے وہ نئی کشتی بھی بنانا جانتا ہے اور اسے تخلیق کے پانیوں میں سلیقے سے کھیلنے کا فن بھی آتا ہے۔ روایت پرستوں کی نسل نہ کشتی کھینے پر قادر تھی' نہ کشتی توڑنے پر۔ کشتی چلی تو ساتھ چل پڑے اور بغیر کرایہ ادا کیے۔ رک گئی تو ساتھ ہی وہ بھی رک کے کھڑے ہیں۔ نئی نسل کشتی بنانا بھی جانتی ہے اور کشتی کھینا بھی۔ اور اتھاہ سمندروں کے ڈھکے اور کھلے رموز کو بھی سمجھتی ہے وہ خوش و خرم موجوں پر سیر کرنے کی قائل نہیں بلکہ قلزموں کی رگیں مروڑنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔"۱۷۱

ناصر کاظمی کے زیر نظر مضمون کا یہ آخری اقتباس ان کے نظریہ فن کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ روایت کی اندھا دھند تقلید کو اپنے فن کے بنیادی تقاضوں کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ روایت پرستوں کی طرح کشتی میں بیٹھ کر موجوں کے سہارے آگے بڑھنے کے بجائے موجوں سے ٹکرانے اور ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کشتی میں سوراخ کرنا خطرناک ہے۔ اس سے کشتی کے ڈوبنے کا اندیشہ ہے لیکن وہ کشتی بھی بنانا جانتے ہیں اور تخلیق کے پانیوں میں اسے سلیقے سے کھینچنے کے فن سے بھی آشنا ہیں۔ وہ پرانی کشتی پر سفر کرنے کے بجائے نئی کشتی بنا کر اس میں سوار ہوتے ہیں۔ یہ روایت اور قدامت کے خلاف ناصر کاظمی کی بغاوت ہے۔ وہ ادب کے بنے بنائے سانچوں کو قبول نہیں کرتے بلکہ اپنے لئے نئے سانچے تشکیل دیتے ہیں کہ وہ جس خیال کو پیش کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے پرانے سانچے فرسودہ اور بے کار ہو چکے ہیں۔ بچپن میں اپنے کھلونوں کو توڑنے والا جس بغاوت سے آشنا ہوا ہے وہ عمر بھر اس کے سینے میں آگ بن کر فرسودگی اور قدامت کو جلا کر بھسم کرتی رہتی ہے۔ اسی بغاوت کا کرشمہ ہے کہ ناصر کاظمی کے ہاں آپ کو کوئی فرسودہ اور باسی شے نہیں ملے گی۔ نیا مال ملے گا۔ جس کی تخلیق میں اس کے جگر کا لہو شامل ہے۔

مجموعی اعتبار سے ناصر کاظمی کا یہ مضمون ان کی تخلیقی زندگی کے پس منظر اور پیش منظر کو ان کی تمام جزئیات سمیت اجاگر کرتا ہے۔ اس مضمون کی روشنی میں ہم ایک ایسے ناصر کاظمی سے روشناس ہوتے ہیں۔ جس کے تخلیقی سلسلے اس کی پوری

زندگی پر محیط ہیں۔ اور بچپن ہی سے اس کے ذہن میں جاگنے والی بغاوت کی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں۔

(۲)

''میر ہمارے عہد میں'':

ناصر کاظمی کا دوسرا مضمون جو ان کے نثری حوالے سے بے حد اہم ہے اور ان کے دیگر مضامین میں سب سے زیادہ طویل ہے ''میر ہمارے عہد میں'' کے عنوان سے پہلی بار ''سویرا'' میں شائع ہوا۔ دوسری بار یہ مضمون ان کے مجموعہ مضامین ''خشک چشمے کے کنارے'' میں شائع ہوا۔ تیسری بار ان کے مرتب کردہ ''انتخاب میر'' میں شامل اشاعت ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر جہاں میر تقی میر اپنے اصل اور صحیح تناظر میں ہمارے سامنے آتے ہیں وہاں ناصر کاظمی کی بے پناہ تنقیدی بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے جو اردو شاعری کی کلاسیکی روایت خصوصاً میر کی شعری روایت کے حوالے سے انہیں ودیعت ہوئی تھی۔ میر کے بارے میں ناصر کاظمی کا مطالعہ حیرت انگیز حد تک ان کی جگرکاوی کی دلیل ہے۔ اس کا واضح ثبوت کلیات میر کا واحد انتخاب ہے جسے انہوں نے اپنے ہاتھ سے خوشخط نقل کر کے ایک کاپی میں محفوظ کیا اور جو ان کے انتقال کے بعد باصر سلطان کاظمی نے ترتیب و تعارف کے ساتھ شائع کیا۔ ناصر کاظمی کی میر شناسی کے بارے میں مظفر علی سید کی یہ رائے نہایت صائب ہے کہ:

> '' میر کو اردو ادب کی تاریخ میں ناصر کاظمی سے زیادہ شاید ہی کسی نے پڑھا ہو اور اس کا بہترین انتخاب ناصر کے سوا کوئی نہ کر سکتا تھا۔''۔۱۸

باصر سلطان کاظمی، ناصر کاظمی کے زیرِ نظر مضمون کی حوالے سے لکھتے ہیں:

> '' ''یہ مضمون لکھنے سے پہلے ناصر کاظمی نے انتظار حسین سے ''چائے کی میز پر ایک گفتگو'' (دھواں سا کچھ اس نگر کی طرف، مطبوعہ ماہ نو ۱۹۵۴ء) میں کہا تھا'' میر کے جو برے بھلے انتخاب ہو رہے ہیں ان میں میر سے

انصاف نہیں ہوا۔ اس کے بہتر نشتروں کا میں بھی ہلاک ہوں لیکن ان نشتروں پر ہی بات ختم نہیں ہو جاتی مجھے تو اس کی غیر معروف سے غیر معروف غزلوں میں بعض اشعار یا مصرعے پدم سانپ کی طرح پیچ و تاب کھاتے اور پھنکارتے نظر آتے ہیں۔ یہ سانپ انگشت کے برابر ہوتے ہیں' مٹی کے رنگ کا۔ عام نظروں سے اوجھل رہتا ہے اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ میں نے یہ زہر بھی سہارا ہے۔'' ۱۹ے

''میر ہمارے عہد میں'' کی شان نزول بھی خاصی دلچسپ ہے۔ اس سلسلے میں شیخ صلاح الدین لکھتے ہیں:

'' ایک رات ناصر اور میں باہر صحن (والگا ریستوان کا بالائی صحن) میں اکیلے بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ یکایک ناصر نے میر تقی میر کے متعلق باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اس نے بتایا کہ میر کو سورہ یوسف جس کو قرآن احسن القصص کہتا ہے' بہت پسند تھی۔ کیونکہ عزیز مصر کی بیوی جیسا واقعہ میر صاحب کو بھی پیش آیا تھا اور ان کی زندگی کا المیہ اس ایک واقعہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو انہوں نی نہایت شرح و بسط کے ساتھ میر کے اشعار اور ''ذکر میر'' کی مدد سے سنایا۔'' ۲۰ے

میر کے حوالے سے زیر نظر مضمون کے ساتھ تو دوسرا معاملہ ہوا کہ اس کے لئے ناصر کاظمی کو گھیر گھار کر اسے قلم بند کروانے پر راضی کر لیا گیا۔ چنانچہ شیخ صلاح الدین کے مندرجہ بالا طویل بیان کی رو سے ناصر کاظمی نے یہ 'مضمون' ریاض احمد چودھری کو لکھوایا اور بعد میں انہوں نے اس کی نوک پلک درست کی۔ اور یہ سویرا میں ''جان پہچان' میر تقی میر۔ بنائے تازہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بعد میں ناصر کاظمی نے اس کا عنوان بدل کر ''میر ہمارے عہد میں'' کر دیا تھا۔ ۲۳ x ۳۶ / ۱۶ سائز کے لگ بھگ بتیس صفحات پر محیط یہ مضمون ناصر کاظمی کی میر فہمی کا ایک خوبصورت عکس مبین ہے۔ اور اس میں انہوں نے میر پر لکھے گئے نوع بنوع مضامین سے الگ نئے زاویوں اور نئی جہتوں سے میر کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی شاید پہلی بار ہوا ہے کہ ناصر کاظمی کو اقبال کے ہاں میر کی بازگشت سنائی دی ہے۔ جس کی

طرف شیخ صلاح الدین نے اپنی کتاب میں بھی اشارہ دیا ہے کہ

"اس مضمون نے ثابت کر دیا ہے کہ میر اقبال کا عظیم پیشرو ہے اور یہ کہ اس بات کی روشنی میں میر تقی میر کی شاعری کا نیا جائزہ لینا لازم ہو گیا ہے۔"

مضمون کے آغاز میں ناصر کاظمی نے شاعری میں ابلاغ کا مسئلہ اٹھایا ہے کہ شاعر اور قاری کا براہ راست رابطہ ختم ہو رہا ہے اور درمیان میں نقاد آ گیا ہے جو اپنے ذاتی مزاج کے حوالے سے شاعر کے بارے میں حتمی فیصلے دیتا اور قاری کو گمراہ کرتا ہے۔ جہاں تک شاعر کا تعلق ہے کہ وہ بھی اپنے افکار اور تجربوں کے لئے یا تو مغرب کی طرف دیکھتا تھا یا اب روایت کی تلاش میں پیچھے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ شاعری میں میر صاحب کو مشعل راہ بنایا گیا ہے لیکن انہیں بھی سمجھنے اور سمجھانے کی بجائے ان کے ایک آدھ رنگ کو لے لیا گیا ہے۔ اقبال کو شاعر سے زیادہ ان کے ملی رجحانات اور فلسفیانہ خیالات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ غالب، شارحین اور مدرسین کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ انیس محض عزاداری کے لئے وقف ہے اور نظیر کو پوچ گو اور مبتذل کہہ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ گویا ناصر کاظمی کے نزدیک ہمارے جدید شاعروں اور نقادوں نے اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کو پورے طور پر سمجھا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میر جیسے شاعر کو بھی، جنہیں اچھالا تو خوب گیا ہے لیکن ان کی شعری بوطیقا کو پوری طرح سمجھنے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ یہاں سے ناصر کاظمی کا میر کے بارے میں بیان شروع ہوتا ہے۔ ان کے مخصوص اسلوب میں کہ جس میں وہ قاری کو اپنے قریب لا کر اس سے گفتگو کرتے ہیں:

"میں بھی میر صاحب کا رسیا ہوں لیکن میر پرست نہیں۔ میں نے اگر میر صاحب کو مانا ہے تو بڑے جھگڑے اور فساد کے بعد۔ شاید اسی لئے آپ کی سمع خراشی کرنا چاہتا ہوں۔ میر اپنا جیون ساتھی ہے۔ لیکن ایسا ساتھی جس سے ہر قدم پر جھگڑا رہتا ہے۔ مدت سے ہم ایک گھر میں رہتے ہیں، ہنستے بولتے ہیں اور روٹھتے منتے رہتے ہیں۔ ان سے میری بچپن ہی میں ملاقات ہو گئی تھی لیکن ان کا تعارف نانا اور والدہ نے کرایا تھا۔ ابتدائی

جماعتوں میں ان کی "فقیرانہ آئے صدا کر چلے" اور "ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا" والی غزلیں بھی پڑھی تھیں۔ لیکن اس وقت ان کی کارستانیاں سمجھ میں نہیں آئی تھیں اور نہ ہی پوری کلیات پڑھنے کی ہمت تھی۔ پھر جب شاعری کا شوق ہوا تو غالب اور اقبال کا شہرہ تھا۔ یوں غالب کوئی آسان شاعر نہیں لیکن اس کے پڑھنے پڑھانے والوں کی ایک فوج ہے اور اس کے کلام کا بہترین انتخاب ہمارے سامنے ہے۔ والدہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ شاعری کا شوق ہے تو پہلے میر صاحب کو پڑھ لو۔ میر کے بہتر نشتر تو چند دنوں میں حفظ ہو گئے تھے لیکن کلیات کی ضخامت سے جی گھبراتا تھا بس میر کی چند ننھی منی غزلوں ہی سے جی بہلا لیتا تھا اور کبھی کبھی دل میں کڑھتا بھی تھا کہ میر صاحب کے اچھے اشعار اتنے تھوڑے کیوں ہیں؟ اور ان کا نام اتنا مشہور کیوں ہے؟"۔۲۱

ناصر کاظمی نے خود کو میر پرست نہیں' میر کا رسیا کہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میر کے ساتھ ان کا لگاؤ اور تعلق اندھا دھند تقلید کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی انہوں نے فیشن کے طور پر میر کو قبول کیا ہے بلکہ یہ ایک تگ و تاز اور غور و فکر کا طویل سلسلہ ہے۔ ایک بڑے جھگڑے اور فساد کے بعد وہ میر کو ماننے پر تیار ہوئے ہیں۔ ان سطور سے ناصر کاظمی کا شعر کے بارے میں ایک کڑا اور سخت معیار بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ تنقید شعر کے وہ پیمانے' جو ہمارے نقادوں کے زیر استعمال رہے ہیں' ناصر کاظمی کے تنقیدی پیمانوں کے مقابلے پر ہیچ مقدار نظر آتے ہیں۔ وہ صرف میر کے غم اور اداسی کو لے کر میر کا جھنڈا بلند کرتے نہیں چلے بلکہ اس کے ہر جہت اور ہر رنگ کو پرکھ کر اس کی عظمت کی شہادت دیتے ہیں۔

"اب میر کی شاعری میں کسی حد تک مجھے اپنی شخصیت کے کچھ اور نئے پہلو بھی نظر آنے لگے یا یوں کہیے کہ میر صاحب کے کچھ اور رنگوں نے مجھے متوجہ کیا۔ جگنو پکڑنے اور سنگریزے چننے کے ساتھ ساتھ لفظ تازہ کی تلاش تو مجھے ابتدا ہی سے تھی اب انہی لفظوں میں ایک جہان معنی نظر آنے لگا۔ میر کی سیدھی سادی غزلوں اور چھوٹی اور پر سکون بحروں اور عام

لفظوں کی تہہ میں مجھے اپنے جذبات کا اضطراب محسوس ہونے لگا۔ ننھے ننھے لفظوں کی کشتیاں عمیق خیالوں اور اتھاہ جذبوں کے سمندر میں کس طرح تیرتی ہیں، یہ راز اس وقت سمجھ میں آیا، میر صاحب کا یہ شعر بچپن میں پڑھا تھا۔

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے
ان کو اس روزگار میں دیکھا

یہ شعر اس وقت بھی جی کو لگا تھا لیکن آج سے ۹ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک رنج دلی سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ بات سنی جو گمان میں نہ تھی اور وہ کچھ دیکھا جو خیال میں نہ تھا۔ سننے اور دیکھنے کے دو متضاد تجربے ایک لمحے میں اس طرح سمٹ آئے کہ دیکھنے اور سننے کی دونوں کیفیتیں گھل مل کر ایک تیسری کیفیت کو جنم دیتی ہیں۔ یہ بلائیں، انسانی دکھ سکھ کے وہ تجربات ہیں جو ہوش سے پہلے سمجھ میں نہیں آسکتے اور یہ "دیکھا" کا لفظ تو میر نے اس طور سے برتا ہے کہ جی ہی نکل جاتا ہے۔ ماضی کے بے شمار تجربات جو انسانوں پر بیتے میر نے انہیں سنا اور ایک مقام نظر پر اس طرح مجتمع کر دیا ہے کہ ہر لفظ ایک اسم بن گیا ہے جو استعارے کا گداز لئے ہوئے ہے۔"۔۲۲

ناصر کاظمی کو میر کی دو بنیادی باتوں نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ ایک "لفظ تازہ" اور دوسرے "جہان معنی" ۔ انہوں نے میر کے شعروں میں "ننھے ننھے لفظوں کی کشتیاں عمیق خیالوں اور اتھاہ جذبوں کے سمندر میں تیرتی" ہوئی دیکھیں۔ یہ بات ناصر کاظمی ہی کر سکتے تھے کہ لفظوں کے طلسم کا اسم ان سے زیادہ کس کو ازبر ہے۔ لفظوں سے شناسائی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے زندگی بھر ریاضت کی۔ اور پھر "جہان معنی" ــــــــ ان کی تنہائی اور اداسی اسی "جہان معنی" کی تلاش کا راز اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے۔ درج بالا عبارت میں ناصر کاظمی کی تنقیدی بصیرت رچی ہوئی نظر آتی ہے۔ میر کے شعر کے حوالے سے "سننے" اور "دیکھنے" کی کیفیت کو انہوں نے اپنی ذات پر آزما کر ان کی معنویت آشکار کی ہے۔ ان کی نثر کا کمال یہ ہے کہ وہ میر کو

سمجھ کر تمثالوں کے ذریعے اسے قاری کو سمجھاتے ہیں اور قاری اس بات پر تذبذب میں ہے کہ میر کو سمجھے یا ناصر کاظمی کے حیرت اثر جملوں پر داد دے۔ دو اڑھائی سو برس پہلے کے میر کو وہ کوئی اسم پھونک کر اپنے پاس بلا لیتے ہیں اور شاید میر نے بھی یہ حق صرف ناصر کاظمی ہی کو دیا ہے کہ

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

میر سامنے بیٹھے ہیں اور دیکھیے ناصر کاظمی ان کے دل کی ویرانی کا تعارف کس انداز میں کراتے ہیں:

"میر جس درخت کی چھاؤں میں بڑھ رہے تھے وہ قبل از وقت گر گیا اس کے بعد انہیں کوئی مشفق نہ ملا' عزیزان حال نے آنکھیں پھیر لیں اور ہمیشہ اپنا ہی ہاتھ ان کے سر پر رہا۔ چکی صبح و شام رنگ بدلتی تھی۔ میر نوجوان کو چاند میں ایک شکل نظر آنے لگی۔ وہ شہر غریب ہو گئے۔ دیوانگی کی زنجیر پاؤں میں پہن لی۔ بہت تڑپے بہت روئے مگر وہ شکل پھر نظر نہ آئی۔ چکی برابر چلتی رہی۔ سورج کہ زندگی کا پیامبر ہے' میر کی دلی پر آگ اور لہو برساتا تھا اور تارے جو کاروانوں کی رہبری کرتے ہیں' خلق خدا کو قہر کی آنکھوں دیکھتے تھے۔ دولت در در کی بھیک مانگتی پھرتی تھی اور کار عدالت کم نسلوں اور ظالموں کے رحم و کرم پر تھا (چار لچے ہیں مستعد کار۔ دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار) کال' سیلاب' خانہ جنگی اور آئے دن کی ہجرت غرض کون سی آفت نہیں تھی۔ باغ زمانہ شہادت گاہ بنا ہوا تھا۔"

رسم و عادت ہے کہ ہر اک دور کا ہوتا ہے ذکر
میر بارے یاد کر رودیں گے گیا یہ دور لوگ

ص ۲۳

ناصر کاظمی نے اٹھارویں صدی کی دلی کا جو لہو رنگ نقشہ پیش کیا ہے' اس کے تناظر میں میر کی دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تاریخ ادب کی کتابوں میں ناقدوں اور صاحب طرز ادیبوں نے اردو شاعری کے سیاسی اور معاشرتی پس منظر میں

نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا ذکر کرتے ہوئے دلی کی تباہی کی داستان رقم کی ہے۔ مگر اس داستان طرازی میں ایک محقق کا ذہن اور نقاد کا لہجہ دکھائی دیتا ہے۔ اور پڑھنے والا اسے تقدیر کا نوشتہ سمجھ کر آگے گزر جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس شکستہ اور خراب حالی کے اثرات اس دور کے شہر آشوبوں میں تلاش کر کے محقق اپنا فرض ادا کر دیتا ہے لیکن ناصر کاظمی نے تو جذبے اور احساس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس گہرے کرب کو اپنے دل میں تلاش کیا ہے اور میر کے دل کی دھڑکنوں کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں شامل کر لیا ہے۔ میر شناسی کا دعویٰ کرنے والے اجڑی ہوئی دلی میں میر کے غم اور اداسی کا جواز تلاش کرتے ہیں وہ میر کی غزلوں کو ایک رسمی انداز میں اس کے ذاتی کرب کا آئینہ بنا کر پیش کرتے اور اسے داخلیت پسند شاعر قرار دے کر اس کی آنکھیں اندر کی طرف کھولتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے میر کی آنکھیں باہر کی طرف کھولی ہیں جن سے وہ دلی کے تباہی کے منظر دیکھتے اور خون کے آنسو روتے ہیں۔ انھوں نے میر کے بظاہر غیر معروف اشعار اور ناقدوں کے بقول بھونڈے اور ثقیل الفاظ میں میر کے عصری آشوب کا کھوج لگایا ہے۔ ان کے نزدیک بڑا شاعر ایک بھرپور انسان بھی ہوتا ہے وہ اپنے تخلیقی سفر میں لفظوں کے کارواں ساتھ لے کر چلتا ہے اور بے شمار تجربوں سے گزر کر اپنی جنت تخلیق کرتا ہے۔ اس کے فن کو مکمل طور پر محسوس کرنے کے لئے پڑھنے والے کو تجربوں کے جہنم سے گزرنا پڑتا ہے۔ بڑے شاعر کا مطالعہ ایک سخت امتحان ہے۔ وہ پڑھنے والے کو ہر لمحہ زندگی کے نئے گوشے اور نئے تجربے سے روشناس کر کے چیلنج کرتا ہے۔ اس کے عام سے شعروں میں قہقہوں کی گونج میں وہ المناک تجربہ پوری شدت سے سمویا ہوتا ہے جس میں دھاڑیں مار کر رویا بھی جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ناصر کاظمی میر کے اس بظاہر عامیانہ سے شعر کی مثال پیش کر کے اس کے تجربے کی گہرائی کو سامنے لاتے ہیں۔

یاں پلیتھن نکل گیا واں غیر
اپنی ٹکی لگائے جاتا ہے

یہ شعر آدمی کے سستے اور عمومی جذبات کو اس قدر برانگیختہ کرتا ہے کہ معقول سے معقول قاری بھی ان کی رو میں بہہ کر اس طرح قہقہے لگانے لگے کہ اسے

اپنے مبتذل ہونے پر کوئی شک نہ رہے' لیکن اس شعر کو دلی کی تباہی کے تناظر میں دیکھیں' جس کا تمدن اور جس کی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور موت بھی اس سے گریزاں تھی۔ یہ المیہ اتنا ناقابل برداشت تھا کہ اس پر رویا بھی نہیں جا سکتا۔ بقول ناصر کاظمی' اس الم کی دربستگی سے پیدا ہونے والے عجز سے بچنے کے لئے قہقہہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ میر نے یہاں ایک ماہر نفسیات کی طرح انسان کے سستے جذبات کو جگا کر اسے بلندی کا زینہ دکھایا ہے۔

ہم نے گزشتہ سطور میں ناصر کاظمی کی تنقیدی بصیرت کا ذکر کیا تھا۔ اس مضمون میں ان کی تنقیدی بصیرت کھل کر سامنے آتی ہے جب وہ میر پر ناقدین کی اعتراضات کو رد کرتے ہوئے میر کا مقدمہ لڑتے ہیں اور اس کی صفائی میں ایسے مضبوط دلائل پیش کرتے ہیں کہ ناقدین کے اعتراصات ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً ناصر کاظمی کی یہ سطور دیکھیے:

"ڈاکٹر کلیم الدین احمد کے تنقیدی سرمائے میں اردو غزل کے بارے میں بس یہ دلچسپ فقرہ کہ "غزل ایک نیم وحشیانہ صنف سخن ہے' مشہور ہوا ہے۔ اس میں کیا کہا گیا ہے یہ تو نقاد جانیں۔ تعجب یہ ہے کہ پروفیسر صاحب کو میر کی شاعری میں امید کا ستارہ کہیں نظر نہیں آتا۔ مگر اس میں ان کا کیا قصور؟ درسی کتابوں کی چھت کے نیچے تو آسمان بھی نظر نہیں آتا۔ معلوم نہیں انہوں نے میر کو کس طرح دیکھا ہے اور خود زندگی کیسی گزاری ہے۔ یوں آج کل غم اور خوشی کا تصور بھی عجیب سا ہے۔ جہاں غم کا لفظ سنا آنکھیں تر کر لیں' خوشی کا ایک لفظ پڑھا تو پھڑک گئے۔ غم اور خوشی امید اور ناامیدی ایک دوسرے کی موت نہیں بلکہ زوجین ہیں اور بڑے شاعر کا احساس الم غم پرستی نہیں بلکہ خود آگاہی اور زندگی کا پیغام ہوتا ہے۔

لذت زہر غم فرقت دلداراں سے
ہووے منہ میں جنہوں کے شہد و شکر مت پوچھو

یہاں غم اور خوشی ایک ایسی بھرپور کیفیت میں اس طرح حل ہو گئے ہیں کہ وجدان میں تھرتھری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب ان کا رونا دیکھیے۔ یہ رونا نہیں بغاوت کا اعلان ہے"

عشق میں دم مارا نہ کبھو تم چپکے چپکے میر کھپے
لوہو منہ پر مل کر اب فریاد کرو تو بہتر ہے

قطرہ قطرہ اشکباری تا کجا پیش سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدہ تر ہو سو ہو

میر نے تو جاگنے اور خواب کرنے کو بھی ملا رکھا تھا اور ان کے نزدیک موت بھی زندگی سے جدا نہ تھی۔

جی میں پھرتا ہے میر وہ میرے
جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر"۔۲۴

درج بالا اقتباس میں ناصر کاظمی اپنی دلیل کی صداقت میں میر کی شاعری سے ایسی مثالیں ڈھونڈ کر لائے ہیں جو شاید میر کے نقادوں کی نظر سے نہیں گزریں۔ ان مثالوں کے ذریعے وہ میر کے حق میں یہ دلیل قائم کرتے ہیں کہ انہیں محض غم پرست اور مایوسی کا شکار قرار دینا درست نہیں ہے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح میر کا احساس الم بھی غم پرستی نہیں بلکہ خود آگاہی اور زندگی کا پیغام ہے۔ وہ زندگی کی دو متضاد کیفیتوں کو ملا کر اس سے ایک مثبت تاثر پیدا کرتے ہیں ان کی شاعری کے محرکات عام انسانی تجربات ہیں اور ان تجربات کے بہت سے مراحل شاعر کی اندرونی تحریک میں ڈھل کر ایک نئے تجربے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ سچے واقعات اور مشاہدات تخلیق کو شاعر اپنے حافظے کے وجدان سے ایک نیا تجربہ بنا دیتا ہے۔

"میر ہمارے عہد میں" کا اہم ترین حصہ وہ ہے جس میں ناصر کاظمی نے اردو شاعروں پر میر کی شاعری کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے خیال میں اردو شاعری پر میر کی شاعری کے اثرات بڑے گہرے اور دور رس ہیں اور ان کے بعد آنے والے تقریباً

تمام بڑے شاعروں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ بڑا شاعر کسی ایک زمانے یا ایک طبقے کے لئے نہیں لکھتا۔ اس کی شاعری ہر زمانے سے بار بار ایک تقاضا کرتی ہے۔ ناصر کاظمی میر کی شاعری کے بعض اہم عناصر اور ہمارے عہد کے ذہنی اور اجتماعی محرکات کے اشتراک کی بات بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے خیال میں میر کے زمانے اور ہمارے زمانے میں بڑا بعد ہے دنیا اتنی بدل چکی ہے کہ آج کے شاعر کے سامنے پہلے سے کہیں وسیع منظر حیات کھل گیا ہے مگر واقعات کی مماثلت کی وجہ سے میر کا زمانہ ہمارے زمانے سے مل گیا ہے۔ میر صاحب نے بھی ہجرت کی اور ہجرت کی واردات ہماری قوم کی تاریخ میں بھی نمودار ہوئی۔ ہجرت اور اس سے وابستہ حوادث کا ذکر کرتے ہوئے وہ دونوں زمانوں کی ہجرتوں کے اسباب پر بحث کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک میر اور ان کے ساتھیوں کی ہجرت اور ہماری ہجرت میں بڑا فرق ہے۔ انہوں نے ہجرت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ جبکہ ہم نے یہ ہجرت خود اختیار کی۔ میر کے زمانے میں مسلمانوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ ہم نے ایک نئی ملت اور ایک نئے ملک کی بنیاد رکھی۔ ہم نے صبح کی روشنی میں آنکھ کھولی میر کا زمانہ رات تھا۔ لیکن انہوں نے یہ رات رو پیٹ کر نہیں گزاری بلکہ اس ویران رات کے سناٹے میں کچھ شب چراغ روشن کئے انہوں نے اپنے معاشرے کو آئینہ دکھا کر عبرت دلائی۔ جگانے کی کوشش کی مگر حوادث کا طوفان کسی کے بس میں نہ تھا۔ ہم دن کی روشنی میں ہیں اور ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ اس دن کو کیسے گزارا جائے۔ ناصر کاظمی کا خیال ہے کہ اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جن کے ظہور کے وقت میر کی رات کا خاصا حصہ گزر چکا تھا اور اقبال نے دن کے قدموں کی آواز سن لی تھی۔ میر و اقبال کے تقابلی مطالعے میں وہ اقبال کے ہاں میر کے فلسفہ حیات کی بازگشت سنتے ہیں۔ انہوں نے اس مضمون میں میر و اقبال کے بیسیوں ایسے اشعار اور مصرعے پیش کر دیئے ہیں جن کے موضوعات' الفاظ اور خیالات میں حیرت انگیز حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ اقبال کے یہاں قلندری' درویشی' خودی' اخلاق' انسان اور عشق کے تصورات کی جھلک میر کے ہاں بھی موجود ہے:

ہمارے اقبال شناسوں نے اقبال کے حوالے سے دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے ہیں لیکن آج تک ان کا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ اقبال کی شاعری کے اہم تصورات

ان سے دو سو برس پہلے میر تقی میر کے ہاں بھی موجود رہے ہیں لیکن وہ میر کے پہلوئے غم ہی کو دیکھتے رہے اور اس کی باقی جہتیں ان کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ یہاں پر ہمیں ناصر کاظمی کے ذہن رسا کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان کی نظر جہاں میر کی زندگی اور ان کے عہد کی پاتال میں اترتی ہے وہاں وہ اقبال کی شاعری اور ان کے فکر و فلسفے سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔ خاص طور پر جہاں انہوں نے میر کے اشعار کے بالمقابل اقبال کی اشعار دے کر ان کی ذہنی اور فکری تطبیق ظاہر کی ہے وہاں ان کی بے پناہ وسعت مطالعہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ میر اور اقبال کے بنیادی فلسفہ حیات کے عناصر میں باہمی رشتہ اور تعلق تلاش کرتے ہوئے وہ ان دونوں شعرا کے نظریہ شعر میں مماثلت بھی پیش کرتے ہیں۔ اقبال کے اس شعر میں کہ:

مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

میں وہ "آتش رفتہ" کو ایک وسیع روایت قرار دیتے ہیں جس میں میر بھی ایک شرر زندہ کی حیثیت سے شامل ہیں۔ اقبال کے جہاں تازہ' مرد آفاق' امام بے حضور' عشق یزداں شکار' صدق مقال' باشعور جنوں اور ایسی بہت سی تراکیب کے مقابلے میں میر کے یہاں جہان دیگر ' انسان کامل' جگردار آدمی' عشق اللہ' صیاد' حق بات' باشعور جنوں ایسی مشترک اقدار ہیں جو محض الفاظ ہی نہیں بلکہ ان کے پیچھے پورا فلسفہ حیات موجود ہے۔ میر اور اقبال کے تقابلی مطالعے میں وہ جن مشترکہ باتوں کو سامنے لاتے ہیں وہ حیرت انگیز حد تک ان دونوں شاعروں کو فکری سطح پر ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہیں۔ اور یوں میر کی قنوطیت' غم پرستی کے قصے ہوا ہو جاتے ہیں۔ ناصر کاظمی ' ناقدین کے اس بیان کو کہ میر کے دل میں قوم کا درد نہیں تھا اور یہ کہ ان کی شاعری محض ذاتی دکھوں کا رونا ہے' بے بصیرتی پر محمول کرتے ہیں۔ ان کے بقول' میر صاحب کے سامنے کوئی زندہ معاشرہ تھا ہی نہیں کہ وہ باقاعدہ طور پر ولولہ تازہ لے کر میدان میں آتے۔ انہوں نے مرنے والوں پر آنسو بھی بہائے اور جو مر رہے تھے انہیں کبھی رلا کر' کبھی ہنسا کر' کبھی غیرت دلا کر ان کی کمزوریوں سے آگاہ کیا مگر وہ اپنی قوم سے مایوس بھی نہیں تھے

یوں تو ہم عاجز ترین خلق عالم ہیں ولے
دیکھنا قدرت خدا کی گر ہمیں قدرت ہوئی

مضمون کے آخر میں ناصر کاظمی نے میر کی اس روایت کا ذکر کیا ہے جو زبان کے حوالے سے ہم تک پہنچی ہے۔ ان کے خیال میں بڑی شاعری تخلیق کرنے کے لئے آج شاعر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انہیں نئے موضوعات کے علاوہ ایک وسیع تر ذریعہ اظہار کی بھی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں میر سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہمیں ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جس میں دوسری مقامی بولیوں کے لئے بھی خاطر خواہ گنجائش ہو اور اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات بھی وسیع تر ہوں۔ میر نے ہندوستانی اردو کی بنیاد رکھی تھی۔ ہمیں پاکستانی اردو کی ضرورت ہے جو ہماری علاقائی زبانوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر آگے چل سکے۔ اس مضمون کا آخری پیراگراف ناصر کاظمی کے مخصوص اسلوب کی عکاسی کرتا ہے اور میر کے بارے میں ان کے طویل مضمون کا رس اس میں سمٹ آیا ہے:

"میں نے میر کے زمانے کو رات کہا تھا۔ یہ رات ہمارے زمانے کی رات سے آملی ہے۔ قافلے کے قافلے اس رات میں گم ہو گئے اور جو بچ نکلے وہ اس سے اب تک لڑ رہے ہیں۔ یہ روحانی واردات جو بیک وقت انفرادی بھی تھی اور اجتماعی بھی ہماری فضائے یاد میں اظہار کے لئے بے چین ہے۔ ہم ایک ہولناک رات سے ہنگامہ و ہراس کے عالم میں گزرے ہیں۔ آزادی کی کرن چمکی تو ششدر رہ گئے کہ رات کب اور کیونکر گزری۔ نہ رنج سفر یاد رہا نہ عیش منزل کا سرور ملا۔ اس ذہنی دھچکے نے ہمارے ذہنی نظام میں افراتفری پیدا کر دی۔ اب ہم کبھی ماضی کی طرف پلٹتے ہیں اور کبھی مستقبل کی طرف دوڑتے ہیں۔ یہ جمود نہیں حرکت ہے مگر محض حرکت بھی جمود سے ایسی مختلف تو نہیں ہوتی۔ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ اس حرکت کو رفتار کیسے بنایا جائے۔ یہ کام تقلید یا تجدید سے تو ہو نہیں سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس تجربے کا اظہار، تجربہ جس میں ماضی، حال اور مستقبل گڈمڈ ہو گئے ہیں، زبان کے ذریعے ممکن ہے اس لئے ہم زبان کے سہارے اپنی

روایتوں سے بھی جا ملے ہیں۔ لیکن آخر حال کے بھی تو تقاضے ہیں۔ اس لئے محض تقلید یا تجدید سے کیا کام چلے گا بے شک وہ میر کی تقلید کیوں نہ ہو۔ میر دریا ہی سہی اور دریا سے بجلی پیدا ہو سکتی ہے لیکن یارو دریا کا رخ شہر کی طرف اس طرح تو نہ موڑو کہ شہر کو سیلاب لے جائے۔ تو اس دریا کو کیسے پار کریں کہ زقند لگا کر تو عبور نہیں کر سکتے مگر اپنی ناؤ تو ہونی ہی چاہئے ع۔

موقوف غم میر کہ شب ہو چکی ہمدم۔"۲۵

ناصر کاظمی کا یہ مضمون مجموعی اعتبار سے ایک بھرپور تاثر کا حامل ہے۔ اس میں انہوں نے میر کے حوالے سے بعض ایسے نکات اٹھائے ہیں جو خصوصی توجہ کے محتاج ہیں۔ پورے مضمون کو پڑھ کر میر کی جو تصویر نگاہوں کے سامنے آئی ہے اسے کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ میر کی سیدھی سادی غزلوں اور پرسکون بحروں اور عام لفظوں کی تہ میں جذبات کا اضطراب نظر آتا ہے۔ عمیق خیالوں اور اتھاہ جذبوں کے سمندر میں ننھے ننھے لفظوں کی کشتیاں تیرتی دکھائی دیتی ہیں۔

۲۔ دو متضاد تجربوں کو ایک "مقام نظر" پر اس طرح مجتمع کر دیا ہے کہ ہر لفظ ایک اسم بن گیا ہے جو استعارے کا گداز لئے ہوئے ہے۔

۳۔ میر نے پامال چیزوں' بھوکے جانوروں اور شکستہ لشکریوں کو غزل میں جگہ دی اور کرخت اور سنگلاخ الفاظ اسی طوطی نفیس کے مزاج کو رٹا دیئے۔

۴۔ میر نے ایک ماہر نفسیات کی طرح انسان کے ستے جذبات کو جگا کر اسے بلندی کا زینہ دکھایا ہے۔

۵۔ وہ اپنے ذاتی تجربے کو ایک اجتماعی رویے کی شکل دے دیتے ہیں۔

۶۔ دور مصائب میں میر نے اپنی قومی روایت' خاندانی نجابت اور عالی حوصلگی کو نہیں چھوڑا۔

۷۔ میر کے یہاں عاشق و معشوق کے تعلقات بھی انسانی سطح پر ہوتے ہیں وہ انسان میں باہمی محبت' آدمیت اور عزت نفس دیکھنا چاہتے ہیں۔

۸۔ وہ لفظوں کا انتخاب اس طرح کرتے ہیں کہ تخصیص اور عمومیت کا امتیاز نہیں رہتا بلکہ تجربات کے بہت سے مراحل شاعر کی اندرونی تحریک میں ڈھل کر ایک نئے تجربہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

۹۔ میر صاحب شعر کیا کہتے ہیں باتیں کرتے ہیں اور شاید اسی لئے وہ اپنے اشعار کو "باتیں" کہتے ہیں۔

۱۰۔ میر غیرت مندی اور خود داری کے باوجود ہر چڑھتے سورج کے ساتھ رہے۔ دیوانگی بھی کی لیکن شعور کے ساتھ۔ ان کی بے رہروی عام انسانوں کی سی نہ تھی بلکہ ایک تخلیقی سفر تھا۔

۱۱۔ میر کا تخلص محض میر تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ پورے معاشرے کا استعارہ بن جاتا ہے۔

۱۲۔ وطن اور محبوب کی جدائی میں وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پیروی کرتے رہے۔ یہ قصہ میر کی شاعری کا "احسن القصص" ہے۔

۱۳۔ میر ایک زندہ دل آدمی تھے مگر اوباش نہ تھے۔ دختر رز کو کبھی منہ نہ لگایا۔ شاید افیون کا استعمال گاہ گاہ کر لیتے ہوں۔

۱۴۔ جب عرصہ حیات تنگ ہوا اور حکومت کا شیرازہ بکھر گیا تو وہ ایک عرصہ تک گوشہ نشین رہے لیکن ان کی درویشی ایک سچے مسلمان کی قناعت ہے کہ وہ انسان کو اس وقت ذہنی انتشار سے بچاتی ہے جب وہ کوشش کے باوجود گوہر مراد حاصل نہ کر سکے۔

۱۵۔ ان کا تصور مذہب محدود نہ تھا۔ وہ درد مندی، آدمیت اور انسانی محبت کے متلاشی تھے کہ محض شاعری کمال انسان نہیں۔

۱۶۔ غالب ہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے میر سے بڑی کاری گری اور کامیابی سے رنگ لیا اور ایک الگ عمارت بنائی۔ بلکہ میر صاحب کا پہلا تخلیقی طالب علم غالب ہی ہے۔

۱۷۔ فن کے معاملے میں وہ بہت سخت تھے۔ ادب اور شرافت کا گھپلا نہیں کرتے تھے۔

۱۸۔ میر کی شاعری اپنے عہد کی ایک ایسی شخصیت ہے جس میں معاشرے کے تجربات، عقائد، آرزوئیں اور زبان، سب مختلف شکلیں مکمل مل کر ایک وحدت بن جاتی ہیں۔

۱۹۔ یہ اتفاق ہے کہ میر صاحب کی شاعری کے بعض عناصر اور ہمارے عہد کے ذہنی اور اجتماعی محرکات میں چند باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔

۲۰۔ گو اقبال نے میر صاحب کا کہیں ذکر نہیں کیا مگر میر کے یہاں جابجا ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو بڑی حد تک اقبال کے فلسفہ حیات سے مماثل ہیں۔

۲۱۔ اقبال نے اپنے زمانے کو خارا تراشی کا زمانہ کہا تھا۔ میر نے اپنی شاعری میں خارا تراشی کو انسانی عزم کا استعارہ بنا دیا۔

۲۲۔ اقبال کے بہت سے اشعار پڑھتے وقت میر کے کتنے ہی اشعار دل میں چٹکیاں سی لینے لگتے ہیں۔

۲۳۔ اقبال اور میر دونوں کے یہاں انسان کو اولیت حاصل ہے۔ اقبال کی طرح میر بھی اپنی قوم سے مایوس نہ تھے۔

۲۴۔ میر زبان ساز بھی تھے۔ ایک وسیع تر ذریعہ اظہار کے سلسلے میں وہ ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔

۲۵۔ میر نے عربی اور فارسی کے الفاظ کو اردو میں اس طرح برتا ہے کہ ان میں ہندوستانیت کی روح رچ بس گئی ہے۔

۲۶۔ آج کل کے اکثر ادیب اردو میں لکھتے وقت انگریزی میں سوچتے ہیں مگر میر صاحب کو دیکھئے کہ اردو میں شعر کہتے وقت عربی اور فارسی میں بھی نہیں سوچتے۔ •

(۳)

میر درد کا مطالعہ

میر تقی میر کی حوالے سے ناصر کاظمی کے طویل مضمون کے جائزے کے بعد

میر کے ہم عصر خواجہ میرؔ درد پر ان کا مضمون ''کھٹے آم کی تلاش'' ہمارے پیش نظر ہے۔ ناصر کاظمی کا یہ مضمون اول اول ماہنامہ ''نصرت'' لاہور کے جنوری ۱۹۶۳ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انتظار حسین اور عزیز الدین احمد کے مرتب کردہ ''۱۹۶۳ء کے بہترین مقالے'' نام کے انتخاب میں اسے شامل کیا گیا جسے حلقہ ارباب ذوق کے زیر اہتمام شائع کیا گیا۔ ازاں بعد یہ ''خشک چشمے کے کنارے'' میں بھی شامل ہے۔ اس مضمون میں ناصر کاظمی نے میر درد کی معروف صوفیانہ شاعری کے عشق حقیقی کے بجائے سیدھے سادے عشقیہ اشعار کو موضوع بنایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ درد نے اپنی شاعری میں عام انسانی جذبات اور عام زمینی قباحتوں کا ذکر کر کے انہیں تصوف کی چادر تلے چھپا دیا ہے۔ یہ مضمون درد کی شاعری کے ایک نئے رخ کو پیش کرتا ہے جو عام نگاہوں سے ابھی تک اوجھل ہے۔

مضمون کا آغاز ناصر کاظمی نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں کیا ہے ملاحظہ کیجئے :

''غالب نے آموں کے بارے میں کہا تھا کہ آم میٹھے ہوں اور بہت سے، خواجہ میر درد کے کلام میں میٹھے آم تو یقیناً موجود ہیں مگر وہ بہت تھوڑے ہیں اور کھٹا آم شاید خال خال ہی ملے۔ یوں کھٹا آدم کھانے کی چیز نہیں مگر میٹھے آم سیر ہو کر کھانے کے بعد کھٹا آم عجب مزا دیتا ہے۔ درد کے باغ شعر میں تو بس دو ایک قسم کے آم ہیں اور وہ بھی بالعموم قلمی قسم کے صوفیانہ آم، دیسی رس بھرے رنگا رنگ آموں کی دھڑیاں تو خدائے سخن میر کے باغ ہی میں ملیں گی جن پر عوام تو کیا خواص بھی جان چھڑکتے ہیں۔

میں اس وقت لکھنے بیٹھا ہوں درد کی شاعری پر اور لے بیٹھا ہوں قصہ آموں کا۔ مگر گھبرایئے نہیں، آموں نے غالب کی شاعری کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس کا ذائقہ شعر تیز تر کر دیا۔ اس لئے بارے آموں کا بیان ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ فن باغبانی سے معمولی دلچسپی رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ آم کا پودا پیوند کے بغیر پھل نہیں لاتا اور اگر اتفاق سے پھل بھی لے آئے تو وہ مقدار میں بہت تھوڑا ہوتا ہے اور ذائقے اور خاصیت

میں نہایت ہی گھٹیا قسم کا۔ پس شاعری کو بھی آم کا پودا جانیئے کہ اس کا پودا بھی رنگا رنگ خیالات اور تجربات کے پیوند کے بغیر عمدہ پھل نہیں لا سکتا۔"۲۶

ناصر کاظمی' بات غالب کے میٹھے آموں سے شروع کر کے شاعری پر لے آئے۔ انہیں درد کے باغ شعر میں دو ایک قسم کے صوفیانہ قلمی آم نظر آتے ہیں جبکہ خدائے سخن میر کے ہاں دیسی رس بھرے رنگا رنگ آموں کی دھڑیاں دکھائی دیتی ہیں اور غالب کے میٹھے آموں نے ان کی شاعری کا ذائقہ تیز کر دیا ہے۔ اچھا شعر میٹھے آم کی طرح ہوتا ہے۔ جس طرح میٹھے اور خوش ذائقہ آم حاصل کرنے کے لئے اس کے پودے کی پیوند کاری ضروری ہے۔ اسی طرح اچھی شاعری بھی اپنے پودے کی پیوند کاری کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ ناصر کاظمی کو درد کے ہاں میٹھے آموں کے ساتھ کھٹے آم بھی ملتے ہیں۔ دیکھئے انہوں نے کس ہنر مندی سے کھٹے آموں کا جواز فراہم کیا ہے۔ کہتے ہیں "یوں کھٹا آم کھانے کی چیز نہیں مگر میٹھے آم سیر ہو کر کھانے کے بعد کھٹا آم عجب مزا دیتا ہے۔" اور یہ کھٹا آم درد کی وہ عشقیہ شاعری ہے جو ان کی صوفیانہ شاعری کے بیچ اپنا رنگ' ذائقہ اور مزا دے رہی ہے۔ چنانچہ "کھٹے آم کی تلاش" دراصل درد کی اس عشقیہ شاعری کی جستجو ہے جس پر درد نے تصوف کی اوڑھنی ڈال رکھی ہے۔ ناصر کاظمی نے اس مضمون میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ درد کو نرا صوفی شاعر قرار دینا ان کی شعر عظمت گھٹانے کے مترادف ہے کیونکہ نرا صوفی اول تو شاعر ہو ہی نہیں سکتا اور اگر ہو گا تو یک رنگ ہو گا۔ نقادوں نے درد کے عشقیہ اشعار کو تصوف کے غلاف میں لپیٹ کر بظاہر ان کی شرافت اور نجابت کا سکہ جمانے کی کوشش کی ہے لیکن بقول ناصر کاظمی

"شرفا کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ شرافت اور شاعری کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ یہ درست ہے کہ میر درد ایک صوفی ہیں لیکن ان کا تصوف بزرگوں کے فیض صحبت یا تصوف کی کتابوں تک محدود نہیں۔ وہ پاک باز ضرور ہوں گے مگر انہوں نے ایام شباب میں زمین کے حسن کی رعنائیوں کو خاصے قریب سے دیکھا اور ڈوب کر ان سے والہانہ محبت بھی کی۔ البتہ مجموعی طور پر ان

کے اکثر اشعار پر تصوف کی پری کا سایہ ضرور نظر آتا ہے۔"۲۷

درد کے تصوف کے حوالے سے ناصر کاظمی نے ہندوستان میں تصوف کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں تصوف کا باقاعدہ آغاز ہندو دھرم کے شیو سکول سے ہوتا ہے۔ اس مدرسہ فکر کے علما یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا کی ذات اپنے تئیں مکمل ترین ہے تو پھر یہ کائنات تخلیق کرنے کا مقصد کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس کا کوئی مقصد تھا تو اس مقصد کی تکمیل کے بغیر خدا کی ذات مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر خدا کی ذات اپنی جگہ مکمل اور برتر ہے اس لئے ان کے خیال میں کائنات اس کی لیلا Sport ہے۔ لہٰذا کائنات کا کوئی مقصد نہیں۔

اس سلسلے کا دوسرا مدرسہ فکر یہ کہتا ہے کہ کائنات مایا یعنی نیرنگ نظر ہے۔ اس لئے یہ مدرسہ فکر عمل کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس لئے بالعموم تصوف کا یہ بنیادی اصول سمجھا جاتا رہا ہے کہ کائنات نظر کا واہمہ ہے۔ اصل حقیقت تو خدا کی ذات ہے۔ پس ترک دنیا کر کے خدا سے لو لگائی جائے۔ ہندو تصوف کا ذکر کر کے ناصر کاظمی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان شعرا نے بہت سے بنیادی خیالات ہندو صوفیا سے اخذ کئے ہیں۔ اسی طرح منصور حلاج اپنے صوفیانہ نظام فکر میں حضرت عیسیٰ کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان صوفیا نے ان عقائد میں بعض اسلامی اصولوں کو بہت حد تک داخل کر دیا مگر تصوف کے ڈانڈے بہر صورت ویدانت، زرتشت یا عیسائیت سے جا ملتے ہیں۔ ناصر کاظمی کے خیال میں ایک صوفی کے ذاتی تجربات اپنی جگہ پر مسلم حقیقت ہو سکتے ہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ انہیں اپنی تحریروں میں کس طرح بیان کرتے ہیں۔ تصوف کے فلسفے کی بنیاد واضح کرنے اور اس کی اصلی حقیقت بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ یہ بات بھی اپنی جگہ طے ہے کہ اگر فارسی اور اردو کی عظیم شاعری کو تصوف سے الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ بے روح نظر آئے گی۔ میر درد کی صوفیانہ شاعری کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں مجاز اور حقیقت کو پیوند لگایا ہے۔ تخلیق کے لئے دو چیزوں کا ملاپ ضروری ہے اور درد کے ہاں مجاز اور حقیقت کا ملاپ ہے۔ زمینی حسن کی تعریف سے مقصد خدا کی تعریف ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے کیونکہ کائنات کی ہر چیز خدا کی عظمت اور برتری کا احساس دلاتی ہے۔

مگر یہ بات بھی تو مناسب نہیں کہ سیدھے سادے جسمانی عشق کو آپ زبردستی عشق حقیقی کے کھاتے میں ڈال دیں۔ چونکہ صوفی کائنات کو ایک واہمہ سمجھتا ہے اس لئے صوفی شاعر کے کلام میں کائنات کے حسن اور اس میں رہنے سہنے والے انسانوں کے باہمی تعلق کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

ناصر کاظمی، درد کے لگ بھگ ایک درجن سے زائد اشعار پیش کر کے اہل نظر کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ ان میں سے عشق حقیقی تلاش کر کے دکھائیں۔ حقیقت میں یہ سب کے سب اشعار سیدھے سادے عشقیہ اشعار ہیں جن میں دور دور تک عشق حقیقی کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ چند اشعار آپ بھی دیکھئے:

ہم جانتے ہیں درد اندھیرے میں رات کو
تو لگ رہا ہے کوچے میں جس گھات کے لئے

اس سنگ دل کی وعدہ خلافی کو دیکھئے
پتھرا گئی ہیں آنکھیں مری انتظار میں

ان اشعار کو پیش کرنے کے بعد ناصر کاظمی لکھتے ہیں:

"اب اہل نظر انصاف سے کہیں کہ مذکورہ اشعار میں عشق حقیقی کہاں ہے اور عشق مجازی کہاں کا عیب ہے؟ کیا بقول درد یہ دنیا گناہ آدم کا کرشمہ نہیں۔ درد صوفی تھے لہٰذا انہوں نے وصال کی منزلیں بھی دیکھیں ہوں گی مگر انہوں نے یہ شعر کیوں کر کہا۔

وہ مرتبہ ہی اور ہے فہمیدہ سے پرے
ہم جس کو بوجھتے ہیں وہ اللہ ہی نہیں

اس شعر میں تو وصال کیا بلکہ صوفیانہ خیالات کی سرے سے نفی کر دی ہے۔ درد نے مجاز اور حقیقت کے پیوند سے جو پودا لگایا ہے اس میں اولین اہمیت مجاز کو دی گئی ہے کہ اس کے بغیر حقیقت کا تصور بھی ممکن نہیں۔ میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ درد کے یہاں کھٹے آم خال خال ہی ملیں گے۔ سو مذکورہ بالا اشعار کی روشنی میں بظاہر بہت حد تک اس بیان کی تردید

ہو جاتی ہے۔ مگر ان کے ہاں میر یا غالب کی سی جرات رندانہ یا شوق فضول نہیں۔ درد نے چالاکی یہ کی ہے کہ اپنی شاعری میں عام انسانی جذبات اور عام زمینی قباحتوں کا تو حسب توفیق جی کھول کر تذکرہ کیا ہے مگر انہیں تصوف کی چادر تلے چھپا دیا ہے۔ ان کی شاعری میں تصوف کی تمام منزلوں کے ساتھ ساتھ گوشت پوست کے عام محبوب کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام سطحی، غیر سطحی، اعلیٰ اور ارفع جذبات بھی ملیں گے جو ایک صحت مند زندہ انسان کی علامت ہیں البتہ ان میں محبوب کا بوسہ لینے کی ہمت نہیں، بوسے کا تذکرہ ضرور موجود ہے۔ جس شخص میں بوسہ لینے کی ہمت نہ ہو وہ جسم کی گنگا میں کیونکر اتر سکتا ہے اور جو شخص جسم کی گنگا میں اترنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔ وہ ہری کے درشن کیسے کر سکتا ہے۔ شاید اسی لئے میر نے بقول آزاد درد کو آدھا شاعر کہا ہے اور آدھا شاعر ہونا بھی کسے نصیب ہے۔" ۲۸ے

"کھٹے آم کی تلاش" کا عمل مضمون کے مذکورہ بالا آخری حصے میں مکمل ہو جاتا ہے۔ درد کی شاعری پر ایسا بے لاگ اور جامع تبصرہ شاید ہی کس نقاد نے کیا ہو۔ ناصر کاظمی نے میر درد کی شاعری کے گرد تنی ہوئی تصوف کی چلمن ہٹا کر درد کا اصلی روپ ملاحظہ کیا ہے جو ایک صوفی صافی بزرگ سے زیادہ ایک شاعر کا روپ ہے۔ انہوں نے درد کے بارے میں بہ تکرار سامنے آنے والے ان بیانات کی اصلیت دکھا دی ہے جن میں درد کے صوفیانہ لب و لہجے کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں کہی جاتی۔ ہو سکتا ہے خود پر میر کے گہرے اثرات کے باعث ان کے پیش نظر میر کا وہ جملہ رہا ہو جس میں انہوں نے درد کو آدھا شاعر کہا ہے۔ اور انہیں پورے کے بجائے صرف آدھا شاعر ثابت کرنا ہی ان کا مقصود رہا ہو۔ لیکن ناصر کاظمی اپنے تجزیے کو درست ثابت کرنے کے لئے جو دلائل ساتھ لے کر آئے ہیں ان کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ انہوں نے یہ جملہ لکھ کر کہ "آدھا شاعر ہونا بھی کسے نصیب ہے" درد کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا ہے لیکن درد کا یہ نیا رنگ قبول کرنے کے لئے قاری کو خاصی محنت کرنا پڑتی ہے۔ ناصر کاظمی کا زندگی بھر یہ چلن رہا ہے کہ انہوں نے روایت کی کشتی میں

سوراخ کر کے اپنی ناؤ خود بنائی ہے۔ وہ روایت کے خلاف نہیں لیکن روایت کے بندھے ٹکے اصولوں کو من و عن قبول کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ چنانچہ انہوں نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی اپنے اپنا ایک زاویہ نظر اختیار کیا ہے وہ روایت کو سمجھنے کے لئے نقاد کے کہے پر عمل نہیں کرتے بلکہ اپنے وجدان اور تنقیدی بصیرت پر بھروسہ کرتے ہیں۔ میر کے بارے میں مضمون کے سلسلے میں بھی ان کا یہی طریق رہا ہے۔ جس میں میر کی روایتی تفہیم سے اختلاف کر کے انہوں نے میر پر نئے پہلوؤں سے گفتگو کی ہے۔ درد کے معاملے میں بھی وہ نئے زاویوں سے بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ کام خاصا مشکل ہے۔ میٹھے آموں کے ڈھیر میں کھٹے آم تلاش کرنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو آموں کی ڈھیریوں کی دھڑیاں چکھنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ ناصر کاظمی کا کمال یہ ہے کہ وہ کھٹے آموں کو ناگواری سے پھینک نہیں دیتے بلکہ اس سے بھی ذائقہ کشید کرتے ہیں کہ ''میٹھے آم سیر ہو کر کھانے کے بعد کھٹا آم عجب مزا دیتا ہے۔''

(۴)

معاصرین کے بارے میں مضامین ::

''اردو کے کلاسیکی شعرا کا کلام ناصر کاظمی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ مطالعے کے دوران اپنے پسندیدہ یا کسی اور اعتبار سے قابل توجہ اشعار پر نشانات لگانا اور بعض اوقات حواشی لکھنا بھی ان کی عادت تھی۔'' ۲۹؎

ان سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی اردو شاعری کی کلاسیکی روایت سے پوری طرح آشنا تھے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لئے اسے ضروری سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی عہد کی شعری روایت سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ خاص طور پر اپنے ہم عصر شعرا کی شعری تخلیقات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ صرف شاعری

ہی نہیں بلکہ افسانے اور مصوری کے بارے میں ان کا علم اور معلومات کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ اس حصے میں ہم ناصر کاظمی کے ان مضامین کا ذکر کریں گے جو انہوں نے اپنے ہم عصر فنکاروں پر تحریر کئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناصر کاظمی کے نثری ذخیرے میں جو مضامین موجود ہیں ان میں "احمد مشتاق" "شہری فرہاد" ' "ایک کہانی' دو استعارے" ' "کچھ شاد عارفی کے بارے میں" ' "شخصیت اور عکس" ' حفیظ ہوشیار پوری" اور "عبدالرحمٰن چغتائی" قابل ذکر ہیں۔ ان میں کچھ مضامین تو اپنے عناوین ہی سے ان شخصیات کا پتہ دیتے ہیں جن کے فن کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ "حفیظ ہوشیار پوری" والا مضمون البتہ شخصی خاکوں کی ذیل میں رکھا جائے گا۔ دیگر مضامین میں "شہری فرہاد" "سجاد باقر رضوی کی شاعری" ' "ایک کہانی' دو استعارے" انتظار حسین کے افسانے اور "شخصیت اور عکس" میرا جی کی شاعری کے بارے میں تحریر کئے گئے ہیں۔

احمد مشتاق کے بارے میں ناصر کاظمی کا مختصر مضمون ایک بھرپور تاثر لئے ہوئے ہے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور میں جن لوگوں کے ساتھ ناصر کاظمی کی محفلیں جمتی تھیں' ان میں ایک احمد مشتاق بھی تھے۔ ناصر کاظمی کے ساتھ چائے خانوں اور ہوٹلوں میں اٹھنے اور گفتگو میں حصہ لینے کے لئے پڑھا لکھا ہونا اور کسی نہ کسی گن گیان کا مالک ہونا ضروری تھا۔ احمد مشتاق ایک بہت اچھے غزل گو ہیں۔ ناصر کاظمی سے ان کی دوستی کی بنیاد ان کی شاعری تھی۔ ناصر کاظمی سے احمد مشتاق کی ملاقات ان دنوں میں ہوئی جب بقول ناصر کاظمی:

> "لاہور کی راتیں جاگتی تھیں۔ جہاں اب نئی آبادیاں بس گئی ہیں وہاں ہرے بھرے جنگل تھے۔ واپڈا ہاؤس کی جگہ میٹرو ہوٹل تھا۔ جہاں رات گئے تک شہر کے زندہ دل جمع ہوتے تھے۔ اسمبلی کے سامنے ملکہ کے بت کے چاروں طرف درختوں کی سبھا تھی جو دائرے بنا کر رات بھر ناچتے تھے اور آتے جاتے مسافروں کو اپنی چھاؤں میں لوریاں دے کر سلاتے تھے۔ سڑکوں پر کوئی کوئی موٹر نظر آتی تھی۔ تانگے تھے اور پیدل چلنے والی مخلوق۔ نہ رائٹرز گلڈ تھی نہ آدم جی اور داؤد پرائز تھے اور نہ غیر ملکی وظائف۔ جس

طرح قیام پاکستان کے وقت سرکاری دفتروں میں جدید قسم کا آرائشی سامان نہ تھا۔ بس چند پنسلیں اور چند بے داغ کاغذ تھے اور بابائے قوم کا ذہن اور پوری قوم کا عزم تھا۔ اسی طرح ادیبوں کے پاس نہ کاریں تھیں نہ فرج اور ٹیلیویژن سیٹ۔ نہ بڑے ہوٹلوں کے بل ادا کرنے کے لئے رقم تھی۔ ان کی جیب میں چند آنے اور ایک معمولی سا قلم ہوتا تھا اور ایک کاغذ پر تازہ تحریر ہوتی تھی۔

یار سب جمع ہوئے رات کی تاریکی میں
کوئی رو کر تو کوئی بال بنا کر آیا۔"۳۰

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب محبتیں تروتازہ اور دوستیاں جوان تھیں۔ محبت اور خلوص کی دولت عام تھی۔ مفاد پرستی، منافقت اور لالچ نے ابھی دلوں میں راہ نہیں پائی تھی۔ بے سرو سامانی کے عالم میں خلوص و وفا کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتا ہے۔ ادیبوں میں کسی طرح کی کوئی گروہ بندی نہیں تھی۔ کیونکہ یہ گروہ بندیاں اور جتھے بازیاں تو اس وقت پیدا ہوئیں جب ادیبوں کے مفادات زیر بحث آئے اور رائٹرز گلڈ جیسے ادارے قائم ہوئے۔ جب ادیبوں کو نوازنے کے لئے انعامات جاری کئے گئے۔ اس وقت تو ادیبوں کے پاس اشیائے تعیش کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ نہ وہ بڑے بڑے ہوٹلوں میں بیٹھ سکتے تھے۔ جیب میں چند آنے کی معمولی ریزگاری اور ہاتھ میں معمولی سا قلم۔ اور اس قلم سے لکھا جانے والا ایک ایک حرف معتبر تھا اور سچے خلوص کی علامت تھا:۔

"رات کی خاموشی میں جمع ہونے والے یہ ہم عصر اپنی آنکھوں میں رفتگاں کے خواب اور مستقبل کا سورج لے کر گھر سے نکلتے تھے اور لاہور کے چائے خانوں، کتب خانوں اور گلیوں میں ستاروں کی طرح گردش کرتے نظر آتے تھے۔ مگر ان کی روش نئے ادب کے معماروں اور مشاعرے کے شاعروں سے الگ تھی۔ یہ تنہائی میں چھپ کے رو لیتے تھے۔ مگر رقت بھری رومانی تحریریں نہیں لکھتے تھے۔ نہ بال بکھرا کر محفل ادب میں آتے تھے۔"۳۱

ان سطور میں ناصر کاظمی نے اس دور کے ادب کی پوری صورت حال بیان کر

دی ہے۔ "آنکھوں میں رفتگاں کے خواب اور مستقبل کا سورج" دو خاص رویوں اور رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس دور میں لکھا جانے والا ادب ماضی کی یادوں اور مستقبل کے خوابوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ ناصر کاظمی کے ہم عصروں اور خاص طور پر ان کے قریبی دوستوں کے ہاں یہ موضوعات اور ایک مشترکہ احساس کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ یہ یاد ان کے ہاں ایک قیمتی سرمایہ ہے جس نے ماضی کے ساتھ ان کا رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ وہ ماضی جسے وہ ہجرت کے نتیجے میں اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ چنانچہ ناصر کاظمی کی غزل ہو یا انتظار حسین کا افسانہ یہ ناسٹلجیا اپنی پوری توانائی کے ساتھ اس دور کے ادب میں موجود ہے۔ ناصر کاظمی کے ہاں "بال بکھرا کر محفل ادب میں آنا" ایک ایسی رومانیت ہے جو ادیب یا شاعر کے باطنی انتشار کو ظاہر کرتی ہے۔ جس کے نتیجے میں رقت بھری رومانی تحریریں ہی لکھی جا سکتی ہیں۔ تنہائی میں چھپ کے رونا اور بات ہے۔ کہ یہ رونے والے کا کیتھارسس ہے جس کے بعد وہ ایک منضبط اور مرتب شخصیت کو لے کر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ ناصر کاظمی کی محفلوں میں آنے والوں کی ایک خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ ان کے ہاں ایک خاص نوع کی ترتیب اور انضباط موجود تھا جس کی وجہ سے ان کی تحریریں اتھلے پن کا شکار نہیں ہوئیں بلکہ بھرپور معنویت اور گہرائی لئے ہوئے تھیں۔ اس حوالے سے احمد مشتاق کا تعارف ایک پکے اور تجربہ کار شاعر کا تعارف ہے۔ جس کی شاعری میں گہری معنویت اور نئے پن کا احساس ملتا ہے۔

"انہی دنوں ایک لڑکا مجھے ایک چائے خانے میں نظر آیا۔ جس کی آنکھوں میں بیداری کی تھکن اور مستقبل کے خواب تھے۔ سفید قمیض سفید شلوار پہنے ہوئی تھا اور وہ بال بنا کر آیا تھا

اجنبی رہزنوں نے لوٹ لئے
کچھ مسافر ترے دیار سے دور

جب میں نے اس سے یہ شعر سنا تو یوں لگا جیسے یہ میری اپنی کہانی ہے احمد مشتاق سے میری دوستی کی بنیاد یہ ہے کہ وہ گھر سے ایک شاعر کا دل لے کر آیا تھا۔

اب رات تھی اور گلی میں رکنا
اس وقت عجیب سا لگا تھا

یہ گلی، جس میں چند ہم عصر چلتے چلتے رک کر ایک جگہ ملے تھے، قیام پاکستان کے بعد ایک نئے طرزِ احساس کی علامت ہے۔"۳۲

گویا ناصر کاظمی، اس وقت احمد مشتاق کی شاعری میں مستقبل کے امکانات دیکھ رہے تھے جب وہ بال بنا کر پہلی بار ان کی محفل میں آیا تھا۔ اور اس کے ایک شعر ہی سے انہوں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ یہ تو میرے ہی قبیلے کا شاعر ہے اور اس کی کہانی میری اپنی کہانی ہے۔ درج بالا اقتباس میں ناصر کاظمی نے جو دو شعر درج کئے ہیں ان کے موضوع، اسلوب اور خیال پر غور کر لیجئے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ ناصر کاظمی ہی کے تجربے کی بازگشت ہے جو ہم ان شعروں میں سن رہے ہیں۔ ساٹھ کی دھائی کے آغاز میں ناصر کاظمی کی اثر پذیری خاصی عام رہی۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

"غزل کے لہجے کو اور زیادہ نجی اور نرم و نازک بنانے میں کوئی ہندوستانی شاعر اتنا کامیاب نہیں ہوا، جتنا پاکستان کا ناصر کاظمی ۔۔۔۔ناصر کاظمی کے ہاں غزل کی علامتوں کی محدود دنیا سے نکل کر شہروں کے کوچہ و بازار، گلیوں اور پارکوں کی زندگی اور متوسط طبقے کی بے قراری اور درماندگی سے نئی شعری فضا تیار کرنے کا حوصلہ ہے۔"۳۳

چنانچہ احمد مشتاق کی شاعری اگر ناصر کاظمی کی اپنی کہانی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے ہاں ناصر کے اثرات اپنے تمام حوالوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ناصر کاظمی، اپنے مختصر مضمون میں ان کی شاعری کو نئے طرزِ احساس کی علامت قرار دیتے ہیں۔ یہ وہی طرزِ احساس ہے جس کی طرف ڈاکٹر محمد حسن نے اشارہ کیا ہے۔

اپنے ہم عصروں کے بارے میں ناصر کاظمی کے مضامین کے سلسلے کا دوسرا مضمون "شہری فرہاد" ہے جو سجاد باقر رضوی کی شاعری پر لکھا گیا۔ یہ مضمون سجاد باقر رضوی کے پہلے شعری مجموعہ "تیشہ کرب" میں دیباچے کے طور پر شامل ہے۔ اور اس پر ۲۹ جنوری ۱۹۶۸ء کی تاریخ درج ہے۔ سجاد باقر رضوی ایک بلند پایہ استاد، شاعر اور نقاد تھے۔ ٹی ہاؤس کی ادبی محفلوں کی جان تھے اور ناصر کاظمی کے قریبی دوستوں میں شمار

ہوتے تھے لیکن شاعری کے معاملے میں وہ ناصر کاظمی کے طرز احساس سے اختلاف رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ احمد عقیل روبی کے اس بیان سے ہوتا ہے:

"مجھے ایک دن دوستوں میں گھرا دیکھ کر سجاد باقر رضوی کہنے لگے، لاہور کے گنبد بے در میں جتنی چاہے خاک اڑاؤ مگر ناصر کاظمی سے بچ کر رہنا۔ اس کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔" ۳۴

سجاد باقر رضوی کا اشارہ اسی طرز احساس کی طرف تھا کہ جو بھی ناصر کاظمی کے قریب آیا وہ ان کے اثرات سے بچ ہی نہیں سکتا۔ شاعری میں وہ نئی نسل کا مقدر تھے اور اپنے عہد کی پوری نسل کو حیرت انگیز طور پر اپنے حلقہ اثر میں لئے ہوئے تھے۔

سجاد باقر رضوی پر ناصر کاظمی کا یہ مضمون جہاں سجاد باقر رضوی کی شاعری کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے وہاں ناصر کاظمی کے دیانت دارانہ نقطہ نظر کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ انہوں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ ایک غیر جانبدارانہ نقاد کا کردار ادا کرتے ہوئے اس مضمون میں شاعر موصوف کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے اور اس کے محاسن و معائب کو جرات مندی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ مضمون کی ابتدائی سطور میں باقر صاحب کا تعارف کس خوش اسلوبی سے کراتے ہیں کہ ان کی شخصیت پورے طور پر نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

"آج سے سات آٹھ سال پہلے باقر صاحب کو میں نے لاہور کے ایک قہوہ خانے میں دیکھا تھا کہ چند نوجوانوں کی حلقے میں بے تکان بولتے چلے جا رہے ہیں اور نوجوان یوں سہمے ہوئے بیٹھے ہیں جیسے مرغی کے بچے بادل کی گرج سے سہم جاتے ہیں۔ قہوہ خانوں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی مگر وہ اپنی آواز کے سحر میں گم مسلسل بولتے جاتے۔ جب تعارف ہوا تو انتظار حسین کے ماتھے پر ایک بھنور سا بن گیا اور ہونٹوں کے نیچے ہنسی کی ایک لکیر دوڑتی نظر آئی پھر معلوم ہوا وہ انگریزی کے استاد ہیں، شاعر ہیں اور کرار حسین صاحب اور عسکری صاحب کے شاگرد ہیں۔ لیکن انتظار حسین کے ماتھے کی گرہ نہ کھلی

باقر سے مل کر آپ نے صورت تو دیکھ لی

اب دل میں آ کے حسن طبیعت بھی دیکھئے

پہلی ہی ملاقات میں باقر صاحب سے اپنی ٹھن گئی۔ ان کی دھواں دھار تقریر سن کر کسی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں، کوئی دیوار کی طرف منہ پھیر لیتا، کوئی تاؤ کھاتا اور کوئی صبر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا مگر باقر صاحب کی تقریر جاری رہتی۔۔۔ ۳۵

درج بالا سطور بالکل خاکے کے انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ایسا شاندار اسلوب ہے کہ پڑھنے والا فورا متوجہ ہوتا ہے اور مضمون کا باقی حصہ پڑھنے کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلیتا ہے۔ ناصر کاظمی کے تمام مضامین میں آپ کو یہ خوبی نظر آئے گی کہ وہ اپنے مضمون کا ابتدائیہ تحریر کرنے کے لئے خاصا اہتمام کرتے ہیں اور Catching lines کو امکانی حد تک دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کی فوری توجہ حاصل کی جا سکے۔ چنانچہ زیر نظر مضمون کا آغاز بھی انہوں نے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ اس پیراگراف میں وہ نقاد کم اور خاکہ نگار زیادہ نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ابتدائی سطور میں ہی سجاد باقر رضوی کی پوری شخصیت کو سمیٹ کر ان کے استادانہ پہلو کو نمایاں کر دیا ہے۔ اور ان کی شخصیت کے بارے میں انتظار حسین سمیت دیگر شرکاء محفل کے تاثرات بھی پیش کر دیئے ہیں۔ ناصر کاظمی کا چٹکی لینے کا انداز بھی خوب ہے۔

"پروفیسر صاحب جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو مجمع پر پوری طرح لاٹھی چارج کر کے ہی سانس لیتے ہیں۔" ۳۶

اس ایک جملے میں انہوں نے سجاد بار رضوی کے "انداز گفتگو" کو "لاٹھی چارج" کہہ کر بیک وقت مقرر اور سامع کے باہمی "ربط" کو نمایاں کر دیا ہے۔ اور پھر یہ جملے دیکھئے:

"قصہ کوتاہ ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ جان ناتواں لاہور کی ادبی محفلوں میں در آئی اور اب تو شہر شہر باقر صاحب کے مداحوں اور شاگردوں کا ایک لشکر موجود ہے لیکن اس کا کیا کیجئے کہ شاعر کا پیٹ کسی طرح نہیں بھرتا۔۔۔۔

کشت ہستی تو مجھے پہچان تیری آس ہوں

میں وہ بادل ہوں جو اب تک ٹوٹ کر برسا نہیں۔۳۷

سجاد باقر رضوی دبلے پتلے کوتاہ قد کی مالک شخصیت تھے۔ ان کے بارے میں جان ناتواں کی ترکیب معنی خیز ہے اور پھر ان کے شعر کے حوالے سے یہ کہنا کہ شہر شہر ان کے مداحوں اور شاگردوں کا ایک لشکر موجود ہے لیکن اس کے باوجود شاعر کا پیٹ کسی طرح نہیں بھرتا' شاعر کے مستقبل کے بھرپور امکانات کی طرف اشارہ ہے۔

اس مضمون میں ناصر کاظمی نے سجاد باقر رضوی کو دو حیثیتوں سے پیش کر کے ان کے فن پر جامع اور مکمل تبصرہ کیا ہے۔ ایک نقاد کی حیثیت سے اور دوسرے شاعر کی حیثیت سے۔ ان کی نقادانہ حیثیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"باقر صاحب نرے غزل گو ہی ہوتے تو نقاد انہیں کب کے ٹھکانے لگا چکے ہوتے لیکن انہوں نے ایک ہزار داستان بھی پال رکھی ہے جو شاعری اور سامعین کے درمیان سفارت کا کام کرتی ہے۔ ہماری پرانی داستانوں کے جنات کی جان کسی طوطے کے جسم میں قید ہوتی ہے اور ان داستانوں کے شہزادے اس طوطے کو قابو میں لانے کے بعد ہی اپنے من کی شہزادی کو جن کی چنگل سے رہا کرانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مگر باقر صاحب کی ہزار داستان ہوشیار نکلی کہ نقاد اسے قابو میں نہ لا سکے۔ اب اگر باقر صاحب کا یہ قول مان لیا جائے کہ تنقید شاعری اور علوم کے درمیان سفارت کا کام کرتی ہے تو ہمارے ان نقادوں کا پنجرا ہو جاتا ہے جو "دریں چہ شک" کہ رٹ سے آگے نہیں بڑھتے۔ باقر صاحب کی ہزار داستان اپنے فریضے میں کہاں تک کامیاب ہے' اس کا فیصلہ تو عسکری صاحب ہی کو کرنا چاہئے۔ میں یہاں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ شاعر کی شاعری اور اس کے نظریات کی ملاقات کسی مقام پر تو ہونی چاہئے۔"۳۸

قیام پاکستان کے بعد جن نقادوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے تنقیدی ادب میں اہم مقام حاصل کیا ان میں سجاد باقر رضوی کا نام بھی آتا ہے۔ ناصر کاظمی ان کی تنقید کو "ہزار داستان" کا نام دیتے ہیں کہ تنقید کے حوالے سے وہ محمد حسن عسکری کے دبستان سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے اردو تنقید میں ایک موثر اور فعال کردار ادا کیا اور

اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے ہزارہا مباحث پیدا کیے۔

"بقول "انسان اور آدمی" کے ناشر کے ' ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک اردو ادب میں جو بھی شوشہ شروع ہوا' عسکری نے شروع کیا اور جو بھی بحث چلی عسکری کے کسی مضمون سے چلی۔ اس وقت سے لے کر آج تک عسکری کے بارے میں کہے ہوئے جستہ جستہ فقرے جمع کیے جائیں تو شاید عسکری کے مضامین سے بھی بڑی ایک لائبریری بن جائے گی۔" ۳۹ے

ناصر کاظمی نے سجاد باقر رضوی کو عسکری صاحب کا شاگرد لکھا ہے اور ان کی تنقید میں کامیابی کا فیصلہ بھی عسکری صاحب ہی پر چھوڑا ہے۔ تاہم انہوں نے سجاد باقر رضوی کے اس خیال کو موضوع بحث بنایا ہے کہ تنقید شاعری اور سامعین کے درمیان سفارت کا کام کرتی ہے۔ اس سلسلے میں سجاد باقر رضوی کا نقطہ نظر ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

"تنقید کو مروجہ علوم اور فن کے درمیان سفارت کی خدمت انجام دینی ہے۔ تخلیقی فنون سے بے نیاز ہو کر علوم بنجر تعصبات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ علوم سے بے نیازی برت کر تخلیقی فنون انتشار' لامعنویت اور سستی جذباتیت' کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ جب علوم اور فنون کے درمیان رابطہ قائم نہ رہے تو علوم پھپھوند اور فن جھاگ بن جاتا ہے اور وہ معنویت جو علم' فن اور زندگی کے مثلث سے پیدا ہوتی ہے' ختم ہو جاتی ہے۔" ۴۰ے

ناصر کاظمی کا موقف یہ ہے کہ شاعر کی شاعری اور اس کے نظریات کی ملاقات کسی مقام پر تو ہونی چاہیے اس سلسلے میں وہ میر' غالب' حالی اور فراق کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انہوں نے شاعری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا عکس ان کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ ان کے خیال میں شاعر اپنے نظریات کو مسلسل تجربات' مشاہدات اور مطالعے کے بعد مرتب کرتا ہے اور شاعری میں انہیں ذائقہ بنا دیتا ہے۔ شاعر کا مطالعہ اور اس کے نظریات خام لوہے کی طرح ہوتے ہیں جو شعر میں دم شمشیر بن کر اپنے جوہر دکھاتا ہے۔

ناصر کاظمی کے بقول

سجاد باقر رضوی کے نظریات سے اختلاف کی گنجائش تو ضرور ہو سکتی ہے
لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنے ادب کو اس کی
تہذیبی رشتوں اور اپنے عہد کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی سنجیدگی
کے ساتھ کوشش کی ہے۔ ان کے نظریات کا نچوڑ یہ ہے کہ معاشرے میں
تخلیقی رویئے ہونے چاہئیں اور تخلیقی رویے پوری ذات کو منظم کئے بغیر
ناممکن ہیں۔ یہ کام تو پوری طرح ایک بڑا شاعر ہی کر سکتا ہے تاہم باقر
صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ معاشرتی اقدار کا شعور شاعر کی شخصیت کو منظم
کرتا ہے اور اس تنظیم کو وہ تخلیقی رویہ کہتے ہیں۔ اور تیزی کے ساتھ
بدلتے ہوئے معاشرے میں زندگی کے لئے یہ رویہ ضروری ہے۔"[۴۱]

سجاد باقر رضوی کی شاعری کے حوالے سے ناصر کاظمی نے معروضی انداز میں
بات کرتے ہوئے اس تخلیقی رویئے کا احساس ان کی غزل میں دریافت کیا ہے۔ ان کے
نزدیک شاعرانہ احتجاج سجاد باقر رضوی کی غزل کا ایک اہم عنصر ہے جو بنجر ذہنوں کو
تخلیقی سرگرمیوں کی راہ میں حائل ہوتے دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں اس نوع
کے اشعار جابجا موجود ہیں جن میں زندگی کے بنجرپن کا احساس تلخ تر ہو جاتا ہے اور بنجر
معاشرے کی اندھی، گونگی اور بہری مخلوق کے دل و دماغ کی مہریں توڑنے کے لئے وہ
خطیب بن جاتے ہیں۔ مگر یہی خطابت جب خود ستائی کی سطح پر آتی ہے تو وہ خود شکنی
کرتے ہیں اور انا کا شعور انہیں شکست کا احساس دلاتا ہے۔ تنہائی اور شکست کا احساس
آدمی کو انتہا پسند بنا دیتا ہے مگر یہی احساس شاعر کی تنظیم ذات کا ذریعہ بھی بن سکتا
ہے۔

ناصر کاظمی، سجاد باقر رضوی کو معاشرے کا شاعر قرار دیتے ہیں جو اپنی صلاحیتوں
کو ایک ایسے مرکز پر لے آتے ہیں جہاں عقل اور جذبہ باہم آمیخت ہو جاتے ہیں۔

"ان کے اشعار میں جذبہ، عموماً عقل کے بھیس میں سامنے آتا ہے۔ اس
صورت میں وہ میر کے بجائے غالب کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ ناصر
کاظمی کے نزدیک غالب کا کلام ایک عقل مند باپ کا سایہ ہے اور باقر
صاحب مصائب کی دھوپ میں اسی سائے کی پناہ لیتے ہیں۔ لیکن غالب کا

سایہ ایک ایسے جن کا سایہ ہے کہ اگر شاعر ذہین نہ ہو تو اسے حواس باختہ کر دیتا ہے۔ یا عقل محض بنا کر اسے ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ چنانچہ باقر صاحب اس سائے سے بچ کر غالب شکن یاس یگانہ چنگیزی کے پینترے کو اپناتے ہیں اور اپنی انا کی پیاس بجھاتے ہیں۔" ۴۲ ؎

ایک شاعر کے لئے شاعری' زندگی کا چلن ہے' ایک طریق زندگی ہے۔ اسی لئے وہ کسی نظریے کو آخری طور پر قبول نہیں کرتا۔ ناصر کاظمی کے نزدیک شاعر کی تقدیر اپنے آپ کو خرچ کرتے رہنا ہے۔ اس مسلسل خرچ ہوتے رہنے میں زندگی کی کامیابیاں حاصل کرنا عبث ہے۔ البتہ اس سے شاعر کے فکر و احساس کی تنظیم ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک شاعر کے لئے یہ کلیہ وضع کیا ہے کہ جہاں وہ خرچ ہوتا دکھائی دے وہاں وہ شاعر ہے اور جہاں وہ کامیاب ہوتا نظر آئے وہاں اسے شک کی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ شاعر کے ہاں کامیابی کا تصور محال ہے کیونکہ وہ تو ہجر کی راتوں کا قرض چکاتے چکاتے زندگی گزار دیتا ہے اور وصل کے لمحے اسے زندگی بھر نصیب نہیں ہوتے۔ ناصر کاظمی اس صورت حال کو سجاد باقر رضوی کی شاعری پر منطبق کرتے ہیں:

"باقر صاحب کے ذہن پر ہجر کی راتوں کے قرض کا احساس شاید اس قدر شدید ہے کہ ان کی دنیا میں فطرت کے خوب صورت فرشتے نہیں اترتے۔ رات' چاند' ستارے' پرندے اور بدلتے موسموں کے رنگ ان کی غزل میں کہیں نظر نہیں آتے۔ بس ایک اندھیری رات ہے یا مصروف دن کے ہنگامے۔ جس کے بیان کے لئے انہوں نے آواز' گونج' سائے اور ہوا کی استعارے وضع کئے ہیں اور ان استعاروں کے پیچھے کراچی شہر کا ہنگامہ صاف سنائی دیتا ہے جہاں انہوں نے ہوش سنبھالا۔" ۴۳ ؎

لیکن کراچی جیسے صنعتی شہر کی ہنگامہ خیز زندگی کے درمیان محبوب کی گلی بھی ہے جہاں شاعر کا شعور اور وقت کا بے چین دھارا سکون حاصل کرنے کے لئے تھوڑی دیر کو ٹھہر جاتے ہیں۔ چنانچہ ان پر سکون لمحات نے سجاد باقر رضوی سے ایسے اشعار بھی کہلوائے ہیں۔ جن میں معصوم جذبات ہیں' حسن و عشق کے معاملات ہیں اور پرانی داستانوں کی فضا ہے۔ اس حوالے سے شاعر نے آواز' رنگ حنا اور خوشبو کو علامتوں

کے طور پر استعمال کر کے غزل میں ایک لطیف سمت کا اضافہ کیا ہے اور کلی کے پھول بن جانے تک مختلف مراحل کو تخلیقی عمل کا استعارہ بنایا ہے۔

چٹکا جو دل تو مثل گل تر بکھر گیا
خوشبو صبا کے ساتھ تھی نغمہ صدا کے ساتھ

ہوں بند خیالوں میں کہ جوں پھول میں خوشبو
آزاد روی میں صفت موج صبا ہوں

فنی اعتبار سے سجاد باقر رضوی کی غزلوں پر گفتگو کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"فنی اعتبار سے ان کی غزلوں میں جو چیز ہمیں سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ ہے، لفظوں کا آہنگ اور اشعار میں ان کی موزوں نشست۔ شاعر کا اپنا ذخیرہ الفاظ ہے اور یہ الفاظ مطالب و معانی کی امانت کو بلا تاخیر قاری کے ذہن تک پہنچا دیتے ہیں۔ البتہ بحور کی تعداد محدود ہے۔ پھر چھوٹی بحروں کی کمی کا شکوہ تو مجھے بھی رہے گا۔ میر صاحب کی طویل بحر میں ان کے قدم پوری طرح نہیں جمتے۔ وہ شاید اس لئے کہ وہ شعوری طور پر غالب کے پیرو ہیں۔" ۴۴

ظاہر ہے سجاد باقر رضوی کے خطابیہ، بلند آواز اور اجتماعی آہنگ کے لئے چھوٹی بحریں کام نہیں دے سکتی تھیں۔ ناصر کاظمی چونکہ خود دھیمے لہجے کے شاعر تھے اور چھوٹی بحروں سے خاصے مانوس تھے۔ اس لئے سجاد باقر رضوی سے ان کا یہ شکوہ بالکل بجا ہے کہ انہوں نے چھوٹی بحریں بہت کم استعمال کی ہیں۔ اسی طرح جہاں تک میر کی طویل بحروں میں ان کے قدم نہ جمنے کا سوال ہے تو اس کا جواز انہوں نے خود فراہم کر دیا ہے کہ یہ پیروی غالب کا نتیجہ ہے۔ سجاد باقر رضوی کے خطابیہ انداز کا جواز پیش کرتے ہوئے انہوں نے بڑی پتے کی بات کی ہے کہ چونکہ ان کا مخاطب آدمی ہے اس لئے زور خطابت ان کے کلام کا جزو اعظم بن گیا ہے اور ان کے ہاں ابہام کے پردے اور زبان و بیان کی باریکیاں نہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ یہ چیزیں زور خطابت کے ساتھ نہیں چل سکتیں۔ ناصر کاظمی، سجاد باقر رضوی کو شاعروں کے اس قبیلے کا ایک فرد سمجھتے

ہیں جس نے محنت اور جانفشانی کو ایک تخلیقی رویہ بنانے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔

"وہ شہری فرہاد ہیں اور زندگی کا پہاڑ کاٹنا ان کا پیشہ ہے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے مجموعہ کلام کا نام "تیشہ لفظ" رکھا ہے۔ اور تیشے سے وہ اپنا سر پھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے کہ ان کی شیریں خود زندگی ہے۔" ۴۵ے

ناصر کاظمی کا زیر مطالعہ مضمون سجاد باقر رضوی کی ہزار داستان سے شروع ہو کر ان کے ہاتھ میں تھامے ہوئے لفظ کے تیشے پر ختم ہوتا ہے جس سے انہوں نے زندگی کا پہاڑ کاٹا ہے۔ ناصر کاظمی نے جس طور شاعر کے تخلیقی رویوں اور شعری نظریات کو نمایاں کیا ہے اس سے سجاد باقر رضوی کا فن اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے شاعر کی شاعری اور اس کے نظریات کی ملاقات کا اہتمام خوبی سے کیا ہے اور ان کی شاعری میں ان کے نظریات کا عکس دکھایا ہے کہ ان کے اس نقطہ نظر کی صداقت پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ "شاعر اپنے نظریات کو مسلسل تجربات، مشاہدات اور مطالعے کے بعد مرتب کرتا ہے اور شاعری میں انہیں ذائقہ بنا دیتا ہے۔"

اس مضمون کی روشنی میں ہم ناصر کاظمی کی تنقید کے بارے میں یہ ضرور کہیں گے کہ ان کا مقصد محض تاثر انگیزی یا شاعرانہ نکتہ آفرینی نہیں بلکہ تخلیقی عمل کی بازیافت ہے اور اس تخلیقی عمل کی بازیافت میں وہ اپنے تخلیقی شعور کو بروئے کار لاتے ہیں اور شاعر کے تجزیے اور توضیح میں ایک معروضی نقاد کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔

ناصر کاظمی کا ایک اور مضمون "کچھ شاد عارفی کے بارے میں" ان کی ناقدانہ صلاحیتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ مضمون ابتدا میں "نصرت" کے جنوری ۱۹۶۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ شاد عارفی، ناصر کاظمی سے ایک نسل پہلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بقول ناصر کاظمی:

"شاد عارفی تقریباً ۴۰، ۴۵ سال سے مشق سخن فرما رہے ہیں اور انہوں نے نظم کے ساتھ غزل بھی کہی ہے اور بڑے طمطراق اور سینہ زوری کے ساتھ۔ ایک طرف تو حسرت، فانی، اصغر، یگانہ، جوش، جگر، اثر اور فراق ان

کے ہم عصر ہیں اور دوسری طرف انہوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بھی بڑی ہنگامہ پرور نظمیں لکھیں۔" ۴۶ے

ناصر کاظمی نے اس مضمون کا آغاز بھی اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ وہ شاد عارفی کو اس الزام سے صاف بچا کر لے گئے ہیں کہ ان کے شعروں کے اردگرد جلے کٹے مکالموں کا ڈھیر لگا ہوتا ہے اور یہ کہ انہیں چاہئے کہ وہ فلموں کے مکالمے لکھا کریں۔ ناصر کاظمی کے بقول فاضل معترض نے اپنی دانست میں شاد صاحب پر پھبتی کسنے کی کوشش کی تھی مگر نادانستہ طور پر وہ ان کی تعریف کر گئے کیونکہ فلمی ادب لکھنے کے لئے مختلف قسم کی صلاحیتیں درکار ہیں۔ محض ایک سطح یا ایک مزاج کا لکھنے والا فلم میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ فلم ایک عوامی فن ہے اور عوام سے قبولیت کی سند وہی حاصل کر سکتا ہے جو عوام کے مزاج کو پوری طرح سمجھتا ہو اور اجتماعی شعور رکھتا ہو۔ گویا شاد عارفی عوام کے مزاج کو بخوبی سمجھتے ہیں اور ان کے ہاں اجتماعی شعور موجود ہے۔ تاہم ان کے کلام میں زبان و بیان کی خوبیوں کے باوجود ایک خاص قسم کی عمومیت اور پھکڑ پن ہوتا ہے جو غزل کے مزاج پر گراں گزرتا ہے۔ ناصر کاظمی نے شاد عارفی کو بنیادی طور پر نظم کا شاعر کہا ہے اور نقادوں کی اس بات سے اختلاف کیا ہے کہ نفرت کا جذبہ ان کی تحریروں میں جزو اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ اس بات کو انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ ان کا کلام پڑھ کر کہیں کہیں ماحول سے جھلاہٹ کا احساس ضرور پیدا ہوتا ہے۔

ان کے کلام میں سودا، نظیر اکبر آبادی، ذوق، داغ اور کسی حد تک اکبر الہ آبادی کی شاعری کے ذائقے موجود ہیں اور ان کے کلام سے وہی لوگ پوری طرح لطف اٹھا سکتے ہیں جنہوں نے اجتماعی زندگی کے نت نئے ذائقوں کا مزہ چکھ رکھا ہے۔

شاد عارفی کے اسلوب پر بات کرتے ہوئے ناصر کاظمی یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا اسلوب اظہار تار پر چلنے کے مصداق ہے۔ جس کے لئے برسوں کا ریاض اور ایک خاص قسم کی عوامی حس اور حوصلہ درکار ہے۔ اپنی نظموں میں تو وہ بکمال حسن و خوبی تار پر چل لیتے ہیں لیکن غزلوں میں وہ روایت میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

شاد عارفی کی غزلوں پر بات کرتے ہوئے ناصر کاظمی لکھتے ہیں:

"شاد عارفی کی غزلوں میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مختلف ذائقوں کے اشعار ہوتے ہیں۔ ان کے شعروں میں میٹھے آموں کے علاوہ کڑوے کسیلے اور ترش آموں کے ذائقے بھی ملتے ہیں۔ بعض لوگوں کو طنزیہ شاعری میں تغزل نظر نہیں آتا مگر بقول شاد "طنز نویسی کوئی عیب نہیں اور اگر ہے تو مجھے اس پر فخر ہے کہ آج میرا کوئی حریف نہیں۔" بہرحال اس فن میں ان کا کوئی حریف ہے یا نہیں' یہ تو ناقد حضرات جانیں۔ مجھے تو ان کی غزلوں کی ایک ادا یہ بھاتی ہے کہ ان میں روایت کی شیرینی کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کی تلخی بھی ہوتی ہے۔ دراصل ہمارے اکثر غزل گو فساد خون کے مرض میں مبتلا ہیں اس لئے شاد صاحب نے غزل کے خون میں ایک الگ مزاج کی تلخی سموئی ہے۔"۴۷

ناصر کاظمی نے اس بات کے باوجود' کہ شاد عارفی کو بعض لوگوں نے خاصا مطعون کیا ہے' ان کی پشت پر ہاتھ رکھا ہے اور ان کے بظاہر اینٹی غزل رویے کو محض اس بنا پر داد دی ہے کہ وہ ماحول کی اس تلخی اور زوال پذیر رجحان کو اجاگر کرتے ہیں جس سے ثقہ قسم کے بزرگ چشم پوشی کر جاتے ہیں۔ یہاں ہمیں ناصر کاظمی کے اس غیر متعصب رویے کا پتہ بھی چلتا ہے جو بعض شعری معاملات میں وہ روا رکھتے ہیں۔ قدیم اساتذہ اور ثقہ شاعروں کے برعکس وہ غزل میں بھی اس امر کی گنجائش باقی رہنے دیتے ہیں کہ اس میں حسن و عشق کے علاوہ ایسے موضوعات کو بھی جگہ دی جائے جو ہمارے سماجی اور تہذیبی رویوں سے جنم لیتے ہیں اور غزل جیسی طوطی مزاج صنف کے منہ سے بھاری بھرکم اور سنگلاخ الفاظ کہلوانے پر کوئی قدغن نہیں لگاتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غزل کے امکانات کو وسیع سے وسیع تر دیکھنا چاہتے ہیں اور اسے چھوٹی موٹی صنف کے بجائے ایک توانا اور طاقتور صنف بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں۔

شاد عارفی کی پسندیدگی کی وجہ ان کی روایت کے ساتھ وابستگی اور کلاسیکی شعرا سے استفادے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

ناصر کاظمی کے مجموعہ مضامین میں شامل ایک اہم مضمون "شخص اور عکس" میراجی کی نظموں کے حوالے سے ہے۔ یہ مضمون "ادب لطیف" کی فروری ۱۹۶۳ء کی

اشاعت میں شامل ہے۔ ہماری شاعری میں میرا جی کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے غیر ملکی شعرا کے مطالعے اور ترجمے سے جدید شاعری کے اصول وضع کئے اور جب حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ ہوئے تو نئے شعرا کی ادبی تربیت میں ان اصولوں کو حسن و خوبی سے استعمال کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ یورپ کی بیشتر ادبی تحریکیں مثلاً علامت نگاری، تاثریت، سرئیلزم وغیرہ میرا جی کی وساطت سے ہی اردو نظم میں داخل ہوئیں اور ان کے بیشتر نمونے میرا جی نے ہی فراہم کئے۔

> "میرا جی کی شاعری جس زمانے میں معروف ہوئی اس وقت ترقی پسند تحریک نے شاعری کا رخ واضح مقصدیت کی طرف موڑ دیا تھا۔ میرا جی نے چڑھتے سورج کی پوجا کرنے کے بجائے ان دھندلکوں کو قبول کیا جو صبح کے ملگجے اندھیرے یا غروب آفتاب کی مٹتی ہوئی روشنی سے ترتیب پاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مشاہدے کی سپاٹ تصویریں مصور کرنے کے بجائے ان نقطوں اور لکیروں کو جمع کیا، جن کے عقب سے روشنی چھنتی تو رنگوں کی جوالا پھوٹ پڑتی۔ میرا جی علامت، استعارہ اور تمثال کے شاعر تھے۔ انہوں نے بات کو پھیلانے کے بجائے سمیٹنے کی کوشش کی اور معنی کو سطح پر بکھیرنے کے بجائے بیج کی طرح اسے پتیوں میں چھپا دیا۔"۴۸

گزشتہ ایک عرصہ کے دوران میرا جی پر خاصا کام ہوا ہے۔ ان کی شاعری کی نئی جہتیں اور نئے زاویے سامنے آئے ہیں۔ ان کی نظموں، گیتوں اور غزلوں کے حوالے سے ہم ایک ایسے شاعر سے متعارف ہوتے ہیں جو ایک عہد ساز شاعر تھا۔ ناصر کاظمی نے میرا جی کو ایک اور انداز سے دیکھا ہے۔ ان کے تصور میں ایک ایسے میرا جی کا نقش محفوظ ہے جو تین پہیوں کی سائیکل پر سوار ہیں انہیں دیکھ کر ناصر کاظمی کو اپنے بچپن کے دور میں محلے کے ایک ڈپٹی صاحب کا اکلوتا بیٹا یاد آ جاتا ہے جس نے بہت سے شوق پال رکھے تھے۔ ایک بار وہ تین پہیوں کی سائیکل چلا رہا تھا۔ تین پہیوں کی وہ سائیکل محلے میں عجوبہ تھی۔ محلے کے لڑکے اس تین پہیوں کی سائیکل پر ایسے ریجھے تھے کہ سکول سے غائب ہو کر ڈپٹی صاحب کے لڑکے کے گرد اکٹھے رہنے لگے تھے اور کوئی سزا اور جرمانہ انہیں اس بات سے نہ روک سکا تھا۔

"میں میرا جی سے تقرب رکھنے والوں میں شامل نہیں ہوں مگر جب میں ان کا تصور کرتا ہوں تو مجھے تین پہیوں والی سائیکل کا خیال آ جاتا ہے۔ شاید میرا جی بھی تین پہیوں والی سائیکل لے کر اردو شاعری میں داخل ہوئے تھے۔ نوجوان ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ بزرگان ادب نے بہت احتجاج کئے۔ اردو کے معلموں نے بہت ناک بھوں چڑھائی۔ مگر نوجوانوں پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا۔"۴۹

نئے نوجوانوں نے میرا جی کی تین پہیوں والی سائیکل کو ایک عجوبہ سمجھا اسے دیکھنے کے لئے میرا جی کے گرد جمع ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ناصر کاظمی کے محلے کے بچے ہر شے سے بے خبر ہو کر ڈپٹی صاحب کے اکلوتے فرزند کی تین پہیوں والی سائیکل کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ بچہ ہر نئی شے کو تحیر کے عالم میں دیکھتا ہے اور اس میں اتنا محو ہوتا ہے کہ پھر اسے اپنے گرد و پیش کی کوئی خبر نہیں رہتی یہاں تک کہ کھانا پینا بھی بھول جاتا ہے۔ چنانچہ میرا جی کے گرد جمع ہونے والے نئے نوجوانوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ میرا جی ایک نیا خیال لے کر شاعری کی دنیا میں وارد ہوئے تھے۔ اس نئے خیال نے نوجوانوں کو ایسا رجھایا جیسے تین پہیوں والی سائیکل بچوں کو رجھاتی تھی۔

"نیا خیال نوجوانوں کی دنیا میں کبھی کبھی یوں آتا ہے جیسے کسی پرانے قصبے کے محلے میں تین پہیوں والی سائیکل آ جائے۔"۵۰

میرا جی نے نوجوانوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے جو نیا خیال پیش کیا اس کی وضاحت گزشتہ سطور میں کر چکے ہیں۔ یہاں "حلقہ ارباب ذوق" کے حوالے سے میرا جی کی شخصیت کا ایک دوسرا پہلو بھی قابل توجہ ہے۔ یونس جاوید لکھتے ہیں:

"یوں تو میرا جی کی شخصیت کے بارے میں بہت سی باتیں سامنے آ چکی ہیں مگر ان بہت سی باتوں سے الگ بھی میرا جی کی ایک تصویر حلقے کے توسط سے سامنے آتی ہے۔ میرا جی جب تک حلقے میں شریک نہ ہوئے تھے، حلقہ اپنی روایتی شان اور جوش و خروش کے باوجود پھیکا اور ست نظر آتا ہے۔ لیکن جونہی میرا جی حلقے میں شریک ہوتے ہیں ان کی شخصیت اور شاعری

دونوں حلقے پر تیزی سے اثر انداز ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ میرا جی ہی تھے جن کی وجہ سے حلقہ ارباب ذوق میں ایک تحریک پیدا ہوئی اور دوسرے ادیب و شاعر اس تحریک میں شریک و معاون ہوتے چلے گئے۔ ان کی دلچسپ و منفرد شخصیت تھی یا ان کی شاعری کا اثر تھا۔ بہرحال حلقے کی کارروائیاں اس بات کی واضح طور پر نشاندہی کرتی ہیں کہ بہت جلد وہ حلقہ ارباب ذوق میں ایک بنیادی اہمیت رکھنے والی شخصیت قرار پا گئے۔"۔۵۱

ان سطور سے میرا جی کی' بقول ناصر کاظمی' تین پہیوں والی سائیکل کا عقدہ کھلتا ہے۔ انہوں نے حالی کی طرح شہر میں سب سے الگ دکان کھولی جس میں گاہکوں کو رجھانے کے لئے بالکل نیا مال موجود تھا۔

"میرا جی نے وہ کلام کرنے کی ٹھانی جو اردو شاعری نے ابھی تک نہیں کیا تھا۔ اور اس کام کو اپنے ذمے لینے کے معنی تھے اردو شاعری سے بغاوت' اس کی تشبیہوں' استعاروں اور علامتوں کے ذخیرے سے انحراف' اس کی مروجہ تکنیکوں سے علیحدگی۔"۔۵۲

ناصر کاظمی کے نزدیک میرا جی نے بیک وقت دو کام کئے اور اس پر وہ تعجب کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ جس وقت وہ مغرب سے آئی ہوئی نئی تکنیک یعنی نظم آزاد کو برت رہے تھے' اسی وقت عہد قدیم کی ایک عورت مہارانی میرا بائی کی مالا بھی جپ رہے تھے۔ چنانچہ اردو شاعری کی روایت کے لئے جتنی نظم آزاد اجنبی اور نئی تھی' اتنی ہی عورت بھی اجنبی اور نئی تھی' نظم آزاد کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن اردو شاعری کی روایت کے لئے عورت کا اجنبی ہونا عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن ناصر کاظمی نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ میرا جی سے پہلے اردو شاعری میں عورت کی صفات کا تو ذکر ہے' عورت بنفس نفیس موجود نہیں ہے۔ کبھی عورت' عورت کا استعارہ بن کر آتی ہے' خود عورت نہیں ہوتی۔ میرا جی نے ہندی شاعری کی روایت اور فرانس کے شاعروں سے رجوع کیا۔ ہندی شاعری کی روایت میں عورت جسم و روح کے بہت سے مراحل طے کر کے آخر کار دیوی بن جاتی ہے جبکہ فرانس کے شاعروں کے یہاں عورت اپنے جسم کے ساتھ قائم رہنے پر اصرار کرتی ہے۔ بقول ناصر کاظمی شاید میرا جی کو یہ

احساس تھا کہ ان دونوں روایتوں میں عورت اپنی روح اور جسم کے ساتھ پوری طرح چھب نہیں دکھاتی۔ چنانچہ انہوں نے ان دونوں روایتوں کے تال میل سے عورت کو اپنے پورے ظاہر و باطن کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے عورت کے خارجی و باطنی مظاہر اجاگر کرنے کے لئے نئی علامتیں اور نئے اشارے وضع کئے چنانچہ ہم ان کی نظمیں پڑھتے ہوئے عورت کے مختلف روپ اور اس کی ساری لطافتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

"اختر شیرانی اور ان کے زیر اثر لکھنے والوں کی نظموں میں جب مناظر فطرت یا عورت کا تذکرہ آتا ہے تو ذہن میں بس ایک رنگین سی دھند چھا جاتی ہے۔ نظر کچھ نہیں آتا۔ لیکن میرا جی' مناظر فطرت ہوں یا عورت کا روپ ہو وہ انہیں زمینی استعاروں کے ذریعے پیش کرتا ہے اور اگر ان مراحل میں اس کی شخصیت کو پیش کرنا پڑ جائے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اس لئے ہم اس کی نظم پڑھتے ہوئے عورت کے روپ اور اس کی ساری لطافتوں اور کثافتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ چیزیں اور مناظر اس کے یہاں زندہ اور ٹھوس ہوتے ہیں۔ رنگینی کا کوئی غلاف انہیں دھندلاتا نہیں ہے۔" ۵۳

ترقی پسند نقاد' ڈاکٹر محمد حسن نے میرا جی کی شاعری کو سرگوشی اور ایمائیت کی آواز قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایمائیت میرا جی کا مخصوص ذریعہ اظہار ہے وہ علامتوں کے ذریعے جنس کے ٹیڑھے میڑھے تصورات کو پیش کرتے ہیں۔ بادل' سمندر' لباس' ٹیلہ' ان کے کلام میں مختلف جنسی اور نفسیاتی علامتوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا جی کا تصور حیات بڑی حد تک ہیجانی ہے اور ہیجانات کو اصل حیات قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے لئے زندگی کے بارے میں علم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ احساس اور ہیجان ہی ہے۔" ۵۴

ناصر کاظمی نے میرا جی کے ہاں عورت کی جن لطافتوں اور کثافتوں کا ذکر کیا ہے اور جنہیں میرا جی نے زمینی استعاروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ وہ یہی بادل' سمندر'

لباس اور ٹیلے کے استعارے ہیں جن کے ذریعے عورت کی جنسی اور نفسیاتی تحلیل ہمارے سامنے آتی ہے۔ میراجی اپنی شاعری کے اس رنگ کو بین الاقوامی سطح کی کشمکش کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نوجوانوں کے انتشار کا ردعمل قرار دیتے ہیں:

"موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش' سیاسی' سماجی اور اقتصادی حالت نے جو انتشار' نوجوانوں میں پیدا کر دیا ہے وہ بالخصوص میرا مطمح نظر رہا ہے اور آگے چل کر جدید نفسیات نے اس تمام پریشاں خیالی کو جنسی رنگ دے دیا۔"؎۵۵

بہرحال ناصر کاظمی نے میراجی کی نظموں کے حوالے سے بڑی خوبصورتی سے ان کے استعاروں اور تکنیک کی بات کی ہے لیکن وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ہمیں میراجی کے نرالے استعارے اور عجیب تکنیک اور انوکھا بہروپ یاد رہ گیا لیکن اس نے تین پہیوں والی سائیکل کا یہ حال ہے کہ اس کے پہیے تو اس کے بعض ہم نشینوں کے ورثے میں آئے اور خالی سائیکل کا ڈھانچہ نئے لڑکے گھسیٹ رہے ہیں۔ ناصر کاظمی کو سائیکل کے پہیے لے جانے والوں سے تو کوئی گلا نہیں کیونکہ پہیے مسلسل حرکت کی علامت ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں میراجی کے آدرش کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن کالی سائیکل کا ڈھانچہ گھسیٹنے والے لڑکے ناصر کاظمی کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ بلکہ وہ ان کا ذکر کرتے ہوئے خاصے تلخ بھی ہو جاتے ہیں۔:

"اب یہ ڈھانچہ ایک مقامی شہرت کا نظم نگار گھسیٹ رہا ہے۔ مقامی شہرت کے لوگوں پر لکھنے کے سلسلے میں مجھے ہمیشہ قباحت رہی ہے۔ جو شخص بادامی باغ سے آگے نہ جانا جاتا ہو اس کے متعلق بات بھی بادامی باغ ہی تک سمجھی جا سکتی ہے۔ مگر جب میر صاحب' بقاء اللہ خاں کا ذکر کرتے نہ شرمائے تو میں صفدر میر کا نام لینے میں کیوں حجاب کروں۔ یہ صاحب پہلے میراجی کو رجعت پسند شاعر کہتے تھے مگر جب انہیں اپنی ذاتی بقا کے لئے ترقی پسندوں سے ناطہ توڑنے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے میراجی کے "متولیوں" کے غیر مشروط طور پر بیعت کر لی اور فیض کو اردو ہلسو کا ایجنٹ بنا کر اور میراجی اور راشد کے گن گا کر وہ رسوخ پیدا کیا کہ انجم رومانی کے سیکریٹری

ہوتے ہوئے حلقہ کے جوائنٹ سیکریٹری بن گئے۔ اس وقت وہ ایک مضمون لئے جیب میں بہت دن اس فکر کے ساتھ پریشان پھرتے رہے کہ کسی محفل میں فیض صاحب ہوں اور وہاں دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا جائے اور آرٹ کونسل میں محفل بار بار جمی مگر جب یہ مضمون پڑھنے کا موقع آیا تو آندھی چل پڑی یا فیض صاحب نہیں آئے اور جب فیض صاحب کو لینن پرائز مل گیا تو ان کی عظمت کا صفدر میر پر پھر نقش قائم ہو گیا اور حلقہ ارباب ذوق' رجعت پسندوں کا اڈہ قرار پایا۔ سیم اور تھور پر نظمیں اور مقالے لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اگر اس کی تنخواہ بھی ملے اور اس کے راستے پاکستان کی تہذیبی اور مادی ترقی کا خدا خدا کر کے پتہ بھی چل جائے تو یہ ہم خرما و ہم ثواب والی بات ہے مگر قوت حافظہ کو سیم اور تھور نہیں لگنا چاہئے۔ آخر میراجی کو ترقی پسند ثابت کر کے صفدر میر کیا کمائیں گے۔ فیض صاحب تو صفدر میر کو پھر بھی شاعر نہیں مانیں گے۔"۵۶؎

درج بالا سطور پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی نے یہ سارا مضمون دراصل انہی سطور کے لئے لکھا ہے۔ انہوں نے یہاں جس انداز میں صفدر میر کی خبر لی ہے اور کسی طرح کی منافقت اور لگی لپٹی رکھے بغیر جس طرح کھلے عام میر صاحب کی طرح صفدر میر کا نام لینے میں بھی حجاب نہیں برتا وہ میراجی کے معاملے میں ان کے حساس پن کی دلیل ہے اور دوسری بات یہ کہ ناصر کاظمی ادب و شاعری کے معاملے میں نظریاتی ہیرا پھیری کے قائل نظر نہیں آتے۔ وہ ان لوگوں کے سخت خلاف ہیں جو ذاتی مفادات کے لئے اپنا بوجھ کسی ایک پلڑے میں نہیں رکھتے۔ زیر نظر سطور میں ناصر کاظمی کا طنزیہ اور کاٹ دار اسلوب اپنے جوبن پر دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے اپنے دیگر مضامین میں بھی ہلکی ہلکی چوٹیں کی ہیں لیکن وہ چوٹیں ایسی نہیں کہ جسم سہلانے کی ضرورت پیش آئے۔ ابتدا میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہ بادل نخواستہ یہ نام لے رہے ہیں کیونکہ مقامی شہرت کے لوگوں پر لکھنے کے سلسلہ میں انہیں ہمیشہ قباحت رہی ہے۔ صفدر میر کو مقامی شہرت کے حامل لوگوں میں شمار کر کے کہ جن کی شہرت باداہی باغ سے آگے نہیں جاتی' ناصر کاظمی نے انہیں انتہائی غیر اہم بنا دیا ہے۔ اور اس کی وجوہ

انہوں نے آگے چل کر تحریر کی ہیں۔ اور پھر مزید تازیانہ یہ لگایا ہے کہ معاوضے پر سیم اور تھور پر مضامین لکھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن حافظے کو سیم اور تھور نہیں لگنا چاہئے۔ اس سے زیادہ سخت بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ ناصر کاظمی کو میرا جی پر ستم کسی صورت گوارا نہیں۔ اگرچہ انہوں نے اسے ایک ضمنی بات قرار دیا ہے لیکن یہ اتنی بھی ضمنی نظر نہیں آتی۔ ظاہر ہے ان سطور پر رد عمل تو ضرور ہوا ہوگا لیکن ناصر کاظمی کی صاف گوئی کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ منہ پر بات کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور ادب کے معاملات کی نزاکت کو خوب سمجھ کر اس سلسلے میں کسی رو رعایت کے قائل نہیں ہیں۔ خاص طور پر جب وہ اپنا نقطہ نظر تحریری صورت میں پیش کر رہے ہوں۔ مضمون کا آخری پیراگراف میرا جی کے فن کو زبردست خراج تحسین کی حیثیت رکھتا ہے اور انہیں دیگر لوگوں کے مقابلے میں ایک سچے اور کھرے فنکار کے طور پر سامنے لاتا ہے:

> "میرا جی جب دیو مالا کا ذکر کرتا تھا تو اس کے پیش نظر پرانے ہندوستان کی پوری دیو مالا ہوتی تھی۔ یونانی دیو مالا پر رابرٹ گریوز کی کتاب پڑھ کر تو دیومالا کا عاشق نہیں ہوا تھا اور ایلیٹ کی نظم ویسٹ لینڈ اس نے بھی پڑھی تھی مگر اس کی شاعری کی جڑیں اپنی زمین کی روایت میں تھیں۔ چینی شاعری سے آشنا تھے مگر انہوں نے ادب کا محمد تغلق بننے کی کوشش نہیں کی۔ اصل میں میرا جی نے انگریزی میں ایم۔ اے نہیں کیا تھا اس لئے اسے کبھی ادب کا دارالسلطنت بدلنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ یوں وہ پیرس اور ماسکو دونوں شہروں سے آشنا تھا مگر خود پنجاب میں رہنا پسند کرتا تھا اور سچ پوچھو تو پنجاب کی دھرتی میرا جی کے گیتوں ہی میں نظر آتی ہے۔ خیر وہ تو شاعر تھا' لکھتا تھا۔ تین پہیوں کی سائیکل پر بیٹھ کر علاقائی کلچر اور یونیسکو کلچر کے ڈانڈے نہیں ملاتا تھا اور تین پہیوں کی سائیکل پر سوار ہو کر لڑکوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے والوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ باتیں تو پیرس اور ماسکو کی کرتے ہیں مگر ان کا نام گلی سے باہر نہیں نکلتا۔" ۵۷

"شخص اور عکس" میں ناصر کاظمی نے میرا جی کی شخصیت کے جھمیلوں میں

پڑنے کے بجائے صرف ان کے فن سے بحث کی ہے۔ ان کی تین پہیوں کی سائیکل جہاں نئے خیالات اور نئی علامتوں کا استعارہ بنتی ہے وہاں ان کی شاعری کی تین جہتوں نظم، غزل اور گیت کی طرف اشارہ بھی اس میں موجود ہے۔ اس کی وضاحت ناصر کاظمی کے اس جملے سے ہوتی ہے کہ "میرا جی نے تین پہیوں والی سائیکل چلاتے چلاتے دو پہیوں والی سائیکل چلانی شروع کر دی اور نظم آزاد کو ملتوی کر کے کبھی غزل لکھی اور کبھی گیت۔" ناصر کاظمی نے اگرچہ مجموعی طور پر ان کے مکمل فن پر بات کی ہے لیکن حوالے کے طور پر وہ نظم ہی کو لے کر آئے ہیں۔ کیونکہ میرا جی کے فن کا بنیادی حوالہ نظم ہی بنتا ہے۔ انہوں نے آزاد نظم میں جو نیا پن اور بھرپور معنویت کا احساس اجاگر کیا ہے، ناصر کاظمی اس کی تہہ تک پہنچے ہیں۔ اور بڑے عالمانہ انداز میں ان کے فنی تجربوں کی اساس دریافت کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ میرا جی کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ "انہوں نے وہ کام کرنے کی ٹھانی جو اردو شاعر نے ابھی تک نہیں کیا تھا اور اس کام کو اپنے ذمے لینے کے معنی تھے اردو شاعری سے بغاوت، اس کی تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کے ذخیرے سے انحراف، اس کی مروجہ تکنیکوں سے علیحدگی۔" یہ بات اردو شاعری کے وسیع پس منظر اور عہد بہ عہد تناظر کے گہرے مطالعے کے بغیر کہی ہی نہیں جا سکتی۔

"حفیظ ہوشیارپوری" کے نام سے ناصر کاظمی نے مضمون ایک ایسے شاعر کا شخصی خاکہ ہے جس کے فن اور شخصیت دونوں سے ناصر کاظمی محبت رکھتے ہیں۔ ناصر کاظمی کا یہ واحد مضمون ہے جس میں وہ ایک مکمل خاکہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ اگرچہ بعض دیگر مضامین میں بھی جستہ جستہ پیراگراف اور جملے ایسے ہیں جو خاکہ نگاری کی حدوں کو چھوتے ہیں لیکن زیر نظر تحریر میں ان کی خاکہ نگاری کے جوہر خوب کھلے ہیں۔ خاکہ نگاری کے باب میں بے شمار نام ایسے آتے ہیں جنہوں نے اپنے دست ہنر شناس سے شخصیت کی پرتیں کھول کر اصل شخص سے متعارف کرانے میں بڑا کمال دکھایا ہے۔ فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، عبدالحق، منٹو، شاہد احمد دہلوی، اور کتنے ہی نام ایسے ہیں جنہوں نے اپنے قلم سے اس صنف ادب کو اعتبار بخشا ہے۔ ناصر کاظمی اگر دو چار خاکے اور لکھ لیتے تو شاید ان کا نام بھی خاکہ نگار کے طور پر ان ناموں

کے ساتھ لکھا جاتا۔ لیکن انہوں نے بوجوہ یہ شغل اختیار نہ کیا کہ شاعری کو ان کی زیادہ ضرورت تھی۔ لیکن حفیظ ہوشیارپوری پر خاکہ لکھ کر انہوں نے یہ ضرور باور کرا دیا کہ اس صنف لطیف پر بھی وہ کتنی دسترس رکھتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں عام طور پر جو چیزیں خاکہ نگار کو چھوٹا بڑا بناتی ہیں' وہ خاکہ نگار کا اسلوب' چہرہ نویسی کا فن اور موضوع خاکہ شخصیت کے محاسن و معائب کا بیان ہے۔ اب یہ خاکہ نگار پر منحصر ہے کہ وہ کہاں کہاں' کس کس انداز میں اپنے ہاتھ کی صفائی دکھاتا ہے اور موضوع خاکہ شخصیت کے ساتھ کیا سلوک برتتا ہے۔ وہ شخصیت کے ساتھ ہمدردانہ انداز اختیار کر کے حسن سلوک بھی کر سکتا ہے اور جارحانہ انداز اختیار کر کے بدسلوکی بھی برت سکتا ہے۔ لیکن ان دونوں طریقوں میں حقیقت اور سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ خرد کو جنوں اور جنوں کو خرد کہنے سے خود خاکہ نگار کا بھونڈا پن اور شخصیت سے عدم آشنائی ہی ظاہر ہوتی ہے۔

ناصر کاظمی نے زیر نظر خاکے میں انتہائی شگفتہ اور بے تکلف انداز میں حفیظ ہوشیار پوری کے جملہ محاسن و معائب آشکار کئے ہیں اور اس میں وہ کہیں بھی عدم توازن یا افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے۔ ناصر کاظمی کی چہرہ نویسی ملاحظہ ہو:

"گہرا سانولا رنگ' پچکے ہوئے گال' خشک ہونٹ' سرمئی برف سے بال' اکہرا جسم' چھوٹی چھوٹی کنچوں والی آنکھیں' کرسی پہ سے اچکتی ہوئی ہڈیوں کی ایک مالا۔ شاعر مسند پر آ کر اپنا کلام سناتا۔ صاحب صدر دل بڑھاتے اور داد دیتے۔ لیکن یہ صاحب اپنی حرکتوں میں مگن تھے۔ خود ہنستے دوسروں کو بھی ہنساتے۔ شاعر ان کی طرف دیکھتا تو ایک دم سنجیدہ ہو جاتا اور سر کو نفی میں ہلا کر داد دینے لگتے۔" ۵۸

حفیظ ہوشیارپوری کے ایسے ابھرے ابھرے نقوش کے تصویر بنانے پر ناصر کاظمی ایک منجھے ہوئے چہرہ نویس نظر آتے ہیں۔ چہرہ نویسی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں تمام تر جزئیات زندہ و متحرک پیش کر دی جائیں۔ سو یہ خصوصیت ناصر کاظمی کی چہرہ نویسی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے نہ صرف شخصیت کی اصلی تصویر کشی کی ہے بلکہ چہرے کا مجموعی تاثر بھی پیش کر دیا ہے۔

اس خاکے میں ایک اہم بات یہ نظر آتی ہے کہ ناصر کاظمی نے شخصیت کے عیوب و محاسن بلاکم و کاست بیان کئے ہیں۔ نیز اس شخصیت کے بارے میں اپنے ذاتی تاثر پر بھی پردہ نہیں ڈالا بلکہ اس میں کوئی رنگ آمیزی کئے بغیر من و عن پیش کر دیا ہے:

"سنا ہے حفیظ خاصا پڑھا لکھا شاعر ہے۔ ہوگا! میں نے تو اس کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہ دیکھی اور نہ ہی اسے کسی کتب خانے کی طرف جاتے دیکھا۔ جب ایک دن اس نے مجھے یہ بتایا کہ اس نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم۔ اے کر رکھا ہے تو میں سنسان سا ہو گیا۔ کم از کم اس وضع قطع کا طالب علم میں نے اس کالج میں تو نہیں دیکھا اور یہ نفسیات نہ جانے اسے کیسے ہضم ہو گئی۔"۵۹ے

ناصر کاظمی نے چھوٹے چھوٹے جملوں اور کم سے کم الفاظ میں حفیظ ہوشیار پوری کی پوری شخصیت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ درج بالا سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی کو انسانی نفسیات پر بھی گہرا عبور حاصل ہے۔ وہ نہ صرف شخصیت کے ظاہری خدوخال اجاگر کرتے ہیں بلکہ اس کی باطنی کیفیت کا بھی درک رکھتے ہیں اور انہیں نہایت خوبی سے بیان کرنے پر قادر ہیں۔

ناصر کاظمی نے اس خاکے میں موضوع خاکہ شخصیت کے علاوہ جزوی طور پر اس کے بھائی راحل اور بیٹی صبیحہ کو بھی شامل کیا ہے کہ ان دونوں کے تعلق سے حفیظ ہوشیار پوری کی شخصیت اصل تناظر میں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ خاکہ نگار کی اپنی شخصی جھلکیاں بھی جابجا نظر آتی ہیں۔ جس کا مقصد اس تعلق خاطر کو ظاہر کرنا ہے جو ناصر کاظمی کو حفیظ ہوشیار پوری سے تھا۔ حفیظ ہوشیار پوری کی بیٹی صبیحہ کے حوالے سے یہ سطور دیکھئے:

"صبیحہ بلا کی ذہین ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بغیر حفیظ کی شخصیت ادھوری سی رہ جاتی ہے۔ وہ اور اس کے دوسرے بہن بھائی حفیظ کو نی ہوشیارپوری کہتے ہیں۔ ماں باپ نے تو نام عبدالحفیظ رکھا تھا۔ عبدل حفیظ نے خود اڑا دیا۔ ح اور ظ بچوں نے اڑا دی۔ میں نے صبیحہ سے پوچھا کہ

کے کیا معنی ہیں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کہنے لگی "ایک" ۔ میں نے کہا "ایک چیز" وہ شرما کر بھاگ گئی۔ صبیحہ کی فارسی دانی کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک دفعہ حفیظ نے مجھے، نور عالم، انتظار حسین اور شیخ صلاح الدین کو چائے پر بلایا۔ حفیظ، نور عالم کو نور قطب عالم کہتا ہے۔ صبیحہ فوراً بول اٹھی "یہ عالم ہیں یا عالم! اور یہ قطب ہیں یا کتب" ہم سب حیران رہ گئے۔ حفیظ بھی لفظوں کا رسیا ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ اپنی بیٹی کا شاگرد ہے۔" ۶۰

زیر نظر خاکے میں ناصر کاظمی کی اپنی شخصیت کا حوالہ ملاحظہ ہو۔

" حفیظ نے ----- جیب سے ریڈیو کا کنٹریکٹ نکال کر مجھے دستخط کرنے کو کہا ----- میری عمر اس وقت سولہ برس ہوگی اور میرے پاس صرف چار پانچ غزلیں ہی اس قابل تھیں کہ کسی ادبی مجلس میں سنائی جا سکیں۔ میں کچھ چپ سا ہو گیا۔ پھر خیال آیا حفیظ سے میری کوئی دوستی بھی نہیں کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی دنیائے ادب میں مجھے کوئی جانتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے دعوت منظور کر لی۔ وہ دن اور آج کا دن ایسی سینکڑوں ہی دعوتیں مل چکی ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایسی دعوتوں کا انتظار سا بھی رہتا ہے کیونکہ رقوم کا سوال ہوتا ہے کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہ کتنی بری گھڑی تھی جب میں ریڈیو کے مشاعرے میں شریک ہوا۔ نہ میں غزل پڑھتا نہ لوگ مجھے جانتے اور نہ ہی میری زندگی عروس سخن کے لئے رسوائے عام ہوتی۔ پھر یہ خیال کہ اور بھی تو کچھ لوگ تھے جنہیں یہ دعوت نامہ ملا تھا لیکن اب ان کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ کوئی کلرک بن گیا کوئی افسر ہو گیا۔ کوئی پاگل ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔" ۶۱

ناصر کاظمی نے اس خاکے میں اس امر کا خیال رکھا ہے کہ حفیظ ہوشیار پوری کی شخصیت کے مثبت پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوں۔ وہ موضوع خاکہ شخصیت کی خوبیوں پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔ جہاں تک خامیوں کا تعلق ہے تو وہ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کے رخ پر بادلوں کی طرح آتی ہیں اور آ کے گزر جاتی ہیں۔ وہ دیگر خاکہ نگاروں

کی طرح شخصیت کا تماشا نہیں بناتے اور نہ کسی کردار کی کسی مضحک صورت کو نمایاں کرتے ہیں۔ موضوع خاکہ شخصیت کے ساتھ ناصر کاظمی کا احترام کا تعلق قائم ہے۔ بلکہ وہ انہیں اپنا استاد بھی مانتے ہیں اور ایسا استاد' جس کی استادانہ صلاحیتوں کے وہ دل سے معترف ہیں:

"حفیظ کی غزل روایت سے آشنا ہے لیکن اس کا قالب نیا ہوتا ہے۔ دراصل وہ اپنے آپ کو روایت سے کسی طرح بھی الگ نہیں کرنا چاہتا وہ بہترین استاد ہے۔ غالب کو جب لوگوں نے بے استاد کہا تو اس نے ایک فرضی استاد ایجاد کیا۔ مجھے قسمت سے اصلی استاد مل گیا۔ اس جیسے فی البدیہہ شعر کہنے والے کم ہی دیکھے ہیں۔" ۶۲

ظاہر ہے ناصر کاظمی جیسا وضعدار آدمی اپنے استاد کا خاکہ لکھتے ہوئے کس حد تک جا سکتا ہے۔ ناصر کی پوری کوشش ہے کہ حفیظ ہوشیارپوری کے کردار کے وہ تمام پہلو نمایاں ہوں جو پڑھنے والے کو متاثر کر سکیں۔ چنانچہ اس کوشش میں وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ خاکہ نگاری کا ایک مقصد شخصیت کا بھرپور اور جامع تعارف بھی ہوتا ہے چنانچہ اس خاکے کے ذریعے ناصر کاظمی نے یہ مقصد حاصل کر لیا ہے۔

ناصر کاظمی کا مضمون "عبدالرحمٰن چغتائی" حیرت انگیز حد تک ان کی فن مصوری سے شناسائی اور شغف کا پتہ دیتا ہے۔ ناصر کاظمی نے جس طرح چغتائی آرٹ کی باریکیوں اور اس کی تکنیک پر بحث کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس فن لطیف کے بارے میں ان کا علم اور مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ ناصر کاظمی نے اس مضمون میں ان اعتراضات کا بھی جائزہ لیا ہے جو مختلف حوالوں سے چغتائی آرٹ پر کئے جاتے ہیں۔ وہ چغتائی کے فن کی مرکزی وحدت' اجنبیت اور انفرادیت کے حوالے سے اسے دنیا کی آرٹ گیلریوں کے لئے ایک عجوبہ قرار دیتے ہیں۔ ناصر کاظمی کے خیال میں جو لوگ چغتائی آرٹ کو جدید فنی رجحانات سے نا آشنا قرار دیتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ اس کی انفرادیت اور مشرقیت ہی نے اسے دوسرے ممالک میں ممتاز کیا ہے۔ وہ اسے مسلمانوں کی تہذیب کی علامت سمجھتے ہیں اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اس فن کے ذریعے چغتائی نے نہ صرف مسلمانوں کی گم گشتہ تہذیب کو زندہ کیا ہے بلکہ انہیں

ان کی عظیم الشان روایت کا احساس بھی دلایا ہے۔

چغتائی کے فن پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس کی تصاویر میں چین اور جاپان کی گلکاریاں، سر زمین عجم کے رنگ اور ایلورا اجنتا کے جسم اور یونان کا احساس جمال جھلکتا ہے۔ گویا چغتائی نے بہت سی چیزیں دائیں بائیں سے لے کر انہیں ترتیب دے لیا ہے اور اسے مشرقی فن کا نام دیتے ہیں۔ ناصر کاظمی اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے چغتائی کے دفاع میں اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ اس نے کسی فنکار کی براہ راست نقل نہیں کی بلکہ دنیا کے عظیم فن کی روایت اور عظمت کو محسوس کرتے ہوئے ایک منفرد انداز پیدا کیا ہے۔ اور مشرقی ممالک میں اپنے معاصرین اور آنے والی نسلوں کے لئے فن کا ایک کلاسیکل ماڈل قائم کیا ہے۔

ناصر کاظمی کسی ملک اور تہذیب سے اثر قبول کرنے کو عیب نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک اصل عیب یہ ہے کہ کسی دوسرے کی بھونڈی نقالی کی جائے۔ اس سلسلے میں وہ کیٹس کی مثال پیش کرتے ہیں جس کی شاعری میں یونان اور اٹلی کی تہذیب کے نشان ملتے ہیں۔ اسی طرح گوئٹے اور دوسرے جرمن شاعروں کے ہاں عرب اور ایران کے اثرات موجود ہیں۔ کارلائل اور خلیل جبران قرآن پاک کی زبان اور انداز پر فریفتہ ہیں۔ سولہویں اور سترہویں صدی کے ہندو آرٹسٹوں کے ہاں مسلمانوں کی تہذیب جھلکتی ہے۔ اقبال، شیخ سعدی، مولانا روم اور خاص طور پر جرمن شاعروں اور فلاسفروں سے متاثر ہیں۔ لیکن ان تمام تخلیق کاروں کا انداز، اسلوب اور احساس اپنا ہے۔ یہی صورت ہمیں چغتائی کے ہاں نظر آتی ہے کہ اس نے دوسرے ملکوں اور تہذیبوں سے اثرات تو قبول کئے ہیں لیکن انہیں اپنے منفرد انداز اور اسلوب اور نئے احساس کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر تصویر اور ہر نقش میں مشرق کی زندہ روایت دھڑکتی ہے۔ علامہ اقبال کی طرح وہ مشرقی ممالک اور خاص طور پر مسلمانوں کا فنکار ہے اور اسے اپنے مشرقی ہونے پر ناز ہے۔

ناصر کاظمی، چغتائی آرٹ کی تکنیک پر گفتگو کرتے ہوئے ایک جدید ترین تکنیک ایچنگ Etching کا تعارف کراتے ہیں۔ یہ تکنیک براہ راست مغربی ممالک سے آئی ہے اور اس میں Groove Drawing کے ذریعے لکڑی اور بالخصوص دھات

پر نقش کندہ کئے جاتے ہیں۔ ناصر کاظمی اس تکنیک کو کاغذ اور شیشے کی پینٹنگ سے کہیں زیادہ مشکل قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کے خیال میں یہ نقش دوسرے تمام نقوش سے زیادہ پائیدار رہتے ہیں۔ پاکستان میں چغتائی کے علاوہ کسی اور نے اس تکنیک کو نہیں اپنایا۔ اس تکنیک میں سخت اور تیز آلات کے ذریعے دھات پر ڈرائینگ کی جاتی ہے۔ اور چغتائی اس فن میں بہت ماہر تھے۔

ناصر کاظمی اپچنگ کی تکنیک کو دوسرے فنی اسالیب سے کہیں زیادہ محنت طلب، صبر آزما اور دقیق قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ تکنیک موضوع یا مرکزی خیال کی ادائیگی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ سخت دھات پر معنوی اور فنی کمال دکھانا ایک غیر معمولی ماہر فن کا کام ہے۔ دھات پر جو خط ایک بار کھینچ دیا جاتا ہے وہ ربڑ یا کسی چیز سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ اپچنگ کی ہر لائن مکمل، واضح اور صاف روشن ہوتی ہے اس میں فنکارانہ ابہام کی گنجائش بہت کم ہے چنانچہ وہی فنکار اس تکنیک سے فائدہ اٹھانے کی جرات کر سکتا ہے جو فن کی ایک ترقی یافتہ منزل اور خاص مقام نظر پر پہنچ چکا ہو۔ اس طرح اپچنگ کے موضوعات کی کیفیاتی خصوصیت، خطوط اور جسموں کی لجاجت اندرونی کیفیات کا عکس، خیال کی مرکزی وحدت اور جذباتی شدت کا فنی اظہار اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک فنکار اپنے فن کے موضوع سے براہ راست تاثر نہ لے اور اس تکنیک پر پورا عبور نہ رکھتا ہو۔

ناصر کاظمی نے اس مضمون میں اپچنگ کی مزید تفصیلات بیان کی ہیں یہاں تک کہ ان خاص آلات اور ساز و سامان کا ذکر بھی کیا ہے جن کی اپچنگ کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً خاص آلات اور سازو سامان میں مندرجہ ذیل اشیا شامل ہیں۔

۱۔ دھات کی پلیٹ، اس میں پیتل اور جست کی پلیٹ زیادہ کار آمد ہے۔ بعض جدید ماہر فن لوہے اور تانبے کی پلیٹ بھی استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ تیزاب کو برداشت کرنے والی سطح۔

۳۔ ایک نوکیلا اور تیز دھار والا قلم جو دھات کی سطح کو آسانی سے تراش دے۔

۴۔ ایک خاص قسم کا تیزاب (Amordant)

۵۔ سیاہی

۶۔ ایک خاص قسم کا کاغذ۔ یہ کاغذ ایسا ہونا چاہئے جو مدت مدید تک خراب نہ ہو سکے۔ اس میں عام طور پر دو قسم کا کاغذ استعمال ہوتا ہے ایک تو شہتوت کے پتوں یا چھال کا بنا ہوا ملائم کاغذ اور دوسرے جاپانی کاغذ۔

۷۔ چھاپہ خانہ' کیونکہ چھاپہ خانے کے بغیر کندہ کی ہوئی تصویر کو کاغذ پر لانا ناممکن ہے۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ اینچنگ کی پلیٹ کو کندہ کرنے کے بعد تیزاب سے صاف کیا جاتا ہے اور پھر اسے چھاپہ خانے کے ذریعے کاغذ پر شائع کیا جاتا ہے۔ بقول ناصر کاظمی چغتائی کے پاس ایک ہینڈ پریس ہے جو سارے دن کی سخت محنت کے بعد ۳۵ یا ۳۰ پرنٹ نکال سکتی ہے۔

ناصر کاظمی کا یہ مضمون سب سے پہلے "اوراق نو" میں شائع ہوا تو اس کے ساتھ آرٹ پیپر پر چغتائی کی ایک تصویر بھی شائع کی گئی۔ اس تصویر میں مغل دور کی محراب بنا کر ایک درسگاہ کا تاثر دیا گیا ہے۔ محراب کے سامنے ایک پیکر ہے جو طالب علم لگتا ہے۔ ناصر کاظمی نے مضمون کے آخر میں اس تصویر پر تبصرہ کیا ہے اور اس کا فنی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ناصر کاظمی کی یہ سطور ملاحظہ ہوں:

"یہ تصویر پیتل کی ایک پلیٹ پر کندہ کی گئی ہے اور بعد میں مومیائی کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔ اس تصویر کو مکمل کرنے میں فنکار کو جن صبر آزما مرحلوں اور دقتوں سے گزرنا پڑا ہے وہ اس تصویر کے مہین خطوط اور گہرے تاثر سے ظاہر ہے۔ ہر تصویر کی خاموشی ہمیں کچھ کہتی ہے۔ اس تصویر میں دو چیزیں ہمیں اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ ایک تو مغل دور کی محراب اور دوسری ایک پیکر جو ایک طالب علم معلوم ہوتا ہے اور اپنی درسگاہ کی محراب کے سامنے کھڑا ہے اس کے جسم کا انداز ایک اندرونی کیفیت کا پتہ دیتا ہے اور محراب کے اندر کی روشن سطح مشرق کے علم اور ذہنی سلجھاؤ کی عکاس ہے۔ سفید اور سیاہ رنگوں کا تضاد فہم و ادراک اور ایک اجنبی احساس کا آئینہ دار ہے۔ اس تصویر کے باریک اور گہرے نقوش میں موضوع کی توانائی اور ہمہ گیری سمٹ آئی ہے۔ فن کار نے اس دقیق ترین

تکنیک کے باوجود بعض اندرونی کیفیات اور مشاہدات کے اظہار کو ممکن بنا دیا ہے۔" ۶۳ے

ناصر کاظمی کے اس مضمون میں زیادہ تر مصوری کی ایک جدید ترین تکنیک اینچنگ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں اور اس کے طریق کار کو بیان کیا گیا ہے لیکن اس حوالے سے چغتائی آرٹ کے اہم ترین پہلو کو سامنے لایا گیا ہے جو اس سے پہلے اکثر لوگوں کے علم میں نہیں تھا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ چغتائی اپنی تصویروں کے لئے اینچنگ کی تکنیک استعمال کرتے تھے۔ ناصر کاظمی نے اپنے مضمون میں اینچنگ کی جن مشکلات اور رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے وہ واقعی چغتائی کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھیں۔ لیکن انہوں نے ایک غیر معمولی ماہر فن کی طرح اس تکنیک میں کمال حاصل کیا اور اس کے ذریعے ایسے لافانی شاہکار پیش کئے جو مصوری کی دنیا میں اپنی انفرادیت اور خوبصورتی کے سبب اپنی مثال آپ ہیں۔

ناصر کاظمی نے چغتائی کی ایک تصویر کے حوالے سے جو تبصرہ پیش کیا ہے۔ اس میں کسی مصور فن پارے کو جانچنے کی صلاحیت اور ایک ماہر فن کی طرح اس کی باریکیوں میں اتر جانے کا اندازہ نمایاں ہے۔ اسی طرح انہوں اینچنگ کی تکنیک کا جس تفصیل سے ذکر کیا ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس فن میں کس قدر دلچسپی رکھتے ہیں۔

فنی اور شخصی تجزیوں کے اس حصے میں ناصر کاظمی کے ایسے مضامین زیر بحث لائے گئے ہیں جن میں شاعری اور مصوری پر ان کے ناقدانہ خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے کا ایک مختصر مضمون "ایک کہانی' دو استعارے" ہے جو انتظار حسین کے دو افسانوں "دن اور داستان" میں فلیپ کے طور پر شامل ہے۔ انتظار حسین ہمارے عہد کے ایک بہت بڑے افسانہ نگار' ناول نگار اور نقاد ہیں۔ وہ بنیادی طور پر اسی طرز احساس سے وابستہ ہیں جو ناصر کاظمی کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ وہ نہ صرف ناصر کاظمی کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے ہیں بلکہ چائے کی میز پر ہونے والی بے شمار گفتگوؤں اور مکالموں میں ناصر کاظمی کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ انتظار حسین کے ناول پر ناصر کاظمی نے نہایت اختصار کے ساتھ اس کے جملہ پہلوؤں کو بیان کیا ہے اور اس ناول کو

قدیم اور جدید کا امتزاج قرار دیا ہے۔ ناصر کاظمی کی یہ تحریر مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر بھرپور معنویت کا احساس لئے ہوئے ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"دن اور داستان" ہے ایک ہی کہانی۔ لیکن جس طرح سن ستاون نے ہماری تاریخ کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا اسی طرح یہ کہانی دو استعاروں میں الگ الگ طور پر لکھی گئی ہے۔ داستان اس طرح ختم نہیں ہوتی جس طرح اگلے وقتوں کے داستان گو اپنی داستان ختم کرتے تھے اور ناول اس طرح ختم نہیں ہوتا جس طرح روایتی ناول ختم ہوتے تھے۔ دونوں افسانوں کے آغاز اور انجام آپس میں گھل مل کر ایک کہانی بنتے نظر آتے ہیں۔ جس میں سو سال کی تاریخ ایک دن میں سمٹ گئی ہے اور دن سو برسوں میں پھیلتا نظر آتا ہے۔ داستان کے کردار روپ بدل کر "دن" کے کردار بن گئے ہیں۔ "دن" کے کردار یوں نظر آتے ہیں جیسے کسی "داستان" کے کرداروں نے نیا چولا پہن لیا ہے۔ ہمارا "ماضی" اس عہد میں ایک نئے استعارے کا منتظر تھا۔ وہ استعارہ اسے قدیم اور جدید کے امتزاج کی صورت میں "دن اور داستان" بن کر نصیب ہوا۔ قدیم اور جدید کا یہی امتزاج کہانی کی تکنیک' زبان کی ساخت اور کرداروں کی تعمیر میں کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ "دن اور داستان" ہمارے اس حاضر کی داستان ہے جو اپنے ماضی کی تلاش میں ہے ماضی جس کے بغیر ہمارا حال بے رنگ ہے اور مستقبل تاریک۔"[۶۴]

مختصر نویسی اگر کوئی فن ہے تو درج بالا تحریر میں اس فن کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ ناصر کاظمی نے اس تحریر میں انتہائی مختصر طور پر کم سے کم الفاظ میں انتظار حسین کے متذکرہ ناول کا رس سمو دیا ہے۔ خاص طور پر انہوں نے دونوں افسانوں کا باہمی ربط تلاش کر کے ان کا معنوی سمبندھ قائم کیا ہے اور اس جملے کے ذریعے وہ بات کہہ دی ہے جس کے لئے صفحے کے صفحے سیاہ کئے جا سکتے تھے کہ "دونوں افسانوں کے آغاز اور انجام آپس میں گھل مل کر ایک کہانی بنتے نظر آتے ہیں جس میں سو سال کی تاریخ ایک دن میں سمٹ گئی ہے اور دن سو برسوں میں پھیلتا نظر آتا ہے۔" اور پھر اس معنوی ربط کو انہوں نے کہانی کی تکنیک' زبان کی ساخت اور کرداروں کی تعمیر تک پھیلا

دیا ہے۔ گویا یہ دونوں افسانے معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے پیوست نظر آتے ہیں جن کے موضوع ماضی، حال اور مستقبل ہر زمانے کا استعارہ بنتے ہیں۔

(۵)

چند ادبی مسائل

ناصر کاظمی کے قدرے طویل مضامین کے جائزے میں ہم نے زیادہ تر ان کے ایسے مضامین پر گفتگو کی ہے جن میں انہوں نے کسی خاص فنی اور تخلیقی حوالے سے بات کی ہے۔ اس حصے میں ہمارے پیش نظر ناصر کاظمی کے وہ مضامین ہیں جن میں انہوں نے کسی خاص ادبی مسئلے کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان مضامین کا انداز زیادہ تر تاثراتی ہے اور ان کے مطالعے سے ناصر کاظمی کا ادب و شاعری کے بارے میں نقطہ نظر واضح ہوتا ہے۔ ان مضامین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سوائے چند ایک کے باقی انتہائی مختصر ہیں۔ ناصر کاظمی کے مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت، جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے، اختصار پسندی ہے۔ جس طرح انہوں نے غزل میں چھوٹی بحریں استعمال کر کے کم سے کم الفاظ میں بات کہنے کا انداز اختیار کیا ہے اسی طرح نثر میں بھی وہ اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ الفاظ کے غیر ضروری استعمال اور طویل بحثوں سے گریز کیا جائے۔ چنانچہ اس وقت ان کے تقریباً تیرہ مختصر مضامین ایسے ہیں جن میں انہوں نے مٹھی بھر لفظوں میں ادب کا پورا منظر نامہ بیان کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ متفرقات میں ان کے چند نثری ٹکڑے آتے ہیں جن میں انہوں نے کسی خیال کو مختصر ترین انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے دو اداریے بھی ہمارے اس جائزے میں شامل ہیں جن میں وہ زبان اور روایت کے حوالے سے بات کرتے نظر آتے ہیں۔ ناصر کاظمی کے تیرہ مضامین میں ''میرا ہم عصر''، ''روایت اور انسانی ارتقا''، ''ادب میں جمود''، ''چوتھی سمت کی تلاش''، ''مجھ کو شاعر نہ کہو''، شاعرانہ صداقت''، ''ادیب اور معاشرتی

پابندیاں" ، "نئے لوگ" ، "معنی کا طلسم" ، "آج کا ادب" ، "میر کے زمانے کی عورت" ، "غالب کا طرفدار نہیں" اور "میرا بائی کی بسن" شامل ہیں۔

ناصر کاظمی کا مضمون "میرا ہم عصر" نومبر ۱۹۶۲ء کے "ادب لطیف" میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے لفظ "ہم عصر" پر بحث کرتے ہوئے اس خیال کو غلط قرار دیا ہے کہ ایک ہی زمانے سے تعلق رکھنے والے دو افراد ایک دوسرے کے ہم عصر ہو سکتے ہیں۔ مضمون کا آغاز انہوں نے ایک گہرے طنز سے کیا ہے :

" عام معنوں میں ایک ہی زمانے میں رہنے والے انسان ایک دوسرے کے ہم عصر کہلاتے ہیں بلکہ اس تکلف کی بھی کیا ضرورت ہے۔ رائٹرز گلڈ تو ہر اس شخص کو ادیب کی سند دے دیتا ہے جو دو گواہ پیش کر دے۔ گلڈ کے تقریباً چھ سو رکن ہیں اور قدرت اللہ کی دیکھئے کہ یہ سب کے سب ایک دوسرے کے ہم عصر ہیں۔ دنیائے ادب میں ہم عصری کے تصور کی یہ درگت دیکھ کر مجھے قرآن حکیم کی وہ آیت یاد آ رہی ہے جس میں اللہ نے عصر کی قسم کھا کر کہا ہے کہ "انسان خسارے میں ہے۔" ۶۵

گویا ناصر کاظمی کے لئے "ہم عصر" کے وہ معروف معنی قابل قبول نہیں ہیں جو عام طور پر ہمارے یہاں استعمال ہوتے ہیں۔ ناصر کاظمی کے خیال میں "عصر" کا لفظ اتنا معمولی نہیں ہے کہ اسے یونہی سرسری طور پر استعمال کر کے اس کے عام معنی مراد لے لئے جائیں۔ اس لفظ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ خدا نے اس لفظ کی قسم کھائی ہے اور کسی بات کا یقین دلانے کے لئے اسی چیز کی قسم کھائی جاتی ہے جو سب سے زیادہ قابل احترام اور عزیز ہوتی ہے۔ ناصر کاظمی نے "سورۃ العصر" کی پہلی آیت کے حوالے سے بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ یاروں نے عصر کو کلاک ٹائم سمجھ لیا ہے اور اس طرح آج کے ہم عصر ابن الوقت بن کر رہ گئے ہیں۔ اسی لئے وہ لوگ جو عصر کو کلاک ٹائم سمجھتے ہیں، قرآن کی رو سے خسارے میں ہیں۔ ناصر کاظمی نے لفظ "عصر" کے لغوی معانی تلاش کر کے اس سے بڑا خوبصورت استنباط کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عربی میں "عصر" کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً عہد، تاریخ، رس، نچوڑ، خوشبو کی بھڑک وغیرہ اور جب یہ لفظ بطور مصدر استعمال ہو تو اس کے معنی ہیں

نچوڑنا۔ گویا ہم عصر وہ تخلیقی لوگ ہوئے جو باہم مل کر کسی خیال یا کسی عہد کا رس نچوڑیں۔ لہٰذا ادب میں وہی لوگ ہم عصر کہلا سکتے ہیں جو روح عصر کا شعور رکھتے ہیں اور ان کا اجتماعی شعور اور تاریخی ورثہ مشترک ہو۔ بلکہ وہ ذہنی طور پر زندگی کو ایک تخلیقی عمل سمجھتے ہوں۔ تخلیق کرنے والے خواہ کسی شعبہ حیات میں کام کر رہے ہوں اور ذہنی طور پر چاہے مختلف سمتوں میں سوچتے ہوں مگر تخلیقی لگن انہیں ایک دوسرے کا ہم سفر اور ہم عصر بنا دیتی ہے۔ ۲۹

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محض ایک عہد میں پیدا ہونا یا ایک جیسا زمانہ پانا ایک دوسرے کا ہم عصر بننے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے روح عصر کا شعور، اجتماعی شعور اور تاریخی ورثے کا اشتراک ضروری ہے۔ سمتیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن بنیادی شرط زندگی کو ایک تخلیقی عمل سمجھنا اور خود کو اس تخلیقی عمل سے گزارنا ہے۔ اس سلسلے میں ناصر کاظمی نے ایک آسان اور سادہ سی مثال پیش کی ہے کہ وہ ادیب جو ان کے زمانے میں لکھنے بیٹھتا ہے اور منٹو کے افسانوں پر تنقید لکھ کر اپنے ادبی کیریئر کا آغاز کرتا ہے اور بالآخر مغربی سوچ کی زیر اثر ادب کو چھوڑ چھاڑ کر کوئی بنیادی کرسی سنبھال لیتا ہے تو اس صورت میں ہم دونوں کسی جماعت کے رکن تو بن سکتے ہیں، ہم عصر نہیں کہلا سکتے۔ اسی طرح ایک دوسری مثال پیش کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ شہرت بخاری نے میرے ساتھ شعر کہنے شروع کئے اور آج بھی ہم دونوں ایک ساتھ چھپتے ہیں اور خوب خوب داد سخن پاتے ہیں تو شعر کہنے، ایک ساتھ چھپنے اور داد سخن پانے کے اعتبار سے تو ہم دونوں ہم عصر ہوئے لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ بیس برس پہلے سپین میں ایک لڑکا گٹار بجاتا تھا اور شعر کہتا تھا۔ وہ بھی میرا ہم عصر ہے تو شہرت بخاری دیوار کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ سپین کا گٹار بجانے والا شاعر میرا ہم عصر ہے مگر وہ میرے ایک دوسرے ہم عصر شاعر کا ہم عصر نہیں ہے۔

ناصر کاظمی کے نزدیک ہم عصر وہ لوگ ہیں جن کی کوئی مشترکہ تاریخ ہو۔ اس حوالے سے وہ میرا بائی اور میر کو بھی اپنا ہم عصر کہتے ہیں جن کے چرنوں میں بیٹھ کر وہ بھجن اور غزلیں سنتے ہیں اور انہیں اپنی کتھا سناتے ہیں۔ بلکہ وہ تو اسلم انصاری کو بھی اپنا ہم عصر کہتے ہیں جس نے ان سے پندرہ سال بعد لکھنا شروع کیا۔ اس لئے کہ جب

وہ کہتا ہے کہ ع

اتنے سارے لوگ ہیں اور میں تنہا ہوں

تو اسلم انصاری کے ساتھ ناصر کاظمی کی تنہائی بھی جاگ اٹھی ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مشترکہ گہرے طرز احساس کے بغیر دو شخص ایک دوسرے کے ہم نوا اور ہم عصر نہیں ہو سکتے۔ اور یہ مشترکہ طرز احساس پیدا ہوتا ہے' زندگی کے مشترکہ تخلیقی عمل سے۔ ایسا مشترکہ تخلیقی عمل جس میں روح عصر کا شعور' اجتماعی شعور اور مشترکہ تاریخی ورثہ کار فرما ہو:

"ہم سب لکھنے والے بظاہر ہم عصر ہیں اور ہم سب خسارے میں ہیں۔ حکم پڑھ کر اقرار کی سنت ادا کرتے ہیں مگر انکار کے ذائقے سے نا آشنا ہیں۔ دراصل ایک ساتھ جینا مرنا یا لکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ایک زمانے میں مل کر سوچنا اور کسی ایک سمت کی تلاش میں سفر کرنا ہم عصری ہے۔"[۶۷]

ناصر کاظمی کے اس مضمون کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک زمانے میں ایک ساتھ مل کر سوچنا' کسی ایک سمت کی تلاش میں سفر کرنا' ایک مشترکہ طرز احساس رکھنا اور مل کر زندگی کے تخلیقی عمل میں شریک ہونا ہی دراصل ایک دوسرے کا ہم عصر ہونا ہے۔ لیکن اگر سمتیں جدا ہیں' طرز احساس مختلف ہے اور زندگی کے تخلیقی عمل میں اشتراک نہیں ہے تو اس پر ہم عصری کا اطلاق نہیں ہوگا۔

ناصر کاظمی کا مضمون "روایت اور انسانی ارتقا" دسمبر ۱۹۶۲ء کے "ہمایوں" میں شائع ہوا۔ یہ مضمون روایت کا مفہوم واضح کرتے ہوئے' انسانی ارتقا میں اس کے عمل دخل کی وضاحت کرتا ہے۔ ناصر کاظمی کے نزدیک ارتقا کا مفہوم یہ ہے کہ ہر دور کو اس کے قبل کے ادوار پر یہ فوقیت حاصل رہی ہے کہ اس کا میدان عمل پہلے سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ میدان عمل وہ زندگی ہے جو ہمہ وقت وسعت پذیر ہو رہی ہے اور انسانی عقل کو وہ ذرائع فراہم کرتی ہے جن کا پھیلتا ہوا دائرہ عقل کی جولانگاہ کو محدود سے لامحدود کی طرف لے کر جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم یونان کی استعداد علمی کا دائرہ جتنا بڑا تھا اسے یونان کے رومن حاکموں کی پوری صلاحیت نظم و نسق چھو

نہیں پائی اور عربی اور ایرانی دانشوروں کا علم اسلامی ممالک میں نہ صرف کئی مسئلوں میں سند ہے بلکہ اب تک مشعل راہ ہے۔

انسانی تاریخ کا مطالعہ بعض ایسے مقامات کی خبر بھی دیتا ہے جہاں انسان کے قدم نہ صرف رک جاتے ہیں بلکہ پیچھے کو ہٹتے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجوہات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمانے کا انسان زندگی کے طویل اندھیرے میں تاریخ کے حوادث کی زد میں تھا اور آج اس کے علم نے اس پر پہلی بار یہ آشکار کر دیا ہے کہ اسے بڑی حد تک تاریخ کی رو بدل دینے کی قدرت حاصل ہو گئی ہے۔

ناصر کاظمی کے خیال میں ہر دور اپنے پہلے دور کی نسبت نیا ہے مگر ان مخصوص معنوں میں آج ہی کا دور' دور جدید کہلانے کا مستحق ہے جبکہ پہلی بار انسان کو اپنی اس قدرت کا واضح شعور حاصل ہوا ہے۔ موجودہ زمانے کی برق رفتاری کو دیکھتے ہوئے ایک سوال فوری فیصلے کا طالب ہے کہ روایت کا انسانی ارتقا میں کہاں تک دخل ہے۔ ناصر کاظمی روایت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ "روایت کے معنی وہ علم اور تہذیب کی تمام استعدادیں ہیں جو انسان کو آج تک حاصل ہوئی ہیں۔"[۶۸] گویا روایت وہ روح ہے جو کسی زمانے میں دھڑکتی ہے اور اس کا ادراک اپنے زمانے پر نگاہ رکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہر زمانے کا علم اور دانش اس زمانے کی روایت ہے جو جدید زمانے کے جدید علوم کے لئے پس منظر کا کام دیتی ہے اور اس ارتقائی عمل میں معاون ثابت ہوتی ہے جو ہر نئے دور کی حدوں کو کچھ اور زیادہ وسیع کر دیتا ہے۔ مضمون کے آخر میں ناصر کاظمی نے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا ہے کہ اگر یہ درست ہے کہ روایت انسانی ارتقا میں عمل دخل رکھتی ہے تو پھر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ روایت انسانی ارتقا میں عمل دخل رکھتی ہے تو پھر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ روایت سے مراد گزشتہ ادوار کے علم کی تقلید ہے یا دور حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔

ادبی نقطہ نظر سے ناصر کاظمی کا یہ سوال بے حد اہم ہے۔ اگر ہم روایت سے مراد علم کی تقلید لیتے ہیں تو انسانی ارتقا کی اس شکل سے صرف نظر کر جاتے ہیں جو لحہ بہ لحہ وسعت پذیر ہے۔ ظاہر ہے گزشتہ ادوار کے علم کی تقلید دور جدید میں ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کرے گی جہاں بقول ناصر کاظمی انسان کے قدم نہ صرف رک جاتے ہیں

بلکہ پیچھے کو ہٹتے نظر آتے ہیں اور ہم ایک بار پھر تاریخ کے حوادث کی زد میں آ سکتے ہیں۔ لہٰذا درست یہی ہے کہ دور حاضر کے تقاضوں کو سمجھ کر روایت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ناصر کاظمی بھی اس مختصر مضمون کے ذریعے یہی بات ہم تک پہنچانا چاہتے ہیں اور تقلید کے بجائے استعارے پر زور دیتے ہیں۔

"ادب میں جمود" مضمون "ہمایوں" کی جنوری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں شامل ہے۔ ناصر کاظمی نے یہ مضمون ان لوگوں کی شکایت کے جواب میں لکھا ہے جنہیں ادب میں جمود نظر آتا ہے۔ یہ شکایت ہمارے نقادوں کو قیام پاکستان کے بعد اس وقت پیدا ہوئی جب تقسیم کے عمل نے نہ صرف سرحدوں کو تقسیم کر دیا تھا بلکہ اس خطے کا انسان بھی ذہنی اور معاشرتی طور پر تقسیم ہو کر رہ گیا تھا۔ ان حالات نے ادب پر بھی اثر ڈالا۔ ناصر کاظمی کے خیال میں زندگی جدوجہد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو اپنے ہر شعبے میں عمل اور حرکت پذیری رکھتا ہے۔ لیکن یہ عمل اور حرکت پذیری کبھی یکساں رفتار سے جاری نہیں رہتی۔ یہ کبھی تیز ہوتا ہے۔ کبھی تیز تر ہو جاتا ہے اور کبھی سست روی پر اتر آتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ عمل رک گیا ہے۔ قیام پاکستان کے تاریخی انقلاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ناصر کاظمی لکھتے ہیں کہ:

"ہماری قوم جس تاریخی انقلاب سے گزری ہے اس سے ہمارے دل و دماغ شل ہو گئے ہیں۔ ہم ذرا تھک سے گئے ہیں، ستا رہے ہیں لیکن یہ تھکن ابدی نہیں بلکہ جسم اور روح کا فطری تقاضا ہے۔ صرف پانچ سال کے مختصر سے عرصے میں کسی مثالی کارنامے کی توقع رکھنا محض بے صبری اور ناتجربہ کاری ہے ہر دور میں غالب اور اقبال پیدا نہیں ہوتے اور ہر دور میں ان کے پیدا ہونے کا امکان بھی نہیں۔ وقت اپنے تقاضوں کے مطابق نئے لوگ بھی پیدا کرے گا۔ انسان کے لئے سوچ کے نئے راستے ہر وقت کھلے ہیں۔ آج ہمیں اپنی قومی روایت کا پوری طرح جائزہ لینا ہے اور اس کی اہمیت کو محسوس کر کے اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔"[۶۹]

ناصر کاظمی کے نزدیک ادب کی رفتار زندگی کی حرکت پذیری کا ایک حصہ ہے۔ جس طرح زندگی کی حرکت پذیری رک نہیں سکتی اسی طرح ادب کی حرکت بھی نہیں رک سکتی۔ اس کی رفتار میں البتہ کمی بیشی واقع ہو سکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب

نہیں ہے کہ ادب جمود کا شکار ہو گیا ہے۔ ادب کی سست رفتار کو جمود کہنا صرف بیمار اور تھکے ہوئے ذہنوں کا عجز ہے۔ اس مختصر مضمون میں ناصر کاظمی کا ایک رجائی انداز جاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اقبال کی طرح اپنی کشت ویراں سے مایوس نہیں۔ ان کے خیال میں دم توڑتی ہوئی نسل بھی اپنے زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک نئی نسل جنم لے چکی ہے جس کی ہمیں حوصلہ افزائی کرنی ہے اور اس کے لئے ایک سازگار فضا پیدا کرنی ہے۔ ناصر کاظمی کو اپنے دور میں بھی ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو آگے چل کر نہ صرف ہمارے ادب کی عظیم الشان روایت میں برابر کے شریک ہوں گے بلکہ ایک نئی روایت کی بنیاد بھی رکھیں گے۔ گویا ناصر کاظمی کے نزدیک ان لوگوں کی اس بات میں کوئی وزن نہیں ہے جو ادب کو جمود کا شکار سمجھتے ہیں اور ادب کے مستقبل سے مایوس ہیں۔

"چوتھی سمت کی تلاش" ناصر کاظمی کا ایک مختصر نثری ٹکڑا ہے جس میں ان کا فکری شعور پوری توانائی کے ساتھ اپنے وجود کا پتا دیتا ہے۔ ناصر کاظمی کے تخلیقی رویوں میں ناسٹلجیا کے حوالے سے نقاد حضرات ان کی تنہائی، اداسی اور راتوں کو جاگنے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ ماضی کی یادوں کو سینے سے لگائے ایک خاص دائرے سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن زیر نظر تحریر سے یہ تاثر غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے ناصر کے بارے میں درست لکھا ہے کہ:

> " ناصر کاظمی کا ماضی بھی محض انفرادی نوعیت کا نہیں ہے۔ یہ اس خطہ ارض کا وہ تہذیبی اور معاشرتی ماضی ہے جو روشن پہلوؤں سے بالکل عاری نہیں ہے اور ناصر اسی روشنی کو یاد کرتا ہے جو کہیں بجھ رہی ہے اور کہیں ڈوب رہی ہے چراغ اور چاند اس کے ہاں ماضی کی اپنی بجھتی اور ڈوبتی روایات کی علامت ہیں۔" ۷۰

"چوتھی سمت کی تلاش" میں ناصر کاظمی کے نزدیک ہر شریف اور حساس آدمی کو ماضی کی یاد بہت عزیز ہوتی ہے اور قدم قدم پر اس کا راستہ روکتی ہے مگر ماضی کے دوبارہ زندگی کرنے کی خواہش بے سود ہے۔ وہ ماضی کو مستقبل اور حال کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں وہ درخت کے مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے

ہیں :

"ماضی جڑ ہے۔ پتے اور کونپلیں حال ہیں۔ مستقبل ثمر ہے۔ جب درخت پر پھل آنا بند ہو جاتا ہے تو شاخ تراشی کرنی چاہئے اور جڑوں کو پانی دینا چاہئے مگر جب شاخیں بیمار ہو جائیں اور پتے جھڑنے لگیں تو جڑوں کو پانی دینا بھی بے سود ہو جاتا ہے۔"۔۱ے

ماضی ایک یاد ہے جس کی آبیاری ہوتی رہنی چاہئے۔ مستقبل ایک خواب ہے جو تصور اور تخیل سے وابستہ ہے اور حال ایک طرز احساس ہے جو تخلیق کار کو ہمہ وقت متحرک رکھتا ہے۔ ناصر کاظمی کے نزدیک "ادب میں ماضی و حال اس طرح گلے ملتے ہیں جیسے دن اور رات۔ دن اور رات کا ملنا دو شخصیتوں' دو قوتوں یا دو بصیرتوں کی ملاقات ہے۔ جب دو بصیرتیں باہم ملتی ہیں تو زبان دوام بن جاتی ہے۔ لکھنے والے کے حضور ماضی و مستقبل' حال بن کر حاضر بزم ہو جاتے ہیں۔"۔۲ے

لیکن صورت احوال یہ ہے کہ دو بصیرتوں کی ملاقات کا اہتمام نہیں رہا۔ زبان کو دوام کیسے حاصل ہو۔ لفظ تو موجود ہیں لیکن لفظوں کو ترتیب دینے والا دست ہنر شناس نہیں رہا۔ تنہائی کے خونچکاں ہاتھ اور سکوت کی فگار انگلیاں کاغذ اور قلم کا درمیانی سفر طے نہیں کر پائیں۔ خیال و فکر کی تازگی عنقا ہو چکی ہے۔ ناصر کاظمی ماضی کی یادوں کو لے کر حال اور مستقبل کا سفر طے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تین سمتوں کا سفر ایک چوتھی سمت کی نشاندہی کرتا ہے جس تک پہنچنے کے خیال و فکر کا اسباب سفر ضروری ہے۔ جب تک سفر کا یہ اسباب مہیا نہ ہو' سفر طے نہیں ہو سکتا۔ اس مضمون کے آخر میں ناصر کاظمی نے شیخ سعدی کے یہ اشعار درج کیے ہیں :

اے سیر ترا نان جویں خوش نہ نماید
معشوق من است آن کہ بہ نزدیک تو زشت است
حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف
از دوزخیان پرس کہ اعراف بہشت است

یعنی اے پیٹ بھرے شخص تجھے جو کی روٹی اچھی نہیں لگتی۔ جو چیز تیرے نزدیک بری ہے وہ میرے نزدیک سب سے پیاری ہے۔ بہشت کی حوروں کے لئے

اعراف ہی دوزخ کی مانند ہے تو ذرا دوزخ میں رہنے والوں سے پوچھ کہ ان کے نزدیک اعراف ہی بہشت ہے۔

سعدی کے ان اشعار کے حوالے سے ناصر کاظمی نے بہت خوبصورت بات کہی ہے کہ ماضی کی یاد دوزخ ہے اور حال کا آشوب اعراف ہے اور مستقبل کا سہانا خواب جنت ہے۔ مستقبل کا سہانا خواب دیکھنے والوں کے لئے حال کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن ماضی کے دوزخ میں جلنے والوں کے لئے حال ہی جنت ہے۔ چہ جائیکہ وہ مستقبل کے خواب دیکھنے لگیں۔ گویا حال' ماضی و مستقبل کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناصر کاظمی نے حال کو پتے اور کونپلیں کہا ہے۔ پتے اور کونپلیں بیمار ہو جائیں اور ان کی شاخ تراشی نہ کی جائے تو پھر جڑوں کو پانی دینا بھی بے سود ہو جاتا ہے۔ حال' خیال و فکر کی تازہ بستیوں کی طرح ہے جنہیں آباد کر کے ہم لفظوں کے فرشتوں سے ہمکلام ہو سکتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے اس نثر پارے میں ماضی' حال اور مستقبل کی علامتوں کے ذریعے ادب کے بنیادی فلسفے کو بیان کر دیا ہے۔ جو انہی تین زمانوں کے حوالے سے اس چوتھے زمانے کی خبر دیتا ہے جسے ادیب کا قلم اپنے وجدان اور تخیل کی مدد سے دریافت کرتا ہے۔

"مجھ کو شاعر نہ کہو" ناصر کاظمی کا ایک ایسا مضمون ہے جو ان کے دیگر تمام مضامین سے ہٹ کر ایک نئے اور اچھوتے موضوع پر ہے۔ حیرت ہے کہ ناصر کاظمی کا طائر خیال ایسے موضوعات کی خبر بھی لاتا ہے جو بظاہر ایک دوسرے دائرہ فکر کے موضوعات ہیں۔ اس مضمون کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی نہ صرف مذہب کا مطالعہ رکھتے تھے بلکہ بعض معاملات میں مذہب کی اصل روح کو سمجھتے بھی تھے۔ اس مضمون کا تانا بانا ایک اہم اور بنیادی سوال کے گرد بنا گیا ہے کہ میر جب یہ کہتے ہیں کہ "مجھ کو شاعر نہ کہو" اور غالب کہتے ہیں کہ "کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے" اور اقبال عمر بھر شاعری کرنے کے باوجود اپنے شاعر ہونے پر نازاں نہیں اور یہ کہتے ہیں:

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
دگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

تو اردو کے ان تین اہم ترین شاعروں کا یہ کہنے سے مطلب کیا ہے؟ اس کا، ایک سبب تو ناصر کاظمی نے یہ بتایا ہے کہ جب ہماری پوری قوم کو زوال آگیا تو شاعری بھی اپنے معیار سے گر گئی اور ہر کس و ناکس نے شاعری شروع کر دی اس لئے ہمارے بڑے شاعروں نے ناشاعروں کے خلاف یہ احتجاج کیا ہے کہ انہیں شاعر نہ کہا جائے۔ لیکن ناصر کاظمی کے نزدیک اس سوال کا اصل جواب یہ نہیں ہے بلکہ اصل بات قرآن حکیم کی وہ آیت ہے جس میں شاعروں کی مذمت کی گئی ہے اور جسے بعض مذہبی اجارہ داروں نے شاعروں کے خلاف استعمال کرنا چاہا اور عام لوگوں کے دل میں یہ بات سما گئی کہ شاعری غیر اسلامی فن ہے۔

یہاں ناصر کاظمی قرآن حکیم کی مذکورہ آیت ۷۳ کا بغور مطالعہ کر کے اس کا اصل مقصد واضح کرتے ہیں۔

ناصر کاظمی کا یہ کہنا کہ

"شاعری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کا لفظ لفظ قابل عمل ہو اور زندگی کے باب میں حرف آخر ہو" انسان کے عجز کا اعتراف ہے لیکن چونکہ وہ خود شاعر تھے اس لئے انہوں نے اس آیت قرآنی ۷۴ میں ایک بلیغ نکتہ تلاش کیا اور وہ یہ کہ آخر لوگوں کو قرآن حکیم پر شاعری کا گمان کیوں گزرا اور اللہ تعالیٰ کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ قرآن شاعری نہیں۔ وحی پر شاعری کا گمان ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ شاعری اور وحی میں کوئی قدر مشترک ضرور ہے۔ ناصر کاظمی کے نزدیک یہ قدر مشترک کلام و بیان کی خصوصیات ہیں۔ مثلاً شاعر بھی شاعری کے لئے لفظ استعمال کرتا ہے اور اس کے لفظوں کا استعمال موزوں بحر میں ہوتا ہے۔ شاعری کا ایک آہنگ اور مجموعی صوتی تاثر ہوتا ہے۔ الفاظ کا صوری استعمال، استعارہ، کنایہ۔ اسی طرح وحی بھی الفاظ کے ذریعے ہم تک پہنچی اور اس میں وہ تمام محاسن موجود ہیں جو اچھے کلام میں موجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے خدا نے اہل عرب کو یہ چیلنج کیا تھا اور حضورؐ کو کہا تھا کہ وہ یہ آیت خانہ کعبہ میں لٹکا دیں اور شاعروں سے کہیں کہ وہ اس کے مقابلے میں ایک مصرعہ بھی لائیں چنانچہ جب آیت دیکھی تو عرب کے فصیح پکار اٹھے کہ واللہ یہ انسان کا کلام نہیں۔

"دراصل یہ وجہ تھی کہ شاعری اور وحی میں فرق ظاہر کیا گیا۔ لیکن جو

لوگ شاعری کو نہیں سمجھتے وہ وحی کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ شاعری وحی کے اقلیم کا ایک ایسا دروازہ ہے جس کے بغیر آپ وحی کے اقلیم میں داخل ہی نہیں ہو سکتے۔"۵۷

ناصر کاظمی نے درج بالا سطور جس وثوق سے تحریر کی ہیں ان کی صداقت کا اندازہ مدینتہ العلم کے دروازے حضرت علی علیہ السلام کے اس قول سے ہوتا ہے۔ کہ "الشعر میزان القوم" شعر کسی قوم کا میزان، یعنی اس کو تولنے اور جانچنے پرکھنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ وحی کے اقلیم میں داخل ہونے کے لئے جس بنیادی شعور اور عقل و فہم کی ضرورت ہوتی ہے وہ شاعری کے علاوہ کہیں سے میسر نہیں ہوتا۔

ناصر کاظمی کے اس مضمون سے جہاں ان کا مذہبی شعور اجاگر ہوتا ہے وہاں وحی اور شاعری کے بارے میں ان کے نکتہ نظر کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے یاد رہے کہ یہاں شاعری کا جو مفہوم ناصر کاظمی نے اخذ کیا ہے وہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس قول کے مطابق ہے کہ "ان من الشعرا لحکمتہ" اسی تسلسل میں موضوع کی ذرا کمی بیشی کے ساتھ ناصر کاظمی کا مختصر مضمون "شاعرانہ صداقت" دیکھا جائے تو شاعری کے ڈھنگ اور اسلوب مزید واضح ہو جاتے ہیں۔ اس مضمون میں ناصر کاظمی نے بات "آب حیات" سے شروع کی ہے کہ بعض محققین کے نزدیک آزاد اپنی تحریر میں ضرورت سے زیادہ مبالغے سے کام لیتے ہیں بلکہ روانی میں جھوٹ سے بھی گریز نہیں کرتے۔ دراصل جو بات خوبی سے ضبط تحریر میں آ جائے وہ جھوٹ بھی ہو تو صحیح ہو جاتی ہے۔ اسے انگریزی والے شاعرانہ صداقت کہتے ہیں اور فراق کے نزدیک تو ایسے جھوٹ پر سچ کو بھی پیار آ جاتا ہے۔ ناصر کاظمی کے خیال میں سچ اور جھوٹ کی سرحدیں ایک جگہ پر جا کر آپس میں مل جاتی ہیں۔ ادب کی دنیا میں سچ اور جھوٹ کی پرکھ ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ بات بن گئی تو سچ ہے ورنہ سب جھوٹ۔ یہاں معاملہ اہل تحقیق اور شاعر کے درمیان ہے۔ اہل تحقیق چار کو چار ہی لکھتے ہیں جبکہ شاعر چار کو ایک جمع تین یا دو جمع دو یا پانچ نفی ایک وغیرہ بھی لکھ دیتا ہے۔ پھر لکھنے کے ڈھنگ ہوتے ہیں۔ کبھی ذات کو صفات کے ذریعے اجاگر کیا جاتا ہے اور کبھی صفات سے ذات کو۔ اس بات کو ناصر کاظمی ایک مثال کے ذریعے یوں واضح کرتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ

وہ آدمی نہیں شیر ہے تو شیر کی تو چار ٹانگیں اور ایک دم ہوتی ہے۔ پھر آدمی شیر کیونکر بن جاتا ہے۔ اور لوگ اسے سچ کیوں مان لیتے ہیں۔

ناصر کاظمی کا مضمون "ادیب اور معاشرتی پابندیاں" سوچ کے ایک نئے زاویے کو سامنے لاتا ہے۔ اس مضمون میں ناصر کاظمی انسان اور معاشرے کے باہمی تعلق کے حوالے سے ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان بعض ایسی ضرورتوں کے لئے جنہیں وہ خود پورا نہیں کر سکتا تھا، معاشرے کا محتاج ہے اور معاشرتی پابندیوں کا اسیر ہے۔ انسان خواہ کچھ بھی کرے وہ معاشرے کا پابند ہے اور معاشرہ اس کی ذاتی خواہشات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر حساس اور ذی شعور شخص معاشرے میں رہتا ہوا بھی اکیلا اور تنہا ہے۔ یہ تنہائی اسے شعور اور احساس کی بدولت ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نہ کسی منزل پر جا کر ایک تخلیق کرنے والے انسان کی شخصیت معاشرے سے ٹکر لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی مہذب معاشرہ نظم و نسق کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ معاشرے کے قوانین مسلم اور اٹل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی ایک مخصوص زبان اور مخصوص الفاظ تک مقرر ہیں۔ لیکن جب ایک نیا ذہن ایک نیا خیال پیش کرتا ہے تو وہ مروجہ خیالات بلکہ مروجہ الفاظ کے پرانے رشتے بھی بدل دیتا ہے۔ جس کی معاشرہ آسانی سے اجازت نہیں دیتا۔ گیلیلو ہو یا سقراط، حسینؓ ہو یا منصور، ان سب کو اپنے خیالات اور آزادی اظہار کے لئے اپنی جان دینا پڑتی ہے۔

اس تمہید سے ناصر کاظمی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان کو تخلیق کرنے کے لئے شخصی یا معاشرتی پابندیوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسی بعض معاشرتی پابندیوں کو قبول بھی کرنا ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی حیاتیاتی اور جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے معاشرے سے ایک سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ معاشرہ اپنے مروجہ اصولوں کے مطابق اس کی ضروریات پورا کرتا ہے لیکن جو شخص اپنے معاشرے کی حدود کو یکسر توڑنا چاہتا ہے وہ معاشرہ اسے قطعی طور پر قبول نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ایک تخلیق کار کو کسی ایک سطح پر معاشرے کی پابندیاں قبول کرنا پڑتی ہیں اور یوں تخلیق کی راہ میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور حائل رہتی ہے۔

ناصر کاظمی، تخلیق کار یا لکھنے والے کو ایک ملک کی طرح سمجھتے ہیں۔ ایک ملک

داخلی طور پر جس قدر خود کفیل ہوگا اسی قدر وہ بیرونی دنیا کی نظر میں معتبر ہوگا۔ جو ملک اندرونی طور پر کمزور ہوگا تو وہ لازمی طور پر خارجہ پابندیوں کا زیادہ پابند ہوگا۔ اسی طرح لکھنے والے کی شخصیت داخلی طور پر جس قدر کمزور اور محدود ہوگی اسی قدر بیرونی پابندیاں اس کی راہ میں حائل ہوں گی۔ چنانچہ اس بحث سے ناصر کاظمی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ سب سے پہلی اور بڑی پابندی لکھنے والے کی اپنی ذات ہے اگر لکھنے والے کا مطالعہ' مشاہدہ اور تجربہ کم ہے تو اس کی تحریر بھی کم پائے کی ہوگی۔ ناصر کاظمی کے اس مضمون سے پتا چلتا ہے کہ اگر لکھنے والا داخلی طور پر مضبوط اور مستحکم ہے اور تخلیقی مطالعے' مشاہدے اور تجربے کے نتیجے میں وہ پورے پاؤں پر کھڑا تو معاشرتی پابندیاں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ بلکہ وہ ان پابندیوں ہی میں اپنے لئے کوئی ایسی راہ نکال سکتا ہے جس کے ذریعے وہ آزادی کے ساتھ اپنی بات کہہ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ مطالعہ 'مشاہدہ اور تجربے سے عاری ہے اور معاشرہ اس کی تمام ضروریات پوری بھی کر دیتا ہے تو وہ ایک عام درباری شاعر اور ادیب تو بن سکتا ہے مگر تخلیق نہیں کر سکتا۔

اس پورے مضمون کا نقطہ مرکزی یہ ہے کہ معاشرے کی پابندیاں اس ادیب کے لئے ہیں جو اندر سے کمزور اور کھوکھلا ہے۔ معاشرے کی پابندیاں اسے مزید کمزور اور کھوکھلا بنا دیں گی۔ لیکن اگر وہ اندر سے مضبوط اور طاقتور ہے تو اس کی اس مضبوطی اور طاقت کے سامنے معاشرتی پابندیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ناصر کاظمی مثالوں کے ذریعے واضح کرتے ہیں کہ اصل مسئلہ معاشرے کی پابندیاں نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ ادیبوں کی کم علمی اور مشاہدے اور مطالعے سے فرار ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اتنی طاقت ہی نہیں رکھتے کہ کوئی شے تخلیق کر سکیں۔ اگر اصل مسئلہ ان پابندیوں ہی کو قرار دیا جائے تو تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ پابندیاں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں اور لکھنے والے اپنی بات لکھتے رہے ہیں۔

ناصر کاظمی کا مضمون "نئے لوگ" زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں اور نئے زمانے کے نئے تقاضوں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ مختصر مضمون نئے اور پرانے کے بیچ ایک حد فاصل کھینچ کر یہ تاثر پیدا کر کے ختم ہو جاتا ہے کہ نئے زمانے میں ہم اپنی اصل اور فطرت سے کتنے دور ہو گئے ہیں۔ ناصر کاظمی اپنے بچپن کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ ان میں دو قسم کے لڑکے تھے ایک وہ تھے جو صنعتی ترقی کے نتیجے میں ایجاد ہونے والی چیزوں کو اپنے گھروں میں دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے اور دوستوں میں آکر بڑے فخر سے ان کا ذکر کرتے تھے اور دوسری وہ جن کا فطرت کے ساتھ بہت گہرا رشتہ تھا اور وہ چڑیوں' فاختاؤں اور طوطوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اب جو زمانہ بدلا ہے اور شہر پھیلتے جا رہے ہیں تو لوگوں کا فطرت کے ساتھ رابطہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ اب سینماؤں میں لگی ہوئی فلموں کا علم ہوتا ہے لیکن گھر کے اونچے طاقوں میں رکھے ہوئے گھونسلوں اور کیاری میں کھلے ہوئے پھولوں کی خبر نہیں ہوتی۔ اب نئی فلموں اور نئی کتابوں کی خبر رکھنے کا زمانہ ہے اور کتابوں کا ذوق بھی بس اس حد تک ہے کہ امتحان پاس کر لیا جائے اور اس کے بعد کتاب سے بھی رہا سہا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔

نئے زمانے کے نئے تقاضے عورت کو بھی گھر کی چار دیواری سے نکال کر درسگاہوں اور زندگی کے بعض اہم شعبوں میں لے آئے ہیں۔ چنانچہ ہماری نوجوان لڑکیاں زندگی کی دوڑ میں بہت سرگرم نظر آتی ہیں۔ خصوصاً درس و تدریس کے میدان میں انہوں نے نمایاں ترقی کی ہے۔ لیکن لڑکیوں کے ساتھ اکثر و بیشتر یہی حادثہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیمی مشاغل سے فارغ ہو کر گھر کی چار دیواری میں سرسام ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور یوں تعلیم کا اصل مقصد پورا نہیں ہو پاتا۔ چاہیئے تو یہ کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد معاشرے کی ایک فعال رکن بن سکیں لیکن المیہ یہ ہے کہ انہیں یہ سب کچھ کرنے کے بعد گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر کچھ کرنا پڑتا ہے جو ہمارے معاشرے میں عورت ہمیشہ سے کرتی آئی ہے۔

مضمون "میر کے زمانے کی عورت" میں بھی ناصر کاظمی نے بنئے اور پرانے کے فرق کو ملحوظ رکھ کر نئے رویوں پر گفتگو کی ہے اور اس کے لئے موضوع عورت کو بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پچھلے دس سال میں پاکستان نیا پاکستان بن گیا ہے۔ ہم نے جدید انداز اختیار کر لئے ہیں۔ دس سال پہلے کی لڑکیاں خط لکھنا تو جانتی تھیں۔ انہوں نے وہ رومانوی افسانے بھی پڑھے تھے جن سے استفادہ کر کے خطوں کو موثر اور دلگداز بنایا جا سکتا تھا لیکن نئی لڑکی فلمی رسالوں سے استفادہ کرتی ہے اور خط لکھ کر بالائی مزہ لیتی ہے۔ وہ خوبصورت پیڈ پر خط لکھتی ہیں ان کی خوابگاہ پر چھاپے ماریئے تو کچھ کتابیں ملیں

گی اور باقی خطوں کا انبار جو پوسٹ نہ کئے جا سکے۔ ناصر کاظمی نے ایک بزرگ خاتون کی مثال دی ہے کہ جنہیں اس بات پر فخر تھا کہ ان کی بیٹی کے پاس خط بہت آتے ہیں۔

انٹرنیشنل فرینڈ شپ نے ڈاک کے نظام کو سنبھالا دے رکھا ہے۔ لڑکی یہ سوچ کر خط لکھتی ہے کہ "پین فرینڈ شپ" ہو رہی ہے۔ لڑکا سمجھتا ہے کہ نامہ محبت آیا ہے۔ اور نئی خط و کتابت کا یہ رنگ ہے کہ لڑکا لڑکی بن کر خط لکھتا ہے اور لڑکی لڑکا بن کر رقعہ تحریر کرتی ہے۔

نئی عورت کے اصل شناخت اس کا لباس ہے اور اسی حوالے ہی لوگ اسے ماڈرن سمجھتے ہیں۔ مگر ناصر کاظمی کے بقول یہ چست لباس تو میر کے زمانے کا ہے۔ نئی عورت کے اگر بال کٹے ہوئے نہ ہوں تو یہ ہو بہو میر کے زمانے کی عورت ہے۔ اس سلسلے میں ناصر کاظمی میر کے ان اشعار کا حوالہ پیش کرتے ہیں جن میں میر نے "تنگی پوشاک"، "تنگی جامہ" اور "تنگ پوشی" کا ذکر کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میر صاحب اسے پری تمثال کہتے ہیں اور ناصر کاظمی کے عہد میں اسے "ٹیڈی" کہا جاتا تھا البتہ لباس چست جب بھی تھا اب بھی ہے۔ میر کے زمانے میں جو کام کبوتروں سے لیا جاتا تھا وہ اب ڈاک سے لیا جانے لگا ہے۔ کام کی نوعیت میں فرق نہیں پڑا۔ لیکن جو بڑا فرق پڑا ہے وہ یہ ہے کہ پرانی شاعری میں اس بات کا ماتم تھا کہ محبوب پردے سے باہر نہیں آتا۔ اب محبوب پردے سے باہر آگیا ہے اور "لیڈیز فرسٹ" کا اصول مسلم بن گیا ہے۔ لیکن عورت کے پردے سے باہر آنے کے بعد مرد شاید پردے میں چلا گیا ہے۔ انقلابات زمانہ نے تمام معیارات بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ ناصر کاظمی نے اس مضمون میں ماضی و حال کے فرق کو بیان کر کے ہماری ان بنیادی قدروں کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے جن کے بدلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ البتہ وہ تبدیلی کے اس عمل میں ایک بات پر زور دیتے ہیں کہ

> "ہم سفری بہت خوب شے ہے۔ خلا میں بھی آدم کا بیٹا اور حوا کی بیٹی ساتھ سفر کریں تو نیک بات ہے مگر اس سفر میں یہ نہیں ہونا چاہئے کہ جنس ہی بدل جائے۔" ۶۷ے

"آج کا ادب" مضمون ناصر کاظمی نے ایک ادبی تقریب میں پڑھا۔ اس مضمون

میں بھی ناصر کاظمی نے رویوں کی تبدیلی پر بحث کی ہے۔ قوم کے حوالے سے انہوں نے کالی قمیضوں کا استعارہ استعمال کرکے عزاداروں کے جوش و خروش اور ماتمی جلوسوں کا ذکر کیا ہے جو محرم کی نویں تاریخ کو سڑک پر چلتے ہوئے ہر قدم پر راستہ روکتے ہیں۔ ناصر کاظمی ان ماتمی جلوسوں کو چودہ صدیاں پہلے کے تناظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ تب تو حضرت امام حسینؓ پر پانی بند کر دیا گیا تھا مگر آج ایسی کوئی مشکل نہیں ہے۔ آج ہمیں کوکا کولا دستیاب ہے۔ ناصر کاظمی کالی قمیض اور کوکا کولا کو دو الگ تہذیبوں کی علامت قرار دیتے ہیں مگر آج یہ دونوں علامتیں گلے مل رہی ہیں اور ان کے ملاپ سے ایک نئی تہذیب جنم لے رہی ہے۔ چنانچہ اس نئی تہذیب کے جنم لینے سے ہمارے رویوں میں بھی بنیادی تبدیلی آگئی ہیں۔ ناصر کاظمی لکھتے ہیں:

> "آج دوپہر کے وقت جب میں یہ مضمون لکھنے ہی بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے آکر میرے دروازے پر زور سے دستک دی۔ اس نے کالی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ میں قلم دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ میں نے کہا بھائی تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔ دراصل مجھے آج کے ادب کے مسئلے پر ایک مضمون پڑھنا ہے۔ وہ غصے میں کہنے لگا کہ آج محرم کی نویں تاریخ ہے اور تم ادب کا قضیہ لے بیٹھے ہو۔ آج حسینؓ اور ان کے اصحاب پر آب و دانہ بند ہے اور یزید اپنے قصر سبز میں رنگ رلیاں منا رہا ہے اور میں سوچنے لگا کہ ادب اور واقعہ کربلا کب اور کیونکر جدا ہوئے۔ کیا واقعہ کربلا ہماری زندگی کا اہم حصہ نہیں اور اگر ہے تو ادب اور زندگی ایک دوسرے کی ضد کیونکر بن گئے۔ کیا کالی قمیض پہن کر ہی واقعہ کربلا کو سمجھا جا سکتا ہے اور کیا محض نام نہاد ترقی پسند نظریات کو اپنا کر ہی ادب اور زندگی میں باہمی رشتہ ممکن ہے۔" ۷۷

ناصر کاظمی کے نزدیک ہمارے رویے تضادات کا شکار ہیں۔ ہم چیزوں کو ان کے اصل پس منظر اور سیاق و سباق سے الگ کرکے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ واقعہ کربلا کی یاد تازہ کرنے کے لئے صرف کالی قمیض پہننا ہی کافی ہے۔ یہ حالانکہ واقعہ کربلا حرکت و عمل کا پیغام دیتا ہے اور اس کا زندگی کے ساتھ اٹوٹ رشتہ

قائم ہے۔ ہمارا ادب بھی زندگی کی حقیقتوں کو نمایاں کرتا ہے۔ لہٰذا واقعہ کربلا کو ادب سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ادیب فیشن کے طور پر زندگی کا نام لیتے ہیں اور خود کو منصور حلاج ثابت کرنے میں مصروف ہیں۔ ترقی پسند ادیب واقعہ کربلا کے ڈانڈے یونانی المیے سے جا ملاتے ہیں۔ حالانکہ یونانی المیے کا ہیرو تقدیر کا تابع ہے اور کربلا کا ہیرو اپنے لئے خود شہادت کا رستہ انتخاب کرتا ہے۔ کربلا کا ہیرو، گریباں چاک کر کے لوگوں کے دل میں جذبہ ترحم نہیں ابھارتا اور نہ ہی ان سے امداد کا طالب ہوتا ہے بلکہ وہ تو چراغ گل کر کے کہتا ہے کہ جس کا جی چاہے رات کی تاریکی میں چلا جائے مگر ہمارے ادب کے حلاج شیزان میں بیٹھ کر شوق شہادت کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ پائپ کے کش لگا کر اور کوکا کولا پی کر نئے ادب کی تعمیر کر رہے ہیں اور ادب اور مذہب ان کے ہاں محض فیشن بن کر رہ گئے ہیں اور مغرب سے درآمد کئے ہوئے خیالات کو وہ ہمارے قومی رجحانات کا نام دیتے ہیں۔۔۔ ۸۷

ناصر کاظمی نے اس مضمون میں بڑی جرأت کے ساتھ اپنے عہد کے ادیب کی منافقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ان کی یہ حقیقت پسندانہ تحریر جہاں واقعہ کربلا کی اصل روح کو سمجھنے کی دعوت دیتی ہے وہاں ہمارے ادیب کو اس کی اصل ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ ادب اگر زندگی کی علامت ہے تو اسے محض شو روم کی زینت بنانا اور بڑے ہوٹلوں میں بیٹھ کر واقعہ کربلا سے اپنی پسند کا مفہوم اخذ کرنا کہاں کا ادب ہے؟ کالی قمیض کو کوکا کولا کے ساتھ ملا کر پیش کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ یہ مختصر مضمون ناصر کاظمی کے حقیقت پسندانہ رویے کی عکاسی کرتا ہے ان کے خیال میں نئی اور پرانی تہذیب کے امتزاج نے ہمیں اپنے اصل کی پہچان بھلا دی ہے۔ ہم اپنی اصلی بنیاد کو چھوڑ کر محض خلاؤں میں ادب کی عمارت تعمیر کرنے میں مصروف ہیں اور اپنی اصل کو بھلا کر مغرب سے درآمد کئے ہوئے خیالات کو قومی رجحانات کا نام دینے لگے ہیں۔ ناصر کاظمی کا مضمون ”معنی کا طلسم“ غالب کے اس شعر کی حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ناصر کاظمی کے نزدیک اس شعر میں ”طلسم“ کا لفظ اپنے بھرپور معنی کے ساتھ

وارد ہوا ہے۔ یہ "طلسم" ہی تو ہے جس کے بغیر اچھے درجے کی شاعری ممکن نہیں مگر شاعری میں یہ طلسم محض بامعنی الفاظ کو نظم کر دینے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ لفظوں کو نت نئے طریقوں سے استعمال کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعری میں لفظ کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ناصر کاظمی لکھتے ہیں:

"لفظ ایک ہرجائی معشوق کی مثال ہے جسے زندہ لوگ بولتے ہیں مگر شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ انہی لفظوں کو اپنی شاعری میں اس طرح رکھ دیتا ہے کہ وہ نئے اور تازہ معلوم ہونے لگتے ہیں اور شعر میں ان کی ترتیب ایک نیا جہان معنی پیدا کر دیتی ہے۔ جس طرح ایک امیر آدمی اپنی دولت کے بل بوتے پر کسی غریب آدمی کی محبوبہ کو اس سے چھین لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح شاعر بھی لفظوں کو عام آدمیوں کی بول چال سے اٹھا کر انہیں ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لیتا ہے۔" ۷۹

ناصر کاظمی سے زیادہ لفظ شناس کون ہو سکتا ہے۔ وہ کہ جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے لفظوں کو اعتبار بخشا ہے۔ جب یہ کہتے ہیں کہ لفظ ایک ہرجائی معشوق کی طرح ہوتا ہے تو وہ عاشق کے کندھوں پر بڑی بھاری ذمہ داری ڈال دیتے ہیں جسے اپنے رویے اور تدبیر کے ساتھ اس ہرجائی معشوق کو رام کر کے قابو میں لانا ہوتا ہے۔ یہ عاشق، شاعر ہے جو لفظوں کو ایک حسن ترتیب کے ساتھ شاعری میں رکھتا ہے اور اس سے ایک نیا جہان معنی تعمیر کرتا ہے۔

ناصر کاظمی کے نزدیک کائنات کے متعین اصولوں کی طرح لفظوں کے بھی ایک بنیادی معنی ہوتے ہیں اور ان کے استعمال کے چند اصول مقرر ہیں۔ جب ستارے اپنی گردش کے اوقات بدلتے ہیں تو موسم بھی بدل جاتے ہیں۔ ہواؤں کے رخ بدلتے ہیں۔ گرم ہوائیں خنک اور خنک ہوائیں گرم ہو جاتی ہیں۔ سمندروں میں تموج پیدا ہوتا ہے۔ نباتات، جمادات، حیوانات اور کسی حد تک انسانوں کے مزاج اور حالات بھی ستاروں کی گردش کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن تخلیقی آدمی ستاروں کی گردش کا تابع نہیں ہوتا۔ اسی طرح شاعر بھی لفظوں کے عام معنی کا ہر وقت تابع نہیں رہ سکتا۔ لفظ شاعر کی ہتھیلیوں پر آ کر ستاروں کی طرح گردش کرنے لگتے ہیں اور گنجینہ

معنی کی ٹھوس حدود سے نکل کر گنجینہ معنی کا طلسم بن جاتے ہیں۔ اپنی اس بات کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ناصر کاظمی نے ایک شعر کی مثال دی ہے:

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

اس شعر کے حوالے سے لفظوں کی طلسم کاری بیان کرتے ہوئے ناصر کاظمی کہتے ہیں کہ وہ زندگی جو ماضی میں تھی' حال میں ہے اور مستقبل میں ہوگی۔ مگر اس نے نہ تو ماضی میں انسان سے وفا کی۔ نہ حال میں اور نہ مستقبل میں وہ کسی سے وفا کرے گی۔ یہاں زندگی محض سامنے کی یا حال کی زندگی نہیں ہے جو عام انسانوں کے ذہن میں ہر وقت سطحی طور پر موجود رہتی ہے بلکہ وہ زندگی جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ مگر یہ زندگی بے وفا ہے۔ اس شعر میں "اسی" اور "وہی" کے الفاظ زندگی کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ اسی بے وفا زندگی پر لوگ آج تک جان دیتے ہیں۔ اس کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے۔ مگر یہ وہی بے وفا زندگی ہے جس نے آج تک کسی سے وفا نہیں کی۔ شعر کا مفہوم بیان کرتے ہوئے ناصر کاظمی نے "زندگی" کے لفظ کو گنجینہ معنی کا طلسم قرار دیا ہے جو زندگی کو اس کے پورے تناظر میں ہمارے سامنے نمایاں کرتا ہے۔ چنانچہ ناصر کاظمی کے نزدیک الفاظ محض گنجینہ معنی نہیں ہوتے بلکہ بقول غالب گنجینہ معنی کا طلسم ہوتے ہیں جو شاعری میں ایک نیا اعجاز اور سحر پھونک دیتے ہیں۔

"غالب کا طرفدار نہیں" مضمون میں ناصر کاظمی نے غالب سے اختلاف رائے قائم کر کے اس کے شعری نظریات پر بحث نہیں کی بلکہ اس عنوان کو استعاراتی انداز میں استعمال کر کے اپنے عہد کے ان ادیبوں کی بات کی ہے جو ہر بات کے حق میں ہوتے ہیں اور دوسروں کے مخالفت مول نہیں لیتے۔ ناصر کاظمی کو اپنے ان ہم عصروں کی یہ روش قطعی طور پر پسند نہیں جو ایک ہی سانس میں میر' غالب' انیس' فانی' اصغر' حسرت' فیض اور شیکسپیر' گوئٹے' ہومر اور ملٹن وغیرہ کا نام سن کر نشے میں سرشار ہو جاتے ہیں اور واہ وا کے ڈونگرے برساتے ہیں۔ ناصر کاظمی کے خیالات میں ہر چیز کی مخالفت کرنا بے شک ایک ذہنی بیماری کی علامت ہے مگر ہر بات کے حق میں ہونا بھی

ذہنی افلاس کی دلیل ہے۔ ان کی نظر میں ایسا ذہنی ماحول صرف افسر قسم کے ادیبوں ہی کو راس آ سکتا ہے جن کے ہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں اور ان کی نظر میں سب "اچھے" ہیں۔ ناصر کاظمی اس شخص کو سرے سے ادیب ہی تسلیم نہیں کرتے جو کسی کا مخالف نہیں۔ ان کے نزدیک ادیب کو جاننے کا یہ معیار نہیں ہے کہ اس کے مداح کتنے ہیں یا اس کی تصانیف کے ایڈیشن کتنے شائع ہوئے بلکہ اگر یہ جاننا ہو کہ وہ کس پائے کا ادیب ہے تو اس کے لئے اس کے مخالفوں کو دیکھنا ہو گا۔ آج تک دنیا میں جو شخص بھی حق بات لے کر اٹھا ہے تو شروع میں زیادہ تر لوگوں نے اس کی مخالفت کی ہے بلکہ مخالفوں ہی نے اس کی بات کو دوسروں تک پہنچانے میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس مضمون میں ناصر کاظمی نے ایک سنجیدہ موضوع کو نہایت سنجیدگی سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مضمون کے آخر میں وہ یہ کہہ کر غیر سنجیدہ ہو گئے ہیں " اس وقت تو میرا ہنسنے اور ہنسانے کو جی چاہتا ہے اس لئے چند باتوں کا اجمالاً تذکرہ کرتا ہوں جن کی مخالفت کرنے کو اکثر میرا جی چاہتا ہے۔" لیکن بات صرف جی چاہنے کی حد تک ہی ہے۔ ناصر کاظمی کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آخر میرا جی چاہنے سے کیا ہو گا۔ وہ چند باتیں ناصر کاظمی ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہیں۔

۱۔ شیخی بگھارنا اور اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنا حالانکہ راقم الحروف اس فن میں خاصا طاق ہے۔

۲۔ غالب اور یگانہ کے رنگ میں غزلیں کہنا۔

۳۔ دوستوں کی خوبیوں کو احتیاطاً" اس لئے نظر انداز کرنا کہ "دوسرے لوگ" کیا کہیں گے۔

۴۔ وقت کی پابندی کرنا اور ہر وعدے کو پورا کرنا۔

۵۔ غیر مسلموں کو کافر سمجھنا۔

۶۔ پوری اسلامی تاریخ پر حرف بہ حرف ایمان رکھنا یا اسے سرے ہی سے رد کر دینا۔

۷۔ انعام حاصل کرنے کے لئے کتاب شائع کرانا۔

ناصر کاظمی کا مضمون "میرا بائی کی بمن" اپنے مندرجات کے حوالے سے بڑا پر تاثیر مضمون ہے۔ ناصر کاظمی نے اس مضمون میں اپنے عہد کے آشوب کو جس دردناک انداز میں بیان کیا ہے وہ آنکھوں کو نم کرتا ہے اور ذہن کے خلیوں کو کھول دیتا ہے۔ مضمون کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اس کے آغاز سے لطف اٹھانا ضروری ہے۔

" ہمارے ایک چچا جان تھے۔ انہیں ہم کربلائی چچا کہتے تھے۔ ان کا شعار تھا کہ ہر برس کربلا کی زیارت کرنے جاتے تھے اور وہاں سے واپس آتے ہوئے ایک نئی بیوی لے آتے تھے۔ بچے پوچھتے "یہ کون ہے؟" کربلائی چچا کہتے' "یہ تمہاری ماں ہے۔" وہ اسے ماں سمجھتے' آداب بجا لاتے اور اس کی عزت کرتے۔ مگر برس گزرتے گزرتے پھر کربلا کا سفر ہوتا اور پھر نئی ماں آ جاتی۔ کبھی یہ ماں عربی بولنے والی ہوتی' کبھی وہ فارسی بولتے ہوئے آتی' کبھی فرانسیسی بولتی سگریٹ پیتی داخل ہوتی۔ اس گھر کے بچے عجب وبال میں گرفتار تھے کہ کس کو ماں جانیں' کس کو ماں نہ مانیں۔ اور ہمارے ایک تایا جان تھے ۱۹۴۷ء میں وہ ہجرت کر کے لاہور پہنچے۔ پہلے نسبت روڈ پر آ کر رہے تھے۔ وہاں سے وہ اٹھا دیئے گئے' پھر کرشن نگر میں ایک متروکہ مکان میں گھس گئے۔ اس مکان سے بھی نکالے گئے تو وہ شیخوپورہ چلے گئے۔ سنا ہے وہاں انہیں کچھ زمین الاٹ ہو گئی ہے لیکن پچھلے مہینے خط آیا تھا۔ پتہ چلا ہے کہ اب وہ کراچی جا پہنچے ہیں۔"۸۰

ناصر کاظمی ان دونوں واقعات کو ایک دوسرے سے ملاتے ہوئے ان میں حیرت انگیز مشابہت تلاش کرتے ہیں ان کے نزدیک دوسری داستان پہلی داستان سے مختلف نہیں ہے کیونکہ یہاں بھی مسئلہ ماں ہی کا ہے۔ کسی خاص چار دیواری' کسی خاص درخت' کسی خاص ویرانے کے حوالے سے ہم زمین سے رشتہ جوڑتے ہیں اور اپنی ماں کو پہچانتے ہیں۔ تایا جان کا احوال' کربلائی چچا کے بچوں سے مختلف نہیں کہ وہ جس چار دیواری' جس محلے' درختوں کے جس جھنڈ' گلی کے جس نکڑ کے حوالے سے زمین سے رشتہ جوڑتے ہیں وہ رشتہ بار بار ٹوٹ جاتا ہے اور اب پوری زمین ان کے قدموں کے نیچے سے سرکی ہوئی ہے۔ ناصر کاظمی اپنے تایا جان کے احوال کو پاکستان کے ہر نوجوان

کے احوال پر منطبق کرتے ہیں جس کے قدموں سے بھی زمین سرکی ہوئی ہے۔ ہمارے پاکستانی نوجوان کو ہر بار ایک نیا سبق پڑھایا جاتا ہے اور اسے ماننے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ پہلے اسے بتایا گیا کہ تمہاری ایک قومی زبان ہے۔ وہ اردو ہے۔ وہ سنتا ہے اور مان لیتا ہے۔ پھر اسے کہا جاتا ہے کہ نہیں' دو قومی زبانیں ہیں اردو اور بنگالی۔ پھر کچھ عرصے کے بعد کہا جاتا ہے کہ نہیں' ان دو کے علاوہ بھی قومی زبانیں ہیں۔ پھر کہا جاتا ہے کہ ہمارا رسم الخط ایک ہے اور وہ قرآن کا رسم الخط ہے۔ پھر یہ کہا جاتا ہے کہ نہیں ہمارا رسم الخط رومن ہونا چاہیے۔ تاریخ کے بارے میں کہا گیا کہ ہماری تاریخ اگست ۱۹۴۷ء سے شروع ہوئی۔ پھر کسی بے چین طبیعت نے کہا کہ نہیں ہماری تاریخ مغل ہند کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ پھر کہا گیا کہ نہیں ہرگز نہیں۔ ہماری تاریخ تو محمد بن قاسم سے شروع ہوتی ہے۔ اس پر کسی نے کہا کہ محمد بن قاسم تو کل کی بات ہے۔ ہماری زمین بہت قدیم ہے اس کی تاریخ تو ہڑپہ اور موہنجوداڑو سے شروع ہوتی ہے۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی تاریخ کیا تھی؟ اس معمے کو حل نہ کیا جا سکا تو اعلان کر دیا گیا کہ اصل میں ہماری کوئی تاریخ ہی نہیں ہے۔

اس صورت حال میں ہمارا پاکستانی نوجوان کربلائی چچا کے ان بچوں کی طرح ہو کر رہ گیا ہے جنہیں سال کے سال ایک نئی عورت دکھا کر کربلائی چچا "ماں" کہنے پر اصرار کرتے تھے۔ اور وہ یہ جاننے سے قاصر تھے کہ ان کی ماں کون ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم اب تک کسی ایک ماں کے حوالے سے اپنی شناخت نہیں بنا سکے۔ ہماری معاشرتی اور تہذیبی زندگی ایک عجیب طرح کے انتشار سے دوچار ہے اس کرب انگیز حقیقت کو ناصر کاظمی یوں بیان کرتے ہیں:

> "ہمارا معاشرہ بے ماں کا معاشرہ بن چلا ہے اور ہمیں دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ تم اپنی ماں سے محبت نہیں کرتے' تمہیں عاق کر دیا جائے گا۔ اس عہد کے باپ اپنے وقت کے نوح بنے ہوئے ہیں اور بیٹوں کو غرق ہونے کی منادیاں سنا رہے ہیں۔ ہمارے شب و روز کی داستان ابن خلدون کا دیوان العبر ہے۔" ۸۱ے

ان سطور میں ناصر کاظمی کے لہجے کی تلخی بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ اس

معاشرے میں رہتے ہوئے خود کو اس سے کٹا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ یہ بے ماں کا معاشرہ ہے جو یتیم ہے اور جس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی شناخت بھی نہیں ہے۔ نئی قدریں اور نئے انداز پرانی قدروں اور روایتوں کو نگل رہے ہیں۔ ناصر کاظمی کو اس بات کا بھی دکھ ہے کہ مال روڈ کے درخت کٹتے جا رہے ہیں۔ کوکا کولا کی بوتلیں سڑک کے ہر موڑ پر نظر آتی ہیں۔ پرانی نشانیاں ختم ہو رہی ہیں۔ مال روڈ سے درختوں کا سایہ اور معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی روایت کا سایہ اٹھتا جا رہا ہے۔ یہ وہ ماحول ہے جس میں آج کے ذہن کی نشوونما ہوئی ہے۔ ایک ہجرت کے بعد ہمیں اتنی ہجرتیں کرنی پڑی ہیں اور اتنی مرتبہ قبلہ بدلنا پڑا ہے کہ زمین سے ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا ہے:

"یوں لگتا ہے کہ ہمیں کسی مٹی نے پیدا نہیں کیا اور کسی ماں نے نہیں جنا۔ ہم اپنے آپ کو یتیم سمجھنے لگے ہیں۔ ہم اکیلے ہیں اور عارضی اور جھوٹی ماؤں نے ہمیں اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔ یتیمی اور تنہائی کا احساس آج کا بنیادی احساس ہے۔ یہ احساس ہم میں اتنا رچ بس گیا ہے کہ سنگت سے ہمیں نفور سا ہو گیا ہے اب تنہائی میں ہمیں مزہ آتا ہے اور کوئی خوشی اچھی نہیں لگتی۔"[۸۲]

ناصر کاظمی کا یہ دکھ ایسا ہے کہ اس کا کوئی علاج یا مداوا بھی نظر نہیں آتا۔ اسی دکھ نے اسے لوگوں کے ہجوم سے نکال کر تنہائی کے حصار میں لا ڈالا ہے۔ جہاں وہ تنہائی کا کرب بھوگ رہا ہے اور جہاں دنیا کی کوئی خوشی اسے اچھی نہیں لگتی۔ اسے اداس ہونے میں مزا آتا ہے۔ اس نے اپنے ماحول سے، اپنے معاشرے سے اپنے گرد و پیش سے اداس ہونا ہی تو سیکھا ہے۔ ناصر کاظمی کی یہ اداسی گزرے وقتوں اور گئے زمانوں کی اداسی سے بالکل جدا اور مختلف ہے۔ وہ اپنی اس اداسی کو آج کا طرز احساس کہتے ہیں۔

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

اس شعر میں اداسی کا یہی فلسفہ کارفرما ہے جو ایک فرد کی اداسی کے بجائے

پورے معاشرے کا طرز احساس بن گیا ہے۔ ناصر کاظمی کے نزدیک ہم ایک نہیں بیک وقت کئی المیوں سے دوچار ہیں۔ ہمارا کلچر کیا ہے؟ ہمارا ماضی کون سا ہے؟ ہماری تاریخ کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ کیا ہماری کوئی دیو مالا ہے؟ کیا ہماری کوئی زبان ہے؟ ہمارا رسم الخط کون سا ہے؟ ہمیں یہ بے شمار سوال درپیش ہیں اور ان میں سے ہر سوال ہمارے لئے گالی بن چکا ہے۔ لیکن ہم گالی کا جواب گالی سے نہیں دے سکتے بلکہ ہم گالی سن کر صرف اداس ہو سکتے ہیں۔ گالی ہمارے اندر اترتی چلی جاتی ہے اور ہماری روح کا دکھ بن جاتی ہے۔ ہماری اداسی ہماری روح کا دکھ ہے۔ ناصر کاظمی کے لئے اس کی اداسی میرا بائی کی بھن ہے۔ اداسی میرا بائی کا وہ بھجن ہے جو اس نے جمنا کو سنا سنا کر اسے دیو مالا بنا دیا ہے۔ ناصر کاظمی اپنی اداسی کا بھجن راوی کے پانی کو سناتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے اس مضمون میں اپنے عہد کا آشوب بیان کر کے دراصل اپنی اداسی کو جواز فراہم کیا ہے۔ ان کی اداسی بے سبب نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک گمشدہ تہذیب کی بازیافت اور خود کو تلاش کرنے کا عمل شامل ہے۔ اسی بات کو ناصر کاظمی نے اپنے ایک دوسرے مضمون "میرا ہم عصر" میں یوں بیان کیا ہے:

> "یہ اداسی کوئی ذاتی اداسی نہیں ہے بلکہ تخلیقی لوگوں کی مشترکہ تقدیر ہے۔ یہ اداسی مایوسی نہیں بلکہ خود آگاہی کی منزل کی طرف پہلا قدم ہے۔ ایک بے وحدت اور اوچھا آدمی ہجوم سے گھبرا کر گالیوں پر اتر آتا ہے مگر ایک شریف النفس اور مہذب انسان اداس ہو کر گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہی اس گناہگار معاشرے کو کیا جواب دے جس کا دل کسی بات پر نہیں دکھتا اور جس کی آنکھ کسی المیے پر نہیں بھیگتی۔" ۸۳

۶ نومبر ۱۹۶۹ء کو ناصر کاظمی نے حلقہ ارباب ذوق کے تیسویں سالانہ اجلاس میں خطبہ صدارت پیش کیا۔ یہ "خشک چشمے کے کنارے" کے نام سے ان کے مجموعہ مضامین میں شامل ہے۔ اس خطبہ صدارت میں ناصر کاظمی نے آغاز میں حلقہ ارباب ذوق کے قیام کے مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

> حلقہ ارباب ذوق میں شامل ہونے والے ادیب پرانی زنجیروں کے بدلے میں نئی زنجیریں لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہ ادیب کو یکسر طور پر آزاد دیکھنا

چاہتے تھے اسی لئے حلقہ ارباب ذوق کی طرف سے کوئی ادبی منشور شائع نہیں کیا گیا اور نہ ہی ادب کی تخلیق کے ضابطے مرتب کیے گئے جس لکھنے والے کا جو نقطہ نظر تھا وہی اس کے لئے مبارک ٹھہرا۔ پس ایک ترک رسوم کا رویہ تھا جو ان ادیبوں میں اشتراک پیدا کرتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں جس بے سروسامانی کا عالم تھا وہی بے سروسامانی حلقہ ارباب ذوق کا طرۂ امتیاز تھی۔ ادیب کے پاس اس وقت اتنا ہی ساز و سامان تھا جتنا پاکستان کے پاس تھا۔ اصل چیز ساز و سامان نہیں بلکہ آزاد ہو جانے کا احساس تھا۔ اس احساس سے کچھ خواب وابستہ تھے جو قوم کی آنکھوں میں بھی تھے اور ادیب کی آنکھوں میں بھی۔ مگر زمانے کے بدلنے کے ساتھ بہت سے لوگوں نے اپنے خوابوں کی تعبیر الاٹمنٹوں اور اونچے عہدوں میں دیکھ لی۔ خوابوں کا چشمہ جس کے کنارے ہم سب نے اکٹھے پڑاؤ ڈالا تھا' خشک ہوتا جا رہا تھا۔ اور پنچھی اڑ کر شاداب زمینوں کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں دوسرے لوگوں کے علاوہ ادیب بھی تھے اور آج صورت حال یہ ہے کہ خوابوں کا چشمہ خشک پڑا ہے اور اکا دکا ادیب ہنس کی صورت چشمے کے کنارے بیٹھا رہ گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ادیب قوم کا نمائندہ اور معاشرے کی زبان ہوتا ہے۔ میں بھی شاعر کی حیثیت سے قوم کا نمائندہ اور معاشرے کی زبان ہوں۔ لیکن پھر مجھے پتا چلتا ہے کہ میں تو ادھر خشک چشمے کے کنارے کنکر چنتا رہ گیا۔ ادھر کسی دفتر کا کوئی افسر چین' جاپان گیا' روس گیا' امریکہ گیا اور میری طرف سے بہت سی باتیں کہہ آیا اور وہاں سے پاکستانی ادیبوں کے لئے خیر سگالی کا پیغام لے آیا۔ ہم ادیب کو قوم کا نمائندہ تو کہتے ہیں لیکن اسے اس نمائندگی کا حق دینے کو تیار نہیں۔ اہل وسائل' وسائل اپنی مٹھی میں رکھتے ہیں اور مسائل ادیب کی جھولی میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ ادیب اور شاعر سے کہا جاتا ہے کہ تم قوم کے ترجمان ہو۔ قوم کے مسائل پر لکھو۔ اب یہ مسائل اور وسائل کی جنگ ہے۔ اہل وسائل شاداب وادیوں میں ہیں اور

ادیبوں کو قومی مسائل پر لکھنے کی نصیحت کر رہے ہیں۔ ادیب کی تقدیر میں خشک چشمے کا کنارہ ہے' برگد کی چھاؤں ہے اور دربدری' خاک بسری ہے۔ ادیب کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنی تقدیر کو جان لے اور اسے قبول کر لے۔ دوسری صورت میں اس کے لئے ذلت و رسوائی ہے اور بس۔

ادیب کے پاس گرچہ وسائل نہیں ہیں مگر اس کے پاس ایک وسیلہ تو ہے۔ یہ وسیلہ لفظ ہے۔ یہ ایک سو ایکواں داؤں ہے۔ سو داؤں اہل وسائل کے پاس ہیں۔ ایک سو ایکواں داؤں ادیب کے پاس ہے اور یہ تو وہ داؤ ہے جس نے فرشتوں کو سجدہ کرا دیا تھا۔ ۸۴

ناصر کاظمی نے ان سطور میں ادیب کے بے وسیلہ ہونے کے باوجود اسے اہل وسائل کے مقابلے میں سربلند کیا ہے اور یہ سربلندی اسے لفظ کے ذریعے حاصل ہوئی ہے۔ ادیب مادی اعتبار سے کمزور سہی لیکن اس کی پشت پر لفظ کی طاقت ہے جو اسے طاقتور بناتی ہے اور اس کی سامنے اہل وسائل کو نیچ دکھاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اسے ناصر کاظمی کی آئیڈیالوجی قرار دیتے ہیں ہوئے لکھتے ہیں:

"ناصر کاظمی نے ادیب کی اس زبردست قوت کا اعلان اس صورت حال کے زیرِ اثر کیا تھا جس کے مطابق ناصر کاظمی کے خیال میں قوم کے بعض افراد نے وسائل خود سمیٹ لیے تھے اور مسائل ادیبوں کی جھولی میں ڈال دیئے تھے۔ ظاہر ہے ناصر اس صورت حال کو بدلنے کے لئے لفظ کا ایک سو ایکواں داؤ استعمال کرنے کی بات کر رہا تھا۔ جس نے فرشتوں سے بھی سجدہ کرا دیا تھا۔ یہ انداز فکر ایک آئیڈیالوجی کی پیداوار نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ مثبت اور تخلیقی آئیڈیالوجی ہے۔" ۸۵

ناصر کاظمی کا یہ خطبہ صدارت ایک زبردست قومی اور ملی احساس کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ وہ اپنے دل میں قوم کا سچا درد اور خلوص رکھتے تھے۔ ایک ادیب کے پاس اس سے بڑھ کر اور سرمایہ ہو بھی کیا سکتا ہے۔ لیکن اسی معاشرے میں ادیب کے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ ناصر کاظمی کو تڑپا دیتا ہے۔ خود غرض اور مفاد پرست لوگ ملک

کے سارے وسائل سمیٹ لیں اور ادیب محض قوم کے مسائل پر لکھتا رہے۔ اس کی تقدیر میں خشک چشمے کا کنارہ ہی رہے، برگد کی چھاؤں، در بدر اور خاک بسری ہی اس کا مقدر ہو۔ ناصر کاظمی ادیب کو اس کی اصل طاقت سے آگاہ کرتے ہیں اور یہ طاقت "لفظ" ہے جو ادیب کا ایک سو ایکواں داؤں ہے۔ اہل وسائل اپنے سو داؤں آزما کر میدان مار سکتے ہیں لیکن ادیب کے ایک سو ایکویں داؤں کا مقابلہ کرنے کی ان میں ہمت نہیں ہے۔ یہ تو وہ داؤ ہے جس نے فرشتوں کو انسان کی چوکھٹ پر جھکا دیا تھا۔ ادیب کو اس داؤں کی حفاظت کرنا ہے اور اسے ضائع ہونے سے بچانا ہے کیونکہ اگر اس کی بے تدبیری سے یہ آخری داؤں بھی ضائع ہو گیا تو پھر اس کے ہاتھ کچھ نہ رہے گا۔ بقول ناصر کاظمی:

"لفظ کا وسیلہ بہت ستم ظریف ہے۔ یہ وسیلہ دوسروں کے کام آتا ہے۔ خود اہل وسیلہ کے کام نہیں آتا۔ یہ تو آم کا پیڑ لگانے والے کا قصہ ہے۔ وہ پیڑ لگا دیتا ہے پھل خلقت کھاتی ہے۔ تخلیقی لفظ کی برکتیں دیکھنی ہوں تو زندگی کے پورے عمل میں دیکھو۔"۸۶ے

ناصر کاظمی کا مضمون "ہرن کا شکار" بظاہر ایک شکار کی کہانی معلوم ہوتا ہے لیکن ناصر کاظمی نے کالے ہرن کے حوالے سے اس میں گہرا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔ ہم "شخصیت و حالات زندگی" کے باب میں پڑھ چکے ہیں کہ ناصر کاظمی کو اپنی بہادری کے قصے اور شکار کی داستانیں سنانے کا بہت شوق تھا اور بقول انتظار حسین، "ایک عرصے تک ہم سب یار ناصر کے سحر میں اس طرح رہے کہ بس سنتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔"۸۷ے چنانچہ زیر نظر مضمون میں انہوں نے ہرن کے شکار کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ بھی حیران کر دینے والا ہے۔ مضمون میں اور بھی باتیں ایسی ہیں جن پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ بیان ناصر کاظمی کا ہے۔ مثلاً

"انبالہ اور پٹیالہ ہرنوں کا گڑھ ہے۔ کئی کئی ہزار ہرنوں کی ڈاریں بیک وقت وہاں عام نظر آ جاتی ہیں۔ پٹیالے میں تو ہرن کیڑے مکوڑے کی طرح پھرتے ہیں۔"۸۸ے

"میں نے رائفل اٹھائی اور دھن سے چلا دی۔ گولی اس کی ران چیرتی

ہوئی اس کے پیٹ سے پار ہو گئی ------- میں آہستہ آہستہ اس ہرن کے پیچھے چلتا رہا اس کی انتڑیاں پیٹ سے نکل کر زمین کو چھو رہی تھیں اور وہ دو میل تک بے تحاشا بھاگتا رہا۔" ۸۹ے

مضمون میں شکار کی تیاری سے لے کر شکار کی جگہ تک پہنچنے کے تمام واقعات بیان کرنے کے بعد بالآخر ناصر کاظمی کی گولی سے ایک ہرن شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ زخمی ہو کر بھاگ نکلتا ہے۔ ناصر کاظمی زخمی ہرن کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ ہرن نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ سامنے ایک سفید سی قبر نظر آتی ہے جس پر "مزار حضرت پیر سید دھومن شاہ" لکھا ہوتا ہے۔ یہ قبر دیکھ کر ناصر کاظمی کو میر کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

آج غزال اک رہبر ہو کر لایا تربت مجنوں پر
قصد زیارت رکھتے تھے ہم جب سے وحشت رکھتے تھے

اور پھر

"دن ڈھل چکا تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر واپس جا رہے تھے۔ سامنے سے ہرنوں کی ایک مختصر سی ڈار دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ میر صاحب نے رائفل اٹھائی ان کا جوان بیٹا بھی ساتھ تھا اس نے اپنا سر باہر نکال کر کہا "ابا جی ہرن۔" ہرن وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ خاصی رات ہو گئی تھی۔ ہم سب میر صاحب کے ساتھ ان کے گھر پر گئے ان کی بیگم دوڑ کر باہر آئیں اور میر صاحب کا دامن پکڑ کر کہنے لگیں "آج کیا شکار لائے؟" ہم سب باہر کھڑے تھے۔ میر صاحب بیگم کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ انہوں نے بڑے جگرے سے کہا "آج بہت بڑا شکار مارا ہے۔ چلو اندر چلیں!" اور وہ وہیں ڈیوڑھی میں بیٹھ گئے۔" ۹۰ے

"کالا ہرن" ناصر کاظمی کے ہاں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا ناصر کاظمی کی تنہائی سے بہت گہرا تعلق ہے۔

"کالا ہرن زیادہ تر ایران میں ہوتا ہے۔ جانوروں کی دنیا میں یہ ایک نایاب مخلوق ہے۔ آہوئے تاتار یا آہوئے ختن اسی لئے مشہور ہے۔ کالا

ہرن اکثر اپنی ڈار سے الگ رہتا ہے اور اپنے مشک نافے کی خوشبو میں مگن رہتا ہے۔ اس کی خوشبو سے دور دور تک جنگل مہک جاتے ہیں۔ ۹۱

چنانچہ اس ہرن کا شکار ناصر کاظمی کے نزدیک اس تنہائی کا شکار ہے جو انسان کے گرد اداسی کا جال بن دیتی ہے اور اسے اپنے باطن کی خوشبو میں مگن کر دیتی ہے۔ یہ باطن سے ظاہر کی طرف اور فرد سے اجتماع کی طرف انسان کی مراجعت ہے۔ ناصر کاظمی کا یہ تصور خالصتہً" رومانی تصور ہے جسے انہوں نے ایک دوسری جگہ بھی بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جو ہرن زخمی ہو جاتا ہے وہ ڈار سے جلدی ہی بچھڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک آدھ میل تو وہ گرمی میں ڈار کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن پھر کسی اکیلے غار یا بنی میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہی اکیلا ہرن سب ہرنوں سے زیادہ اجتماعی شعور رکھتا ہے۔ "گویا یہ تنہائی میں اجتماع کا تصور ہے۔

(۶)

ریڈیائی فیچرز::

ناصر کاظمی کے مضامین پر ایک طویل محاکمے کے بعد ہمارے پیش نظر ان کے وہ ریڈیو فیچرز اور نشریے ہیں جو انہوں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران لکھے اور مختلف پروگراموں میں پیش کئے۔

ناصر کاظمی کے حالات زندگی سے ان کی جن ملازمتوں کا پتا چلتا ہے ان میں " ہمایوں" کی ایڈیٹر شپ اور ریڈیو پاکستان لاہور میں بطور سٹاف آرٹسٹ ملازمت ہے۔ ریڈیو کے ساتھ ناصر کاظمی کا تعلق اس وقت قائم ہو گیا تھا جب ان کی عمر صرف سولہ برس تھی۔ اس دور میں حفیظ ہوشیار پوری لاہور ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے اور انہی کے توسط سے ناصر کاظمی کا ریڈیو سے رابطہ ہوا۔

" حفیظ نے .... فوراً جیب سے ریڈیو کا کنٹریکٹ نکال کر مجھے دستخط کرنے کو کہا .... میری عمر اس وقت سولہ برس ہو گی اور میرے

پاس صرف چار پانچ غزلیں ہی اس قابل تھیں کہ کسی ادبی مجلس میں سنائی جا سکیں۔" ؎ ۹۲

سولہ برس کی عمر میں ریڈیو سے یہ کنٹریکٹ ان کی زندگی کے آخری سانسوں تک جاری رہا۔

" وہ دن اور آج کا دن ایسی سینکڑوں ہی دعوتیں مل چکی ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایسی دعوتوں کا انتظار سا بھی رہتا ہے کیونکہ رقوم کا سوال ہوتا ہے۔" ؎ ۹۳

زندگی کے آخری سات آٹھ برس میں ناصر کاظمی سٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے ریڈیو کے باقاعدہ ملازم ہو گئے۔ اس سلسلے میں منیر احمد شیخ لکھتے ہیں :

" آخر میں اس نے ریڈیو کی باقاعدہ نوکری کر لی اور وہیں پچھلے کئی برس سے وہ کام کر رہا تھا۔ ریڈیو میں اس نے "سفینہ غزل" جیسے عمدہ اور اعلیٰ سکرپٹ لکھے اور خود اپنی خوبصورت آواز میں انہیں براڈ کاسٹ بھی کیا۔ ان پروگراموں کو سن کر یقین نہیں آتا تھا کہ ناصر اتنا سنجیدہ اور باقاعدہ بھی ہو سکتا ہے جتنا کہ وہ ان پروگراموں کی پیش کش میں نظر آتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ریڈیو کی تاریخ میں اردو غزل اور اردو شاعری کے اساتذہ پر اتنے خوب صورت پروگرام شاید ہی ہوئے ہوں۔"

ناصر کاظمی نے ریڈیو کے ادبی پروگراموں "ایوان سخن"، "شہر غزل"، "بزم خیال"، "حرف و صوت"، "موج خیال"، "گل نغمہ"، "شہر غزل" اور "سفینہ غزل" کے لئے مختلف شعرا' اساتذہ غزل اور فن شاعری پر سکرپٹ لکھے اور انہیں پیش کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے نظیر اکبر آبادی' غالب' داغ' حسرت موہانی' اقبال' راشد' میرا جی' فیض کے علاوہ جن شعری مباحث کو موضوع تحریر بنایا ان میں "نئی غزل"، "اردو شاعری میں ردیف کی اہمیت"، "اردو غزل میں ہجر و وصال"، "شاعر اور خدا کی تلاش" اور "شاعر اور تنہائی" شامل ہیں۔ ان مضامین کو اگرچہ ریڈیو اور سامعین کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر تحریر کیا گیا ہے' تاہم یہ ناصر کاظمی کے ایک ایسے اسلوب کی نمائندگی بھی کرتے ہیں جو سادہ اور عام فہم ہے اور ان کی دیگر نثری تحریروں سے مختلف

ہے۔ ان کی حیثیت معلوماتی نثر پاروں کی بنتی ہے لہٰذا ان پر بحث و تجزیے کی بہت کم گنجائش ہے۔

○::○

حواشی

۱۔: خشک چشمے کے کنارے، ص:۶۰

۲۔: احمد عقیل روبی، "مجھے تو حیران کر گیا وہ"، ص:۵۴

۳۔: عبداللہ، سید، ڈاکٹر، "سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فکری و فنی جائزہ"، ص:۴۸

۴۔: سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، "معروضات"، ص:۸۷

۵۔: سرسید احمد خان، "مضامین تہذیب الاخلاق"، ج ۲، ص:۴۴۷

۶۔: سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، "معروضات"، ص:۱۵۶

۷۔: ناصر کاظمی، خطبہ صدارت حلقہ ارباب ذوق لاہور، ۵ نومبر ۱۹۶۹ء

۸۔: ناصر کاظمی، "میں کیوں لکھتا ہوں"، سویرا، لاہور شمارہ ۱۵، ۱۶،

۹۔: احمد عقیل روبی، "مجھے تو حیران کر گیا وہ"، ص:۷۰، ۷۱

۱۰۔: ناصر کاظمی "میں کیوں لکھتا ہوں" سویرا، لاہور شمارہ ۱۵۔۱۶،

۱۱۔: سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر "معروضات"، ص:۱۵۹

۱۲ ـ: ناصر کاظمی، "میں کیوں لکھتا ہوں" ، سویرا، لاہور شمارہ ۱۵ ـ ۱۶،
۱۳ ـ: ناصر کاظمی، میرا ہم عصر، ادب لطیف، نومبر ۱۹۶۲ء
۱۴ ـ: ناصر کاظمی، "میں کیوں لکھتا ہوں" سویرا لاہور، شمارہ ۱۵ ـ ۱۶،
۱۵ ـ: ناصر کاظمی، "میں کیوں لکھتا ہوں" ، سویرا، لاہور، جلد ۱۵ ـ ۱۶،
۱۶ ـ: ناصر کاظمی، "میں کیوں لکھتا ہوں" ، سویرا، لاہور، شمارہ ۱۵ ـ ۱۶،
۱۷ ـ: ناصر کاظمی، "میں کیوں لکھتا ہوں" ، سویرا، لاہور شمارہ ۱۵ ـ ۱۶،
۱۸ ـ: مظفر علی سید، "ناصر کاظمی ایک گم گشتہ نوا" مضمون مشمولہ "ہجر کی رات کا ستارہ" مرتبہ احمد مشتاق لاہور، ۱۹۷۲ء
۱۹ ـ: باصر سلطان کاظمی، تعارف انتخاب میر، مرتبہ ناصر کاظمی، لاہور ۱۹۸۹ء، ص: ۷، ۸
۲۰ ـ: صلاح الدین، شیخ، "ناصر کاظمی ایک دھیان" ، لاہور، آغاز پبلشرز، ۱۹۹۱ء، ص: ۷۰، ۷۳
۲۱ ـ: ناصر کاظمی، "میر ہمارے عہد میں" مضمون مشمولہ "خشک چشمے کے کنارے" ، ص: ۹۰، ۹۱
۲۲ ـ: ناصر کاظمی، "خشک چشمے کے کنارے" ص: ۹۲، ۹۳
۲۳ ـ: ناصر کاظمی، "خشک چشمے کے کنارے" ، ص: ۹۴
۲۴ ـ: ناصر کاظمی، "خشک چشمے کے کنارے" ، ص: ۹۸، ۹۹
۲۵ ـ: ناصر کاظمی، "خشک چشمے کے کنارے" ص: ۱۱۹، ۱۲۰
۲۶ ـ: ناصر کاظمی، "کھٹے آم کی تلاش" ، ماہنامہ نصرت، لاہور جنوری ۱۹۶۳ء
۲۷ ـ: ناصر کاظمی، ماہنامہ "نصرت" لاہور، جنوری ۱۹۶۳ء
۲۸ ـ: ناصر کاظمی، "کھٹے آم کی تلاش" ، ماہنامہ نصرت لاہور، جنوری ۱۹۶۳ء
۲۹ ـ: باصر سلطان کاظمی، تعارف، "انتخاب میر" مرتبہ ناصر کاظمی، ص: ۵
۳۰ ـ: ناصر کاظمی، "احمد مشتاق" مضمون مشمولہ "خشک چشمے کے کنارے" ص: ۵۹
۳۱ ـ: ناصر کاظمی، "احمد مشتاق" ، مضمون مشمولہ، "خشک چشمے کے کنارے"

، ص:۵۹، ۶۰

۳۲ :۔ ناصر کاظمی، ''احمد مشتاق'' ، مضمون مشمولہ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ص:۶۰

۳۳ :۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ''جدید اردو ادب'' ، ص:۱۵۱

۳۴ :۔ احمد عقیل روبی، ''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' ، ص:۱۹

۳۵ :۔ ناصر کاظمی، ''شہری فرھاد'' ، مضمون مشمولہ ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۶۱

۳۶ :۔ ناصر کاظمی ، ''شہری فرھاد'' ، مضمون مشمولہ ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۶۲

۳۷ :۔ ناصر کاظمی، ''شہری فرھاد'' ، مضمون مشمولہ ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۶۲

۳۸ :۔ ناصر کاظمی ، ''شہری فرھاد'' ، مضمون مشمولہ ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۶۲

۳۹ :۔ مظفر علی سید، ۱۹۶۳ء کے بہترین مقالات، مرتبہ انتظار حسین، عزیز الدین احمد، ص:۷۷

۴۰ :۔ سجاد باقر رضوی، ''تہذیب و تخلیق'' (دیباچہ) ص:الف

۴۱ :۔ ناصر کاظمی، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۶۳

۴۲ :۔ ناصر کاظمی، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۶۴

۴۳ :۔ ناصر کاظمی، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۶۶

۴۴ :۔ ناصر کاظمی، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۶۸

۴۵ :۔ ناصر کاظمی، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۶۹

۴۶ :۔ ناصر کاظمی، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۷۲

۴۷ :۔ ناصر کاظمی، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۷۴

۴۸ :۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تحریکیں'' ، ص:۵۸۸

۴۹ :۔ ناصر کاظمی، ''شخص اور عکس'' ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۷۶

۵۰ ـ: ناصر کاظمی ، ''شخص اور عکس'' ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۷۶
۵۱ ـ: یونس جاوید ، ''حلقہ ارباب ذوق'' ، ص:۲۷
۵۲ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۷۷
۵۳ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۷۹
۵۴ ـ: محمد حسن ، ڈاکٹر ، ''جدید اردو ادب'' ، ص:۸۷
۵۵ ـ: میراجی ، ''میری بہترین نظم'' مرتبہ حسن عسکری ، ص:۱۸۵
۵۶ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۷۹
۵۷ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۸۰ ، ۸۱
۵۸ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۱۸۷
۵۹ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۱۸۷
۶۰ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۱۹۱
۶۱ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۱۹۰
۶۲ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۱۹۳
۶۳ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۵۸
۶۴ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۷۰
۶۵ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۱۹
۶۶ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۲۰
۶۷ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۲۲
۶۸ ـ: ناصر کاظمی ، ''روایت اور انسانی ارتقا'' ، ''ہمایوں'' دسمبر ۱۹۶۲ء
۶۹ ـ: ناصر کاظمی ، ''ادب میں جمود'' ، ''ہمایوں'' ، جنوری ۱۹۵۳ء
۷۰ ـ: احمد ندیم قاسمی ، ''ناصر کاظمی اور آئیڈیالوجی کا مسئلہ'' ، ''ہجر کی رات کا ستارہ'' مرتبہ احمد مشتاق ، ص:۸۹
۷۱ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۲۸
۷۲ ـ: ناصر کاظمی ، ''خشک چشمے کے کنارے'' ، ص:۲۸
۷۳ ـ: ''اور شعرا کی جماعت ایسی ہوتی ہے کہ ان کے پیچھے چلنے والے گمراہ

ہوتے ہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ وادی وادی بے مقصد پھرتے رہتے ہیں اور وہ ایسی باتیں کہتے ہیں' جو کرتے نہیں۔"

(سورۃ الشعرا' آیت ۲۲۴ تا ۲۲۶)

۷۴ ـ: "اور ہم نے ان (پیغمبرؐ) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ وہ ان کے شایان تھی۔"

(سورۃ یٰسین' آیت ۶۹)

۷۵ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۳۲

۷۶ ـ: ناصر کاظمی' "خشک چشمے کے کنارے" ص:۵۱

۷۷ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۴۲'۴۳

۷۸ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۴۳

۷۹ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۴۰

۸۰ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۱۹۵

۸۱ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۱۹۶

۲۲ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۱۹۷

۸۳ ـ: ناصر کاظمی "میرا ہم عصر" "ادب لطیف' نومبر ۱۹۶۲ء

۸۴ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ' ص:۱۱

۸۵ ـ: احمد ندیم قاسمی "ہجر کی رات کا ستارہ" از احمد مشتاق ص:۸۸

۸۶ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۱۱

۸۷ ـ: انتظار حسین "ہجر کی رات کا ستارہ" مرتبہ احمد مشتاق' ص:۳۱

۸۸ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۴۵

۸۹ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۴۸

۹۰ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۴۹

۹۱ ـ: ناصر کاظمی "خشک چشمے کے کنارے" ص:۴۴

۹۲ ـ: ناصر کاظمی "نقوش" شخصیات نمبر (حفیظ ہوشیار پوری) ص:۱۱۰۷

۹۳ ـ: ناصر کاظمی "نقوش" شخصیات نمبر (حفیظ ہوشیار پوری) ص:۱۱۰۷

باب پنجم

گئے دنوں کا سراغ

□☆::☆□

ناصر کاظمی کی گفتگو، مکالمے اور غیر مطبوعہ ڈائریاں::

(الف)

ناصر کاظمی کی گفتگو اور مکالمے::

ناصر کاظمی کے مکالموں پر گفتگو سے پہلے ان مکالموں کے پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔ ناصر کاظمی کی شخصیت کے باب میں ان کے دوستوں سے التفات اور محفلیں جما کر طویل گفتگوؤں کے سلسلے قائم کرنے کا ذکر ہوا۔ ناصر کاظمی کا ریڈیو کی باقاعدہ ملازمت اختیار کرنے تک یہی چلن رہا کہ وہ راتیں جاگ کر گزارتے اور سڑکوں پر چلتے ہوئے، پارکوں اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر گفتگو کا ایسا رنگ جماتے کہ سننے والے مسحور ہو جاتے۔ بہت کم ایسا ہوا کہ انھیں اپنی گفتگو کے لئے احباب میسر نہ آئے ہوں

لیکن جب کوئی نہ ہوتا تب بھی ان کا یہ کلام جاری رہتا۔ فطرت سے، درختوں سے، شہر سے، سڑکوں سے۔ رات ڈھلنے لگتی، ستارہ سحری نمودار ہوتا تو یہ کلام اس سے ہوتا۔ ناصر کاظمی کی گفتگو کا اعجاز اپنا رنگ دکھاتا اور ان کی شخصیت کا جادو سرچڑھ کر بولتا۔ شیخ صلاح الدین نے "ناصر کاظمی ـــ ایک دھیان" میں اس اعجاز اور سحر کا خوب ذکر کیا ہے۔

" ناصر سے تنہائی میں گفتگو کر کے مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ میں نے اپنے اندر ایک نئے جہان کا انکشاف کیا ہے، طاقت کا ایک نیا سوتا پھوٹ پڑا ہے۔ خوبصورت، بامعنی، متنوع اور تخلیقی گفتگو دوسرے کے منہ سے سننے اور اس کو قبول کر لینے کی ناصر میں اتھاہ صلاحیت تھی۔ وہ ایسی گفتگو کی روانی میں کسی وجہ سے بھی حائل نہ ہوتا تھا۔ وہ ایسی آواز کے لئے ہمہ تن کان بن جاتا تھا اور اس آواز کے ماخذ کے گرداگرد ایسی حفاظتی دیوار چن دیتا تھا کہ کوئی تیسرا شخص کبھی مخل نہ ہوتا۔ وہ صحیح معنوں میں دوستی، تنہائی اور تخلیق کا محافظ تھا ـــــــ "۱ے

"اس کی گفتگو میں ڈرامے کا اظہار بہت کم اور انکشاف کا مزا بہت زیادہ ہوتا۔ ایسی حالتوں میں ہم دونوں کی گفتگو انکشاف کے جہد کی ایک بھرپور کوشش بن جاتی ہے۔ اس کا سانولا چہرہ، مینار نور کی روشن آنکھ، اس کی آواز کا لحن طلسم کشائی کا اسم اور یہ پوری کوشش خود آگاہی کا ذریعہ بن جاتی ـــــــ "۲ے

"ـــــــ میری فضائے یاد میں اس کے جسم کی حرکات و سکنات کی کوئی ایسی تصویر نہیں ابھرتی جس میں اس کی روح جھانکتی ہو کیونکہ وہ اظہار کے لئے اپنے جسم کے مختلف اعضا کو بہت کم استعمال میں لاتا تھا، صرف اس کے ہونٹ ہلتے تھے اور ان میں سے پھوٹتی ہوئی، ابلتی ہوئی آواز اور الفاظ کا بہاؤ۔ اس کو اپنی آواز اور الفاظ پہ عبور پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ شاید ہی ہاتھوں، شانوں، آنکھوں، ابروؤں یا نتھنوں کو بروئے کار لاتا لیکن اس کے باوجود آخر انسان ہی تو تھا۔ کبھی کبھی، کسی فرار ہوتے ہوئے لمحے کے

لئے، اس کی آنکھوں میں چمک کوندتی، اس کی پلکیں تھرتھراتیں، اس کے سانولے سے چہرے پر شفق پھوٹتی۔ یہ سب کچھ اس کی گفتگو میں وہی کردار ادا کرتے جو اس کی شاعری میں سکوت اور خاموشی۔ یہ اس کی گفتگو اور اس کی آواز کے زیر و بم کو ایک نیا بعد دے دیتے جو بالکل ہی غیر متوقع ہوتا اور ناقابل فراموش ــــــ" ۳ے

"ناصر بے ترتیب مگر عجیب و غریب گفتگو اتنے اعتماد سے کرتا تھا کہ ایک شام سعید محمود کو یہ کہنا پڑا:"

"تم اگر یہ بھی کہو کہ درختوں سے ٹینک پھلوں کی صورت لٹک رہے تھے تو مجھے یقین آجائے گا۔"

اس کو اس طرح کی گفتگو کا شوق شاید اس لئے تھا کہ ایسی فینٹسی Fantacy بھری گفتگو کے دوران وہ بہت ہی حکیمانہ باتیں کر جاتا تھا جس کی قدر و قیمت کا اسے لمحہ بہ لمحہ شعور ہوتا تھا ــــــ اس طرح کی گفتگو کو ناصر نے اپنا اسٹائل بنا لیا جو بیشتر دوستوں اور ہم نشینوں کے لئے پل صراط کے سفر سے کم نہ تھا۔ جو اس پل صراط سے پورے دھیان سے گزر لیتا وہ ناصر کو اتنا عزیز ہو جاتا کہ وہ اس سے اس اسٹائل میں بات نہ کرتا بلکہ صاف، شفاف اور دو ٹوک مگر Imaginative گفتگو کرتا۔ ایسے دوستوں سے مکالمہ کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ مکالمے کے ذریعے سے دونوں انجانے جہاں اپنے اندر تلاش کرتے، منکشف کرتے اور ان کو شعور کے روبرو حاضر کرتے۔" ۴ے

"ــــــ آدھی رات کے بعد ناصر کا تخیل جاگتا تھا اور جادو جگانے کے لئے مچل مچل جاتا تھا۔ تنہائی میں جادو جگانے کا کیا مزا۔ جنگل میں مور ناچے تو مور اور مورنی تو یقیناً لطف اٹھاتے ہوں گے، مگر جادو جگانے کے لئے ناظرین کی اشد ضرورت ہے کیونکہ ناظرین کی آنکھوں میں جادو کا اثر پھوٹتی ہوئی روشنی سے جگایا جاتا ہے اور یہ روشنی جادو جگانے والے تخیل کو پر لگاتی ہے اور جادو جگانے کے بعد طلسم باندھنے پر مائل ہو جاتا ہے۔ ناصر کی باتیں ہر رات نیا طلسم باندھتی تھیں۔ اگرچہ نیند بہت پیاری تھی مگر ناصر

کی آواز کا جادو چلنے نہ دیتا تھا۔۔۔۔۔۔۔" ۵

"ناصر کی باتوں کو صرف اسی کے لب و لہجہ اور اسی کے الفاظ میں' اسی کی ترتیب الفاظ میں بیان کیا جائے تو پھر ان کے جادو کی تاثیر کا علم ہو سکتا ہے۔ ان کو اپنی زبان میں بیان کرنا اس لئے ممکن نہیں کہ میں نے نہ تو کبھی ڈائری لکھی اور نہ کبھی دوسرے ذرائع سے ناصر کی باتوں کو ریکارڈ کرنے کی کوشش کی۔" ۶

درج بالا سطور ایک ایسے شخص کے قلم سے تحریر ہوئی ہیں جو بیس بائیس برس تک ناصر کاظمی کی محفلوں میں شامل اور ان کی گفتگوؤں میں شریک رہا ہے۔ اور پاک ٹی ہاؤس' ڈین ریستوران' لوہاری کے چائے خانوں' میٹرو ہوٹل اور سڑکوں' راستوں پر پیدل سفر کے دوران ناصر کاظمی کی مسلسل گفتگو کے اسیر شیخ صلاح الدین کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کے توسط سے ناصر کاظمی نے بے شمار انگریزی کتب کا مطالعہ بھی کیا۔ جن کی فہرست انہوں نے اپنی کتاب کے آخر میں دی ہے۔ گفتگو کے لئے مطالعہ اور مشاہدہ بے حد ضروری ہے۔ لیکن ناصر کاظمی کے مکالموں اور گفتگو سے کہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کتابوں سے پڑھے ہوئے جملے دہرا کر سننے والوں کو حیرت میں ڈال رہے ہیں۔ سننے والوں میں انتظار حسین' حنیف رامے' شیخ صلاح الدین' مظفر علی سید' احمد مشتاق اور سجاد باقر رضوی جیسے لوگ ہوں تو کہنے والے کو بہت سنبھل کر احتیاط سے بات کرنا پڑتی ہے۔ اردو شاعری کی پوری کلاسیکی روایت ان کی انگلیوں پر تھی اور ان کے حلقہ احباب میں ایسے لوگ بھی تھے جو اساتذہ کے دیوانوں میں اترے ہوئے تھے۔ چنانچہ ایسی محفلوں میں نئی بات کہنا ہی مشکل کام تھا۔ یہ ناصر کاظمی کے تخیل کی سحر کاری تھی کہ پڑھے لکھے لوگ ان کی گفتگو سننے کے لئے شب گزیدگی کے عمل میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ ناصر کاظمی کی گفتگو اور مکالمے ان کے تخلیقی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے مطالعے کے بغیر نہ تو ان کی شخصیت کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس تخلیقی واردات کو محسوس کیا جا سکتا ہے جس میں سے ناصر کاظمی نے خود کو گزارا۔ ناصر کاظمی کی گفتگو اور مکالموں کی اہمیت جاننے کے لئے ہم انتظار حسین سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب میں نے پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنا شروع کیا تو مجھے پتا چلا کہ ناصر اتنا اکیلا نہیں ہے جتنا اکیلا وہ مجھے پت جھڑ کی دوپہر میں نظر آیا تھا۔ وہ تو چلتی پھرتی انجمن ہے۔ جہاں بیٹھ جاتا ہے وہاں ایک محفل آراستہ ہو جاتی ہے۔ ہوٹل میں بیٹھے تو ہوٹل میں یاروں کا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ ہوٹل سے نکل کر کسی گھاس کے تختے پر جا بیٹھے تو گھاس پہ بھا جم گئی۔ اکیلا تو میں تھا۔ اندر مستقبل موسم یاد کی اداس ہوا چلتی رہتی تھی۔ باہر دوسرا ہی موسم تھا۔ ترقی پسند ادیب تقسیم کے جواب میں ناقابل تقسیم تہذیب اور انسان دوستی کے راگ الاپ رہے تھے۔ عسکری صاحب نے پاکستانی ادب کی بات کرتے کرتے اسلامی ادب کا مضمون باندھنا شروع کر دیا تھا۔ میں بھی تھوڑا اس بحث میں الجھا مگر گم شدہ چہروں نے ناصر کو پت جھڑ میں اداس ہوتے دیکھا اور اپنے اندر کی بات باہر لایا۔ "ناصر صاحب! ہمارے ادھر شاما چڑیا ہوا کرتی تھی۔ وہ یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔"

"شام چڑی"؟ ناصر چونکا "شام چڑی کی کیا بات ہے۔" اور پھر اسے شاما چڑیا کو ایسے بیان کیا کہ میں نے جانا کہ شاما چڑیا کو میں نے اب دیکھا ہے ۔۔۔۔۔۔ شاما چڑیا پاکستان میں ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ کیا پاکستان میں ساون کی جھڑی لگتی ہے اور کیا یہاں کی برسات کی شاموں میں مور کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ پاکستان میں سرسوں کیسے پھولتی ہے اور بسنت کا آسمان کیسا ہوتا ہے۔ یہ میرے سوالات تھے مگر ترقی پسند ادب اور اسلامی ادب کی بحثوں میں مجھے ان کی معنویت کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ان کی معنویت کو میں نے ناصر کی صحبت میں بیٹھ کر جانا۔ مگر ناصر موسم یاد کی اداس ہوا میں چلتا چلتا کہیں آگے نکل گیا تھا۔ اس نے اپنے اندر ایک باغ اگا لیا تھا۔ باہر کی ساری کمی اس باغ کے اندر پوری ہو گئی تھی۔ ناصر جب اس باغ کی سیر کراتا تو میرے اپنے سوال معطل ہو جاتے۔ ہم سب دوست کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتے۔ کبھی کبھی ہم میں سے کوئی ایک حیرت کے ساتھ سوال کرتا۔ مگر ناصر اس طرح وضاحت کرتا کہ اگر کسی دل میں کوئی تھوڑا بہت شک پیدا

ہوتا تو وہ فوراً ہی زائل ہو جاتا۔"ے۷

ناصر کاظمی کو لوگ جادو گر کہتے تھے' لفظوں کا جادوگر۔ اس کی جادوگری نے کتنے سامری جت کر دیئے اس کی پھینکی ہوئی رسیاں سانپ بن کر کتنے اژدھوں کو نگل گئیں۔ منیر احمد ش کا بیان ملاحظہ ہو:

"مجھے دراصل اس کی جادوگری نے اپنی طرف کھینچا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر تھا ہی جادوگر۔ شاعری ہو یا نثر یا ٹیبل ٹاک وہ رسیاں پھینکتا جاتا اور سانپ نکلتا جاتا ایک بار جو بھی اس کے طلسم میں آگیا پھر وہ باہر نہیں نکل پاتا تھا۔"ے۸

بالآخر وہ وقت آ ہی گیا جب ناصر کاظمی کے ساتھ گفتگو میں شریک ہونے والوں کو اس امر کا احساس ہوا کہ ان گفتگوؤں کا قلم بند ہونا کتنا ضروری ہے۔ شیخ صلاح الدین کے بقول "یہ خیال سب سے پہلے ناصر کاظمی ہی نے پیش کیا کہ ہم لوگ جو آپس میں گفتگو کرتے ہیں اس کو اگر کوئی ہم میں سے قلم بند کر لیا کرے تو خوب رہے۔ سب نے تجویز کو پسند کیا اور طے یہ پایا کہ احمد مشتاق گفتگو کو قلم بند کیا کرے گا۔ اور ناصر' انتظار' حنیف اور میں گفتگو کریں گے۔ لہٰذا اس کے مطابق اگلے دن سے احمد مشتاق کاغذ اور قلم لے کر آ گیا۔ ڈین میں ' میٹرو میں گفتگو قلم بند ہونے لگی۔ چند ہفتوں کے بعد جب مسودہ پڑھنے کی کوشش کی گئی تو احمد مشتاق بھی اپنی تحریر نہ پڑھ سکا۔ حنیف نے اپنا ذمہ لیا کہ وہ اس مسودے سے صاف مسودہ تیار کرنے کی کوشش کرے گا۔ کچھ مہینوں کے بعد چودھری نذیر احمد کے کانوں میں بھنک پڑی کہ ہم نے اپنی گفتگو قلم بند کی ہے۔ ان کا اصرار ہوا کہ مسودہ صاف کر کے انہیں دیا جائے۔ وہ سویرا میں اس کو شائع کریں گے ــــ حنیف اور میں نے طے کیا کہ بجائے پہلی گفتگو کے مسودے کو شائع کرنے کے' کیوں نہ کسی موضوع پر نئی گفتگو سویرا کے دفتر میں قلم بند کی جائے۔ ہم دونوں نے آپس میں طے کیا کہ ٹی۔ ایس ایلیٹ کے مشہور مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" کا ترجمہ کرایا جائے۔ اس میں مختلف ادیبوں سے اس حوالے سے مضامین لکھوائے جائیں اور ناصر' انتظار حسین' حنیف اور میں اس عنوان کے حوالے سے اردو کے عظیم شاعروں پر مکالمہ کریں۔ ایلیٹ کے مذکورہ مضمون کا

ترجمہ مختار صدیقی سے کرایا گیا اور خود ان سے ایک مضمون لکھوایا گیا۔ ان کے علاوہ عبادت بریلوی، شاد عارفی، پروفیسر محمد حسن، سجاد ظہیر، عارف عبدالمتین، ظہیر کاشمیری اور مظفر علی سید سے مضمون لکھوائے گئے۔ مکالمہ "سویرا" کے دفتر میں کیا گیا جو ہفتے بھر میں مکمل ہوا۔ اس مکالے میں کاتب کے فرائض حنیف، انتظار اور ناصر نے ادا کئے۔ جب ایک کلام کرتا تو باقی دو کاتبوں میں سے ایک لکھتا جاتا۔ کاتب خود اگر چاہتا تو ایک آدھ فقرہ بول دیتا۔ اس مکالے سے ہم سب مطمئن تھے مگر ناصر پھر بھی چاہتا تھا کہ اس کے مسودے پر کئی دن غور کرے آخر اس نے غور کرنے کے بعد مسودہ واپس کر دیا اور تجویز کیا کہ اس کا نام "خوشبو کی ہجرت" رکھ دیا جائے۔ یہ نام میں نے اپنے زیرِ تحریر ناول کے لئے تجویز کر رکھا تھا۔ مگر ناصر کے اصرار پر اس نام پر اتفاق کر لیا گیا۔" ۹ے

اس کے بعد سویرا کے اگلے شمارے کے لئے ناصر کاظمی، حنیف رامے، شیخ صلاح الدین اور انتظار حسین نے ایک اور مکالمہ کیا۔ اس مکالمے کا نفس مضمون، سفر تھا چنانچہ اسی مناسبت سے اس کا نام "رفتار کا بدن" تجویز ہوا۔ ان دو مکالموں کی اشاعت کے بعد ان چار ادیبوں کے مابین اور کوئی مکالمہ نہیں ہوا۔

بقول شیخ صلاح الدین:

" ان دو مکالموں کے بعد تیسرا اور چوتھا مکالمہ اس لئے نہ ہوا کہ مکالمے کے تصور سے انتظار حسین اور ناصر کو تکبر کی بو آتی تھی اور تکبر کے خیال سے وہ ڈر گئے کیونکہ مکالمے تو افلاطون نے لکھے تھے یا پھر مہاتما بدھ سے منسوب ہیں جو ہم تک پہنچے ہیں۔" ۱۰ے

"خوشبو کی ہجرت" اور "رفتار کا بدن" کے علاوہ ناصر کاظمی اور انتظار حسین کے درمیان چار گفتگوؤں کا سراغ ملتا ہے۔ ان گفتگوؤں کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صلاح الدین لکھتے ہیں:

" ان مکالموں کے بعد ناصر اور انتظار نے مختلف موضوعات پر اپنی گفتگوئیں لکھی ہیں۔ مگر یہ گفتگوئیں شرکاء کی ذکا کرتی نظر نہیں آتیں کیونکہ یہ دونوں شرکاء کی بہترین صلاحیتوں اور پنہاں صلاحیتوں کو بروئے کار

نہیں لا پائیں۔ مکالمہ ایسی ہی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا ناصر زیادہ عرصہ انتظار حسین کے ساتھ گفتگوؤں کے معاملے میں تعاون نہ کر سکا۔"۔۱۱

انتظار حسین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گفتگوئیں جو بقول شیخ صاحب "دونوں شرکاء کی بہترین صلاحیتوں اور پنہاں صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا پائیں۔" "خوشبو کی ہجرت" اور "رفتار کا بدن" والے مکالمے سے پہلے ہو چکی تھیں۔ اس سلسلے کی پہلی گفتگو جب مئی ۱۹۵۴ء کے "ماہ نو" کراچی میں چھپی تو شیخ صاحب کی تعریف پر ہی دوسری گفتگو ہوئی جو اسی برس ستمبر کے "ماہ نو" میں شائع ہوئی۔

"میں نے شہ پائی اور سوال کر ڈالا کہ غالب کی یہاں عندلیب اور قمری تو ہیں مگر کیا مرغی کے بچے کا بھی ذکر ملتا ہے؟ اس پر ناصر رواں ہو گیا اور مشتاق نے جھٹ پنسل جیب سے نکال کاغذ پھیلا کر لکھنا شروع کر دیا ------ خیر تو یہ گفتگو قلم بند ہوئی۔ ناصر نے کہا یہ ہماری ٹیبل ٹاک ہے۔ اسے چھپنا چاہیے۔ وہ ٹیبل ٹاک "ماہ نو" میں چھپی اور پھر لاہور سے کراچی تک ہم پر بے بھاؤ کی پڑتی چلی گئیں۔ مگر شیخ نے اس غیر ثقہ گفتگو میں ایک علمی ثقاہت کا رنگ دیکھا۔ اس پر ہم اور شیر ہو گئے۔ پھر ٹیبل ٹاک ہوئی اور پھر "ماہ نو" میں چھپی۔

خیر شیخ صاحب نے تو حوصلہ افزائی کی تھی مگر حنیف رامے کو خوب پتا تھا کہ ان ٹیبل ٹاکس میں علم کی کتنی کمی اور فلسفے کا کتنا فقدان ہے۔ پھر اس کمی کو پورا کرنے کا یہ طریق احسن بندوبست ہوا "سویرا" کے دفتر میں بیٹھ کر "خوشبو کی ہجرت" نام والا مکالمہ ہوا۔ جس میں شیخ صاحب، ناصر کاظمی، حنیف رامے اور اس ہیچمداں نے شرکت کی۔ اور غالب احمد اور احمد مشتاق نے ایک ایک فقرہ بول کر اس میں گراں قدر اضافہ کیا۔"۔۱۲

ان سطور کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اولاً "خوشبو کی ہجرت" اور "رفتار کا بدن" سے پہلے دو مکالمے "غالب اور ہم" اور "دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف" قلم بند ہو کر شائع ہو چکے تھے۔ ثانیاً" شیخ صاحب نے پہلے مکالمے پر شرکاء

گفتگو کی تعریف کی اور ان کی حوصلہ افزائی کی جس کے نتیجے میں بقول انتظار حسین اپنی اس گفتگو سے مطمئن نہ تھے اور حنیف رامے کو خوب پتا تھا کہ ان ٹیبل ٹاکس میں علم کی کتنی کمی اور فلسفے کا کتنا فقدان ہے۔ بہرحال یہ بات طے ہے۔ کہ "خوشبو کی ہجرت" کا محرک یہی تھا کہ ایسے مکالمے باضابطہ طور پر ہونے چاہئیں اور شرکاء ان میں تیاری کر کے شامل ہوں۔ چنانچہ "سویرا" کے دفتر میں اس امر کا اہتمام ہوا جہاں چودھری نذیر احمد کے انتظامات کے تحت یہ لوگ اکٹھے ہوئے اور باضابطہ گفتگو کی۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ناصر کاظمی اور انتظار حسین کے درمیان ہونے والے مکالمے غیر معیاری تھے۔ ان مکالموں کا اپنا رنگ ہے بلکہ ہماری رائے میں ان مکالموں میں شرکاء کا بے ساختہ پن زیادہ نمایاں ہے اور ان سے ناصر کاظمی کی اصل گفتگو زیادہ وضاحت سے سامنے آتی ہے۔

اس سے پہلے کہ ان مکالموں کا جائزہ پیش کیا جائے ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد دراصل اس شک پر قائم ہے جو ناصر کاظمی کی گفتگو سن کر ان کے کئی دوستوں کو ہو جاتا تھا۔ انتظار حسین نے اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے:

"ناصر اس عہد کے محیرالعقول واقعات سناتا تھا اور ہم دم بخود سنتے رہتے تھے ۔۔۔۔۔۔ رفتہ رفتہ ہم نے حیرت کی منزل سے نکل کر شک کی منزل میں قدم رکھا ۔۔۔۔۔۔ خیر شک کرنے اور سوال اٹھانے کی یہ منزل تو بہت بعد میں آئی تھی۔ ایک عرصے تک ہم سب یار ناصر کے سحر میں اس طرح رہے کہ بس سنتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔" [۱۳]

دوستوں کا یہ شک اپنی جگہ پر درست تھا کیونکہ ناصر کاظمی اپنی گفتگو کے دوران بعض ایسے واقعات بیان کر جاتے تھے جو حقیقت سے بہت دور ہوتے تھے۔ اسی شک کی بنا پر مظفر علی سید نے ایک مفروضہ قائم کر لیا:

"ناصر کے بارے میں یہ داستان بہت عام ہے کہ وہ بے حد کاہل آدمی تھا اور کسی اور کی لکھی ہوئی تحریر کا مطالعہ کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اگرچہ ادھر ادھر سے سنی سنائی معلومات کو وہ اتنے اعتماد کے ساتھ ذاتی

دریافت بنا کر پیش کر سکتا تھا کہ بڑے بڑے شک کرنے والے پہلو بدلنے کے سوا کچھ بھی ردعمل ظاہر نہ کر سکیں۔" ۔۱۴

مظفر علی سید کے اس مفروضے پر بات کرتے ہوئے شیخ صلاح الدین کہتے ہیں:

" یہ کہنا غلط ہے کہ ناصر نے محض سنی سنائی معلومات کو اپنی ذاتی دریافت بنا کر پیش کر دیا تھا۔ وہ بہت گہرا مطالعہ کرنے کا عادی تھا۔ وہ نہ صرف اردو شاعری کی پوری کلاسیکی روایت سے واقف تھا بلکہ اساتذہ کے ضخیم کلیات کے عمیق مطالعے نے اسے گہرا فنی شعور عطا کر رکھا تھا۔ وہ انگریزی سے نابلد نہیں تھا بلکہ مجھ سے تقریباً سو سے زائد انگریزی کتب لے کر اس نے پڑھیں اور ان میں سے اکثر کے بارے میں اس نے کہا کہ یہ میں واپس نہیں کروں گا۔ چنانچہ میں نے بھی نہ صرف اسکی زندگی میں بلکہ اس کے مرنے کے بعد بھی ان کتب کی واپسی کا تقاضا نہیں کیا۔" ۔۱۵

شیخ صلاح الدین کے اس بیان کی روشنی میں مظفر علی سید کے مفروضے کو قبول کرنے کی قطعی گنجائش نہیں رہتی۔ یہاں چلتے چلتے ایک دلچسپ واقعہ بھی سن لیجئے۔ راوی شیخ صلاح الدین ہیں:

" ناصر کاظمی کی محفل میں مظفر علی سید اردو کے گمنام اور غیر معروف شعرا کا تعارف کرایا کرتا تھا۔ یقین، قائم چاند پوری وغیرہ بعض شعرا کے یہاں سے وہ وجودیت کا فلسفہ ڈھونڈ لایا کرتا تھا۔ جب کسی شاعر کا ذکر بہت ہو چکتا تو ناصر اس کی سب سے مشہور یا اچھی غزل کی زمین میں بہت ہی اچھی غزل کہہ دیتا اور وہ شاعر ناصر کی محفل سے رخصت کر دیا جاتا۔ مظفر علی سید نے چند ماہ قائم چاند پوری کا بہت رنگ باندھا۔ اس کی زمینوں میں غزلیں کہیں۔ لیکن جب چینیز میں ناصر نے چپکے سے بغیر کسی اعلان یا ذکر کے، قائم کی سب سے اچھی زمین میں اپنی وہ غزل سنائی جس کا مطلع ہے۔

جب تلک دم رہا ہے آنکھوں میں
ایک عالم رہا ہے آنکھوں میں

تو مظفر علی سید بہت ناراض ہوا۔ اس کے بعد ناصر کی محفل میں

قائم چاند پوری کا کبھی ذکر نہ آیا۔"۔۱۶

ناصر کاظمی کی گفتگو پر شک تو کیا جا سکتا ہے کہ اکتساب علم کے لئے "شک" بہت ضروری ہے لیکن اس شک کا فائدہ اٹھا کر یہ کہنا کہ "کسی اور کی لکھی ہوئی تحریر کا مطالعہ کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا" ناصر کاظمی کے ساتھ صریحاً" زیادتی ہے۔ احمد عقیل روبی لکھتے ہیں:

" ناصر کاظمی پڑھے لکھے شاعر تھے۔ ہندو اور یونانی دیومالائی داستانیں انہیں ازبر تھیں۔ کالی داس اور میرا بائی کا گہرا مطالعہ تھا۔ انگریزی' فرانسیسی اور جدید شعرا کے کلام پر نظر رکھتے ہیں لیکن انہیں عالمی ادب کی چیدہ چیدہ خصوصیات کو اپنے اسلوب کے کپڑے پہنا کر پیش کرنے کا فن آتا تھا۔"۔۱۷

یہاں چند مثالیں ملاحظہ ہوں

خوشبو کی ہجرت ::

اس مکالے کا پس منظر گزشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے۔ "سویرا" کے دفتر میں ناصر کاظمی' شیخ صلاح الدین' حنیف رامے اور انتظار حسین نے ٹی۔ ایس ایلیٹ کے مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" کو بنیاد بنا کر یہ مکالمہ کیا۔ اس مکالمے کے تمام شرکاء کی علمی بصیرت اور موضوع کے تمام پہلوؤں پر گرفت اس کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے۔ شیخ صلاح الدین نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے موضوع کے حوالے سے چند بنیادی باتیں کیں۔ مثلاً ایک وحشی سماج میں فنکار کی تخلیق کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں اور تخلیق محض گونگے کا خواب ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ ایسی تہذیب میں زبان صرف سماجی اعمال کے عکس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ فن کار کے لئے ضروری ہے کہ جس تہذیب کے اندر وہ تخلیقی کام کرنا چاہتا ہے اس کی زبان میں اتنی صلاحیت ہو کہ وہ سماجی اعمال اور ان کے ردعمل کی کسی اور سطح پر قلب ہیئت کر سکے۔ اس پر ناصر کاظمی نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا وحشی تہذیبوں میں فن کا وجود اور احساس بالکل نہیں تھا۔ اور انہیں تہذیب کہنا جائز ہے؟

اس کا جواب شیخ صاحب یوں دیتے ہیں کہ تہذیب کا تصور علم انسانیت سے اخذ ہے اور کسی بھی معاشرے کو اصطلاحاً" تہذیب کہتے ہیں۔

حنیف رامے نے ایک سوال اٹھایا کہ کیا کسی فنکار کے لئے روایت کا تصور صرف اس کی اپنی صنف سخن کی روایت تک محدود ہوتا ہے؟ یعنی کیا ایک مصور کے سامنے صرف مصوری کی روایت ہی ہے یا وہ اپنی روایت میں دوسرے فنون کی روایتوں کو بھی شمار کر سکتا ہے اور کیا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی روایت کے اجزائے ترکیبی میں اس کے اپنے میدان کی روایت شامل نہ ہو۔

ناصر کاظمی نے اس سوال پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ فنکار کے لئے دوسرے فنون کی روایتوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ انہوں نے اپنی مثال دیتے ہوئے کہا کہ میں تو موسیقی اور مصوری کو بھی اپنی روایت سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصوری اور موسیقی انسانی تہذیب کے لاشعور میں محفوظ رہتی ہیں اور ان کے شعور کا اظہار شاعری ہے۔ شعور، لاشعور کے بغیر اندھا ہے۔ یوں موسیقی اور مصوری کو شاعری کی آنکھیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ روایت دراصل پورے اجتماع کے ماضی اور حال کے تجربات کی گونج ہے خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے میں پھیلی ہوئی ہو۔ محض پرانے شاعروں کو پڑھ لینے سے تو سیدھی سادی غزل گوئی ہی نکل سکتی ہے۔

انتظار حسین نے ناصر کاظمی کی اس بات سے اتفاق کیا۔ تاہم انہوں نے روایت کے مفہوم میں زیادہ توسیع کرتے ہوئے اسے فنون کے علاوہ دوسری چیزوں پر بھی پھیلا دیا۔ اور کہا کہ انجن ھاری کی گھریا بچپن کی سرتیاں بھی میری روایت کا حصہ ہیں اور یہ کہ میں نے نظیر کو اکثر افسانہ نگار کی طرح پڑھا ہے۔

شیخ صاحب کا خیال تھا کہ یہ کسی فن کار کی تمام انسانی اور فنی صلاحیتوں پر مبنی ہے کہ اس نے کیا کیا کچھ کہاں کہاں سے لیا۔ دنیا کے عظیم فنکاروں کی روایت کی سلطنت کی حدود زمان و مکان سے بے نیاز ہوتی ہیں۔

ناصر کاظمی نے روایت کی پاسداری کے حوالے سے ایک مثال کے ذریعے اپنا نقطہ نظر یوں پیش کیا کہ جب پہلی بار انسان کو دریا پار کرنے کی ضرورت پیش آئی ہوگی تو ظاہر ہے اس نے لکڑی کو کسی نہ کسی طرح استعمال کیا ہوگا۔ دوسری بار کسی نے کشتی

قسم کی کوئی چیز بنا دی ہو گی جو پانی میں تیر سکے۔ اب تیسری بات یہی رہ گئی کہ کشتی کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور کشادہ بنایا جائے اور وہ آسانی سے گہرے پانیوں میں سے گزر کر صحیح و سلامت ساحل تک پہنچ جائے۔ یوں دریا پار کرنے کی ایک روایت بن گئی اور آج تک موجود ہے۔ کشتیوں نے بھی بڑے بڑے جہازوں کی شکل اختیار کر لی۔ یہ جہاز خود بخود چلنے لگے۔ اب اس طرح کی کشتیاں بنالینا کوئی تخلیقی کام نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ سمندر کے پار کرنے کے لئے ہم تمام روایت سے الگ طریقہ نکال سکتے ہیں۔

حنیف رامے نے اب تک کی گفتگو پر صاد کرتے ہوئے فنکار کی روایت کو اپنے فن اور دیگر سارے فنون کی روایت تک محدود کرنے کے بجائے اسے انسانی تجربہ قرار دیا۔ انسان نے جو کچھ سیکھا ہے فنکار اس میں سے نئی نئی باتیں نکالتا ہے یہ نئی باتیں نئے رشتے ہیں جو وہ ان انسانی تجربات کے ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل سے ڈھونڈتا ہے۔

شیخ صاحب کا نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ سب کچھ صحیح تو ہے مگر فنکار کے محض انسان ہونے سے متعلق ہے ایک انسان کے بیشتر اعمال اس کی سماجی اور حیاتیاتی ضرورتوں کی تسکین کے لئے وجود میں آتے ہیں جبکہ فنکار کے اعمال بحیثیت فنکار ان ضرورتوں میں سے کسی ضرورت کی تسکین نہیں کرتے۔ فنکار اپنے ذاتی تجربات' اپنے سماج کے تجربات' اپنی نسل کے تجربات کو بعینہ استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ ان کی ہیئت اور اس ہیئت کے قلب کو بدلتا ہے۔ اور بدلی ہوئی شکل کو اس طرح ترویج دیتا ہے کہ رشتوں کا ایک نظام وجود میں آ جاتا ہے اور پھر رشتوں کے اس نظام کو کسی بھی ذریعہ ابلاغ کے راستے کسی خاص طبقے کے ذہنوں تک پہنچاتا ہے۔ تاکہ وہ نظام ان کے اذہان میں ایک بار پھر جنم لے اور پروان چڑھے اسی لئے آج تک فنکار اور سماج کا رشتہ امن و امان کا نہیں جنگ و جدل کا ہے۔

اس موقع پر حنیف رامے نے ایک اہم سوال اٹھایا کہ تیسرے درجے کے لکھنے والے انسانی تجربے کو کوئی فنکارانہ قالب عطا نہیں کر سکتے چنانچہ پڑھنے والوں کے لئے اپنے آپ کو اس لکھنے والے کے ساتھ چلانا بڑا آسان ہوتا ہے لیکن جب پڑھنے

والے کا واسطہ کسی بڑے فنکار سے پڑتا ہے اور وہاں اسے کسی مقام پر بھی اپنے ذاتی احساسات اور جذبات کا عکس نظر نہیں آتا تو پھر وہ اس فنکار کی تحریروں سے کیسے لطف اندوز ہوتا ہے؟

ناصر کاظمی نے اس مسئلے پر بات کرتے ہوئے کہا کہ یہاں بھی روایت اپنا کام کرلیتی ہے۔ تیسرے درجے کا لکھنے والا محض روایت کا سہارا لے کر روایتی انداز میں روایتی جذبات کا اظہار کرتا ہے اور پرانے ماہرین فن کے جچے تلے مفروضوں کو بغیر ہضم کئے اگل دیتا ہے۔ تیسرے درجے کے لکھنے والے کے قاری بھی تیسرے درجے کے انسان ہوتے ہیں۔ تیسرے درجے کا لکھنے والا روایت کو محض موروخوں کا زبدہ سمجھتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں اور عام انسان بھی اپنے جذبات کے ہجوم میں اپنے جذبات کی داد دیتا ہے اسے شاعری یا ادب سے کوئی سروکار نہیں۔ فنکار کا روئے سخن کسی ایسے اناڑی قاری کی طرف نہیں ہوتا کیونکہ وہ روایت کو جہاں اپنے ماضی کا جیتا جاگتا سرمایہ سمجھتا ہے وہاں وہ اسے مستقبل کی Water Supply کا منبع بھی سمجھتا ہے۔

شاعر کا کام تو نئے تجربات اور حقائق کو جانے پہچانے جذبات سے منسلک کرنا ہے۔ ہر تخلیق حال ہے۔ فنکار کا یہی کام ہے کہ وہ ماضی کو حال بنا دے اور اس میں وہ تمام تجربات سمو دے جو مستقبل کے سرچشمے بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ فنکار ایک وسیع المشرب شخصیت کی طرح اپنے اندر دو چیزوں کا احساس ضرور رکھتا ہے۔ ایک درخت دوسری پرندہ۔ پرندہ اڑ کر نادیدہ زمانوں کی خبر لاتا ہے اور ان کے اسما پھر اسے آ بتاتا ہے۔ درخت دن بدن بڑھتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی مدد سے ایک تخلیقی شخصیت کسی فن پارے کو وجود میں لاتی ہے۔ وہ لکھنے والا جو نئے حقائق دریافت کرتا ہے اور انہیں جانے پہچانے جذبات سے منسلک کرتا ہے وہ عام آدمی کو ایک دم متاثر نہیں کر سکتا۔ عام آدمی کو تو جانا پہچانا' محفوظ کیا ہوا' میٹھا رس بھرا جذبات کا گنا چاہئے۔

انتظار حسین نے قصہ چہار درویش کی ایک کہانی سے بات نکالی۔ بادشاہ اپنی ساتوں بیٹیوں سے پوچھتا ہے کہ تم مجھے کیسا چاہتی ہو؟ چھ بیٹیوں کا جواب ایک سا تھا۔ ہم تمہیں میٹھے کی طرح چاہتے ہیں۔ یہ چھ بیٹیوں کا انداز نظر ایک ایسے لکھنے والے کا طرز عمل ہے جس کے پاس اپنی طرف سے کہنے کے لئے کوئی بات نہیں ہوتی۔ ساتویں

بیٹی اس پٹی ہوئی روایت سے گریز کرتی ہے اور کہتی ہے کہ میں تو تمہیں نمک کی طرح چاہتی ہوں۔ یہ ایک زندہ اور بڑے فنکار کا طرز عمل ہے اور یہاں سے قاری اور فنکار کے درمیان جنگ و جدل شروع ہوتا ہے۔ بادشاہ اس قاری کی علامت ہے جو اس نئی حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔

یہاں شیخ صاحب' ناصر کاظمی اور انتظار حسین کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہیں کہ ان دونوں نے جو کچھ کہا ہے وہ حنیف کے سوال کا مکمل جواب نہیں پھر شیخ صاحب اپنے عالمانہ انداز میں بعض باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے ایک بچے کا تصور پیش کرتے ہیں۔ جو چیزوں کو توڑتا پھوڑتا ہے۔ چیزوں سے کھیلتا ہے اور اکثر و بیشتر تنہائی میں کسی اور شخص کی موجودگی کے بغیر باتیں کرتا ہے۔ یہ تمام اعمال اس کی کسی بہت بڑی ضرورت کی تسکین کرتے ہیں۔ اس تسکین کا سماجی جواز ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ لہٰذا بچہ فنکار کو سمجھنے کی پہلی منزل ہے۔ کیونکہ بچے اور فنکار میں ایک بات مشترک ہے کہ بچے کے اعمال اور فنکار کی تخلیق' بادی النظر میں سماجی محرکات نہیں رکھتے۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ وہ صلاحیت کیا ہے جس کی وہ شکلیں بچے کے اعمال اور فنکار کی تخلیق کی تسکین ہوتی ہیں۔ دونوں اپنے تجربات کو ایسی شکل دینا چاہتے ہیں کہ جو ان کے اندر موجود کسی خاص سطح پر زندہ ہو سکیں اور یہ سطح ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ فرق یہ پڑتا ہے کہ انسان پروان چڑھنے کے ساتھ ساتھ حیاتیاتی اور سماجی ضرورتوں کی تسکین کو خود اپنی کوششوں سے مہیا کرنے پر مجبور ہے اور ان ضرورتوں سے وجود میں آئے ہوئے اعمال کے دھندے میں یہ سطح اس کے شعور سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اس کے استعمال کرنے کی ضرورت اسے شاذو نادر ہی پڑتی ہے۔ بچہ بہ حیثیت بچے کے اور فن کار بہ حیثیت فنکار کے ان ضرورتوں سے بے نیاز ہے۔

ایک فن کار اپنی زندگی میں ہر لمحہ اور ہر لحظہ فن کار نہیں ہوتا چند لمحوں کو مستثنا کر کے وہ ہمیشہ انسان رہتا ہے اور اپنے عام تجربات انسان کی حیثیت سے حاصل کرتا ہے۔ فن کار کے مسائل پر سوچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی ان دو حیثیتوں کو خلط ملط نہ ہونے دیں۔

حنیف رامے نے شیخ صاحب ہی کی بات میں پیوند لگاتے ہوئے کہا کہ ایسے

لمحات ایک عام انسان پر بھی بیت سکتے ہیں لیکن فن کار وہی ہے جس نے ان لمحات کو کسی نظام میں پرویا ہے اور اس نظام کے ذریعے نئے اصول ڈھونڈے ہیں۔ یہ اصول صرف اس فنکار کی اپنی صنف پر ہی منطبق نہیں ہوتے بلکہ ان کا دائرہ عمل دوسرے فنون اور زندگی کے دوسرے شعبوں تک پھیلا ہوتا ہے۔

اس کے بعد حنیف رامے نے اگلا سوال یہ اٹھایا کہ ہماری روایت کیا ہے؟ اردو شاعری کی روایت کیا ہے؟ شیخ صاحب نے اس سوال پر گفتگو کرتے ہوئے تاریخ کے حوالے سے بات کی۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کی سرزمین پر یکے بعد دیگرے کئی نسلوں، تہذیبوں اور زبانوں نے جنم لیا۔ ہر حملہ آور اپنے ساتھ اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنا نظریہ حیات لے کر یہاں پہنچا اور تہذیبوں زبانوں اور نظریات کے باہمی میل ملاپ اور جنگ و جدل سے ایک نئی زبان، تہذیب اور نظریہ حیات وجود میں آتا رہا۔ ہندوستان میں ہر دور میں بیک وقت دو زبانیں رائج رہی ہیں۔ ایک عالمانہ زبان اور دوسری عام زبان۔ اسی میل جول سے ایک نئی زبان بنی جو جذبات و خیالات کے تخلیقی اظہار کے لئے استعمال ہونے لگی۔ اسی طرح مزید انقلابات اور تبدیلیوں کے عمل سے زبان کی نوعیت بدلتی رہی۔ اردو زبان اسی طرح وجود میں آئی۔ اس زبان کے استعمال سے حاصل کردہ تجربات فن کاروں کے لئے ان کے فن کا مواد ہے اور ان فن کاروں نے بحیثیت انسان اپنی کارفرما صلاحیتوں کے باہمی اظہار سے مرتب شدہ رشتوں کو فن کی شکل دینے کی کوشش کی اور ان فن پاروں میں انہوں نے ضرورت کے لحاظ سے زبان اور تہذیب کے سرچشموں تک پہنچنے کی سعی کی تاکہ وہ ماضی اور مستقبل کو ایک مقام پر جمع کر سکیں۔ یہ مقام اتصال ہمیشہ حال ہوتا ہے۔ ماضی ایک معنوں میں روایات ہوتا ہے اور اسی طرح ایک مستقل تجربہ۔ جو فنکار روایت اور تجربے کو ایک جگہ جمع کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا وہ اپنے فرض میں ناکام رہتا ہے۔ اردو زبان میں اپنی فطرت کے لحاظ سے پھیلنے کے لئے بہت ہی زیادہ امکانات ہیں۔ اس زبان میں ان تمام تجربات کو بیان کرنے کی صلاحیت ہے جن کا تعلق زمینی اور کائناتی ضرورتوں سے ہے اس کا ثبوت اردو زبان میں اظہار شدہ ادب، شاعری اور دوسری اصناف اظہار سے دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اس کا ثبوت شاعری میں تلاش کرنے کی کوشش کریں تو مجھے اور

سمجھانے میں آسانی رہے گی۔

انتظار حسین نے یہ خیال پیش کیا کہ زبان وہ جو مٹی سے اگے۔ زبان سے جب تک اس مٹی کی خوشبو نہ آئے جس میں اس نے جنم لیا تو وہ زندہ زبان نہیں ہو سکتی۔

حنیف رامے نے خیال ظاہر کیا کہ جہاں اردو زبان میں مادے اور روح دونوں کے اظہار کے امکانات موجود ہیں وہاں انسانی جذبات کے تمام مظاہر بھی اس میں اظہار پا سکتے ہیں۔ اب یہ زبان اپنے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی عناصر کی بدولت شخصیت کا مکمل اظہار کر سکتی ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں شخصیت کا صرف وہ حصہ اظہار پاتا ہے جسے Anima کہتے ہیں اور غیر ہندوستانی زبانوں میں وہ حصہ اظہار پاتا ہے جسے Animus کہتے ہیں اردو میں ان مختلف عناصر کے تعامل سے سارے انسانی جذبات کا اظہار ممکن ہو گیا ہے۔

ناصر کاظمی نے اردو زبان کے لسانی قواعد کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس زبان کے لسانی قواعد تمام زبانوں سے منفرد' جامع اور اٹل ہیں اور فارسی' عربی اور سنسکرت زبانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان زبانوں نے اردو میں جو اضافہ کیا ہے وہ ایک تو رسم الخط ہے جو سیدھا سادا فارسی عربی کا ہے اور دوسرا تصورات کا۔ لیکن اس سے زبان کی اپنی حیثیت تو جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ اردو زبان میں سے اگر ہندی کے 'کا' 'کے' 'کی' نکال دیں تو ساری زبان کی عمارت ڈھ جائے گی۔ ورنہ اس کی مثال یہی رہے گی کہ:

خانہ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا

اسی تسلسل میں شیخ صاحب نے کہا کہ ان تمام امکانات کو اردو شاعری میں جس شخص نے سب سے پہلے پوری طرح اظہار بخشنے کی کوشش کی ہے وہ میر ہے۔ میر حسب نسب کے اعتبار سے عربی ہے' سید ہے اور اس کے آباؤ اجداد اس کے وجود میں آنے سے پہلے چار نسلوں تک عالم تھے اور علم کو ذریعہ عزت سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ذہن کے اعتبار سے صحیح معنوں میں عالم ہے۔ اپنے جذبات کی سطح کے لحاظ سے ایک پورا آدمی ہے اور اپنی کارفرما صلاحیتوں کے امتزاج کی ساخت اور نوعیت کے لحاظ سے شاعر

ہے۔ وہ اپنے شاعر ہونے کو بہت بڑی نعمت سمجھتا ہے اور اس نعمت سے کفران کرنے کے لئے قطعاً" تیار نہیں ہے۔

شاعر ہونے کی حیثیت سے' عالم ہونے کی حیثیت سے اور بھرپور انسان ہونے کی حیثیت سے اظہار کے لئے ہر قسم کے ذرائع سے عمل پیرا ہونا چاہتا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ ایسے سماج میں جنم لیتا ہے جہاں تضاد اور فساد کی طاقتیں قوت آزما ہیں اور سماج کا پورا نظام رو بہ انحطاط ہے اور وہ سماج اس کی شاعرانہ اور انسانی شخصیت کو مواقع مہیا نہیں کرتا بلکہ اس کے اظہار کے رستے بند کرتا ہے۔ اگر میر کا سماج ایک پر امن سماج ہوتا تو اس کی تخلیقات کی نوعیت بالکل مختلف ہوتی اس کے ہاں پورے دن کا سا ماحول نظر آتا جہاں ہر شے روشن ہوتی اور ہر شے کا مقام متعین کیا جا سکتا مگر اس کی تخلیقات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک پوری رات تھی جس میں بجلی بار بار چمکتی ہے اور کبھی کائنات کا ایک پہلو منور کرتی ہے اور کبھی دوسرا۔ اس کوندے میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ ہر اس فن کار کو جو فن کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے ایک گہرا دکھ بھرا درد دیتا ہے۔ جسے بھولنے کے باوجود نہیں بھلایا جا سکتا۔

میر کی بات چلی تو ناصر کاظمی بھی پہلو بدل کو گویا ہوئے۔ میر اردو کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے زبان کو شاعر بنایا۔ دراصل وہ شاعر کے ساتھ ساتھ زبان ساز بھی تھا۔ اس اعتبار سے اس کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ میر نے اپنی زبان اور اپنی زبان کے ادب کی تمام روایتوں کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ ان سے ایک حد تک رشتہ بھی قائم رکھا۔ اردو زبان کے قواعد اور مزاج کو دیکھتے ہوئے اس نے ہندوستانی زبانوں کو پوری اہمیت دی۔ جب اسے بیک وقت اپنے دل و دماغ کی بات کرنی ہوتی تو اس نے فارسی اور عربی تہذیب کی آواز کو اپنے اظہار میں سمویا۔ جب وہ بحیثیت انسان اپنے آپ کو ہندوستان کی جغرافیائی حدود میں پھولتا پھلتا دیکھتا ہے تو ہر خیال کے ساتھ ہر لفظ کو اس طرح پرکھتا ہے کہ ع۔

آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

یہاں وہ اپنی دھرتی سے پیار جتاتا ہے۔ محض شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ اس دھرتی کی بات کرتا ہے اور بحیثیت مسلمان وہ اپنے طرزِ عمل کا بے جھجک اظہار کرتا

دکھائی دیتا ہے۔ اس کا سماج کی طرف رویہ یہ ہے:

دیں گالیاں انھی نے وہی بے دماغ ہیں
میں میر کچھ کہا نہیں اپنی زبان سے

روایت کے متعلق اس کے یہ دو شعر دیکھئے:

نکتہ دانان رفتہ کی نہ کہو
بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات

کس کا روئے سخن نہیں ہے ادھر
ہے نظر میں ہمارے سب کی بات

میر کی زبان پر بات کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا کہ جب وہ بحیثیت ایک بھرپور انسان کے اپنے تجربات کا ذکر کرتا ہے تو اس کی زبان پر ہندی زبان کا اثر نظر آتا ہے اور جب وہ بحیثیت شاعر کے اپنے مقام سے بولتا ہے تو اس کی زبان الفاظ اور آواز و آہنگ کے اعتبار سے فارسی و عربی سے مشتق نظر آتی ہے۔

ناصر کاظمی نے شیخ صاحب کی اس بات کی تائید میں میر کے کلام سے دو مثالیں پیش کیں۔ جو ان کے دونوں پہلوؤں کی تائید کرتی ہیں۔

۱۔ بن جو کچھ بن سکے جوانی میں
رات تو تھوڑی ہے بہت ہے سانگ

۲۔ مقدور تک شراب سے رکھ انکھڑیوں میں رنگ
یہ چشمک پیالہ ہے ساقی ہوائے گل

آ گیا عشق میں جو پیش نشیب اور فراز
ہو کے میں خاک برابر اسے ہموار کیا

میر سے گفتگو چلی تو نظیر پر آ گئی۔ شیخ صاحب نے نظیر کو اس عہد کا دوسرا بڑا شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ نظیر اپنے جذبات کی سطح کے لحاظ سے چھوکرا ہے۔ وہ اپنے

جسم اور احساسات سے پہلی بار شعوری طور پر آشنا ہوتا ہے اور وہ ہر واقعے کو ایک کائناتی حادثہ سمجھتا ہے۔ اسے ہر حادثے میں ایک ہنگامے کی شکل نظر آتی ہے۔ وہ ہر ہنگامے میں شامل ہو کر ناچتا کودتا ہے اور جب تھک جاتا ہے تو واپس آ جاتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کے ہر ہنگامے پر ایک عام انسان کی طرح ناچتا ہے اور اس کو بحیثیت شاعر اظہار بخشتا ہے اور اس اظہار کے لئے اسے ایسی زبان کی ضرورت تھی جس میں آواز و آہنگ ایسا ہو کہ کان بند کر لینے پر بھی سنائی دے۔ وہ ہندوستانی زبانوں سے ایسے الفاظ ڈھونڈتا ہے جن میں آواز ہے' آہنگ ہے' شور ہے۔ اسی طرح وہ غیر ہندوستانی زبانوں میں سے الفاظ نکال نکال کر لاتا ہے اور جب ان کو ہیئت دیتا ہے تو ان کا باہمی امتزاج ایک بامعنی شور کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

نظیر کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انتظار حسین کہتے ہیں کہ نظیر اردو شاعری کی سلطنت کی ساتویں شہزادی ہے۔ اس نے ایک پوری روایت کو رد کر کی ایک نئی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے ایک نیا دسترخوان بچھایا ہے جس پر بے شمر نمکین کھانے چنے رکھے ہیں۔ یہاں تک کہ گندل کا ساگ اور مکئی کی روٹی بھی موجود ہے۔

میر و نظیر کے بعد شیخ صاحب' غالب کا نام لیتے ہیں۔ ان کے بقول غالب ایسے سماج میں پیدا ہوا جہاں سماج اور سلطنت کی چولیں اور میخیں اکھاڑی جا رہی تھیں۔ ایک نئی تہذیب' ایک نئی قوم' ایک نئی زبان اور ایک نیا نظریہ حیات اس سماج پر چھا جانے کو تھا۔ غالب اپنے آباؤ اجداد کے پیشے کے لحاظ سے سپاہی تھا اور سپاہی کو جنگ' فتح اور کبھی کبھی شکست سے بہرہ ور اور دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے جذبات ایک ایسے ذہین بچے کے سے ہیں جو ہر چیز پر قبضہ چاہتا ہے۔ ہر نعمت سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے۔ ہر آسائش کو اپنا حق سمجھتا ہے اور جب اسے مایوسی ہو تو کہرام مچاتا ہے۔ لڑنے مرنے پر تل جاتا ہے اور اس کے بعد منہ بسورے کسی کونے میں تخیلات کی دنیا میں کھو جاتا ہے جہاں اسے آخری پناہ ملتی ہے۔ وہ بادشاہ کا مقرب بننا چاہتا ہے اس لیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے امتزاج کی ساخت اور اس کی نوعیت کے لحاظ سے تخت دلی پر جلوہ افروز ہونے سے قاصر ہے۔ وہ ایک ذہین بچے کی طرح اپنے احباب کو موہ لینے کی کوشش کرتا ہے ان کی نظروں کو خیرہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اسے تمام نعمتیں

اور آسائشیں مہیا کر دیں جو وہ خود مہیا نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی شاعری کو نعمت تو سمجھتا ہے لیکن کسی بڑی نعمت کے عوضانے میں اپنی نعمت کو چھوڑنے پر تیار نظر آتا ہے۔ اس کی اردو شاعری میں جہاں بھی جذبات اور احساسات کا ادراک ہے وہاں اس کی تصرف پسندی صاف جھلکتی ہے۔ وہاں تو وہ فرماں روائے کشور ہندوستان پر بھی کمند ڈالنے سے نہیں چوکتا۔ تصرف پسندی کا اظہار وہ قصیدوں تک میں کرتا ہے۔

ناصر کاظمی نے غالب کی تصرف پسندی کے حوالے سے بات کو آگے چلایا۔ ان کے بقول یہ تصرف پسندی صرف غالب ہی تک محدود نہیں' یہ تو ہر انسان چاہتا ہے۔ غالب اور حکومت کی ٹکر محض سیاسی نہیں تھی وہ بادشاہ کا استاد یا وزیر بھی نہیں بننا چاہتا تھا بلکہ وہ تو بادشاہ کا رقیب بننے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہاتھی کی سواری کو اس کا جی بھی چاہتا تھا لیکن ماہر لسانیات کا الزام لینا اسے ہرگز قبول نہ تھا۔ بادشاہ کو دراصل شاعری نہیں سیکھنی تھی وہ تو زیادہ سے زیادہ لفظوں کی نوک پلک کے بارے میں استفادہ چاہتا تھا۔ یوں بھی ان دنوں کسی استاد کو بھی بے استادا ہونا گوارا نہ تھا۔ پھر یہ ا ہے کہ عجم کا ایک سرو رواں بلی ماراں کے کوچے میں خاک پھانکتا پھرے اور لال قلعہ میں زاغ و زغن کہرام مچائیں۔ ساری لڑائی یہی تھی اور غالب کے رشک کا Thesis یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ پھر غالب کی جوان آرزوؤں کی چلتی پھرتی تصویر بھی تو لال قلعہ کے کسی گوشہ میں رونق افروز تھی۔

بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار یار میں
فرمانروائے کشور ہندوستان ہے

یہاں زبان دانی کا کیا کمال دکھایا ہے۔ یار کے معنی آفرینندہ کائنات بھی ہیں ہادی و رہبر بھی' دوست بھی' بادشاہ بھی اور لال قلعہ کی ایک غارت ایمان بھی۔ جب روئے سخن ایسی ایسی جم جاہ شخصیتوں کی طرف ہو تو بھلا بھجن اور کرت کی نرم و نازک اور رسیلی زبان کس طرح اس کے جذبات کا ساتھ دیتی۔ لال قلعہ کے دروازوں کو یا تو ہاتھی توڑ سکتے تھے یا عربی و فارسی لفظوں کا آراستہ و پیراستہ لشکر۔ وہ تو امیر خسرو ہی تھے کہ سیدھے سادے بھلے مانس گدھے پر سوار ہو کر بستی بستی امن و آشتی کے نغمے سناتے تھے اور ان کا نام چاروں دانگ بجتا تھا۔

غالب میر صاحب کی عزت ذرا اس لئے کر لیتا ہے کہ وہاں سے اس نے بھی فیض پایا ہے۔ کہیں تو سیدھے سادے مصرعے ہی اڑا لئے ہیں' کہیں زمینیں ہی گول کردی ہیں اور کہیں تراکیب جوں کی توں رکھ لی ہیں لیکن یہ مصرعے' تراکیب' زمینیں وہی ہیں جن میں غالب کو اونچے ڈھب کی غزل کا مواد نظر آتا ہے۔ غالب کے شاعرانہ تخیل میں اس کے احساسات' اس کے جذبات اور تصورات ایک بہت بڑے لشکر کی طرح قطاریں بنائے مسلح و لیس مارچ کرتے سنائی دیتے ہیں۔ اس شور سے غالب کو اپنے آپ پر پاگل ہونے کا گمان اگر ہو تو وہ بے چارہ حق بجانب ہے اور اس احساس سے بچنے کے لئے اسے ضرورت پیش آئی ہوگی کہ وہ یہ دیکھے اور تلاش کرے کہ اردو کی روایت میں اسے کوئی اس جیسا مل سکتا ہے یا نہیں۔ میر کی شاعری کا وہ حصہ جہاں میر کو اپنے شاعر ہونے کے فرائض سے عمدہ برآ ہونے کا شدید احساس ہے اور اس نے اس کا اظہار کیا ہے اور وہاں جو زبان اس نے استعمال کی ہے اس کے طمطراق اور شوکت میں غالب کو اپنے جذبات کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ لہذا اسے میر سے انس بھی ہوتا ہے اور وہ اس کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھتا اور سیکھتا ہے۔ اس طرح روایت کے ایک حصے کو غالب نہ صرف ایک نئی زندگی دیتا ہے بلکہ اس کے امکانات میں اضافہ کرتا ہے۔

اس کے بعد شیخ صاحب اقبال کی بات کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں اردو شاعری میں جس جس قسم کی شخصیت نے اظہار پایا ہے۔ ان تمام شخصیتوں کے نقوش اقبال کے کلام میں محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ مگر اقبال نہ تو ان سب کا ملغوبہ ہے اور نہ صرف انہی کا ایک امتزاج۔ اس کے یہاں ان شخصیتوں کے سوا اور بھی کئی شخصیتیں ہیں۔ اسے تصورات میں بحیثیت تصورات کے اتنی گہری دلچسپی ہے کہ وہ ان کے منطقی اور مابعد الطبیعاتی رشتوں سے ایک نظام بنانا چاہتا ہے۔

ناصر کاظمی اقبال کے کبوتروں کے حوالے سے بات کرتے ہیں کہ اقبال کو جب دونی ملتی تھی تو آڑیوں سے کنی کاٹتا اور دونی کا کبوتر خرید کر جیب میں بھر لیتا۔ اقبال کی شاعری میں کبوتر نے بہت ساتھ دیا ہے بلکہ شاہین کو بھی اپنی بلندیوں سے زمین پر اتارا ہے۔ یہیں سے اقبال کی شاعری میں ایک نیا فلسفہ جنم لیتا ہے۔ غالب نے حویلیوں پر

پتنگ بازی کی۔ نظیر نے بھانت بھانت کا جانور پالا اور میر نے بھی پرندوں سے داد سخن چاہی اور اپنے آپ کو راج ہنس کے روپ میں دیکھا اور یہ آرزو بھی کی کہ مرنے کے بعد مرغ چمن اس کی تربت پر پھول بکھیر کر حق صحبت ادا کرے۔

انتظار حسین کو پالتو کبوتر پر اعتراض تھا جو کوٹھیوں اور چھتریوں تک ہی رہتا ہے۔ آسمان پر جاتا بھی ہے تو سیٹی کے اشارے پر لوٹ آتا ہے۔ اور تالی کے زور سے اونچا اٹھتا ہے۔ ان کے نزدیک کبوتر تو جنگلی ہوتا ہے جو چھتوں، چھتریوں، کوٹھیوں اور منڈیروں کو خاطر ہی میں نہیں لاتا اور پورب اور پچھم کی دنیا سے نکل کر آسمانوں کا رخ کرتا ہے۔ پالتو کبوتر زمین کا جانور ہے۔ ایک محدود زمین۔ اقبال کے یہاں زمین بھی ہے اور زمینیں بھی۔ تخلیقی آدمی ایک زمین پہ نہیں رہتا وہ دیس دیس سفر کرتا ہے اور بیک وقت کئی کئی زمینوں میں رہتا ہے۔ اقبال کے یہاں ایک زمین تو وہ ہے جہاں وہ پیدا ہوا، پلا اور بڑھا۔ اس کی نظم "الارض للہ" میں پنجاب کے گیہوں کے کھیت لہلہاتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ تو ایک زمین ہے۔ ایک زمین اقبال کے سینے کے اندر آباد ہے۔ تخلیقی سفر تو اس نے اسی زمین میں طے کیے ہیں۔ میر اکبر آباد سے چلے اور دلی میں چھاؤنی چھائی، دلی سے اٹھے اور لکھنؤ میں پڑاؤ ڈالا۔ لیکن اقبال دلی، صفاہاں اور سمرقند سے ہوتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔

ناصر کاظمی کہتے ہیں کہ اقبال ان زمینوں کو چھوڑتا ہوا جس زمین کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا وہ اسے مل گئی ہے۔ وہ اس زمین میں ابدی نیند سو رہا ہے اور اسکی آواز اس زمین سے سارے عالم میں پھیلتی جا رہی ہے۔ کبوتروں کا شوق تو ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل اقبال نے انسان سے رشتہ استوار کرنے کے لئے تمام مخلوقات سے دوستی کی۔ جب اسے "خیر البشر" نے روشنی دکھائی تو وہ انسان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ انسان کو اس نے کئی روپوں میں دیکھا اور اس نے اپنی شاعری میں اسے جو اسما عطا کئے ہیں وہ ایک پورا فلسفہ حیات بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً آدم اور ابلیس بساط حیات کے یہ دو مہرے اسے طاقت کے اسم نظر آتے ہیں اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے نبرد آزما بھی۔ ان کی جنگ و جدل اور ہار جیت سے جو روح پیدا ہوتی ہے وہ اسے انسان کے پیکر میں دیکھتا ہے۔ دراصل وہ انسان سے یہ مطالبہ کرتا

ہے کہ وہ فطرت کی پوری طرح تسخیر کرے اور آئین خداوندی کے تحت اس پوری کائنات کی خلافت کی باگ ڈور سنبھالے۔

ابلیس اور آدم کا مکالمہ اقبال کے فلسفے کی ایک کڑی ہے۔ اسی طرح چیونٹی اور عقاب کا مکالمہ آدم کی اس منزل کا سراغ دیتا ہے جہاں اس نے اپنے آپ کو انسان کی مرتبے تک پہنچایا۔ اقبال یہاں سے قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے اور شاعری کے ذریعے ایک نمائندہ انسان کے اظہار کو جنم دیتا ہے۔

پیغمبرؐ اسلام کے پیغام کے بعد خدا نے انسان کو پوری طاقتیں سونپ دی تھیں اور اسے ایک مکمل دین کا نظام بھی دے دیا تھا۔ اس کے بعد وہ انسان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ حق اختیار کا صحیح استعمال کرے۔ انسان کے لئے یہ بڑی کڑی منزل ہے اور یہ وہ آخری امتحان ہے جو اس کائنات کے آخری لمحے تک جاری رہے گا۔

اس حق اختیار نے خالق کو ناگزیر تنہائی بھی دی ہے۔ اس عالم میں آسمان بیضہ مور دکھائی دیتا ہے۔ یہاں سے حیات اور انسان کی کشمکش میں سے ایک نیا راستہ نکلتا ہے اور Inner Space کا احساس جاگتا ہے۔

شیخ صاحب نے اقبال کے سلسلے میں گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا کہ اقبال کے نظام کا قلب وہ پر درد اور رنگین داستان ہے جو آدم علیہ السلام کے جنت سے ہجرت کرنے سے متعلق ہے۔ انسان جنت میں شعور کے بغیر تھا اس نے ابلیس کے اشارے پر ابدیت کے درخت کا پھل کھا لیا تاکہ وہ جسم کے راستے سے جاودانی ہو جائے۔ ابلیس عقل محض کا اسم ہے۔ عقل محض صرف نا امیدی ہے۔ آدم نے محض عقل کا سہارا لیا اور جنت سے زمین پر آ جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس ہجرت کا اولاد آدم کو بہت ہی دکھ ہے۔ اولاد آدم اس ہجرت کی تمثیل کو اپنی زندگی میں بار بار قالب بخشتی ہے۔ بچہ ماں کے رحم سے ہجرت کر کے مادی دنیا میں آتا ہے اور پھر موت کی جنت میں کھو جاتا ہے۔ ایک فن کار اور خالق اپنے احساسات' جذبات' تصورات اور تخیلات کی جنت سے ہجرت کرنے پر ہر لمحہ ہر لحظہ مجبور ہے۔ اس کی تخلیقات اس کی دنیائے تخیل سے ہجرت کر کے کئی کئی عالمین کا سفر کرتی ہیں۔ انسان اس لمبی اور مسلسل ہجرت کے معنی اگر سمجھ لے تو وہ اس مادی دنیا میں ایک ابدی اور جاودانی جنت کی تخلیق کر سکتا ہے۔

جنت کا لفظ بذات خود یہی معنی رکھتا ہے کہ جو ان دیکھی ہے۔ نظروں سے اوجھل ہے جہاں شعور کے بغیر ہی داخل ہوا جا سکتا ہے۔ فن کار اپنی تخلیقات سے پہلے کچھ عرصہ اس قسم کی جنت میں گزارتا ہے۔

حنیف رامے مصوری کی روایات کو اپنی تکنیک کا حصہ قرار دیتے ہوئے اسے اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں اور بحیثیت فن کار دیانت اور نجابت کو اپنے فرائض میں شامل کرتے ہوئے اپنے سائے کو قبول کرنا دیانت اور عامیت سے کنارہ کشی نجابت کا حصہ گردانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ میں ایسے ہی کسی مقام پر کھڑا ہوں جہاں کبھی میر صاحب کھڑے تھے۔ مجھے تو روایت کی داغ بیل ڈالنی ہے۔ متحرک اور سرگرم عمل روایت کا سنگ بنیاد رکھنا ہے۔ درباروں اور سرکاروں کی مرہون احساس مصوری میں لہو دوڑاتا ہے۔ میرے دائیں بائیں اور پیچھے رنگ برنگی بد دیانتیوں اور عامیت کے جو ڈھیر لگے ہیں۔ میرے سارے وجود کو وہ اپنے پورے بے ڈھنگے پن کے ساتھ قبول ہیں۔ اگر میرے وجود کو ان ڈھیروں کا احساس و ادراک نہ ہوا تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود میں ایک ایسے ہی ڈھیر کی صورت ڈھیر ہو جاؤں۔

یہاں ناصر کاظمی نے حنیف رامے سے سوال کیا کہ اگر تم کسی دن یہ اعلان کر دو کہ مجھے تو سبز رنگ سرخ نظر آتا ہے تو مصوری کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ میں اگر سبز گھاس کی جگہ سرخ گھاس لکھ دوں تو ہماری روایت کی پرانی حویلی میں ایک کہرام نہ مچے گا' کیونکہ ان کے خیال میں گھاس سبز ہی ہوتی ہے۔ ویسے سرخ بھی ہوتی ہے۔

حنیف رامے نے جواب دیا کہ سیاہی رنگ ہے۔ سفیدی روشنی ہے۔ روشنی سے سارے رنگ عبارت ہیں۔ روشنی اپنی آنکھ میں ہو تو جو چیز تم دیکھو اسے جو رنگ چاہو دے لو۔ روشنی تمہاری ہے تو رنگ بھی تمہارے ہیں۔

پھر ناصر کاظمی' انتظار حسین سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے یہاں روشنی آسمان سے اترتی ہے یا زمین سے چلتی ہے۔

انتظار حسین نے کہا کہ اپنے یہاں روشنی زمین سے نکلتی ہے۔ پٹ بیجنا گوبر سے نکلتا ہے اور بیر بہوٹی گیلی گھاس پر ٹمٹماتی ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ اپنے یہاں نئی

حس ذرا کم کم ہے۔ آنکھوں سے زیادہ کان کام کرتے ہیں۔ روشنی کو پہلے آواز بنا لیتا ہوں پھر سنتا ہوں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنی ساری روایت آواز کا ایک سلسلہ ہے۔ اردو ادب کی روایت میں کار فرما وہ حصے ہیں جہاں ہر لفظ ایک آواز ہے اور ہر آواز ایک نغمہ۔ نظیر کے یہاں فحش آوازیں بھی ننگی آوازیں نہیں ہوتیں انہیں ذرا کریدیئے تو پتہ چلے گا کہ یہ تو غلاف تھا۔ اندر سے اور آواز نکل آئے گی۔ وہاں آوازیں پیاز کی گٹھیاں ہیں جن میں گٹھلی نام کو نہیں ہوتی۔ پرت ہوتے ہیں۔ تہیں ہوتی ہیں۔

اس پر ناصر کاظمی بولے کہ یار کبھی کبھی تو چاند بھی مجھے پیاز کا ایک پرت نظر آتا ہے میں دھیان کی انگلیوں سے راتوں اس کے پرت اتارتا رہا لیکن یہ چاندی کا پیاز ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ کبھی کبھی پیاز کی گٹھی دیکھ کر یہ گمان گزرتا ہے جیسے چاند اتر آیا ہے۔ غزل گوئی میں خرابی یہی ہے کہ وہاں پیاز کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے یہ کام بھی اب کرنا ہی پڑے گا۔

انتظار حسین نے کہا' بچے چاند کو چندا ماموں کہتے ہیں۔ تم نے چاند کو پیاز کی گٹھی کہا۔ یعنی بچوں کی روایت سے بغاوت کی۔ دراصل ایک بچہ ہر فن کار کے اندر موجود ہوتا ہے بلکہ بچہ ہر انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ عام انسانوں کے یہاں یہ بچہ سو جاتا ہے لیکن فن کار کے یہاں بچہ مستقل طور پر جاگتا رہتا ہے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی جنت کو ڈھونڈتا رہتا ہے۔

مکالمہ اپنے آخری مراحل میں داخل ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی گویا ہوتے ہیں اور روایت کی تشریح یوں کرتے ہیں : روایت کے معنی علم اور تہذیب کی وہ تمام استعداد ہے جو انسان کو آج تک حاصل ہوئی ہے۔ یعنی روایت وہ روح ہے جو کسی عصر رواں میں دھڑکتی ہے اور اس روح کا ادراک اپنے زمانے پر نگاہ رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے ایک پس منظر لازمی ہے اور یہ پس منظر وہ علم فراہم کرتا ہے جو بقدر توفیق تعلیمی اداروں سے طلبا کو میسر آتا ہے۔ زندہ روایت ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرنا نہیں سکھاتی بلکہ اس کے ذریعے فن کار اپنے مقدر کے ستارے کو پہچان سکتا ہے اور اس کی گردش کو قابو میں لانا انفرادی صلاحیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ محض علم

حاصل کر لینے سے اگر کوئی شخص فن کار بن سکتا تو بھلے مانس تنقید نگاروں کو کون پوچھتا؟ فن کار اپنے علم کو براہ راست نہیں اگلتا بلکہ اسے ہضم کرتا ہے اور تخلیقی لمحوں کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ علم حاصل کرنے اور تخلیقی کام کرنے کے درمیان ایک وقفہ بھی ہوتا ہے شاید یہی وہ وقفہ ہے جب میر نے یہ کہا تھا۔

تحصیل علم کرنے سے دیکھا نہ کچھ حصول
میں نے کتابیں رکھیں اٹھا گھر کے طاق میں

علم اور تجربے کے سفر کے بعد ذہن تھک جاتا ہے۔ اس تھکن میں سرور کے ساتھ ساتھ ایک بے زاری کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس وقفے میں فن کار اپنے علم اور تجربے کو اپنے تصور کی کٹھالی میں پگھلا کر کندن سونا بناتا ہے۔ بچپن میں دیوالی کے موقعہ پر ہم رنگ برنگی موم بتیاں جمع کر کے پگھلا لیتے۔ پھر اس ہفت رنگ موم سے نئی بتیاں بناتے۔ دیکھنے والا نہیں بتا سکتا کہ اس بتی میں کتنی قسم کا موم ہے۔ یہ تو بتیاں بنانے والے ہی کو خبر ہے۔ یہی حال شاعری میں زبان کا ہے اور زبان لفظوں سے وجود میں آتی ہے۔ لفظوں کا قبیلہ بھی بڑا خود سر واقع ہوا ہے۔ جب بھی کسی نئے لفظ کی ضرورت ہوتی تو زبان کے خیمے کے باہر للکارنا پڑتا کہ اس لفظ کی روح تو ہمارے خیالوں میں ہے اسے حاضر بزم کرو۔ شاعر تو لفظوں کو اس طرح گرفتار لیتا ہے جیسے شیر ہرن کو اپنے پنجے میں دبوچ لے۔ لفظوں کو اپنے خیال کے ساتھ چلانا میں نے اپنے عزیز ہم عصر سرسوں کے پھول سے سیکھا جہاں ہرن چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔

اب ذرا اپنے آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک رات میں سوتے سوتے چونک پڑا۔ میرے کمرے کے باہر دو درخت آپس میں بحث کر رہے تھے۔

پہلی آواز: چلو کمرے کے اندر چلیں!

دوسری آواز: نہیں وہاں ہماری برادری نہیں۔ انسان ہمارا دشمن ہے۔

پہلی آواز: تم جنگلی ہو۔ انسان نے ہمیں مہذب بنایا۔ ہم پر احسان کیا۔

دوسری آواز: انسان اور ہم میں کیا قدر مشترک ہے؟

پہلی آواز: اس مکان کا رہنے والا محض انسان ہی نہیں، فن کار بھی ہے۔ اس کے اندر بھی ایک سدا بہار درخت ہے۔ میں نے بارہا اس

سے گفتگو کی ہے۔ دیوار کے شگاف سے جھانک کر دیکھو! ہماری برادری انسان سے کتنی مایوس ہے۔ وہ میزیں' کرسیاں' پلنگ اور الماریاں سب درخت تھے تم انہیں پہچاننے کی کوشش کرو۔

دوسری آواز: تم انسان کے جاسوس ہو! تم جاؤ میں تو واپس جاتا ہوں۔

انفرادیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ روایت کو سرے سے نظرانداز کر دے لیکن وہ روایت ہی خام ہے جس میں انفرادی صلاحیت کے پنپنے کی گنجائش نہیں۔ آج ہم انسانی شعور کے ایک نئے موڑ پر کھڑے ہیں۔ ہمارے مسائل اگلے وقتوں کے لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ روایت کا بیشتر حصہ جسے لوگ آج تک قابل تقلید سمجھتے رہے ہیں' اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ہمارے لئے بے جان اور بے تعلق سا ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے لئے روایت کا مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے باوجود ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے سامنے انفرادی صلاحیت کا مسئلہ زیادہ اہم ہے۔ میر کا "شب چراغ" تھوڑی دور تک راستہ دکھا سکتا ہے' منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔ جو فن کار نئی روایت نہیں بنا سکتا وہ کوئی تخلیقی کارنامہ بھی نہیں کر سکتا۔

ناصر کاظمی کا مکالمہ یہاں ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد انتظار حسین اور شیخ صلاح الدین نے حرف آخر کے طور پر اپنی اپنی بات کہی ہے۔ جس میں ناصر کاظمی کی درج بالا گفتگو سے اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔

یہ طویل مکالمہ معیاری سائز کی کتاب کے چھتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مکالمہ ایسا ہے کہ باوجود ہماری کوشش کے اس کا خلاصہ بھی خاصا طویل ہو گیا۔ یہ ساری گفتگو اتنی مربوط اور منظم ہے کہ اس میں جہاں قطع و برید کی گنجائش نہیں وہاں چند صفحات میں اس کا خلاصہ پیش کرنا بھی ناممکن ہے۔ بہرحال اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ شرکائے گفتگو کی علمی استعداد' بلند فکر اور گفتگو کا انداز کھل کر سامنے آ گیا۔ خاص طور پر تین پڑھے لکھے اور تنقیدی بصیرت رکھنے والے علمائے ادب کے درمیان بیٹھ کر ناصر کاظمی کی عالمانہ گفتگو سے مظفر علی سید کا وہ اعتراض بھی رد ہو جاتا ہے کہ "ادھر ادھر سے سنی سنائی معلومات کو وہ اپنے اعتماد کے ساتھ ذاتی دریافت بنا کر پیش کر سکتا تھا

کہ بڑے بڑے شک کرنے والے پہلو بدلنے کے سوا کچھ بھی رد عمل ظاہر نہ کر سکیں۔"

اس مکالمے میں ناصر کاظمی کی گفتگو سنی سنائی باتوں پر قائم نہیں بلکہ ان کے گہرے مشاہدے، مطالعے اور وسیع علم اور تجربے کا پتہ دیتی ہے۔ اگرچہ شیخ صلاح الدین کی علمیت پورے مکالمے پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر میر، نظیر اکبر آبادی، غالب اور اقبال کے حوالے سے انہوں نے نہایت عالمانہ گفتگو کی ہے لیکن ناصر کاظمی نے ان شعرا کے دروں میں جھانک کر ان کی نفسی کیفیات تک پر اس انداز میں گفتگو کی ہے کہ روایت کے سلسلے میں پورا منظر روشن ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس مکالمے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں ناصر کاظمی نے ایک سنجیدہ موضوع پر نہایت سنجیدگی اور احتیاط کے ساتھ گفتگو کی ہے اور بحیثیت ایک فنکار کے فن اور فنکار کے بارے میں نہایت واضح طور پر اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ ناصر کاظمی کی اس گفتگو سے ان پر "میریت" اور روایت پسندی کے الزام کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر ان سطور کو ناصر کاظمی کا نظریہ فن قرار دیا جا سکتا ہے:

> " ہمارے لئے روایت کا مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے باوجود ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے سامنے انفرادی صلاحیت کا مسئلہ زیادہ اہم ہے۔ میر کا "شب چراغ" تھوڑی دور تک راستہ دکھا سکتا ہے، منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔ جو فن کار نئی روایت نہیں بنا سکتا۔ وہ کوئی تخلیقی کارنامہ بھی نہیں کر سکتا۔" ۱۸؎

ناصر کاظمی کے نزدیک میر کا "شب چراغ" جہاں تک راستہ دکھاتا ہے اس سے روشنی لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اسے منزل پر پہنچنے کا وسیلہ نہیں بنایا جا سکتا۔ منزل پر پہنچنے کے لئے فنکار کو نئی روایت کا ڈول ڈالنا ہوگا جو اس کی انفرادی پہچان بن سکے۔ گویا ناصر کاظمی روایت سے زیادہ انفرادی صلاحیت کے مسئلے کو اہم قرار دیتے ہیں جس کے بغیر کوئی بھی فن کار تخلیقی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ ناصر کاظمی کے خیال میں روایت وہ روح ہے جو کسی عصر رواں میں دھڑکتی ہے اور اس روح کا ادراک اپنے زمانے پر نگاہ رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ جو شخص اپنے حال سے بے خبر ہے اور ہر

شے کو ماضی کے آئینے میں دیکھنے کا عادی ہے اور ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرتا ہے وہ اپنے مقدر کے ستارے کو نہیں پہچان سکتا۔ فن کار اپنے علم کو براہ راست نہیں اگلتا بلکہ اسے ہضم کرتا ہے اور تخلیقی لمحوں کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے اور جو فن کار پرانے ماہرین فن کے بچے تلے مفروضوں کو بغیر ہضم کئے اگل دیتا ہے وہ تیسرے درجے کا لکھنے والا ہوتا ہے وہ محض روایت کا سہارا لے کر روایتی انداز میں روائتی جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ ہر تخلیق حال ہوتی ہے فن کار کا یہی کام ہے کہ وہ ماضی کو حال بنا دے اور اس میں وہ تمام تجربات سمو دے جو مستقبل کے سرچشمے بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

۴۔ دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف:۔

یہ گفتگو بھی چائے کی میز پر ناصر کاظمی اور انتظار حسین کے درمیان ہوئی اور قلم بند ہو کر "ماہ نو" کراچی کے ستمبر ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ اس گفتگو میں میر تقی میر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ میر تقی میر پر ناصر کاظمی کے ایک مضمون "میر ہمارے عہد میں" پر گزشتہ باب میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ زیر نظر مکالے کو بھی اسی مضمون کا تسلسل قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس میں میر کے حوالے سے بعض خوابیدہ گوشے بے نقاب ہو کر سامنے آتے ہیں اور پڑھنے والے کو میر فہمی میں مدد دیتے ہیں۔ اس گفتگو کا عنوان میر ہی کے ایک شعر سے ماخوذ ہے:۔

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

اس شعر سے میر پر بات شروع ہوتی ہے۔ ناصر کاظمی کے نزدیک اس شعر میں میر کے دو Images ہیں۔ ایک شاعر کے دل و دماغ کا اور دوسرا باہر کی دنیا کا۔ امیج کا مقصد یہی ہے کہ جو بات شاعر کے ذہن میں ہو وہ اسے باہر کے لینڈ سکیپ میں دکھائے اور جو باہر کی دنیا کے مناظر ہوں انہیں شاعر اپنے دل میں تلاش کرے۔ تخلیقی امیج کا یہ تصور ہمارے پورے ادب میں شعوری طور پر سرے سے موجود ہی نہیں۔ میر نے دلی

کے علاوہ دل میں بھی ایک دلی بسائی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کے لئے دل اور دلی یعنی احساس اور احساس کا منبع دو الگ الگ چیزیں نہیں تھیں۔

دیدہ گریاں ہمارا نہر ہے

دل خرابہ جیسے دلی شہر ہے

میر کا "دیدہ گریاں" محض میر کا "دیدہ گریاں" نہیں رہتا بلکہ اس پورے دور کے زوال کی مجموعی کہانی بن جاتا ہے۔ یہاں نہر ایک پوری رواں دواں کیفیت اور احساس کی علامت ہے۔ میر نے دلی کی بربادی دل کی آنکھ سے دیکھی تھی۔

میر ایک درویش منش شاعر ہے جس کی زندگی کی ضرورتیں محدود ہیں اور اس کی زندگی کا تصور لا محدود ہے۔ وہ نہ داد چاہتا ہے نہ بیداد یہ کبیدہ خاطر ہوتا ہے وہ تو اپنے پڑھنے والوں سے یہ کہتا ہے۔

ہے میر فقیر اس کو نہ آزار دیا کر

میر کی کلیات اس قدر ضخیم و جسیم ہے کہ ذوق سلیم ہی اس میں سے جواہر پارے نکال سکتا ہے۔ میر کی کلیات کی مثال تو تاج محل کی سی ہے۔ وہ تاج محل جو ابھی تیار ہوا ہے۔ اس کے گرد ملبہ جوں کا توں پڑا ہے اور مچانیں ابھی اتاری نہیں گئیں۔ ہر مکان کا ملبہ تاج محل کا ملبہ نہیں ہوتا۔ میر کی کلیات کو اگر ہم ملبے والا تاج محل سمجھ لیں تو اس سے میر کی شاعری کی عظمت اور اہمیت بڑھ جاتی ہے کم نہیں ہوتی۔ اس کے تاج محل کا ملبہ عام نقادوں اور شاعروں کی نظر سے اوجھل رہا۔ اس ملبہ میں جو جواہر پارے اور عقیق ریزے چھپے ہوئے ہیں ان سے کئی رنگ محل تعمیر کئے جا سکتے ہیں۔ شرط جوہری کی ہے۔ اردو کا بڑے سے بڑا غزل گو میر کی عمارت کے ملبے سے بنا ہے۔ اگر مواد کے استعمال اور ذرائع کا پتہ چل جائے تو صاحب ہنر کے لئے بڑی عمارت بنانا بھی آسان ہے۔

میر ایک بوڑھے برگد کے درخت کی طرح ہے جس کی چھاؤں میں سفر کرنے والے شب بسری تو کر سکتے ہیں، آگ جلا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں جلدی ہی تازہ دمی نہ پیدا ہو سکے تو برگد کی چھاؤں انہیں زیادہ ٹھہرنے نہیں دے گی۔ کوئی تازہ رس سبزہ اور نئی پنیری اس کی چھاؤں میں پنپ نہیں سکتی۔ اس کی چھاؤں میں تو وہ ویران کنواں

ہی رہ سکتا ہے جس میں جنگلی کبوتر آباد ہو گئے ہوں۔

میر کے زمانے میں اظہار بیان کے وہ اسالیب اور اصناف موجود نہ تھے جو آج ہیں۔ اسی لئے نہ تو لکھنے والے کی صلاحیتیں پوری طرح بروئے کار آتی تھیں اور نہ لکھنے والا موضوع سے انصاف کر سکتا تھا۔ میر نے نظمیں بھی کہی ہیں، قصیدے بھی، رباعیاں بھی، مثنویاں بھی اور غزل کا تو وہ باوا آدم ہے ہی جس نے اس کی تقلید کی وہ بھی مارا گیا اور جس نے اس سے روگردانی کی وہ بھی مارا گیا۔

کلیات میر کے کچھ حصے کو میں میر کا روزنامہ بھی سمجھتا ہوں میر نے لسانیات کے سلسلے میں جو کام کیا ہے وہ بھی اسی میں موجود ہے۔ غالباً میر سب سے پہلا شاعر ہے جس نے اردو میں سب سے پہلے فن تنقید کو شعر کے رستے سے رائج کیا۔ اچھا شاعر پہلے نقاد بھی ہوتا ہے۔۱۹۰ زیر نظر مکالے میں ناصر کاظمی کے حوالے سے میر کے بارے میں جو گفتگو شامل ہے اس کا ایک اجمالی خاکہ درج بالا سطور میں پیش کیا گیا ہے۔

مکالے کا آغاز بڑے دلچسپ انداز میں ہوتا ہے۔ انتظار حسین بچپن کی یاد تازہ کرتے ہوئے دھوئیں کا ذکر کرتے ہیں جو کبھی آسمان پر بل کھاتا ہوا نظر آتا اور کبھی روئی کے کارخانے کی چمنی سے نکلتا ہوا دکھائی دیتا۔ اور کبھی ایک دھند کی صورت میں پھیلا ہوا۔ اسی حوالے سے ترگنیف کا ناول "دھواں" زیر بحث آتا ہے جس میں مصنف نے اپنے زمانے کے پورے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور سیاسی تحریکوں کو دھوئیں کی طرح اڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ دھوئیں کا بیان ترگنیف کے ہاں واقعی خوبصورت ہے لیکن بقول انتظار حسین "دھوئیں سے اپنی Association ترگنیف سے بالکل مختلف قسم کی ہے۔ ہمارے سامنے جونہی دھوئیں کا نام آتا ہے تو ایک جیتی جاگتی، بستی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

ناصر کاظمی دھوئیں کی لکیروں میں زندگی کی معنویت تلاش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دھوئیں کی لکیریں روشنی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتیں۔ اس دھوئیں کے ذکر سے شرکا گفتگو کی بات چیت کا رخ میر کی جانب مڑتا ہے اور اس کے مصرع "دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف" کے حوالے سے اس کی پوری شخصیت اور شاعری زیر بحث

آتی ہے۔ جس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا گیا ہے۔ گفتگو کے اختتام پر نئی اور پرانی نسل کا امتیازی فرق پیش کیا گیا ہے۔ پرانی نسل کے نگر کا دھواں ترگنیف کے ناول والا دھواں ہے کہ بھک سے آگ لگی' بھاڑ میں ایک شور سا ہوا' دھواں اٹھا۔ شفاف فضا میں دھوئیں نے ہرزہ سرائی کی اور پھر مطلع صاف ہو گیا۔ جبکہ نئی نسل کے نگر کا دھواں بستیوں کا پتا دیتا ہے۔ ایک دھواں وہ بھی تھا جو اتھاہ تھا۔ جس کی کوئی حد نہ تھی۔ وہ دھواں منجمد ہو کر سکڑا اس نے انگڑائی لی۔ ایک پیکر اختیار کیا اور ایک ٹھوس زندہ متحرک اور گرم کرہ بن گیا۔

ناصر کاظمی کے بقول یہ دھواں سرے سے غائب نہیں ہو گیا بلکہ بلندیوں اور پستیوں کے درمیان قناتیں بن کر محیط ہو گیا اور ان میں کچھ روشن روشن روزن پیدا ہو گئے۔ آنکھ والا ہو تو ان روزنوں میں سے وہ منزلیں بھی دیکھ سکتا ہے۔ جہاں سے پہلی کرن نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ جہاں سے نیست ہست ہوا۔ مخلوق وجود میں آئی۔ جنہیں شک ہے وہ اسے محض دھواں ہی سمجھتے ہیں لیکن جو صاحب تخلیق ہیں اور اپنے سینے میں یقین کی روشنی رکھتے ہیں وہ اس دھوئیں کی طرف روشنی سمجھ کر دوڑتے ہیں اور اس دھوئیں کو منجمد کر کے نئی مخلوق تخلیق کرتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے سینے میں ایک چنگاری رکھتے ہیں ورنہ خالی سینے اگر الاؤ کے دھوئیں کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑیں بھی تو انہیں بقول اقبال یہی نظر آئے گا۔

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

اس مکالمے میں دھوئیں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ دھوئیں کے ساتھ ہی آگ' روشنی حرارت اور ہوا کا تصور قائم ہوتا ہے۔ یہ اشیا بھرپور زندگی کے مظاہر ہیں جو زندگی میں تحریک پیدا کرتے ہیں۔ گویا دھواں زندگی کے تحرک کی علامت ہے۔ یہ ان آباد بستیوں کا پتہ دیتا ہے جہاں زندگی کا عمل جاری و ساری ہے۔ ایک فنکار کے لئے دھواں تخلیقی عمل کی علامت ہے اور یہ دھواں تخلیقی عمل دل کے لئے جلنے سے وجود میں آتا ہے' انتظار حسین کہتے ہیں کہ میں جس بستی کے رنگا رنگ دھوئیں کا ذکر کرتا ہوں وہ بستی کہاں ہے وہ تو دل ہے اور اسی کے بارے میں میر نے یہ کہہ رکھا

ہے کہ:

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

اب اس دھوئیں کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو یہ اڑ کر فضا میں تحلیل ہو جائے اور وقتی طور پر اپنے وجود کا اعلان کر کے ختم ہو جائے۔ جیسا کہ ترگنیف سیاسی تحریکوں کو دھوئیں کی طرح اڑتے ہوئے دیکھتا ہے۔ یہی حال ہماری ان ادبی تحریکوں کا ہوا جو سیاست کی بیخ لگا کر میدان میں اتریں اور فضا کو دھواں دھار کرنے کے بعد منظر سے غائب ہو گئیں۔ مکالمے میں یہ اشارہ ترقی پسند تحریک کی طرف ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ ایک پیکر اختیار کر کے ایک ٹھوس، زندہ اور متحرک کرے کی شکل اختیار کر جائے اور صاحب تخلیق لوگوں کے لئے روشنی کا استعارہ بن کر ان کے تخلیقی عمل کو جلا بخشتا رہے۔ دھوئیں کی یہ دوسری صورت میر جیسے شاعروں کے ہاں نظر آتی ہے جن کے دل کا دھواں ایک تجسیمی شکل اختیار کر کے صاحب ہنر لوگوں کو ان کی تخلیق کا جواز فراہم کرتا ہے۔ لیکن اس دھوئیں کو منجمد کر کے نئی مخلوق وہی لوگ تخلیق کر سکتے ہیں جن کے اپنے سینے بھی کسی چنگاری سے روشن ہیں۔ خالی سینے رکھنے والوں کو بجھی ہوئی آگ اور ٹوٹی ہوئی طناب کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔

○::○

ناصر کاظمی کی غیر مطبوعہ ڈائریاں:

حسن سلطان کاظمی کا کہنا ہے:

"پاپا کو شروع ہی سے ڈائری اور روزنامچہ لکھنے کی عادت تھی ان کی

بہت سی ڈائریاں قیام پاکستان کے وقت ہجرت کے دوران اور بہت سی بعد میں گم ہو گئی تھیں جو ڈائریاں دستیاب ہیں وہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۱ء تک کے عرصہ پر محیط ہیں اور کچھ یادداشتیں انہوں نے لکھ رکھی ہیں۔ بہت سی ڈائریوں کو سامنے رکھ کر ان کا انتخاب ایک الگ سے ضخیم رجسٹر میں کیا ہے جس کا نام انہوں نے خود "چند پریشاں کاغذ" رکھا ہے۔"۔ ۲۰

حسن سلطان کاظمی کی گفتگو کے اس اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ناصر کاظمی کو ابتدا ہی سے ڈائری لکھنے کا شوق تھا۔ ان کی کچھ ڈائریاں راقم کی نظر سے بھی گزری ہیں۔ ان ڈائریوں میں انہوں نے اپنی یادداشتیں قلم بند کی ہیں۔ یہ روزنامچے نہیں ہیں بلکہ ان میں انہوں نے اپنی پیدائش سے لے کر قیام پاکستان اور ہجرت کی یادداشتوں کو جمع کیا ہے ان کی ان یادداشتوں ہی کو ناہید قاسمی نے اپنے ایم۔ اے اردو کے مقالے "ناصر کاظمی شخصیت اور فن" میں ڈائری نمبرا کا نام دیا ہے جو کتابی صورت میں بھی قائم ہو چکا ہے۔۲۱ ۔ ان یادداشتوں میں ناصر کاظمی نے ابتدا اپنی تاریخ پیدائش سے کی ہے اور کہا ہے کہ وہ

"۸ دسمبر ۱۹۲۵ء بروز ہفتہ علی الصباح اپنے نانا مرحوم کے گھر قاضی واڑہ میں پیدا ہوا۔"۔ ۲۲

ناصر کاظمی نے اپنی ڈائری میں جو اپنی تاریخ پیدائش تحریر کی ہے اس کی تصدیق نہ تو ان کے بچپن کے دوست افتخار کاظمی نے کی ہے اور نہ ہی میٹرک کی سند سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ جیسا کہ پہلے باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ناصر کاظمی میٹرک کی سند کے مطابق یکم دسمبر ۱۹۲۳ء کو انبالہ شہر میں پیدا ہوئے، صحیح تاریخ پیدائش ہے۔ اس بارے میں افتخار کاظمی کا کہنا ہے:

"میری پیدائش ۱۹۲۳ء کی ہے اور ناصر کاظمی مجھ سے چھ سات ماہ چھوٹا تھا اس لئے مجھے یقین ہے کہ ناصر کے پیدائش یکم دسمبر ۱۹۲۳ء ہی کو ہوئی تھی۔"۔ ۲۳

اب جبکہ افتخار کاظمی نے ناصر کاظمی کی اس تاریخ پیدائش کی تصدیق کر دی ہے تو پھر کیا وجہ تھی کہ ناصر نے اپنی ڈائری میں تاریخ پیدائش میں رد و بدل کیا۔ ہونا تو

یہ چاہیئے تھا کہ وہ اپنے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں بھی ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء لکھواتے جس سے ان کی عمر کم ثابت ہوتی جیسا کہ آج کل لوگ ملازمت کے حصول کے لئے ہمیشہ اپنی عمر کم لکھواتے ہیں تاکہ اوور ایج نہ ہو جائیں۔ اس ضمن میں انتظار حسین کی رائے یہ ہے۔

> "ایک زمانے میں نوکری کے حصول کے لئے عمر زیادہ لکھوائی جاتی تھی ہو سکتا ہے ناصر کاظمی نے بھی ملازمت کے حصول کے لئے ایسا کیا ہو اور میٹرک کے امتحان میں اپنی عمر یکم دسمبر ۱۹۲۳ء زیادہ لکھوا دی ہو تاکہ سرکاری ملازمت میں آسانی ہو"۔ ۲۴

گو انتظار حسین کا کہنا درست ہے کہ اس زمانے میں الٹ رواج تھا اور لوگ سرکاری ملازمت کے حصول کے لئے زیادہ عمر لکھوا دیتے تھے مگر ناصر کاظمی کا معاملہ اس لئے مختلف ہے کہ ناصر کاظمی کو ملازمت سے ابتدا ہی سے چڑ تھی ان کے والد جب کبھی انہیں یہ کہتے کہ بیٹا جلدی سے بی۔ اے کر لو تاکہ اچھی سی ملازمت مل جائے تو ان کی طبیعت میں اس کا شدید ردعمل ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ ناصر کاظمی نے ملازمت کی مخالفت کے سبب ذہین ہوتے ہوئے بھی بی۔ اے نہیں کیا۔ دوسرے ناصر کاظمی کے بچپن کے دوست افتخار کاظمی کا یہ کہنا زیادہ معتبر ہے کہ "وہ مجھ سے چھ سات ماہ چھوٹا تھا اور میری پیدائش ۱۹۲۳ء کی ہے" ناصر اور افتخار کاظمی دونوں کلاس فیلو تھے اور افتخار کاظمی اور ناصر نے میٹرک کا امتحان ۱۹۳۹ء میں پاس کیا جس کی تصدیق افتخار کاظمی نے بھی کی ہے۔ اس لئے ناصر کاظمی کی ڈائری کی ابتدا جس جملے سے ہوتی ہے وہ ان کی تاریخ پیدائش سے متعلق ہے جو راقم کی تحقیق اور جستجو کے مطابق غلط ہے۔

باقی اس ڈائری میں ناصر کاظمی نے جو واقعات قلم بند کئے ہیں ان میں سے بھی کچھ غلط ہیں اور بہت سے درست ہیں مثلاً پہلے باب میں اس پر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے کہ ناصر کاظمی کے دادا اور والد بہت بڑے رئیس یا زمیندار نہیں تھے جبکہ ڈائری ہی میں ناصر نے انہیں رئیس لکھا ہے' باقی ان یادداشتوں میں ناصر نے اپنے ابتدائی حالات زندگی نہایت سادہ اسلوب تحریر میں بیان کئے ہیں جو ناصر کاظمی کی شخصیت کی

تفہیم کے لئے ابتدائی نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ حسن سلطان کاظمی نے کہا ہے کہ یہ یادداشتیں مختلف حصوں میں بکھری ہوئی ہیں اس لئے انھیں ڈائری نمبر۱ ڈائری نمبر ۲ اور ڈائری نمبر ۳ نام دیا گیا ہے اور جو ڈائری نمبر ۳ ہے وہی اصل میں ناصر کاظمی کی صحیح ڈائری ہے جس میں ناصر کاظمی نے ڈائری نمبر۱ اور ڈائری نمبر ۲ کی یادداشتوں کو ایک ضخیم رجسٹر کے اوراق میں یکجا کر دیا ہے اور اس کا نام چند پریشاں کاغذ رکھا ہے۔

"یہ چند پریشاں کاغذ" اب کافی پیلے اور نرم پڑ چکے ہیں۔ ناصر کاظمی کے چھوٹے فرزند حسن سلطان کاظمی آج کل ان غیر مطبوعہ پریشاں کاغذوں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ ناصر کاظمی نے اپنی اس باقاعدہ ڈائری کا نام چند پریشاں کاغذ اس لئے رکھا ہے کہ یہ ڈائری جو باقاعدگی کے ساتھ لکھی جا رہی تھی کہیں کہیں بے قاعدہ بھی ہو جاتی ہے۔

"چند پریشاں کاغذ" کی ابتدائی تاریخ:

ناصر کاظمی نے اپنی یہ ڈائری باقاعدگی کے ساتھ یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو لکھنا شروع کی اور اس کا نام "چند پریشاں کاغذ" رکھا۔ اس ڈائری کی کوئی تحریر اب تک کسی جگہ بھی شائع نہیں ہوئی۔ راقم نے اس ڈائری یا روزنامچہ کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے اور ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن کی تفہیم کے لئے اس سے بھرپور استفادہ بھی کیا ہے جس کے نقوش اس مقالہ میں موجود ہیں۔ اس ڈائری کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی کی شخصیت بہت پہلو دار تھی۔ شعر کہنا اور پھر روزانہ ڈائری لکھنا ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ مگر ناصر نے شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے دیگر مشاغل جن میں کبوتر بازی اور شطرنج سرفہرست ہے حیرت انگیز طور پر اپنا یہ تخلیقی مشغلہ بھی جاری رکھا۔ ناصر کاظمی کا کلام جس طرح سے انفرادیت کا حامل ہے اسی طرح سے ان کے نثری اسلوب کا بھی اپنا ایک جدا رنگ ہے اور اس انداز تحریر کے بارے میں الگ سے باب میں جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈائری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اوراق کی ورق گردانی سے ناصر کاظمی کی شاعری اور مطالعے کے بارے میں علم ہوتا ہے بلکہ ان کے

روز و شب کی مصروفیات سے بھی مکمل آگاہی ہوتی ہے' ڈائری میں انہوں نے ہر روز کی مصروفیات کا ذکر کیا ہے۔ کس سے ملاقات ہوئی۔ کون سی کتابیں پڑھیں۔ کہاں جانا ہوا۔ اس کے علاوہ ناصر کی روزانہ کی دلچسپ سیر اور مشاغل کا ذکر بھی گاہے بگاہے ملتا ہے۔ اس ڈائری میں ناصر کاظمی نے پہلی مرتبہ کبوتروں کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ تفصیل جب منظر عام پر آئے گی تو کبوتر بازوں کے لئے معلومات کے نئے در وا ہوں گے۔ آیئے اب ان "چند پریشاں کاغذوں" میں سے کچھ کاغذوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ خوش خوراکی اور خوش لباسی ::

ناصر کاظمی ابتدا ہی سے خوش لباس تھے اس کا ذکر ان کی شخصیت کے پہلے باب میں بھی آ چکا ہے وہ بہت نفیس لباس زیب تن کرتے۔ جب وہ ۱۹۴۰ء میں انبالہ سے لاہور ایف۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے آئے تھے تو اس زمانے میں بھی لوگ انہیں ان کی خوش لباسی کے سبب پرنس کہہ کر پکارتے تھے' سو ناصر کاظمی نے ہمیشہ اجلا لباس زیب تن کیا نہ تو مفلوک الحال شعرا کی طرح بال بڑھائے اور نہ ہی کبھی شیو بڑھایا۔ ہمیشہ بال ترشواتے تھے اور روزانہ شیو کیا کرتے تھے۔ سردیوں میں سوٹ' پاجامہ اور کالی شیروانی پہنا کرتے تھے اور گرمیوں میں پینٹ اور شرٹ و بوشرٹ پہنتے تھے۔ حسن سلطان کاظمی کا کہنا ہے کہ پاکستان میں عوامی لباس کی مقبولیت کے سبب انہوں نے قمیض شلوار بھی پہننا شروع کر دی تھی مگر مشاعرہ میں وہ اکثر شیروانی اور پاجامہ پہنتے تھے اور کبھی کبھار سوٹ میں بھی مشاعرہ پڑھ لیتے تھے جہاں تک خوش خوراکی کا تعلق ہے انہیں دال تو بالکل پسند نہیں تھی۔ بھنا ہوا قیمہ اور مٹر قیمہ بہت پسند کرتے تھے بقول افتخار کاظمی "ناصر کاظمی کو مٹر قیمہ اتنا پسند تھا کہ ایک مرتبہ انہیں جلاب لگ گئے مگر مٹر قیمہ کھانے سے باز نہیں آئے۔ ۲۵۰

شیخ صلاح الدین کا کہنا ہے کہ "وہ جب ہوٹل میں کھانے کا آرڈر دیتے تو پوچھتے کہ کیا کیا ہے اور پھر میز پر ہر طرح کا کھانا لگواتے خود بھی کھاتے اوروں کو بھی

کھلاتے۔"۔۲۶

ریڈیو پاکستان کے محمد اعظم خان کہتے ہیں کہ "ناصر کاظمی خوش خوراک تھے ان کے گھر سے دوپہر کو روزانہ ان کے لئے کھانا پک کر آتا تھا اور ہمیشہ ایک سے زیادہ سالن ہوتا تھا وہ شوربے والا سالن ضرور منگواتے تھے۔"۔۲۷

ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے سینئر پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار عتیق اللہ شیخ کا کہنا ہے کہ ناصر کاظمی کھانے کے معاملے میں بڑا اہتمام کرتے تھے ریڈیو پاکستان لاہور میں ان کا ٹھکانہ بشیر زیدی اسیر کے کمرے میں ہوتا تھا وہ بشیر زیدی اسیر کو کہتے بھائی آپ کے کمرے میں کونے کی تلاش ہے وہ کہتے کہ میرے سر آنکھوں پر۔ بشیر زیدی اسیر اور ہم سب لوگ ان کی بہت قدر کرتے تھے کھانے کے معاملے میں وہ بہت نفاست پسند تھے اور روزانہ دوپہر کو ان کے گھر سے کھانا آتا اور وہ کئی دوستوں کے لئے کافی ہوتا تھا۔۲۸

ناصر کاظمی کی خوش خوراکی اور خوش لباسی کا ذکر اس ڈائری میں ۳ جنوری ۱۹۵۳ء کے عکس سے ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"۳ جنوری علی الصباح آنکھ کھلی۔ بستر پر چائے پی۔ اناس کھایا۔ پھر سو گیا۔ پھر آنکھ کھلی اور پھلوں کا رس پیا اور ناشتہ کیا۔ باہر نکلا' پھرتا پھراتا ہمایوں کے دفتر ایک بجے پہنچا شام کو گھر آیا اور آدھی رات ارجن ٹینا میں گیا۔ محفل گرم رہی غزل کہی۔"

جب ذرا تیز ہوا ہوتی ہے
کیسی سنسان فضا ہوتی ہے۔۲۹

ناصر کاظمی خوش خوراک تو تھے ہی وہ پھل بھی بہت پسند کرتے تھے اور تمام پھلوں میں انہیں اناس بہت پسند تھا اس کا ذکر ان کے کئی "پریشان کاغذوں" میں ملتا ہے۔ اس ڈائری میں ناصر نے اپنے روز و شب کے ساتھ ساتھ جب کبھی کوئی شعر ہو گیا تو اس کا بھی ذکر کیا۔ جیسا کہ ۳ جنوری کے روزنامچہ سے ظاہر ہے۔

۲۔ ہمایوں کے بارے میں:

ناصر کاظمی ایک عرصہ تک ہمایوں کے ایڈیٹر رہے وہ ہمایوں میں جس قدر دلچسپی لیتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ احباب کے تذکرے بھی ان کی ڈائری میں ملتے ہیں یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی ڈائری دیکھئے:

"ہمایوں کا سالگرہ نمبر چھپ کر آیا۔ آسمان پر بادلوں کے سفینے تیر رہے ہیں۔ رات بارش ہوئی تھی ایک مسلسل غزل کہی۔ ساتویں شعر پر جعفر طاہر حسب عادت لوٹ پوٹ ہوا:

سر مقتل بھی صدا دی ہم نے
دل کی آواز سنا دی ہم نے

اس ڈائری کے ورق پر ناصر نے ہمایوں کے ساتھ ساتھ بارش کا بھی ذکر کیا ہے۔ بارش بھی ہمیشہ ناصر کاظمی کی کمزوری رہی۔ جعفر طاہر مرحوم سے ناصر کاظمی کی بہت دوستی تھی۔ شیخ صلاح الدین کہتے ہیں:

"ایک مرتبہ میں اور ناصر کاظمی جھنگ گئے وہاں مشاعرہ تھا۔ اگلے روز ہم جعفر طاہر کے یہاں مقیم تھے ان کی بیگم نے اندر سے فرمائش کی ناصر کاظمی اپنی غزلیں ٹیپ پر ریکارڈ کرا دیں۔ ناصر کاظمی نے بھابھی کی فرمائش پوری کر دی۔ جب وہ ترنم کے ساتھ اپنی درد ناک آواز میں غزل پڑھ رہے تھے تو اندر سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ جعفر طاہر کی بیگم سیدوں کا بہت احترام کرتی تھیں اور وہ جعفر طاہر کے بیٹوں کو سید ہونے کے ناتے سے ہمیشہ شاہ جی کہہ کر بلاتی تھیں۔" [۳۰]

۳۔ پتوں اور بجلی کا ذکر:

ناصر کاظمی کی ڈائری میں جابجا باغات۔ درختوں اور پتوں کا بہت ذکر ملتا ہے۔ ان درختوں کی اوٹ سے نکلتا ہوا چاند تو ان پر قیامت ڈھاتا تھا ایک زمانہ میں لاہور میں بھی ہر جگہ بجلی عام نہ تھی۔ پتوں کے جھڑنے اور موم کی شمع کی جگہ بجلی کے قمقموں

کا ذکر ناصر اپنی اس غیر مطبوعہ ڈائری میں یوں کرتے ہیں :

" ۲ جنوری ۱۹۵۳ء ۔ میاں بشیر احمد صاحب سے تنخواہ لی۔ آج شجر حیات کے دو برگ شاخ سے جدا ہو گئے۔ یہ دونوں پتے کتنے عزیز تھے اولین بہار کے دو ورق۔

مدت کے بعد گھر میں موم کی شمع کی جگہ بجلی کا قمقمہ جل رہا ہے۔ ننھا سا چولھا بھی گرم ہے۔ ایک طرف پتے جھڑ رہے ہیں اور ایک طرف کلیاں آنکھ کھول رہی ہیں چاند کا رنگ سبز ہو رہا ہے :"

یہ نہ سمجھ سو رہی ہے رات
میری آنکھوں میں رو رہی ہے رات
بچ گئے تھے جو ان کی یورش سے
وہ سفینے ڈبو رہی ہے رات ؎۳۱

۴۔ حلقہ ارباب ذوق کا ذکر::

ناصر کاظمی حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پینا اور گپ لگانا بھی ان کا معمول تھا۔ صلاح الدین شیخ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ناصر کاظمی نے حلقہ ارباب ذوق میں غزل تنقید کے لئے پیش کی۔

سعادت حسن منٹو نے غزل کی تعریف کی اور پھر خود ہی سعادت حسن منٹو نے کہا کہ منٹو کی سند کے بعد اب کسی اور کو اس غزل کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس کا ذکر اس غیر مطبوعہ ڈائری میں یوں ملتا ہے :

" ۴ جنوری ۱۹۵۳ء صبح ناشتہ کیا پھر سو گیا۔ دو بجے سو کر اٹھا۔ حلقہ ارباب ذوق کے جلسے میں گیا۔ یوسف ظفر کی نظم شہرت بخاری نے پڑھ کر سنائی۔ شیخ صلاح الدین کے ہمراہ ارجن ٹینا گیا۔ وہاں انتظار بھی آ گیا۔

یک قلم دست صبا کی تحریر
صفحہ گل سے مٹا دی ہم نے"۔ ۳۲

۵۔ راولپنڈی سازش کیس اور فیض صاحب سے ملاقات کا ذکر:

ناصر کاظمی اخبارات کا باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے اور وہ قدرے سیاست میں بھی دلچسپی لیتے تھے جبکہ احمد مشتاق کی دلچسپی بہت تھی۔ وہ اکثر احمد مشتاق ہی سے سیاست کے بارے میں سنتے مگر ایسی سیاست جس سے ادب یا ادیب کا تعلق ہو اس سے گہری دلچسپی ہونا اور غور و فکر کرنا ایک ادیب اور شاعر کے لئے فطری بات تھی۔ راولپنڈی سازش کیس پاکستان کی سیاسی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے اس کیس میں فیض احمد فیض، جنرل اکبر خان اور دوسرے انقلابیوں کو کورٹ سے چار چار سال قید بامشقت سنائی گئی تھی اس سازش کیس کا ذکر ناصر نے "چند پریشاں کاغذ" میں یوں کیا ہے:

"۵ جنوری ۱۹۵۳ء آج کی سب سے اہم خبر راولپنڈی سازش کیس کے مقدمے میں فیض احمد فیض، جنرل اکبر خان اور دوسرے ساتھیوں کو چار چار سال کی قید بامشقت ہوئی۔"۔ ۳۳

اگلے روز یعنی چھ جنوری کی ڈائری میں ناصر نے اپنے اجلے لباس اور انناس کا ذکر کیا ہے یہ دونوں ناصر کو پسند تھے۔ اس ڈائری میں انہوں نے راولپنڈی سازش کیس میں سزا پانے والی نامور شاعر فیض احمد فیض سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے اور اس کے علاوہ انہیں صحافی بننے کی جو پیش کش ہوئی تھی اسے انہوں نے قبول نہیں کیا تھا اس کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"۶ جنوری ۱۹۵۳ء کوئی خاص بات نہیں۔ عام بات بھی نہیں۔ سفید قمیض پہن کر گھر سے نکلا۔ انناس کھایا۔ دوستوں میں فیض صاحب کا تذکرہ ہوتا رہا۔ فیض صاحب سے آل انڈیا ریڈیو لاہور کے ایک مشاعرے میں سن بیالیس میں تعارف ہوا۔ اس کے بعد سلطان احمد ناصر (جو آج کل شیخوپورہ

میں ایڈووکیٹ ہیں۔ میرے ہم جماعت بھی تھے) کے ساتھ ان کے ہاں آنا جانا رہا۔ اور فیض صاحب بھی حفیظ ہوشیار پوری کے ہمراہ اکثر ملتے رہے پھر قیام پاکستان کے بعد سن ۱۹۴۷ء میں پروفیسر مجید صاحب کے کمرے میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے مجھے روزنامہ امروز میں ایک معقول جگہ بھی پیش کی تھی مگر میں نے اخبار نویس بننا پسند نہ کیا۔ ۳۴

اس ڈائری سے ناصر کاظمی کے عہد جوانی بلکہ جب وہ ایف۔ اے کے طالب علم تھے بطور شاعر مقبولیت کا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے سن بیالیس میں آل انڈیا ریڈیو لاہور کے مشاعرہ میں حصہ لیا تھا جس میں فیض صاحب بھی شریک تھے اور پھر یہ بھی کہ فیض نے انہیں باقاعدہ امروز کی ملازمت کی پیش کش بھی کی تھی جسے انہوں نے قبول نہ کیا۔

۶۔ احمد ندیم قاسمی، اختر شیرانی، مولانا عبدالمجید سالک اور عبدالمجید بھٹی کا ذکر:

ناصر کاظمی کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا وہ جہاں نوجوانوں میں بے حد مقبول تھے وہاں وہ بزرگوں اور سینئر شعرا کا بھی بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کے ابتدائی دوستوں میں حمید نسیم نمایاں تھے انہوں نے حمید نسیم کے ساتھ بہت سے مشاعروں میں حصہ لیا اپنے سے سینئر ادیبوں اور شاعروں سے اپنی ملاقات کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

"۷ جنوری ۱۹۵۲ء ندیم قاسمی سے ملاقات ہوئی ندیم صاحب سے میری ملاقات سن بیالیس میں تابش صدیقی کی ذریعے ہوئی پھر مولانا عبدالمجید سالک کے دفتر انقلاب میں۔ اس کے بعد وہ پھول اور تہذیب نسواں کے مدیر ہوئے تو روزانہ شام کو دارالاشاعت پنجاب میں جہاں وہ رہتے تھے، ملاقاتیں ہوتیں۔ وہاں اختر شیرانی سے بھی ملنا ہوتا کہ ہم دونوں ان دنوں اختر شیرانی کے بہت مداح تھے۔ میں ان دنوں اسلامیہ کالج ریواز ہوسٹل میں رہتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد حمید نسیم بھی اسی ہوسٹل میں آ گئے۔ امرتسر سے ایم۔ اے انگریزی کرنے کے بعد وہ فلاسفی کا ایم اے کر رہے تھے بعد کو ڈاکٹر سعید اللہ سے ان کی ان بن ہو گئی اور ان کا داخلہ روک لیا گیا۔ حمید نسیم کے ساتھ عبدالمجید بھٹی سے ملاقات ہوئی وہ ان دنوں عرب ہوٹل کے اوپر ایک مکان میں رہتے تھے یہ مکان ملک بھر کے ادیبوں اور شاعروں کی سرائے تھا۔ بھٹی صاحب وضع دار آدمی ہیں ہر صنف ادب میں قدم رکھتے ہیں مخلص آدمی ہیں اور ساری عمر انہوں نے قلم سے لکھ کر زندگی بسر کی۔"۳۵

۷۔ انگریزی ادب سے دلچسپی:

ناصر کاظمی انگریزی ادب کا بھی باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کیا کرتے تھے۔ شیخ صلاح الدین کا کہنا ہے کہ اب بھی ناصر کاظمی کی لائبریری میں میری کئی ایک انگریزی رائٹرز کی کتابیں ملیں گی جو ناصر نے مجھ سے پڑھنے کے لئے لیں اور کبھی واپس نہ کیں۔ اس ڈائری میں بھی ناصر نے کئی جگہوں پر اپنے پسندیدہ انگریزی رائٹرز کا ذکر کیا ہے:

"۸ جنوری سپین کے جواں مرگ شاعر لورکا کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا یہ شاعر مجھے بے حد پسند تھے۔"۳۶

اس کے ساتھ ڈائری پر لورکا کی چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ لورکا ناصر کاظمی کا پسندیدہ شاعر تھا جو جوانی ہی میں مار دیا گیا تھا۔ خود ناصر نے بھی کوئی زیادہ عمر نہیں پائی۔

۸۔ گھڑ سواری اور شکار کا ذکر:

ناصر کاظمی کو گھڑ سواری اور شکار سے جس قدر دلچسپی تھی اس کا ذکر پہلے باب میں بڑی تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ چند پریشاں کاغذ میں بھی ناصر نے اپنے ان

خوابوں کو اسی طرح سے دھرایا ہے انبالہ میں انہوں نے اپنے دوست اسحاق کے ساتھ شکار کھیلنے کا ذکر کیا تھا' یہاں وہ چودھری انوار احمد ایڈووکیٹ کے حوالے سے انکشاف کر رہے ہیں:

"۱۹ جنوری بدھ۔ صبح سویرے یار دیرینہ چودھری انوار احمد ایڈووکیٹ نے آ جگایا انوار سن ۴۵ء میں انبالہ صدر پولیس سٹیشن میں بطور اے ایس آئی تعینات تھا اس کے ساتھ میں نے ضلع انبالہ کے تقریباً تمام دیہات کا سفر کیا۔ دو تین برس تک اس کے ساتھ ہرن کا شکار کھیلا اور گھڑ سواری کی۔ اس کے ہمراہ شکار کے دوران تیس چالیس کوس گھوڑے پر سفر طے کرنا معمول تھا۔"۳۷

۹۔ ٹی ہاؤس / کافی ہاؤس کے ادیب دوست:

ناصر نے ان چند پریشان کاغذ میں پاک ٹی ہاؤس / کافی ہاؤس کا ذکر بھی بڑے اہتمام کے ساتھ کیا ہے۔ پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس ابتدا ہی سے ادیبوں کا گڑھ رہے ہیں اور ہر دور میں یہاں کا ماحول سر شام ادبی فضا میں ڈھل جاتا رہا ہے اور آج بھی ٹی ہاؤس کی یہی صورت ہے جبکہ کافی ہاؤس بند ہو چکا ہے۔ ۱۹ جنوری کی ڈائری میں ناصر نے لکھا ہے کہ:

"پاک ٹی ہاؤس کہ ادیبوں اور شاعروں کا گڑھ ہے۔ شہرت بخاری اور بقا نقوی کے ساتھ کچھ وقت گزارا اس کے بعد کافی ہاؤس میں مظفر' انور جلال' انور شبنم دل' ریاض قادر' اے حمید' صوفی جبار کے ساتھ تا دیر ہنگامہ رہا۔ ریاض قادر نے تازہ غزل کہی جس کا ایک شعر نقل کر رہا ہوں۔

زمانے کے پہلو میں وعدے تو لاکھوں ہیں نشوونما کے
مگر یہ جو دن جا رہا ہے ہمارا تمہارا نہیں ہے۔"۳۸

یہاں ڈائری میں ناصر کاظمی تازہ کے ساتھ غزل لکھنا بھول گئے۔ اس ڈائری کی تحریر سی اس دور کے ادیبوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں اور اس

کے ساتھ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی شعر فہمی کے بارے میں بہت وسیع النظر تھے اور جس کا شعر پسند آ جائے اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہتے۔ جیسا کہ ریاض قادر کے شعر کو رقم کیا ہے۔

۱۰۔ ۶ دسمبر ۱۹۶۵ء کا ذکر:

ناصر کاظمی نے قیام پاکستان کے وقت انبالہ سے لاہور ہجرت کی اور پھر اس دھرتی کو اپنا ہمیشہ کے لئے مسکن بنا لیا وہ اس دھرتی کی خوشبو میں رچ بس گئے اور اس مٹی کی مہکاروں کو اپنے لہو کی گردش میں شامل کر لیا۔ انہوں نے پاکستان کو دارالامان کہہ کر پکارا۔ اور جب اس دھرتی پر پہلا قدم رکھا تو ناصر کے والد نے پہلے اپنے بیٹے کو اس خطہ سرسبز پر آزاد سورج کی پہلی کرن دیکھنے پر مبارک باد پیش کی جس کے جواب میں ناصر نے بھی والد صاحب کو مبارک باد دی۔ اس کے جواب میں ناصر کاظمی کے والد نے ناصر سے کہا کہ ہم تو بجھتے ہوئے چراغ ہیں تم نے اس ملک کی فضاؤں میں سانس لینا ہے۔ یہ ملک اب تمہارا ہے ناصر کاظمی نے ارض پاکستان سے اپنا وجود وابستہ کر لیا۔ انہوں نے گو ہجرت کے حوالے سے اپنی پرانی یادوں کو دھرایا اور گئے دنوں' گئے موسموں اور کھوئی ہوئی مہکاروں کو یاد ضرور کیا مگر نئے موسموں' نئی مہکاروں' نئے رنگوں سے اپنی دل کی بستی کو جگمگایا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب دشمن نے رات کے اندھیاروں میں اس پاک دھرتی پر چوری چھپے حملہ کر کے اسے اجاڑنا چاہا تو ناصر کی آواز پاکستان کے مجاہدین کے لئے بلند حوصلگی' جرات اور بہادری کی کمک بن گئی۔ انہوں نے بہت سے قومی نغمے لکھے جو بے حد مقبول ہوئے یہ نغمے ناصر کاظمی کے شعری مجموعے نشاط خواب میں شامل ہیں۔ ناصر کاظمی کے دل میں جذبہ حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا انہوں نے ہندو سامراج کے گھناؤنے عزائم اور ظلم و بربریت کو سن سنتالیس میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ناصر کاظمی کی آنکھیں تب ہی سے کھلی ہوئی تھیں اس لئے انہوں نے کھلی آنکھوں کے ساتھ دشمن کی خلاف قلم سے جہاد کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے انہوں نے فرنگیوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار بم بنا کر اور

پھر کمشنر ہاؤس پر اسے پھینک کر کیا تھا اور یہاں مادر وطن کی حفاظت اور دشمنوں کو ناکو چنے چبوانے کے لئے انہوں نے لفظوں کی بندوقوں سے کامیاب برشٹ مارے۔ وہ چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کی ڈائری میں یوں لکھتے ہیں:

"ابھی صبح کاذب تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی ہم حیران ہوئے آج اتنی جلدی کون آ گیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو محلے کے دودھ والوں نے بتایا کہ پاکستان پر ہندوستان کا حملہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی جلو سے ان کے دو آدمی یہ خبر لائے ہیں۔ میں فوراً تیار ہو کر ریڈیو سٹیشن پہنچا۔ خبر درست تھی۔ دن کے ساڑھے نو بجے تھے کہ ایک دم آسمان پر بہت زور سے دھماکہ ہوا۔ ہم سمجھے کہ دشمن نے گولہ باری کی ہے تھوڑی دیر بعد جیلانی صاحب انجینئر بٹ صاحب ڈائریکٹر مسکرائے اور کہنے لگے کہ ہمارے ۱۰۴ جہازوں نے Sound Barrier عبور کیا ہے۔ میرزا ادیب، وزیر آغا کی گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ریڈیو سٹیشن میں اس وقت صرف تین ترانے موجود تھے ایک فلمی ترانہ ساتھیو مجاہدو ------- دوسرا عالی کا ترانہ میرے نغمے تمہارے لئے ہیں، جو رن کچھ کے جنگ کے موقع پر لکھا گیا تھا اور ایک اور تھا میں نے فوراً ایک ترانہ لکھا۔"

ہمارے پاک وطن کی شان"۔ ۳۹

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ریڈیو پاکستان نے دشمن کے پروپیگنڈا کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے اہم کردار ادا کیا تھا۔ شاعروں نے اس جنگ میں جو قومی نغمے اور جنگی ترانے لکھے وہ ہمارے ادب کا ایک اہم باب ہیں۔ اسی طرح ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھی شعرا نے قوم کے شانہ بشانہ جہاد میں حصہ لیا۔ پاکستان کی تاریخ گواہ ہے کہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہمارے گلوکاروں، فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں نے جو کردار ادا کیا زندہ قوموں میں اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ ادیبوں نے ریڈیو کے لئے ایسے سکرپٹ لکھے جو جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھے۔ شعرا نے دشمن کو اپنے ترانوں اور قومی نغموں کے ذریعے للکارا، گلوکاروں نے بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ اپنی آواز کا جادو جگایا، فنکاروں نے محاذ جنگ پر جا کر مجاہدین کے حوصلوں کو بلند کیا۔ اس زمانے میں ملکہ

ترنم نور جہاں کا یہ نغمہ بے حد مقبول تھا "اے وطن کے سجیلے جوانو میرے نغمے تمہارے لئے ہیں۔" ناصر کاظمی نے یوں تو بہت سے قومی نغمے لکھے مگر سرگودھا اور سیالکوٹ دشمن کا خصوصی نشانہ تھے سو انہوں نے سیالکوٹ کے حوالے سے لکھا " سیالکوٹ تو زندہ رہے گا" اور سرگودھا کے حوالے سے لکھا "زندہ دلوں کا گہوارہ سرگودھا میرا شہر" "نشاط خواب" میں ناصر کاظمی کے جذبہ حب الوطنی سے سرشار بھرپور شاعری شامل ہے۔ اس کے علاوہ ناصر کاظمی نے "صدائے کشمیر" کے نام سے کشمیریوں کے لئے بھی ترانہ لکھا۔ جو انہوں نے آزاد کشمیر ریڈیو سے ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو پڑھا تھا۔ نشان حیدر میجر عزیز بھٹی کو بھی منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ انہوں نے بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ ناصر کاظمی کی قومی شاعری کی تفصیل شاعری کے باب میں آچکی ہے۔ ناصر کاظمی نے اپنی ۶ ستمبر کی ڈائری میں جس تیسرے ترانے کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ایک اور تھا۔ وہ ترانہ طفیل ہوشیار پوری کا تحریر کردہ تھا جو فلم میں بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ یہ ترانہ ہر دور میں مقبول رہا آج بھی افواج پاکستان کی پریڈ کے موقع پر اس کی گونج سنائی دیتی ہے' ترانہ یہ ہے:

توحید کا پرچم لہرایا اے مرد مجاہد جاگ ذرا

اب وقت شہادت ہے آیا ۔۔۔۔۔۔ اللہ ہو اکبر۔ اللہ ہو اکبر

اس نغمہ پر طفیل ہوشیار پوری مرحوم کو بعد از مرگ حکومت پاکستان کی جانب سے تمغہ حسن کارکردگی بھی ملا تھا۔ لیکن ناصر کاظمی جس نے بے شمار قومی نغمے اور ترانے لکھے وہ اس اعزاز سے جیتے جی بھی اور مرنے کے بعد بھی محروم رہا۔ ناصر کاظمی نے ادب میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں اور تحریک پاکستان سے لے کر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ میں جو مجاہدانہ کردار ادا کیا اس کا اب بھی تقاضا ہے کہ حکومت قومی سطح پر ان کی خدمات کا اعتراف کرے۔

۱۱۔ ناصر کاظمی کی بیگم اور بیٹوں کا تذکرہ:

"چند پریشاں" کاغذ میں ناصر کاظمی نے اپنی شادی اور اپنی بیگم کا بطور خاص ذکر

کیا اور یہ بھی بتایا کہ برات کہاں سے چلی اور کون کون شامل تھے۔ لکھتے ہیں:

"میری شادی چھ جولائی ۱۹۵۲ء کو رات منٹگمری بارات گئی۔ حلقہ ارباب ذوق اور کافی ہاؤس سے برات جمع کی۔ باراتیوں میں نور عالم، شیخ صلاح الدین، شاہد حمید، صفدر میر، خواجہ اسد اللہ، نانا فضل رسول، بھائی حامد حسین، اصغر حسین شاکر، عنصر اور بڑی بھابھی شامل تھے۔

۷ جولائی کی پہلی گھڑی نکاح ہوا۔" ۴۰

اس ڈائری میں حفیظ ہوشیار پوری کی تاریخ نکالنے کا ذکر بھی ہے اور یہ بھی کئی ڈائریوں میں درج ہے کہ وہ اپنی بیگم شفیقہ کاظمی کو "بانو" اور "تیکن" کے نام سے پکارتے تھے۔ اپنے بیٹوں باصر سلطان کاظمی اور حسن سلطان کاظمی کا بھی ناصر کاظمی نے اپنی اس خصوصی ڈائری میں ذکر کیا ہے۔ باصر اور حسن کی ولادت کے حوالے سے جس تاریخ کو وہ پیدا ہوئے ناصر نے ڈائری لکھی ہے جس کا ذکر پہلے باب میں ہو چکا ہے۔

۱۲۔ عنصر کاظمی کا تذکرہ:

ناصر کو اپنے چھوٹے بھائی سے بے حد محبت تھی وہ اکثر دوستوں سے بھی اس پیار کا ذکر کرتے ہوئے کہتے تھے کہ میں عنصر کے لئے کچھ نہ کر سکا اس زمانے میں عنصر کاظمی اے جی آفس میں کلرک بھرتی ہوئے تھے اور اب انیسویں گریڈ کے اعلیٰ افسر ہیں۔ ناصر نے اپنی ڈائریوں میں جگہ جگہ عنصر کا ذکر کیا ہے اس ڈائری میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"عنصر میری زندگی کا آخری سہارا ہے۔" ۴۱

۱۳۔ آباؤ اجداد کا ذکر اور اپنے بڑے سوتیلے بھائی حامد حسین کا ذکر:

ناصر کی ڈائریوں میں یعنی چند "پریشاں کاغذ" میں دیگر عزیز و اقارب اور ان کے بڑے سوتیلے بھائی حامد حسین کا ذکر بھی ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے عزیزوں میں سے

عزیز الحق برادر نسبتی' اپنے تایا سید فیض الحسن موسوی جنہیں وہ تایا فیضی کہا کرتے تھے اور جو شجرہ سادات کی المشہور کتاب "گلزار موسوی" کے مولف اور دیگر مذہبی کتابوں کے مصنف تھے' کا ذکر بھی موجود ہے۔ خورشید اکبر ننھیالی کزن' ماموں اشتیاق رسول کاظمی جن سے ان کی دوستی بھی تھی اور لاڈ میں انہیں کلا ماما کہا کرتے تھے اور ناصر کی ان سے دوستی بھی تھی کا بطور خاص ذکر ہے۔ انبالہ میں جیسے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ لوگوں کے نام بگاڑ کر پکارنے کا رواج عام تھا اس میں مرد و زن دونوں ہی شامل تھے۔ بعض اوقات ایک نام کے کئی لوگ ہوتے تھے تو ان کی پہچان کے لئے ان کے نام کے ساتھ عرف یا اضافت لگا دی جاتی تھی۔ مثلا انبالہ میں ناصر کاظمی بھی تین تھے اور یوں ناصر کئی تھی اس لئے پہچان کے لئے انہیں اس طرح پکارا جاتا ہے۔

ناصر کاظمی ------ ناصر حبشی (شاعر) ناصر کاظمی ------ باقر والا۔ ناصر کاظمی ------ بدھو والا۔ ان کے علاوہ جو ناصر تھے ان میں ناصر جھلا۔ ناصر مویا۔ ناصر قیم والا' ناصر شوکت والا قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں انبالہ میں مختلف ناموں کے ساتھ عرف سے پکارنے کا رواج بھی عام تھا۔ مثلاً عبادت علی رضوی بادو۔ صادق حسین چین۔ علی عباس باچھو۔ قیصر عباس رضوی مسٹر' ضیا بندہ' رضا بندہ اچھر۔ چھاکو۔ تاجو لوٹا' ہاشو' کیمی' بھیمہ۔ چھلا۔ لال۔ چھاجی۔ تاری۔ شیق۔ فیق۔ چھارو اچھ۔ بندو منا۔ چھان ' چاپانگو' مانا' شیرا' فرو' پاتا' گدڑی بنو' اختر جھلی والا' اختر ڈیڑھ گلا۔ اختر جمویا وغیرہ شامل ہیں۔ اختر حسین رنگین انبالہ کے نہ صرف اچھے شاعر اور سوز خواں تھے بلکہ اچھے خطاط بھی تھے ناصر کاظمی ان سے ہمیشہ اپنے اشعار بڑے بڑے کاغذوں پر لکھواتے تھے۔

۱۴۔ قرآن کریم اور نہج البلاغہ کا مطالعہ ::

شیخ صلاح الدین بتاتے ہیں کہ ناصر کاظمی کا قرآن اور حدیث کا بھی بہت مطالعہ تھا انہوں نے قرآن کریم ترجمہ کے ساتھ پڑھا ہوا تھا اور اکثر ان سے قرآن حکیم اور احادیث کے حوالے سے گفتگو ہوتی تھی تو وہ کہتے تھے جس نے قرآن کریم کا مطالعہ

نہیں کیا وہ اچھا شاعر اور ادیب کبھی نہیں ہو سکتا۔ ۴۲

ناصر کاظمی مولائے کائنات حضرت علیؑ کے بھی بہت شیدائی تھے آل رسولؐ ہونے کے ناتے سے انہیں اپنے اجداد پر ہمیشہ فخر رہا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۵۴ء کی ڈائری میں درج ہے کہ انہوں نے اس روز سے دوبارہ نہج البلاغہ کو پڑھنا شروع کیا اس طرح قرآن کریم کے پڑھنے کا ذکر بھی ان کی ڈائریوں میں ملتا ہے۔

۱۵۔ احباب کے تذکرے اور مشاعرے ::

ناصر کاظمی نے اپنی ان ڈائریوں میں جہاں جہاں وہ مشاعرہ پڑھنے گئے وہاں کا ذکر اور پھر اپنے قریبی احباب کا ذکر کئی جگہوں پر کیا ہے۔ ان احباب میں سعادت حسن منٹو، عبدالرحمٰن چغتائی، شاکر علی، محمد حسن عسکری، انتظار حسین، شیخ صلاح الدین، احمد مشتاق، غالب احمد اور حنیف رامے شامل ہیں۔ ان احباب کے علاوہ لاہور کے ہوٹلوں کا بھی بہت تذکرہ اور احباب کے ساتھ گھومنے پھرنے اور خاص طور پر باغات میں جا کر پرندوں کی آوازوں کے درمیان خود کو پا کر خوشی محسوس کرنے کے تذکرے عام ہیں۔ ڈائریوں میں پہلے انار کلی کی رہائش اور پھر مارچ ۱۹۵۷ء میں کرشن نگر منتقل ہونے کا ذکر بھی موجود ہے۔

۱۶۔ کبوتروں کے بارے میں مکمل معلومات ::

ان "چند پریشاں کاغذ" میں کبوتروں کے بارے میں جو معلومات ناصر کاظمی نے دی ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔ یہ ایک الگ سا گوشہ ہے۔ جس میں کبوتروں کی اقسام، ان کی اڑانوں، لمبی اڑانوں کے لئے مختلف نسخے اور کبوتروں کے علاج کے لئے نادر نسخے درج ہیں۔ یہ نسخے ناصر کاظمی کو جہاں جہاں سے ملے ان کی تفصیل سے بھی انہوں نے آگاہ کیا۔ اس بارے میں ہم پہلے باب میں بھی اس ڈائری کے حوالے سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ ناصر کاظمی کو کبوتروں کے پالنے کا شوق بچپن ہی سے تھا وہ جہاں کہیں کوئی

اچھا نادر کبوتر دیکھتے بس بے چین ہو جاتے اور جب تک اسے حاصل نہ کر لیتے تھے وہ چین سے نہ بیٹھتے تھے۔ افتخار کاظمی کا کہنا ہے کہ انبالہ میں ناصر کاظمی کے پاس ایک ایسا شیرازی کبوتر بھی تھا جس کے پر اوپر سے سرخ اور نیچے کا حصہ بلیو اور آسمانی تھا یہ ایک نادر کبوتر تھا جو وہ باواسنت سنگھ کو دے آیا تھا۔ افتخار کاظمی کا کہنا ہے کہ ناصر کو کبوتروں کے بارے میں غیر معمولی معلومات حاصل تھیں۔ ہمیں یاد ہے کہ وہ کبوتروں کی سیدھی اور تیز اڑان کے لئے عطر حنا لے کر سلائی اور روئی سے کبوتروں کی ناک کے پاس عطر کی ہلکی سی بوند لگا دیتا تھا جس سے کبوتر ہمیشہ سیدھے اور تیز اڑتے تھے یہ اس کا خوشبو کا سفر تھا۔ ۴۳

سو اس ڈائری میں ناصر کاظمی نے کبوتروں کی اڑانوں سے لے کر ان کی خوراک کے نادر نسخے تحریر کئے ہیں۔ ناصر نے کبوتروں کو مختلف ٹکڑیوں میں اڑانے کے طریقے بھی بتائے ہیں اور پھر ان اڑانوں کے حوالے سے استاد شریف اور بابو نصیر الدین سمیت مشہور کبوتر بازوں کے نسخے بھی درج کئے ہیں۔ یہ گوشہ جب کتابی صورت میں آئے گا تو کبوتر بازی پر ایک نادر کتاب ثابت ہو گا۔ ناصر کاظمی نے جس تفصیل کے ساتھ کبوتروں کی اقسام اور ہر موسم کے اعتبار سے ان کی خوراک اور علاج کا جس طرح سے ذکر کیا ہے اس سے پہلے کسی شاعر یا ادیب کے یہاں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ناصر کاظمی وہ واحد اور منفرد شاعر تھا جو نہ صرف کبوتروں سے بے حد پیار کرتا تھا بلکہ اسے کبوتر اپنے بچوں کی طرح عزیز تھے۔ وہ انہیں آسمان کے ننھے سفیر کہا کرتا تھا۔ ان ڈائریوں میں ناصر کاظمی نے مشاعروں کے ساتھ ساتھ جہاں جہاں وہ گئے ان لوگوں کا بھی ذکر کیا جو کبوتروں سے دلچسپی رکھتے تھے انہیں جہاں کہیں سے اچھا کبوتر ملا وہ لے آئے اور جہاں کسی سے کبوتروں کے بارے میں کوئی نسخہ ملا تو اسے بھی لکھ لیا۔ سو " چند پریشاں کاغذ" کا یہ "گوشہ کبوتراں" نہایت اہمیت کا حامل ہے اور یہ ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن کی تفہیم کے لئے بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔

○::○

حواشی

۱ ـ: صلاح الدین ، شیخ، "ناصر کاظمی ایک دھیان" ، لاہور، آغاز پبلشرز ، ۱۹۹۱ء ، ص : ۵۶
۲ ـ: صلاح الدین ، شیخ، "ناصر کاظمی ایک دھیان" ، لاہور، آغاز پبلشرز ، ۱۹۹۱ء ، ص : ۵۶
۳ ـ: صلاح الدین شیخ، "ناصر کاظمی ایک دھیان" ، ص : ۸۰ ، ۸۱
۴ ـ: صلاح الدین شیخ، ناصر کاظمی ۔ ایک دھیان" ، ص : ۸۹ ، ۹۰
۵ ـ: صلاح الدین شیخ، ناصر کاظمی ۔ ایک دھیان" ، ص : ۱۰۲
۶ ـ: صلاح الدین شیخ ، "ناصر کاظمی ، ایک دھیان" ، ص : ۱۰۶
۷ ـ: انتظار حسین، "چار گھڑی یاروں کا میلہ" ، ہجر کی رات کا ستارا مرتبہ احمد مشتاق ، ص : ۲۷ ، ۲۸
۸ ـ: منیر احمد شیخ "چراغوں کا دھواں" ہجر کی رات کا ستارا مرتبہ احمد مشتاق ،
۹ ـ: صلاح الدین شیخ ، "ناصر کاظمی ، ایک دھیان" ، ص : ۱۱۲ ، ۱۱۳
۱۰ ـ: صلاح الدین شیخ ، "ناصر کاظمی ، ایک دھیان" ، ص : ۱۱۲ ، ۱۱۳
۱۱ ـ: صلاح الدین شیخ ، "ناصر کاظمی ، ایک دھیان" ، ص : ۸۹
۱۲ ـ: انتظار حسین، "چار گھڑی یاروں کا میلہ" ، ہجر کی رات کا ستارہ، مرتبہ احمد مشتاق ، ص : ۴۰
۱۳ ـ: انتظار حسین ، "چار گھڑی یاروں کا میلہ" ، ہجر کی رات کا ستارا مرتبہ احمد مشتاق ، ص : ۳۰ ، ۳۱

۱۴ :- مظفر علی سید، "ناصر کاظمی، ایک گم گشتہ نوا"" ہجر کی رات کا ستارا، مرتبہ احمد مشتاق ص:۱۰۷

۱۵ :- صلاح الدین، شیخ، انٹرویو مقالہ نگار، ۲۶ جون ۱۹۹۴ء

۱۶ :- صلاح الدین شیخ، "ناصر کاظمی، ایک دھیان" ص: ۲۰

۱۷ :- احمد عقیل روبی، "مجھے تو حیران کر گیا وہ" ص: ۳۲

۱۸ :- ناصر کاظمی، "خشک چشمے کے کنارے"، ص: ۲۴۷

۱۹ :- ناصر کاظمی، "خشک چشمے کے کنارے"، ص: ۲۹۰ تا ۳۰۷

۲۰ :- حسن سلطان کاظمی گفتگو مقالہ نگار، ۲۶ جون ۱۹۹۴ء

۲۱ :- ناہید قاسمی، "ناصر کاظمی شخصیت اور فن"

۲۲ :- ناصر کاظمی ڈائری نمبر ۱

۲۳ :- افتخار کاظمی گفتگو مکرر، ۲۹ جون ۱۹۹۴ء

۲۴ :- انتظار حسین گفتگو مقالہ نگار، ۲۶ جون ۱۹۹۴ء

۲۵ :- افتخار کاظمی مکرر گفتگو مقالہ نگار، ۲۶، جون ۱۹۹۴ء

۲۶ :- صلاح الدین، شیخ، گفتگو، ۲۶ جون ۱۹۹۴ء

۲۷ :- اعظم خان گفتگو ۲۶ جون ۱۹۹۴ء

۲۸ :- عتیق اللہ شیخ گفتگو ۳۰ جون ۱۹۹۴ء

۲۹ :- "چند پریشاں کاغذ" ناصر کاظمی کی غیر مطبوعہ ڈائری مملوکہ باصر سلطان کاظمی۔ حسن سلطان کاظمی

۳۰ :- شیخ صلاح الدین، گفتگو مقالہ نگار، ۲۶ جون ۱۹۹۴ء

۳۱ :- ناصر کاظمی، "چند پریشاں کاغذ" غیر مطبوعہ

۳۲ :- ناصر کاظمی، "چند پریشاں کاغذ" غیر مطبوعہ

۳۳ :- ناصر کاظمی "چند پریشاں کاغذ"، غیر مطبوعہ

۳۴ :- ناصر کاظمی، "چند پریشاں کاغذ"، غیر مطبوعہ

۳۵ :- ناصر کاظمی "چند پریشاں کاغذ" غیر مطبوعہ

۳۶ :- ناصر کاظمی "چند پریشاں کاغذ" غیر مطبوعہ

۳۷:۔ ناصر کاظمی "چند پریشاں کاغذ" غیر مطبوعہ
۳۸:۔ ناصر کاظمی "چند پریشاں کاغذ" غیر مطبوعہ
۳۹:۔ ناصر کاظمی "چند پریشاں کاغذ" غیر مطبوعہ
۴۰:۔ ناصر کاظمی "چند پریشاں کاغذ"
۴۱:۔ ناصر کاظمی "چند پریشاں کاغذ
۴۲:۔ شیخ صلاح الدین گفتگو، ۲۶ جون ۱۹۹۴ء
۴۳:۔ شیخ صلاح الدین گفتگو، ۲۶ جون ۱۹۹۴

○::○

ضمیمہ

ناصر کاظمی کا عکسِ تحریر

"ضمیمہ"

ناصر کاظمی کے عکس تحریر:

ا۔ ناصر کاظمی ایک متنوع شخصیت کے حامل شاعر اور ادیب تھے۔ انہوں نے اپنی مختصر زندگی میں چونکا دینے والی تخلیقات یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ بظاہر ایک باتونی' بے پروا اور لا ابالی شخصیت کے انسان دکھائی دیتے تھے مگر ان کی شخصیت میں جس قدر ڈسپلن' ٹھہراؤ اور حیرانیاں تخلیق کرنے کا جوہر تھا وہ ان کی شاعری اور نثرپاروں کے علاوہ ان کے معمول کے روزناچوں' اوقات کار' احساس ذمہ داری' مغربی اور مشرقی ادب کے وسیع مطالعے' کلاسیکی شعرا کے کلام کے انتخاب اور مختلف مشاغل سے سامنے آتا ہے۔ کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ ناصر کا تمام علم سماعی تھا مگر ہم پچھلے اوراق میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ناصر ایک وسیع المطالعہ شاعر اور ادیب تھے۔ ان کی نظریں نہ صرف اردو کے کلاسیکی شعرا اور ادیبوں پر تھیں بلکہ انہوں نے انگریزی ادب کے اہم تخلیق کاروں کو بھی پڑھ رکھا تھا۔ ہمارے یہاں کے شعرا میں ایسی بہت کم مثالیں ملتی ہیں جو ناصر کاظمی کی طرح بہت پڑھے لکھے ہوں گو ناصر کاظمی ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کر سکے مگر ان کا علم کئی ڈگریاں حاصل کرنے والوں پر بھاری تھا۔ انہوں نے گو مغربی اور مشرقی لکھاریوں کو بہت پڑھا ان کے بارے میں گفتگوئیں بھی کیں مگر انہوں نے اپنی شاعری اور نثر کی حویلی کو ہمیشہ جدا اور منفرد رکھا۔ ناصر کاظمی نے نہ صرف قیام پاکستان سے پہلے اپنی ڈائری روزانہ لکھی بلکہ قیام پاکستان کے بعد بھی اس سلسلے کو جاری رکھا۔ غیر مطبوعہ ڈائریوں کے باب میں ہم ان پر تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ ان اوراق میں ہم سب سے پہلے ناصر کاظمی کی تحریر کردہ

ایک غیر مطبوعہ ڈائری جسے انہوں نے چند پریشان کاغذ کا نام دیا ہے پہلی مرتبہ اس سے چند ڈائریوں کے عکس پیش کرتے ہیں۔۔۱

۲۔ یہاں ہم ایسے عکس تحریر پیش کر رہے ہیں جو اس سے پیشتر کبھی شائع نہیں ہوئے ناصر کاظمی نے مختلف کلاسیکی شعرا کے کلام کا جو انتخاب کیا ہے اس کے عکس ان انتخابات میں شائع ہو چکے ہیں۔ چند پریشاں کاغذ کے علاوہ ناصر کاظمی نے اپنی الگ سے بھی ڈائریاں لکھیں جن میں ان کی ابتدائی زندگی کے حالات درج ہیں۔ ذیل میں ہم ایک ایسی ہی ڈائری کے کچھ اوراق پیش کر رہے ہیں جن سے ناصر کاظمی کے ابتدائی حالات زندگی سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس ڈائری میں ناصر کاظمی نے اپنی تاریخ پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء لکھی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ تاریخ درست ہو کیونکہ یہی تاریخ انہوں نے ایک دو اور جگہوں پر بھی تحریر کی ہے۔ مگر ان کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں جو تاریخ پیدائش درج ہے وہ یکم دسمبر ۱۹۲۳ء ہے۔ بقول انتظار حسین یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں سرکاری نوکری کے حصول کے لئے اپنی تاریخ پیدائش زیادہ لکھوانے کا رواج تھا۔ ہو سکتا ہے ناصر نے بھی اپنی تاریخ پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کی بجائے یکم دسمبر ۱۹۲۳ء لکھوا دی ہو مگر ایسے میں انہیں صرف سن ہی تبدیل کرنا چاہئے تھا اور دو سال بڑھا کر لکھوا دیتے مگر انہوں نے ۸ دسمبر کو یکم دسمبر کیوں کر دیا اس لئے ہمارے نقطہ نظر کے مطابق ناصر کاظمی کی تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۲۳ء ہی شعوری ہے اور یہی درست ہے۔ آیئے اب ملاحظہ کیجئے ناصر کاظمی کی ایک غیر مطبوعہ ڈائری کے اوراق۔۔۲

۳۔ یہ وہ غیر مطبوعہ دستاویزات ہیں جو ریڈیو پاکستان لاہور میں ناصر کاظمی کی پرسنل فائل میں شامل ہیں ان میں ناصر کاظمی کے ہاتھ کی تحریر کردہ انگریزی میں درخواستیں بھی ہیں اور وہ کنٹریکٹ بھی جس کی رو سے ناصر کاظمی نے ۴۳۔۷۔ا کو ریڈیو سے بحیثیت سکرپٹ رائٹر کنٹریکٹ سائن کیا تھا۔ ان دستاویزات کا ذکر پہلے باب میں تفصیل سے آچکا ہے یہاں ہم چند اہم

دستاویز کا عکس پیش کر رہے ہیں جن میں سب سے اہم ناصر کاظمی کا میٹرک کا سرٹیفکیٹ جس پر ان کی تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۲۳ء درج ہے۔ میٹرک کا امتحان ناصر کاظمی نے ۱۹۳۹ء میں پاس کیا تھا گویا ۱۹۲۳ء سن پیدائش سے ناصر نے ۱۶ برس کی عمر میں میٹرک کیا۔ اگر ۱۹۲۵ء تاریخ پیدائش صحیح مان لی جائے تو پھر میٹرک کا امتحان پاس کرنے کی عمر ۱۴ برس بنتی ہے مگر قابل غور بات یہ ہے کہ اس ڈائری میں جہاں ناصر کاظمی نے اپنی پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء تحریر کی ہے وہاں آگے چل کر لکھا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں میری عمر ۱۳ برس کی تھی۔ اس ڈائری میں ناصر کاظمی لکھتے ہیں کہ انہوں نے آٹھویں جماعت کا امتحان ڈکشائی سے پاس کیا تھا اور تیرہ برس کی عمر میں ناصر کاظمی ڈکشائی ہی میں تھے۔ اگر ۱۹۳۷ء میں ناصر کاظمی ۱۳ برس کے تھے اور آٹھویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں دو سال بعد جب انہوں نے میٹرک کا امتحان دیا تو وہ ۱۵ برس کے ہو گئے تھے جبکہ ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کے حساب سے ان کی عمر اس وقت ۱۴ برس کی ہونی چاہئے تھے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ تیرہ برس کی عمر میں مڈل پاس کرنے کے بعد ۱۴ برس کی عمر میں میٹرک کر لیتے انہوں نے مسلم ہائی سکول انبالہ میں دو سال تک میٹرک کی تعلیم حاصل کی۔ اگر یکم دسمبر ۱۹۲۳ء کے مطابق ناصر کاظمی کی عمر کا تعین کیا جائے تو میٹرک کے امتحان کے وقت یعنی ۱۹۳۹ء میں ناصر کاظمی کی عمر ۱۶ برس بنتی ہے جبکہ ۱۹۲۵ء کے حساب سے وہ میٹرک ۱۴ چودہ برس کی عمر میں پاس کرتے ہیں حالانکہ وہ مڈل میں اپنی عمر خود اپنی ڈائری میں تیرہ برس بیان کر چکے ہیں اور سن ۱۹۳۷ء لکھا ہے۔ سو اگر ۱۹۲۵ء کو تاریخ پیدائش مان لیا جائے تو ناصر کاظمی ۱۹۳۷ء میں تیرہ برس کے نہیں ہو سکتے اس لئے انہوں نے میٹرک کے امتحان میں جو عمر یکم دسمبر ۱۹۲۳ء درج کی ہے وہی درست ہے۔ ہم ان اوراق میں ترتیب وار ان دستاویز کے عکس پیش کر رہے ہیں۔

میٹرک کی سند یونیورسٹی آف دی پنجاب رول نمبر ۷۳۶۰ امتحان میٹرک سیشن ۱۹۳۹ء

۲۔ انکم ٹیکس اسیسمنٹ منٹ جس میں کنٹریکٹ کی تاریخ ۶۴ ۔ ۷۔ ۱ تا ۶۴ ۔ ۶ ۔ ۳۰ درج ہے۔

۳۔ ناصر کاظمی کی درخواست ریجنل ڈائریکٹر کے نام جس میں انہوں نے کتابوں پر انکم ٹیکس کی چھوٹ کے لئے لکھا۔ ۲۔ اپریل ۱۹۷۰ء

۴۔ ناصر کاظمی کی درخواست ریجنل ڈائریکٹر کے نام ٹی وی کے نعتیہ مشاعرہ میں شرکت کے لئے اجازت! ۱۸، مئی ۱۹۷۰ء

۵۔ ناصر کاظمی کی لاہور سے کراچی اور کراچی سے لاہور آنے جانے کی تفصیل کی رپورٹ۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۵ء

۶۔ ناصر کاظمی کی بیماری کی درخواستیں ریجنل ڈائریکٹر کے نام مورخہ

۳۰ مارچ ۱۹۷۱ء — ۳۰۔ اپریل ۱۹۷۱ء
۳۰ اپریل ۱۹۷۱ء — ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء
۳۱ مئی ۱۹۷۱ء — ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۱ء
۱۷ نومبر ۱۹۷۱ء — ۱۸ نومبر ۱۹۷۱ء
۲۷ مئی ۱۹۷۱ء

۷۔ اے وی ایچ ہسپتال سے سجاد ترمذی کے نام خط

۷۱ ۔ ۳ ۔ ۲۹ — ۷۱ ۔ ۴ ۔ ۲۳
۷۱ ۔ ۵ ۔ ۲۷ — ۷۱ ۔ ۵ ۔ ۳۰

۸۔ میڈیکل سرٹیفکیٹس — ۷۱ ۔ ۱۰ ۔ ۲۱
۷۱ ۔ ۱۱ ۔ ۱۸

۹۔ ریجنل ڈائریکٹر کا خط ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان کے نام برائے امداد دو ہزار روپے۔ ۱۸۔ مئی ۱۹۷۱ء

۱۰۔ ادیبوں کی جانب سے قرار داد جو الطاف فاطمہ کے دستخطوں سے جاری ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی۔ صفدر میر۔ خدیجہ مستور۔ ظہیر کاشمیری۔ ڈاکٹر انور سجاد۔ میرزا ادیب۔ انتظار حسین۔ کی جانب سے واضح کیا گیا ہے کہ اگر ناصر کاظمی کو آپریشن کے لئے امداد نہ دی گئی تو ہم ریڈیو کے لئے بطور، احتجاج

لکھنا چھوڑ دیں گے۔

۹۔ جنوری ۱۹۷۲ء

۱۱۔ ریجنل ڈائریکٹر مسعود قریشی کا ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کے نام ایک خط جس میں ناصر کاظمی کی امداد کی درخواست کی گئی۔

۱۷۔ جنوری ۱۹۷۲ء

۱۲۔ ریجنل ڈائریکٹر مسعود قریشی کا خصوصی پیغام ڈائریکٹر جنرل کے نام جس میں ناصر کاظمی کی بیماری کے سلسلے میں امداد کے لئے ادیبوں کی جانب سے احتجاجی پیغام بھجوایا گیا۔

۱۸۔ جنوری ۱۹۷۲ء

۱۳۔ ناصر کاظمی کی موت کا میڈیکل سرٹیفکیٹ ' ناصر کی وفات کے بعد گریجویٹی کی ادائیگی کے سلسلے میں

۲۔ مارچ ۱۹۷۲ء

۱۴۔ ریڈیو یونین کی جانب سے ابو الحسن نغمی اور اے حمید کی ڈائریکٹر جنرل کو درخواست۔

۶۔ مارچ ۱۹۷۲ء

دو تین نئے بے تکان ملک بدر کے ادیبوں اور شاعروں
کی سرائے تھا - بھی عجب وضع دار آدمی ہیں - ہر صنف ادب
میں طبع آزمائی کر چکے ہیں - مخلص آدمی ہیں اور ساری عمر
انہوں نے علم سے لگاؤ کر کے زندگی بسر کی -

۸ - جنوری - اسپین کے جواں مرگ شاعر لورکا کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا -
یہ شاعر مجھے بے حد پسند ہے -

"The ear of grain keeps intact-
its hard yellow laughter.
Again.
Children eat brown bread
and delicious moon.

Love, love.
Enclosed by my thighs,
the sun swims like a fish

۱۹ - جنوری بدھ - صبح پرانے یار دیرینہ چودھری انوار احمد ایڈووکیٹ نے
آ گھیرا - انوار صاحب ۵۹ء میں ایبٹ آباد میں بطور پولیس سب انسپکٹر یا
اے ایس آئی تعینات تھے - ان کے ساتھ میں نے ضلع ایبٹ آباد کے
تقریباً تمام دیہات کا سفر کیا - دو تین برس تک ان کے ساتھ
ہرن کا شکار کھیلا اور گھوڑ سواری کی - انہی کے ہمراہ شکار کے
دوران جس چالیس کوس گھوڑے پر سفر طے کر لینا
کمال تھا -

—

پاک ٹی ہاؤس میں ادیبوں اور شاعروں کا گڑھ ہے۔ بشرت بخاری اور بقا نقوی کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ ایسے ہی کافی ہاؤس میں حفیظ، انور جلال انور شمیم دل، ریاض قادر، اے حمید، عرفی جبار کے ساتھ کافی دیر تک رہا۔ ریاض قادر نے تازہ کہی تھی ایک غزل نقل کرتا ہوں۔

زمانے کے پہلو میں وہ دے قدم کرتی ہیں نشوونمو کے
مگر یہ جو دن جا رہا ہے ہمارا، ہمارا ہی ہے

ALBERT VICTOR HOSPITAL

(MAYO HOSPITAL) LAHORE

Patient. MR. Nasir Kazmi. Age. 46 yrs

Certified that the above named has been admitted, as a case of Haematemesis since 6.3.1971 under care of Prof. Alamgir Khan FRCP

~~He is likely to stay with us for~~ ______ ~~days,~~

~~and after discharge, shall need~~ ______ ~~days rest, as advised by his Physician/Surgeon.~~

He has been advised rest & treatment upto 29.5.1971, in continuation of his previous leave from 6.3.71 to 8.5.1971. He is still admitted in this hospital for his treatment.

M. Akbar Sial

Date.

Medical Officer 2.7.5.71

میڈیکل سرٹیفکیٹ کا عکس

ALBERT VICTOR HOSPITAL

(MAYO HOSPITAL) LAHORE

Patient. Mr Nasir Kazmi. Age. 46 m.

Certified that the above named has been admitted, as a case of Haematemesis since 6.3.1971 under care of Prof Alamgir Khan. F.R.C.P

He is likely to stay with us for few days, and after discharge, shall need × days rest, as advised by his Physician/Surgeon.

He was recommended leave from March 6 to May 29. 1971. He is fit to resume his duties with light work.

Date. 30.5.71.

Medical Officer

میڈیکل سرٹیفکیٹ کا عکس

ALBERT VICTOR HOSPITAL

(MAYO HOSPITAL) LAHORE

Patient. MR. Nasir Kazmi Age. 47

Certified that the above named has been admitted, as a case of Haematemesis since 21-10-71 (admitted in casualty on 20-10-71) under care of Prof. Alamgir Khan Unit

He is likely to stay with us for upto 16-11-71 days, and after discharge, shall need upto 11th December 1971 days rest, as advised by his Physician/Surgeon.

G. Akbar Sial 16/11/71

Date.

Medical Officer

میڈیکل سرٹیفکیٹ کا عکس

ALBERT VICTOR HOSPITAL

(MAYO HOSPITAL) LAHORE

Patient. MR- Nasir Kazmi Age.

Certified that the above named has been admitted, as a case of Haematemesis since 21.10.71 to 16.11.71 in A.V.H. and on 20.10.71 in casualty ward under care of ~~Prof. Alamgir Khan FRCP~~

He ~~is likely to stay with us for ________ days, and after discharge, shall need ________ days rest, as advised by his Physician/Surgeon~~

He was recommended leave for the period he stayed in this hospital, and also was advised rest after discharge. However I have again examined him today after his one day's rest following discharge from the hospital. I found him medically fit to resume duty with immediate effect, of course with light duty.

Date. 18.11.71

P.M.S.

Medical Officer

Mayo Hospital Lahore

میڈیکل سرٹیفکیٹ کا عکس

xxxxxxxxxxxxxxxxxxx MPA(107)

MPA- 1 -5609 Phone:54778

May 18, 1971.
19,

My dear Dr. Iqbal Hussain Zaidi

This is in respect of Mr. Nasir Kazmi the ailing poet and our script-writer who has been in the hospital for the last 70 days and about whom some of the participants of the evening meeting at Lahore talked to you. Mr. Nasir Kazmi is a script-writer (staff artist) at this Station contracted for five years with effect from 1-7-1966 and at present drawing a salary of Rs.610/-per month. One day he vomitted blood and was taken to the hospital. The medical examination revealed that he has peptic ulcer. We have not with-held his salary but this has not given much relief to him because his expenditure has been very heavy in the hospital. He is a poor man and a respected member of the writers' community.

2. The rules and regulations governing staff artists do not allow reimbursement of medical charges. I understand that a case for extending the facility of reimbursement of medical charges or free medical treatment at Central Government Hospitals was prepared by the Dte-General but so far it has not received sanction of the competent authority. Under the existing rules, we cannot help Mr. Nasir Kazmi by reimbursing expenditure on medical treatment. I have discussed ways and means of possible help to Mr. Nasir Kazmi in his extreme financial hardship with the Director Administration, Mr. A.A. Hanafi and with our S.A.S. Accountant. They were of the view that Government may be approached to sanction either a lump sum to the tune of Rs.2,000/- out of Staff Welfare Fund as a special case or the actual amount of medical treatment plus accommodation charges at the hospital. Mr. Kazmi's expenditure on examination, medicines and accommodation in the hospital has so far been to the tune of Rs.1,800/-. It is, therefore, requested that a case may please be prepared and recommended to the Government for sanction of the above amount as a special case from the Staff Welfare Fund.

3. I may mention here that column writers like Intizar Hussain are taking up this theme in their columns. I enclose a cutting on the subject. It would be a good gesture if Radio Pakistan could do something for him.

With respectful regards,

Yours sincerely

(Masud Qureshi)

Mr. Ijlal Haider Zaidi, TQA., C.S.P.,
Director General, Radio Pakistan,
81/A, Satellite Town,
Rawalpindi.

Encl: as above.

ریجنل ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان لاہور کی جانب سے ڈائریکٹر جنرل ریڈیو

پاکستان اسلام آباد کے نام ناصر کاظمی کے لئے مالی امداد کی درخواست

کا عکس ۱۸ - ۵ - ۱۹۷۵

The intellectuals and writers of Lahore unanimously adopted a resolution requesting immediate financial help of approximately Rs.2,000/- to Mr. Nasir Kazmi, a staff artist of Radio Pakistan Lahore who is seriously ill awaiting a major operation in the hospital.

Amongst others the writers represented in the meeting were renowned writers like Ahmad Nadeem Qasmi, Safdar Meer, Khadija Mastoor, Zaheer Kashmiri, Dr. Anwar Sajjad, Meerza Adeeb, Intizar Hussain. They stated that they will not cooperate with Radio as a mark of protest if this help is not immediately given.

الطاف فاطمہ

۱۲ لارنس روڈ لاہور

ادیبوں کی جانب سے مالی امداد کا مطالبہ

CREED MESSAGE FROM MR. MASUD QURESHI, TQA., REGIONAL DIRECTOR RADIO PAKISTAN LAHORE

TO MR. IJLAL HAIDER ZAIDI, TQA., CSP., DIRECTOR GENERAL RADIO PAKISTAN, RAWALPINDI

MESSAGE BEGINS

MR. NASIR KAZMI, STAFF ARTIST, RADIO PAKISTAN LAHORE IS AGAIN SERIOUSLY ILL AND IN HOSPITAL AWAITING AN OPERATION STOP THE ENTIRE INTELLECTUAL COMMUNITY OF LAHORE FEELS THAT RADIO SHOULD DO SOMETHING TO HELP HIM FINANCIALLY STOP WE HAVE DONE WHAT LITTLE WE COULD DO PRIVATELY AND ALSO HE WAS GIVEN TWO GRADE ADVANCE INCREMENTS THIS YEAR BUT HE NEEDS LUMPSUM HELP TO THE TUNE OF RUPEES TWO THOUSAND STOP I HAD PREVIOUSLY WRITTEN TO THE DIRECTORATE GENERAL FOR SUCH HELP BUT UNFORTUNATELY IT COULD NOT MATERIALISE STOP IT SEEMS HIGH TIME THAT FROM SOME BENEVOLENT FUND MR. NASIR KAZMI IS GRANTED THE ABOVE MENTIONED AMOUNT IMMEDIATELY STOP

MESSAGE ENDS

NE for favour of creeding.

Sd/-

(Masud Qureshi)TQA
REGIONAL DIRECTOR
Phone:54778.

MPA(107)-/ 1629×30 Dated: January 17, 1972.

1. Copy by post in confirmation of the above creed message forwarded to the Director General, Radio Pakistan, 81/A, Satellite Town, Rawalpindi. We had invited about 40 writers and poets in our Concert Hall on 15-1-1972 to have consultation with them regarding our literary and poetic programmes. The meeting passed a resolution requesting for help to Mr. Nasir Kazmi. Copy of this resolution is enclosed for your kind information. I personally think that if we could give financial help urgently to Mr. Nasir Kazmi to the tune of Rs.2,000/-, it will/helpful to him and appreciated by the writers community. His operation is to take place within the current week. May God save him!

I also enclose a cutting of a column which appeared in today's MASHRIQ at page 3.

2. Copy to Mr. Nasir Ahmad, Dy.Director General(Admn) alongwith a copy of the column in MASHRIQ and copy of our previous letter, for necessary action.

Sd
17/1

(MASUD QURESHI)TQA
REGIONAL DIRECTOR,
Radio Pakistan, Lahore.

ڈائریکٹر جنرل کو بھیجے گئے ٹیلیکس کا عکس

CREED MESSAGE FROM MR MASUD QURESHI RDL TO MR IJLAL HAIDER ZAIDI COMMA TQA COMMA CARPT CSP COMMA DIRECTOR GENERAL COMMA RADIO COMM. RAWALPINDI STOP DATED 18.1.72

BEGINS

IN CONTINUATION OF MY CREED MESSAGE DATES SEVENTEENTH JAN., 1972, I REPRODUCE BELOW A RESOLUTION SENT TELEGRAPHICALLY BY THE WRITERS AND INTELLECTUAL COMMUNITY OF LAHORE TO THE MINISTER FOR INFORMATION AND NATIONAL AFFAIRS AT KARACHI LAST EVENING:

''THE INTELLECTUALS AND WRITERS OF LAHORE UNANIMOUSLY ADOPTED A RESOLUTION REQUESTING IMMEDIATE FINANCIAL HELP OF APPROXIMATELY TWO THOUSAND RUPEES TO MR NASIR KAZMI A STAFF ARTIST OF RADIO PAKISTAN COMMA LAHORE WHO IS SERIOUSLY ILL AWAITING A MAJOR OPERATION IN THE HOSPITAL STOP AMONGST OTHERS THE WRITERS LIKE AHMAD NADEEM QASMI COMMA SAFDAR MEER COMMA KHDIJA MASTOOR COMMA ZAHEER KASHMIRI COMMA DR.ANWAR SAJJAD COMMA MEERZA ADEEB COMMA INTIZAR HUSSAIN STOP THEY STATED THAT THEY WILL NOT CO-O[illegible]TE WITH RADIO AS A MARK OF PROTEST IF THIS HELP IS NOT IMMEDIATELY GIVEN STOP ''

2. M I REQUEST THAT IN VIEW OF THE VERY TIGHT FINANCIAL POSITION OF MR NASIR KAZMI AND GRAVE CONCERN IN THE INTELLECTUALS SOME FINANCIAL HELP FOR MR NASRRPT NASIR KAZMI MAY KINDLY BE OBTAINED URGENTLY STOP

ENDS PL ACK TIME 1150 HOURS .M
PL ACK
OKPL

ایک اور ٹیلیکس کا عکس

ALBERT VICTOR HOSPITAL (MAYO HOSPITAL)
LAHORE

DEATH REPORT FORM

ROOM
BED 24

~~M.L.~~
NML.

Patient's Name- MR Nasir Kazmi

Diagnosis- Ca. stomach c̄ secondaries

Surgeon/Physician- Prof. Mamzir KM & SM Masood

Date of Admission- 13. 1. 72

Date and Time of Death- 2. 3. 72 at 5:00 A.M.

Cause of Death-

Ca. stomach

Sam Muw
Medical Officer

ناصر کاظمی کی موت کا سرٹیفکیٹ

Dated 4.3.72

بخدمت ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان راولپنڈی

(بتوسط ریجنل ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان لاہور)

جناب محترم!

ہمارے بہت عظیم رفیقِ کار، سٹاف آرٹسٹ جناب ناصر کاظمی ۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ضابطے اور قاعدے کی مجبوری کی بنا پر محکمہ انہیں کسی قسم کی مالی امداد نہ دے سکا۔ اس افسوس میں یقیناً آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں گے۔ امید ہے جب کارپوریشن کا قیام عمل میں آجائے گا تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

فوری مسئلہ مرحوم کی گریجویٹی کا ہے۔ آپ نے کمال مہربانی اور حسن سلوک سے ۷ فروری کو یونین کے نمائندوں سے گفت و شنید کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ گریجویٹی کی موجودہ شرح مضحکہ خیز ہے۔ صنعتی مزدوروں کو سال پیچھے تیس ۳۰ یوم کی گریجویٹی ملتی ہے۔

بہ مناسب اور بروقت حسب بالا پیمنٹ کرنا ناصر کاظمی مرحوم کی بیوہ کو پنشن ۲۰ یوم سالانہ کی شرح سے گریجوایٹی منظور فرما کر رقم کے اجرا کا حکم جلد از جلد صادر فرمائیں ۔ نوازش ہوگی ۔

اے حمید ۔ ابوالحسن نغمی

صدر ۔ جنرل سیکرٹری یونین

سٹاف یونین ریڈیو پاکستان لاہور کی جانب سے ڈائریکٹر جنرل

کے نام درخواست میں گریجوایٹی کی جلد ادائیگی کی اپیل

کتابیات

ALBERT VICTOR HOSPITAL

(MAYO HOSPITAL) LAHORE

Patient. MR. Nasir Kazmi. Age. 46 yrs

Certified that the above named has been admitted, as a case of Haemetemesis since 6.3.1971 under care of Prof. Alamgir Khan FRCP

~~He is likely to stay with us for ______ days, and after discharge, shall need ______ days rest, as advised by his Physician/Surgeon.~~

He has been advised rest & treatment upto 29.5.1971, in continuation of his previous leave from 6.3.71 to 8.5.1971. He is still admitted in this hospital for his treatment.

Date.

G. Akbar Sial

Medical Officer 2.7.5.71

میڈیکل سرٹیفکیٹ کا عکس

ALBERT VICTOR HOSPITAL

(MAYO HOSPITAL) LAHORE

Patient. Mr Nasir Kazmi. Age. 46 m.

Certified that the above named has been admitted, as a case of Haematemesis since 6.3.1971 under care of Prof Alamgir Khan. F.R.C.P.

He is likely to stay with us for few days,

and after discharge, shall need X days rest, as advised by his Physician/Surgeon.

He was recommended leave from March 6 to May 29. 1971.
He is fit to resume his duties with light work.

Date. 30.5.71.

Medical Officer

میڈیکل سرٹیفکیٹ کا عکس

ALBERT VICTOR HOSPITAL
(MAYO HOSPITAL) LAHORE

Patient. MR. Nasir Kazmi Age. 47

Certified that the above named has been admitted, as a case of Haematmesis since 21.10.71 (admitted in casualty on 20.10.71) under care of Prof. Alamgir Khan FRCP

He is likely to stay with us for upto 16.11.71 days, and after discharge, shall need upto 11th December 1971 days rest, as advised by his Physician/Surgeon.

G. Akbar Sial
16/11/71

Date. Medical Officer

میڈیکل سرٹیفکیٹ کا عکس

ALBERT VICTOR HOSPITAL
(MAYO HOSPITAL) LAHORE

Patient. MR- Nasir Kazmi Age.

Certified that the above named has been admitted, as a case of Haematemesis since 21.10.71 to 16.11.71 - [illegible] on 20.10.71 in casualty [illegible] under care of ~~Prof. Alamgir Khan FRCP~~

He ~~is likely to stay with us for ________ days,~~

and after ~~discharge, shall need ________ days rest, as advised~~

~~by his Physician/Surgeon~~

He was recommended leave for the period he stayed in the hospital, and was also advised rest after discharge. However I have again examined him today after his one day's rest following discharge from the hospital. I found him medically fit to resume duty with immediate effect, of course with light duty.

[Signature] Medical Officer

Date. 18.11.71

میڈیکل سرٹیفکیٹ کا عکس

xxxxxxxxxxxxxxx MPA(IV)

MPA- 1 - 5609 Phone:54778

May 18, 1971.
19,

My dear Dr. Iffat Haider Zaidi

This is in respect of Mr. Nasir Kazmi the ailing poet and our script-writer who has been in the hospital for the last 70 days and about whom some of the participants of the evening meeting at Lahore talked to you. Mr. Nasir Kazmi is a script-writer (staff artist) at this station contracted for five years with effect from 1-7-1966 and at present drawing a salary of Rs.610/-per month. One day he vomitted blood and was taken to the hospital. The medical examination revealed that he has peptic ulcer. We have not with-held his salary but this has not given much relief to him because his expenditure has been very heavy in the hospital. He is a poor man and a respected member of the writers' community.

2. The rules and regulations governing staff artists do not allow reimbursement of medical charges. I understand that a case for extending the facility of reimbursement of medical charges or free medical treatment at Central Government Hospitals was prepared by the Dte-General but so far it has not received sanction of the competent authority. Under the existing rules, we cannot help Mr. Nasir Kazmi by reimbursing expenditure on medical treatment. I have discussed ways and means of possible help to Mr. Nasir Kazmi in his extreme financial hardship with the Director Administration, Mr. A.A. Hanafi and with our S.A.S. Accountant. They were of the view that Government may be approached to sanction either a lump sum to the tune of Rs.2,000/- out of Staff Welfare Fund as a special case or the actual amount of medical treatment plus accommodation charges at the hospital. Mr. Kazmi's expenditure on examination, medicines and accommodation in the hospital has so far been to the tune of Rs.1,800/-. It is, therefore, requested that a case may please be prepared and recommended to the Government for sanction of the above amount as a special case from the Staff Welfare Fund.

3. I may mention here that column writers like Intizar Hussain are taking up this theme in their columns. I enclose a cutting on the subject. It would be a good gesture if Radio Pakistan could do something for him.

With respectful regards,

Yours sincerely

(Masud Qureshi)

Mr. Ijlal Haider Zaidi, TQA., C.S.P.,
Director General, Radio Pakistan,
81/A, Satellite Town,
Rawalpindi.

Encl: as above.

ریجنل ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان لاہور کی جانب سے ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان اسلام آباد کے نام ناصر کاظمی کے لئے مالی امداد کی درخواست کا عکس ۱۹۷۱ - ۵ - ۱۸/۱۹

The intellectuals and writers of Lahore unanimously adopted a resolution requesting immediate financial help of approximately Rs.2,000/- to Mr. Nasir Kazmi, a staff artist of Radio Pakistan Lahore who is seriously ill awaiting a major operation in the hospital.

Amongst others the writers represented in the meeting were renowned writers like Ahmad Nadeem Qasmi, Safdar Meer, Khadija Mastoor, Zaheer Kashmiri, Dr. Anwar Sajjad, Meerza Adeeb, Intizar Hussain. They stated that they will not cooperate with Radio as a mark of protest if this help is not immediately given.

May be filed with P/file

الطاف فاطمہ
۱۲ لارنس روڈ لاہور

ادیبوں کی جانب سے مالی امداد کا مطالبہ

CREED MESSAGE FROM MR. MASUD QURESHI, TQA., REGIONAL
DIRECTOR RADIO PAKISTAN LAHORE

TO MR. IJLAL HAIDER ZAIDI, TQA., CSP.,
DIRECTOR GENERAL RADIO PAKISTAN,
RAWALPINDI

MESSAGE BEGINS

MR. NASIR KAZMI, STAFF ARTIST, RADIO PAKISTAN LAHORE IS AGAIN SERIOUSLY ILL AND IN HOSPITAL AWAITING AN OPERATION STOP THE ENTIRE INTELLECTUAL COMMUNITY OF LAHORE FEELS THAT RADIO SHOULD DO SOMETHING TO HELP HIM FINANCIALLY STOP WE HAVE DONE WHAT LITTLE WE COULD DO PRIVATELY AND ALSO HE WAS GIVEN TWO GRADE ADVANCE INCREMENTS THIS YEAR BUT HE NEEDS LUMPSUM HELP TO THE TUNE OF RUPEES TWO THOUSAND STOP I HAD PREVIOUSLY WRITTEN TO THE DIRECTORATE GENERAL FOR SUCH HELP BUT UNFORTUNATELY IT COULD NOT MATERIALISE STOP IT SEEMS HIGH TIME THAT FROM SOME BENEVOLENT FUND MR. NASIR KAZMI IS GRANTED THE ABOVE MENTIONED AMOUNT IMMEDIATELY STOP

MESSAGE ENDS

NE for favour of creeding.

Sd/-

(Masud Qureshi) TQA
REGIONAL DIRECTOR
Phone:54778.

MPA(107)/- 1629×30 Dated: January 17, 1972.

1. Copy by post in confirmation of the above creed message forwarded to the Director General, Radio Pakistan, 81/A, Satellite Town, Rawalpindi. We had invited about 40 writers and poets in our Concert Hall on 15-1-1972 to have consultation with them regarding our literary and poetic programmes. The meeting passed a resolution requesting for help to Mr. Nasir Kazmi. Copy of this resolution is enclosed for your kind information. I personally think that if we could give financial help urgently to Mr. Nasir Kazmi to the tune of Rs.2,000/-, it will be helpful to him and appreciated by the writers community. His operation is to take place within the current week. May God save him!

I also enclose a cutting of a column which appeared in today's MASHRIQ at page 3.

2. Copy to Mr. Nasir Ahmad, Dy.Director General(Admn) alongwith a copy of the column in MASHRIQ and copy of our previous letter, for necessary action.

Sd
17/1

(MASUD QURESHI)TCA
REGIONAL DIRECTOR,
Radio Pakistan, Lahore.

ڈائریکٹر جنرل کو بھیجے گئے ٹیلیکس کا عکس

CREED MESSAGE FROM MR MASUD QURESHI RDL TO MR IJLAL HAIDER ZAIDI COMMA TQA COMMA CARPT CSP COMMA DIRECTOR GENERAL COMMA RADIO COMMA RAWALPINDI STOP DATED 18.1.72

BEGINS

IN CONTINUATION OF MY CREED MESSAGE DATES SEVENTEENTH JAN., 1972, I REPRODUCE BELOW A RESOLUTION SENT TELEGRAPHICALLY BY THE WRITERS AND INTELLECTUAL COMMUNITY OF LAHORE TO THE MINISTER FOR INFORMATION AND NATIONAL AFFAIRS AT KARACHI LAST EVENING:

''THE INTELLECTUALS AND WRITERS OF LAHORE UNANIMOUSLY ADOPTED A RESOLUTION REQUESTING IMMEDIATE FINANCIAL HELP OF APPROXIMATELY TWO THOUSAND RUPEES TO MR NASIR KAZMI A STAFF ARTIST OF RADIO PAKISTAN COMMA LAHORE WHO IS SERIOUSLY ILL AWAITING A MAJOR OPERATION IN THE HOSPITAL STOP AMONGST OTHERS THE WRITERS LIKE AHMAD NADEEM QASMI COMMA SAFDAR MEER COMMA KHDIJA MASTOOR COMMA ZAHEER KASHMIRI COMMA DR.ANWAR SAJJAD COMMA MEERZA ADEEB COMMA INTIZAR HUSSAIN STOP THEY STATED THAT THEY WILL NOT CO-OPERATE WITH RADIO AS A MARK OF PROTEST IF THIS HELP IS NOT IMMEDIATELY GIVEN STOP ''

2. M I REQUEST THAT IN VIEW OF THE VERY TIGHT FINANCIAL POSITION OF MR NASIR KAZMI AND GRAVE CONCERN IN THE INTELLECTUALS SOME FINANCIAL HELP FOR MR NASRRPT NASIR KAZMI MAY KINDLY BE OBTAINED URGENTLY STOP

ENDS PL ACK TIME 1150 HOURS .M
PL ACK
OKPL

ایک اور ٹیلیکس کا عکس

ALBERT VICTOR HOSPITAL (MAYO HOSPITAL)
LAHORE

DEATH REPORT FORM

ROOM
BED 24

~~M.L.~~
N.M.L.

Patient's Name— MR Nasir Kazmi

Diagnosis— Ca. stomach c̄ secondaries

Surgeon/Physician— Prof. Mamgin Khan & S.M. Masood

Date of Admission— 13.1.72

Date and Time of Death— 2.3.72 at 5.00 A.M.

Cause of Death—

Ca. stomach

[signature]
Medical Officer

ناصر کاظمی کی موت کا سرٹیفکیٹ

Dated 4.3.72

بخدمت ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان راولپنڈی

(بتوسط ریجنل ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان لاہور)

جناب محترم۔

ہمارے بہت عظیم رفیق کار، ممتاز آرٹسٹ جناب ناصر کاظمی ۲ مارچ ۷۲ء کو وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ضابطے اور قاعدے کی مجبوری کی بنا پر محکمہ انہیں کسی قسم کی مالی امداد نہ دے سکا۔ اس افسوس میں یقیناً آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں گے۔ امید ہے جب کارپوریشن کا قیام عمل میں آجائے گا تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

فوری مسئلہ مرحوم کی گریجویٹی کا ہے۔ آپ نے کمال فیاضی اور حسن سلوک سے ۲ فروری کو یونین کے نمائندوں سے گفت و شنید کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ گریجویٹی کی موجودہ شرح مضحکہ خیز ہے۔ صنعتی مزدوروں کو سال پیچھے تیس ۳۰ یوم کی گریجویٹی ملتی ہے۔

اب مناسب اور بروقت یہ بات ہوگی کہ ناصر کاظمی مرحوم کی
بیوہ کو پنشن ۳۰ یوم سالانہ کی شرح سے گریجوئٹی منظور فرما کر رقم
کے اجرا کا حکم جلد از جلد صادر فرمائیں - نوازش ہوگی -

اے حمید - ابوالحسن نغمی

صدر - جنرل سیکریٹری یونین

سٹاف یونین ریڈیو پاکستان لاہور کی جانب سے ڈائریکٹر جنرل

کے نام درخواست میں گریجوایٹی کی جلد ادائیگی کی اپیل

کتابیات

کتابیات

(الف) کتابیات:

۱۔: آزاد، محمد حسین: ''آب حیات''
لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۵۰ء

۲۔: ابو الخیر کشفی، ڈاکٹر: ''اردو شاعری کا تاریخی و سیاسی پس منظر''
کراچی، ادبی پبلشرز، ۱۹۷۶ء

۳۔: ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر: ''لکھنؤ کا دبستان شاعری''
لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۷ء

۴۔: احمد عقیل روبی: ''مجھے تو حیران کر گیا وہ''
لاہور، ورڈز آف وزڈم، ۱۹۹۴ء

۵۔: احمد مشتاق: ''مجموعہ (شاعری)''
لاہور، مکتبہ خیال ۱۹۹۳ء

۶۔: ایضاً: ''ہجر کی رات کا ستارا''
(مرتبہ) لاہور نیا ادارہ، ۱۹۷۳ء

۷۔: اختر انصاری: ''غزل اور درس غزل''
علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۶ء

۸۔: ایضاً: ''غزل کی سرگذشت''
علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۵ء

۹ ـ: انتظار حسین / عزیز الدین احمد: "۱۹۶۳ء کے بہترین مقالات"
لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۶۴ء

۱۰ ـ: انور سدید، ڈاکٹر: "اردو ادب کی تحریکیں"
کراچی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۸۵ء

۱۱ ـ: جمیل جالبی، ڈاکٹر: "تاریخ ادب اردو" (جلد اول)
لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۸ء

۱۲ ـ: ایضاً: "تاریخ ادب اردو" (جلدِ دوم)
لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء

۱۳ ـ: ایضاً: "دیوان حسن شوقی (مرتبہ)
کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۱ء

۱۴ ـ: حالی، الطاف حسین: "مقدمہ شعر و شاعری"
لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء

۱۵ ـ: حامد حسن قادری: "داستان تاریخ اردو"
کراچی، اردو اکادمی، سندھ ۱۹۶۶ء

۱۶ ـ: حامدی کاشمیری: "ناصر کاظمی کی شاعری"
الہ آباد، اردو رائٹرس گلڈ، ۱۹۸۲ء

۱۷ ـ: حسن اختر، ملک، ڈاکٹر: "اردو ڈرامے کی مختصر تاریخ"
لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء

۱۸ ـ: رام بابو سکسینہ: "تاریخ ادب اردو" (مرتبہ تبسم کاشمیری)
لاہور، علمی کتب خانہ، س۔ن

۱۹ ـ: رضا علی عابدی: "شیر دریا"
لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

۲۰ ـ: زور، محی الدین قادری: "تین شاعر" (میر، انیس، ہوریس)
حیدر آباد، جامعہ عثمانیہ، ۱۹۲۹ء

۲۱ ـ: سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر: "تہذیب و تخلیق"

لاہور' کلاسیک' ۱۹۶۶ء
۲۲۔: ایضاً: "تیشہ لفظ" (شاعری)
لاہور' نگارشات' ۱۹۶۸ء
۲۳۔: ایضاً: "معروضات" لاہور' پولیمر پبلی کیشنز' ۱۹۹۰ء
۲۴۔: سہیل احمد' ڈاکٹر: "طرفین"
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور' ۱۹۸۸ء
۲۵۔: شبیہہ الحسن' سید: "تاریخ" دھلی ساہتیہ اکادمی' ۱۹۸۴ء
۲۶۔: شبیہہ الحسن' ہاشمی: "آل رضا کی غزل گوئی"
لاہور سفینہ' پبلی کیشنز' ۱۹۸۹ء
۲۷۔: شہرت بخاری: "کھوئے ہوؤں کی جستجو"
لاہور' سنگ میل پبلی کیشنز' ۱۹۸۷ء
۲۸۔: صلاح الدین احمد مولانا: "تصورات اقبال" (جلد اول)
لاہور المقبول پبلی کیشنز' ۱۹۶۹ء
۲۹۔: صلاح الدین شیخ: "ناصر کاظمی' ایک دھیان"
لاہور' آغا پبلشرز' ۱۹۹۱ء
۳۰۔: ظہیر کاشمیری: "۱۹۴۸ء کا شعری ادب"
لاہور' نیا ادارہ ۱۹۴۹ء
۳۱۔: عابد علی عابد' سید: "شعر اقبال" لاہور' بزم اقبال' ۱۹۷۷ء
۳۲۔: عبادت بریلوی' ڈاکٹر: مدیر خصوصی'
"تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان و ہند" (جلد نہم)
لاہور' جامعہ پنجاب' ۱۹۷۲ء
۳۳۔: ایضاً: "جدید شاعری"
کراچی' اردو دنیا' ۱۹۶۱ء
۳۴۔: ایضاً: "شاعری اور شاعری کی تنقید"
کراچی' اردو دنیا' ۱۹۶۵ء

۳۵ ـ: عبدالحی سید: "گل رعنا" اعظم گڑھ
دارالمصنفین، ۱۹۷۰ء
۳۶ ـ: عبدالسلام ندوی: "شعر الہند" (جلد اول)
اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۳۹ء
۳۷ ـ: عبداللہ سید ڈاکٹر: "سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فکری و فنی جائزہ"
اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء
۳۸ ـ: عزیز احمد: "انتخاب جدید" (مرتب)
کراچی، انجمن ترقی اردو، س ـ ن
۳۹ ـ: غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: "اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر"
لاہور، جامعہ پنجاب، ۱۹۶۶ء
۴۰ ـ: فراق گورکھپوری: "اندازے"
لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۵ء
۴۱ ـ: فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری"
لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء
۴۲ ـ: ایضاً: "اقبال، سب کے لئے"
کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۸ء
۴۳ ـ: فضیل جعفری: "چٹان اور پانی"
الہ آباد، شب خون کتاب گھر، ۱۹۷۳ء
۴۴ ـ: فیاض محمود سید: مدیر خصوصی، "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" (جلد دہم)
لاہور، جامعہ پنجاب، ۱۹۷۲ء
۴۵ ـ: ایضاً: " (جلد ہشتم) ۱۹۷۱ء
۴۶ ـ: فیض احمد فیض: "میزان"
لاہور، ناشرین ۱۹۶۳ء

۴۷ـ: فیض الحسن سید: ''گلزار موسوی''
انبالہ' مطبع دی گرامی پرنٹرز' لمیٹڈ' ۱۹۴۰ء
۴۸ـ: قدرت اللہ شہاب: ''شہاب نامہ'' لاہور
سنگ میل پبلی کیشنز' ۱۹۸۷ء
۴۹ـ: گوپی چند نارنگ: ''اسلوبیات میر'' دہلی'
ایجوکیشنل بک ہاؤس' ۱۹۸۵ء
۵۰ـ: محمد حسن ڈاکٹر: ''جدید اردو ادب''
کراچی' غضنفر اکیڈمی' ۱۹۷۴ء
۵۱ـ: محمد حسین' ڈاکٹر: ''دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر''
علی گڑھ' ادارہ تصنیف' ۱۹۶۴ء
۵۲ـ: ایضاً: ''کلیات سودا'' (جلد اول)
مرتبہ' نئی دہلی' ترقی اردو بیورو' ۱۹۸۵ء
۵۳ـ: مسعود حسن رضوی ادیب: ''ہماری شاعری''
لکھنؤ نول کشور' ۱۹۴۴ء
۵۴ـ: مصحفی' غلام ہمدانی: ''تذکرہ' ہندی'' اورنگ آباد'
انجمن ترقی اردو' ۱۹۳۳ء
۵۵ـ: مظفر عباس' ڈاکٹر: ''اردو میں قومی شاعری''
لاہور' مکتبہ عالیہ' ۱۹۷۸ء
۵۶ـ: میر تقی میر: ''تذکرہ نکات سخن'' (مرتبہ عبدالحق)
اورنگ آباد' انجمن ترقی اردو' ۱۹۳۵ء
۵۷ـ: ناصر کاظمی: ''انتخاب انشا'' (مرتبہ)'
لاہور' فضل حق اینڈ سنز' ۱۹۹۱ء
۵۸ـ: ایضاً: ''انتخاب میر'' (مرتبہ)'
لاہور' مکتبہ خیال' ۱۹۸۹ء

۵۹ :- ایضاً: "انتخاب نظیر" (مرتبہ)
لاہور، فضل حق اینڈ سنز، ۱۹۹۰ء

۶۰ :- ناصر کاظمی: "انتخاب ولی" (مرتبہ)
لاہور، آغاز پبلشرز، ۱۹۹۱ء

۶۱ :- ایضاً: "برگ نے" (شاعری)
لاہور، مکتبہ خیال، ۱۹۸۲ء

۶۲ :- ایضاً: "پہلی بارش" (شاعری)
لاہور مکتبہ خیال، ۱۹۹۴ء

۶۳ :- ایضاً: "خشک چشمے کے کنارے" (نثر)
لاہور، فضل حق اینڈ سنز، ۱۹۹۰ء

۶۴ :- ایضاً/انتظار حسین: "خیال" (۱۸۵۷ء نمبر) ۱۹۵۷ء

۶۵ :- ایضاً: "دیوان" (شاعری)
لاہور مکتبہ خیال، ۱۹۹۳ء

۶۶ :- ایضاً: "سر کی چھایا" (ایک کتھا)
لاہور، مکتبہ خیال، ۱۹۸۱ء

۶۷ :- ایضاً: "کلیات ناصر" لاہور مکتبہ خیال، ۱۹۸۷ء

۶۸ :- ایضاً: "نشاط خواب"
لاہور، فضل حق اینڈ سنز، ۱۹۹۲ء

۶۹ :- ناہید قاسمی: "ناصر کاظمی شخصیت اور فن"
لاہور، فضل حق اینڈ سنز، ۱۹۹۰ء

۷۰ :- نصیر حسین کاظمی، سید: "نسب نامہ کاظمی سادات انبالہ"
لاہور، ۱۹۹۱ء

۷۱ :- نور الحسن ہاشمی، سید: "ولی کا دبستان شاعری"
کراچی، اردو اکیڈمی، سندھ ۱۹۶۶ء

۷۲ :- ایضاً: "کلیات ولی" (مرتبہ)

کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۴ء

۷۳ :۔ وارث علوی: ''تیسرے درجے کا مسافر''

لاہور، نگارشات، ۱۹۸۶ء

۷۴ :۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: ''اردو شاعری کا مزاج''

لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۴ء

۷۵ :۔ وقار عظیم، سید پروفیسر: ''اردو ڈراما فن اور منزلیں''

لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۹۲ء

۷۶ :۔ ایضاً: ''اقبال شاعر یا فلسفی''

لاہور، تصنیفات، ۱۹۸ء

۷۷ :۔ ایضاً مدیر خصوصی: ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند''

(جلد ہفتم) لاہور، جامعہ پنجاب ۱۹۷۱ء

۷۸ :۔ یونس جاوید: ''حلقہ ارباب ذوق''

لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء

(ب) رسائل و جرائد:

نمبر	رسالہ	مقام	شمارہ	سال
۱ـ	ادب لطیف،	لاہور	سالنامہ	۱۹۴۴ء
۲ـ	" "	"	اپریل / مئی	۱۹۵۵ء
۳ـ	" "	"	نومبر	۱۹۵۵ء
۴ـ	" "	"	دسمبر	۱۹۶۱ء
۵ـ	" "	"	اکتوبر	۱۹۶۲ء
۶ـ	" "	"	نومبر	۱۹۶۲ء
۷ـ	" "	"	دسمبر	۱۹۶۲ء
۸ـ	" "	"	فروری	۱۹۶۳ء
۹ـ	" "	"	جون	۱۹۵۴ء
۱۰ـ	اوراق،	لاہور	مارچ	۱۹۷۳ء
۱۱ـ	راوی،	مجلّہ گورنمنٹ کالج، لاہور	اپریل	۱۹۷۲ء
۱۲ـ	ساقی،	کراچی	جنوری / فروری	۱۹۵۳ء
۱۳ـ	سویرا،	لاہور	شمارہ ۱۷ ـ ۱۸	
۱۴ـ	" ،	"	شمارہ ۱۹ ـ ۲۰ ـ ۲۱	
۱۵ـ	فنون،	"	غزل نمبر ۱۹۶۹ء	
۱۶ـ	"	"	اپریل / مئی	۱۹۷۲ء
۱۷ـ	"	"	جون / جولائی	۱۹۷۲ء
۱۸ـ	کتاب	لاہور	اپریل	۱۹۷۳ء
۱۹ـ	لفظ،	مجلّہ اورینٹل	دسمبر	۱۹۷۲ء

کالج، لاہور

۲۰۔ "	"	جنوری	۱۹۷۳ء
۲۱۔ "	"	جنوری	۱۹۷۴ء
۲۲۔ ماہ نو	کراچی	مئی	۱۹۵۴ء
۲۳۔ "	"	ستمبر	۱۹۵۴ء
۲۴۔ "	"	مارچ	۱۹۵۵ء
۲۵۔ نیا دور،	کراچی	شمارہ ۷ – ۸	
۲۶۔ نصرت،	لاہور	جنوری	۱۹۶۱ء
۲۷۔ "	"	جنوری	۱۹۶۳ء
۲۸۔ ہمایوں	لاہور	نومبر	۱۹۵۲ء
۲۹۔ "	"	جنوری	۱۹۵۳ء
۳۰۔ "	"	نومبر	۱۹۵۶ء
۳۱۔ ""	دسمبر	۱۹۶۲ء	

(ج) ہم عصر ادیبوں کے مضامین:

۱۔: آفتاب احمد: اداس شاعر، اجنبی مسافر،
"ہجر کی رات کا ستارہ" ۱۹۷۳ء

۲۔: احمد مشتاق: پیش لفظ "ہجر کی رات کا ستارہ" ۱۹۷۳ء

۳۔: احمد ندیم قاسمی: "ناصر کاظمی کی یاد میں"
فنون، لاہور، اپریل / مئی ۱۹۷۲ء

۴۔: احمد ندیم قاسمی: ناصر کاظمی اور آئیڈیالوجی کا مسئلہ
"ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۳ء

۵۔: انتظار حسین: "آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے"
نقوش لاہور، مئی ۱۹۵۲ء

۶۔: " : "برگ نے" لفظ، مجلّہ
اورینٹل کالج لاہور، جنوری ۱۹۷۳ء

۷۔: " : چار گھڑی یاروں کا میلہ
"ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۲ء

۸۔: " : "ناصر کاظمی نیند کی تلاش میں"
راوی مجلّہ گورنمنٹ کالج، لاہور اپریل ۱۹۷۲ء

۹۔: جابر علی سید: "جدید نظم، جدید غزل اور جدید طرز احساس"
فنون، لاہور (جدید غزل نمبر) ۱۹۶۹ء

۱۰۔: جیلانی کامران: زندہ ناصر کاظمی،
"ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۳ء

۱۱۔: خورشید رضوی: ناصر کاظمی، اوراق، لاہور مارچ ۱۹۷۳ء

۱۲۔: سجاد باقر رضوی: پگلے کی پیغمبری، لفظ، مجلّہ اورینٹل کالج لاہور، ۱۹۷۳ء

۱۳:۔ ": "تنہائی کا سفر" معروضات ۱۹۹۰ء

۱۴:۔ ": ناصر کاظمی' ایک جائزہ' فنون لاہور جنون ۱۹۷۲ء

۱۵:۔ سلیم احمد: "نئی دنیا کا مسافر"
"ہجر کی رات کا ستارہ" ۱۹۷۳ء

۱۶:۔ سہیل احمد خان ڈاکٹر: "سرسوں کے پھول کا ہم عصر"
"ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۳ء

۱۷:۔ ": ناصر کاظمی کی یادیں "طرفین" ۱۹۸۸ء

۱۸:۔ شمس الرحمان فاروقی: ناصر کاظمی "برگ نے" کے بعد
"ہجر کی رات کا ستارہ" ۱۹۷۳ء

۱۹:۔ صغرا بی بی: "بم' کبوتر اور شاعری"
"ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۳ء

۲۰:۔ صلاح الدین محمود: "اجنبی شہر کی تلاش"
"ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۳ء

۲۱:۔ عبادت بریلوی ڈاکٹر: آج کی شاعری' نقوش لاہور جون ۱۹۶۰ء

۲۲:۔ عبدالمجید: "وہ اک نہال تھا جو اگا اور جل گیا"
"ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۳ء

۲۳:۔ فراق گورکھپوری: ناصر کاظمی' "ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۳ء

۲۴:۔ مظفر علی سید: ناصر کاظمی - ایک گم گشتہ تو
"ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۳ء

۲۵:۔ محمد حسین ڈاکٹر: "آج کی شاعری"
نقوش لاہور' جون ۱۹۶۰ء

۲۶:۔ محمد حسن عسکری: "تھا ایک انداز جنوں یہ بھی"
"ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۳ء

۲۷:۔ محمد حسن عسکری: "تھا ایک انداز جنوں یہ بھی"
"ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۳ء

۲۸ ۔: محمد حنیف رامے: "ناصر کاظمی۔ اداس نسلوں کا شاعر"
کتاب' لاہور۔ اپریل ۱۹۷۴ء

۲۹ ۔: محمد حنیف فوق: "اردو غزل کے نئے زاویے' فنون' لاہور
(جدید غزل نمبر) ۱۹۶۹ء

۳۰ ۔: منیر احمد شیخ: چراغوں کا دھواں۔ "ہجر کی رات کا ستارا" ۱۹۷۳ء

۳۱ ۔: منیر نیازی: ناصر کاظمی مرحوم کا آخری مجموعہ کلام
"ہجر کی رات کا ستارا"۔ ۱۹۷۳ء

۳۲ ۔: یونس حسن ڈاکٹر: اختر شیرانی کی رومانی شاعری'
اردو کراچی شمارہ ۲۰ ۔ ۱۹۷۰ء

(د) انٹرویوز:

۱۔○ اجمل نیازی ڈاکٹر: انٹرویو مقالہ نگار — ۷ جون ۱۹۹۳ء
۲۔○ اسلم انصاری: " — ۲۴ نومبر ۱۹۸۸ء
۳۔○ افتخار کاظمی: " — ۷ مئی ۱۹۹۳ء
۴۔○ " : " — ۲۹ جون ۱۹۹۳ء
۵۔○ انبالہ کے ایک گمنام سے انٹرویو: " — ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ء
۶۔○ انتظار حسین: " — ۱۰ مارچ ۱۹۹۳ء
۷۔○ " : " — ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ء
۸۔○ " : " — ۲۸ اپریل ۱۹۹۳ء
۹۔○ " : " — ۲۶ جون ۱۹۹۳ء
۱۰۔○ حسن سلطان کاظمی: " — ۱۰ مئی ۱۹۹۳ء
۱۱۔○ " : " — ۲۶ جون ۱۹۹۳ء
۱۲۔○ حسن عسکری کاظمی: "

۱۳۔○ شفیقہ کاظمی : " ۷ اپریل ۱۹۹۴ء
۱۴۔○ " : " ۳ مارچ ۱۹۹۳ء
۱۵۔○ شہرت بخاری : " ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء
۱۶۔○ صلاح الدین، شیخ : " ۲۶ جون ۱۹۹۴ء
۱۷۔○ عتیق اللہ شیخ : " ۳۰ جون ۱۹۹۴ء
۱۸۔○ عنصر کاظمی : " ۳ مارچ ۱۹۹۳ء
۱۹۔○ کاظمی علی شاہ سید : " ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۳ء
۲۰۔○ کوثر عباس رضوی سید : " ۳۱ مارچ ۱۹۹۰ء
۲۱۔○ محمد اعظم خان : " ۲۶ جون ۱۹۹۴ء
۲۲۔○ محمد باقر کاظمی : " ۳ اپریل ۱۹۹۳ء
۲۳۔○ مزور امام : " ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۳ء
۲۴۔○ مسعود الحسن کاظمی سید : " ۱۰ جنوری ۱۹۹۴ء

(ہ) غیر مطبوعہ مواد:

۱:۔ چند پریشاں کاغذ :۔ ناصر کاظمی
مملوکہ باصر سلطان کاظمی ، حسن سلطان کاظمی
۲:۔ ڈائری نمبر۱ ناصر کاظمی
مملوکہ باصر سلطان کاظمی ، حسن سلطان کاظمی
۳:۔ ڈائری نمبر۲ ناصر کاظمی
مملوکہ باصر سلطان کاظمی ، حسن سلطان کاظمی
۴:۔ ذاتی فائل ناصر کاظمی
مملوکہ ریڈیو پاکستان ' لاہور
۵:۔ کارروائی حلقہ ارباب ذوق ' اجلاس ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۱ء

مملوکہ طارق زیدی سابق سیکریٹری

۶۔: "ناصر کاظمی" (مضمون) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا
(غیر مطبوعہ) محررہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۱ء

○::○

ناصر کاظمی کی جادوئی شخصیت کے کرشمے کا اندازہ ان خاکوں سے لگایا جاسکتا ہے جو اب تک اس کے معاصرین اور احباب نے لکھے ہیں مگر یہ ساحرانہ شخصیت ایک باکمال شاعر کی تھی اور اس کا سب سے بڑا کرشمہ ناصر کی شاعری ہے۔ ناصر کی غزل میں جو طرز احساس اُبھرا اس میں تخیُّل کی کیمیا گری چیزوں کو ربط باہم عطا کر کے نئی نئی شکلیں بناتی ہے۔ اس میں تجربوں کی مانوسیت بھی ہے اور تجربوں کا تحیّر بھی۔ ان سب شعری تصویروں کے چاروں طرف تہذیبی حوادث کا دائرہ ہے جو انہیں نئی معنویت دیتا ہے۔

ناصر کی شخصیت پر کچھ کام پہلے بھی ہوا ہے لیکن حسن رضوی کا پی۔ایچ۔ڈی کے لئے لکھا گیا مقالہ اب تک اپنی وسعت کی وجہ سے الگ حیثیت رکھتا ہے۔ حسن رضوی نے بڑی محنت سے ناصر کے خاندان اور آبائی ماحول کے بارے میں نئی معلومات فراہم کی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان معلومات کو پوری طرح درست مانا جائے اس سلسلے میں تحقیق کے نئے امکانات موجود رہیں گے لیکن حسن رضوی نے پہلی بار اس ماحول کا مربوط اور تفصیلی بیان کیا ہے۔ یہ امتیاز کم اہمیت کا حامل نہیں۔ اس تصنیف کا تنقیدی حصہ بھی یقیناً قابل توجہ ہے۔ اگرچہ حسن رضوی نے شاعر کی سوانح اور شاعری کا جو رشتہ جگہ جگہ جوڑا ہے وہ تنقیدی اسلوب کے اعتبار سے اکہرا لگتا ہے لیکن اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس اسلوب کو آزما لیا گیا۔ ناصر پر لکھنے والوں کو اب لازمی طور پر اس سے آگے چلنا ہو گا۔ یوں حسن رضوی نے آنے والے مسافروں کے لئے رستہ صاف کیا ہے۔

سہیل احمد خان

Rs. 400.00 ISBN - 969 - 35 - 0715 - 0